عید الاضحیٰ مبارک

دل گداز تحریریں • زندگی کی تصویریں

ماہنامہ

سچی کہانیاں

کراچی

September
2017

☆...... 'مسئلہ یہ ہے' قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل

☆...... سلسلے وار ناول 'خانقاہ' اور 'نواب' بدیسی کہانی 'دی سگنل مین'

ماہنامہ
سچی کہانیاں
کراچی

E-mail pearlpublications@hotmail.com

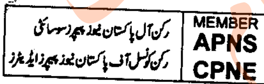
بانی سہام مرزا



مدیرِ اعلیٰ: منزہ سہام

گروپ ایڈیٹر: ناصر رضا

مدیر: دانیال شمسی



منیجر مارکیٹنگ
زین شمسی
0331-8221212

منیجر سرکولیشن
آفتاب عالم
0334-3193174

انکم ٹیکس ایڈوائزرز
فدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

رابطے کے لیے
021-35893122
021-35893123

خط و کتابت کا پتا: 88-C II فرسٹ فلور خیابانِ جامی کمرشل ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

قیمت فی شمارہ: 60 روپے ✻ جلد: 34 - شمارہ: 09 ✻ ستمبر 2017ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

صفحہ	عنوان	مصنف
07	پہلے تولو پھر بولو	منزہ سہام
08	احوال	ناصر رضا
20	ایوب بن حبیب	م۔ن۔خ
42	کھلا ہے بابِ رحمت	سیمیں غزالہ نیازی
47	گلزارِ ابراہیمی	تسنیم منیر علوی
53	اپنی جاں نذر کروں	عاصم نسیم
59	نہ قفس نہ آشیانہ	تبسم زہرہ رضوی
73	سسکتے رہے ارمان	حسین خواجہ
78	وائے مقدر	ابومحمد آزاد
82	نیلگوں	سید عبادت کاظمی
85	محبت جل گئی تھی	نوشین آراء
90	دیر آئے درست آئے	ممتاز احمد
96	قسمت کی لکیریں	رضوانہ آفتاب
104	انجام تو یہی ہونا تھا	عبدالغفار عابد
108	عذاب یوں آیا	مجید احمد جائی
116	عبرت کا نشان	مہر پرویز دولو
112	چراغ تلے اندھیرا	نازیہ بتول رضا



فون: 021-35893122-35893121 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی، سٹی پریس OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی

رخصتی	ڈاکٹر شمیم انصاری	119
کاہے کو دنیا میں آئی	ڈاکٹر طارق آکاش	123
کس سے فریاد کریں	فیضان حسین عثمانی	129
روح کا انتقام	شیخ معظم الٰہی	132
حاصل لاحاصل	کائنات بھٹی	137
وہ میری سہیلی	فرح انیس	141
نواب	حمیرا خان	144
کچا گھڑا	میجر (ر) امتیاز ملک	164
سرپرائز	روشن آراء	171
ڈسٹ بن	رانا زاہد	176
خانقاہ	کاوش صدیقی	182
آپ کی ڈائری	قارئین	205
مسئلہ یہ ہے	ادارہ	215
شعر کہانی	ڈاکٹر محمد محسن	225
سفر کہانی	شیراز خان	230
سچی کہانیاں کی دنیا	زین شمسی	234
شبانہ اعظمی	عمر خطاب خان	236
سگنل مین	نجیب عمر	248

... پاکستان 890 روپے افریقہ 65 ڈالر کینیڈا آسٹریلیا 65 ڈالر ایشیا یورپ 55 ڈالر / قانونی مشیر جی ایم بھنوا ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

اب CSS ایک حقیقت

1) والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ اُن کی اولاد اُن کا نام روشن کرے مگر فی زمانہ اکثر والدین اپنی خواہش کو بس اپنے دل میں ہی دبا کر رکھ لیتے ہیں۔

2) مشہور تعلیمی اداروں اور ان سے جڑے اساتذہ کی بھاری بھر کم فیس عام والدین کی پہنچ سے بہت دور ہوتی ہیں۔

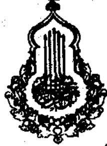
3) ایسے میں ہم آپ کی رہنمائی کریں گے ہم آپ کی اولاد کو آپ کے لیے باعث فخر بنائیں گے۔

4) علم کی دنیا میں CSS ایک خواب۔

5) اس خواب کی حقیقی تعبیر کے لیے ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

6) انتہائی قابل ٹیچرز سے گھر بیٹھے اپنی لاڈلی بیٹی یا ہونہار سپوت کو CSS کی تیاری کرائیں۔

7) CSS میں آپ کی کامیابی کو ہم یقینی بنائیں گے۔



'پہلے تولو پھر بولو'

زبان کا وار تلوار کے وار سے زیادہ کاٹ دار اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔

بڑوں سے سنا سمجھنے کی عمر سے پہلے پلو میں باندھا اور پھر ساری زندگی اس پر عمل کرنے کی کوشش کی کہ چاہے کسی کی کوئی بات کتنی بری لگے' رویے کتنے دکھ دیں' بس ایک چپ ہی سادھے رکھنی ہے اور اگر صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے تب بھی الفاظ' لہجہ اور زبان قابو میں ہی رکھتے ہیں کیونکہ اِس کا حکم میرے نبی ﷺ نے بھی دیا...... پاکستان ایک مُٹھی کی مانند ہے اور اس بند مُٹھی کو گھونسہ چاروں صوبے مل کر بناتے ہیں۔ دشمن اسی لیے چاہنے کے باوجود بھی زبانی گولہ باری کے علاوہ کچھ نہیں کر سکا...... اس ملک میں بسنے والے چاہے کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں' سب پاکستانی ہیں اور کسی کو حق نہیں کہ وہ یہ کہے کہ ثابت کریں کہ آپ پاکستانی ہیں...... اور خاص کر اُن لوگوں سے کہنا کہ بتاؤ کہ تم پاکستانی ہو بھی یا نہیں' جن کی قربانیوں کی وجہ سے پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ بالکل ایسا ہی ہے جیسے باپ سے پوچھا جائے کہ ثابت کرو کہ گود میں بیٹھا یہ بچہ تمہاری ہی اولاد ہے......

شاید اسی لیے کہتے ہیں کہ پہلے تولو پھر بولو......

عجب جنون مسافت میں گھر سے نکلا تھا
خبر نہیں ہے کہ سورج کدھر سے نکلا تھا
یہ کون پھر سے انہی راستوں میں چھوڑ گیا
ابھی ابھی تو عذابِ سفر سے نکلا تھا

منزہ سہام

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

محترم احوالی دوستو! سلامت باشد! آپ سے وعدے کے مطابق آپ کی آراء کی روشنی میں، سچی کہانیاں کا شمارہ ستمبر 2017ء بہت سی تبدیلیوں کے ساتھ آپ کے پیش خدمت ہے' سہام مرزا صاحب اور شمیم نوید مرحوم نے سچی کہانیاں کے آغاز میں کہانیوں کی سرخیوں کے ساتھ شعر والا جو یکتا اور منفرد انداز دیا تھا وہ دوبارہ اپنالیا گیا ہے' تاریخی کہانی' سچی کہانیاں کا مقبول سلسلہ تھا' اُس کا بھی دوبارہ آغاز ہو رہا ہے' ماضی میں آپ کا نہایت ہی پسندیدہ سلسلہ 'آپ کی ڈائری' بھی دوبارہ شروع ہوگیا ہے۔ مختصر یہ کہ ہماری پوری کوشش ہے کہ سچی کہانیاں آپ کی پسند' آراء اور معیار کے مطابق مرتب کیا جائے ان تبدیلیوں کے ساتھ آپ کو شمارہ ستمبر کیسا لگا؟ آپ کے تبصرے اور آراء کا انتظار رہے گا۔ اور اب سچی کہانیاں کی دیرینہ دوست' مقبول و معروف شاعرہ اور کہانی کار' عکاشہ سحر کے اِس نہایت ہی اعلیٰ شعر کے ساتھ آغازِ احوال......

مجھ کو دیارِ عشق میں رہنا ہے عمر بھر
صاحب یہ دشت تو مری اپنی خرید ہے

☆ یہ سب سے پہلا خط ہے کراچی سے' سچی کہانیاں کی بہت ہی بہترین لکھاری' مقبول و کامیاب ناول 'تاشون' جن کی شناخت بن گیا' شازلی سعید مغل کا...... ناصر بھائی! آداب! آپ نے تو بتایا نہیں' ہماری لکھاری دوست نسیم سکینہ صدف کے ذریعے آپ کی ادارہ سچی کہانیاں میں دوبارہ آمد کا علم ہوا' یہ جان کر بہت خوشی ہوئی آپ کو بہت مبارک ہو' اِس خوشی میں' میں آپ کو اور سچی کہانیاں کو ایک بہت اچھا تحفہ دینا چاہ رہی ہوں' یہ تحفہ کیا ہے' اس کے لیے آپ کو مجھ سے رابطہ کرنا ہوگا' اب اجازت آئندہ ماہ شمارے پر مکمل تبصرے کے ساتھ حاضری ہوگی۔

☆ شازلی بیٹا! تمہارا موبائل نمبر مس ہوگیا تھا' اس لیے ادارے میں واپسی کی اطلاع تمہیں نہ دے سکا' بہرحال بہن نسیم سکینہ صدف کا بہت شکریہ کہ انہوں نے ہماری خبر تم تک پہنچائی' اور رہی بات تمہارے گفٹ کی تو' میں تم سے رابطہ کرنے سے پہلے یہ بات یقین سے کہہ رہا ہوں کہ ہمارے اور سچی کہانیاں کے لیے تمہارا یہ گفٹ تمہاری کوئی نئی تحریر' کہانی یا ناول ہی ہوسکتا ہے۔ ایسا ہی ہے نا؟

☆ یہ دوسرا خط ہے' حیدرآباد سے سید سرور ندیم کا ہے' لکھتے ہیں۔ آپ کا ارسال کیا شمارہ اگست موصول ہوا' اِس نوازش کے لیے شکریہ' اس شمارے کی سب سے اچھی بات ماہِ اگست یوم آزادی کے حوالے سے خصوصی تحریر کی اشاعت ہے' ایک زمانے میں خاص دنوں اور ماہ وغیرہ کے حوالے سے کہانیوں کی اشاعت سچی کہانیاں' کا خاصا تھا' بعد میں نجانے کیوں یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ سلیم اختر صاحب کی کہانی 'بازارِ عشق' کے کیا کہنے' واہ کہانی پڑھ کے مزا آ گیا' راجہ بازار کا جو انہوں نے لفظوں سے نقشہ بنایا ہے' اس کا

جواب نہیں، آرڈی ہیمبرن کی زندگی کو بہت مختلف انداز میں تحریر کی شکل دی گئی ہے، اچھی لگی۔ باقی تحریریں بہت اچھی، اچھی، بہتر اور بس ٹھیک قسم کی رہیں۔ سائیں مولابخش چانڈیو کی زندگی کا خاکہ بھیجنے میں کچھ تاخیر ہو رہی ہے معذرت خواہ ہوں، اور وہ کہانی کی سرخی کے ساتھ شعر والی میری بات پر کچھ سوچا؟

☜ بھائی سید سرور ندیم! آپ نے ہماری خاطر احوال کے لیے وقت نکالا دل کی گہرائیوں سے شکریہ خاص دنوں کے حوالے سے خاص کہانی، سچی کہانیاں کا یہ خاصا اب برقرار رہے گا، بھائی سلیم نے واقعی کمال کہانی لکھی ہے، چانڈیو صاحب کی زندگی والے خاکے کا انتظار رہے گا، اور ہاں! کہانی کی سرخی کے ساتھ شعر آپ کی بات پر صرف سوچا ہی نہیں، زیرِ نظر شمارے سے عمل بھی شروع ہوگیا ہے۔ اور کوئی حکم؟

☆ سچی کہانیاں کے دیرینہ دوست لکھاری، فیضان حسین عثمانی حیدرآباد سے احوال میں شریک ہیں۔

محترم ناصر رضا بھائی، السلام علیکم! آپ کی خیریت اپنے پروردگار سے نیک مطلوب چاہتا ہوں، آپ کی سچی کہانیاں میں واپسی کی مبارکباد میں آپ کو سب سے پہلے بذریعہ فون دے چکا ہوں، دوسرے فون پر آپ نے مجھے حکم دیا کہ میں کہانی اور خط کے ساتھ فوراً حاضر ہوجاؤں تو میں آپ کے بلاوے پر حاضرِ خدمت ہوں۔ آپ کے آنے کے بعد بہت سے پرانے اور سینئر لکھاری بھی ضرور شامل احوال ہوں گے اور اپنی جاندار تحریروں سے سچی کہانیاں کو چار چاند لگا ئیں گے، میں اپنی آمد کے ساتھ ساتھ اپنے پرانے لکھنے والوں کو بھی کہہ رہا ہوں کہ وہ بھی ناصر بھائی کی آمد کے بعد خود بھی حاضرِ احوال ہوجائیں، میرے بہت پیارے دوست اشعر جواد اور ہماری آپا صفیہ تو اگست کے شمارے میں انٹری دے چکے مگر ابھی اور بہت سوں کو آنا ہے۔ ارشد علی ارشد، سرور شاذ، زوبیہ جہد، عباس جانباز اور قابل قدر انکل فہیم (جو کہ نہ جانے کہاں پس منظر میں چلے گئے ہیں) ناصر بھائی سچی کہانیاں سے میری بڑی طویل وابستگی ہے میں نے ہر دور کے ایڈیٹر کو دیکھا، اُن کے لیے لکھا اُن کی ادارت میں پرچہ پڑھا، چاہے وہ نسیم نوید انکل ہوں یا دانش دیروی، یا سلیم فاروقی، یا سلیم آذر، یا پھر پرویز بلگرامی ہوں۔ سب میرے لیے محترم اور قابل عزت ہیں میرے استاد ہیں۔ 1989ء سے 2017ء بڑے طویل عرصہ سے دلی وابستگی ہے پرچے سے اور آپ سے، آپ کی اپنائیت محبت اور چاہت کا احساس ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے۔ آپ نے بھائیوں کی طرح جو میرا ہاتھ تھاما تو آج تک نہیں چھوڑا اور نہ کبھی چھوڑیں گے انشاء اللہ۔ آپ نے کہانی مانگی تھی میں کہانیاں لے کر آیا ہوں، اب یہ آپ پر ہے کہ آپ اُن کو کب اور کس طرح پرچے کی زینت بناتے ہیں۔ کیونکہ ہم تو پرچے کو اپنے مطالعے میں تسلسل رکھے ہوئے ہیں۔ پرچے میں حاضر نہیں تھے تو کیا ہوا، پرچہ پڑھ ضرور رہے تھے دکھ اس بات کا ہے کہ اِس پرچے میں ایسے نام و نہاد لکھاری بھی شامل ہونے لگے ہیں، جو اپنی ذاتی حسد، بغض اور جلن کو کہانیوں کا نام دے کر اپنے ہی لوگوں پر بہتان لگا کر اُن کی کردار کشی کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کو ہدایت دے اور عقل دے آمین۔ ناصر بھائی! آج کل ہر کوئی ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے میں ماہر ہو چکا ہے مگر یہ نہیں سوچ رہا کہ کہیں ایسا نہ کہ میری اچھالی ہوئی کیچڑ اگر پلٹ کر میرے اوپر آ گئی تو کیا ہوگا، آج کل ہر کوئی مظلوم بن کر دوسرے کو ظالم ظاہر کرنے میں لگا ہوا ہے۔ جبکہ یہ سوچ بنا کہ اگر کسی مظلوم نے سچ میں مجھے ظالم بنا کر پیش کر دیا تو کیا ہوگا، جس کو دیکھو وہ کہہ رہا ہے کہ ہمارے معاملات اللہ دیکھ رہا ہے، ہم نے اللہ پر چھوڑ دیا ہے، عقل سے پیدل اور نادان لوگوں کو یہ نہیں پتہ اللہ تو سب کے معاملات دیکھ رہا ہے سب سے اللہ پر چھوڑ رکھا ہے ہر کام ہر معاملہ، کون صحیح کون غلط یہ وہ ضرور دکھا دیتا ہے۔ آج کل لوگوں کو اُن کے کیے کا صلہ اللہ پاک دنیا میں ہی دکھا کر دے دیتا ہے، کہیں اولاد کا برا کیا، ماں باپ کے آگے آ رہا ہے کہیں ماں

باپ کا کیا اولاد بھگت رہی ہے' تو کہیں بہن بھائی کا برا دوسرے بہن بھائی کے ساتھ آ رہا ہے' مگر لوگ آنکھیں بند کر کے بیٹھے ہیں اللہ سے توبہ یا معافی نہیں مانگ رہے بس اللہ پاک سب کو ہدایت عطا کرے آمین۔

﴾ بھائی فیضان حسین عثمانی! آپ کی احوال میں آمد سے دل شاد ہوا' آپ نے اپنے خط میں جو لکھا ہے' ہمیں اُس سے سو فیصدی اتفاق ہے۔ ہم دل سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ سب کو نیک ہدایت دے' سب پر اپنا کرم فرمائے۔

☆ معروف لکھاری سیمیں غزالہ نہاں' کراچی سے احوال میں شریک ہیں۔ ناصر صاحب' السلام علیکم! امید ہے خیریت ہوگی' پہلے تو میں آپ کو واپس آنے کی مبارکباد دے دوں! پھر آپ کا شکریہ بھی ادا کروں کہ آپ نے مجھے اتنی اہمیت دی کہ میری حج کی روداد کو شرف قبولیت بخش رہے ہیں۔ اس تحریر میں اپنی کچھ ذاتی باتیں بھی سچی کہانیاں سے شیئر کی ہیں۔ اس لیے کہ سچی کہانیاں میں سب سچ ہی ہوتا ہے۔ اور تمام عملہ اور قارئین اپنے لگتے ہیں اور ویسے بھی میری کہانیاں سچی ہوتی ہیں۔ میری ایک اور کہانی 'قدرت کے فیصلے' بھی سچی کہانیاں کو بھیجی تھی۔ وہ بھی بالکل سچی ہے اور میری دوست کے بھائی کی بچی کا واقعہ ہے۔ اس کو بھی دیکھ لیجیے گا مہربانی ہوگی۔ پُراسرار نمبر کے کہانی بھی جلدی بھیج دوں گی۔ یہ پُراسرار تو ہے مگر خوفناک نہیں' پسند آئے تو شائع کر دیجیے گا شکریہ۔

﴾ سیمیں غزالہ نہاں صاحبہ! آپ کو بھلا ہم اہمیت کیوں نہیں دیں گے' آپ ہماری بہت ہی اچھی لکھاری ہیں' آپ نے حج کی روداد تو بہت ہی کمال لکھی ہے' ہمیں یقین ہے کہ یہ تمام قارئین کو بھی پسند آئے گی۔ البتہ ''قدرت کے فیصلے'' ہم تک نہیں پہنچی ہے' ریکارڈ کے لیے اگر کاپی محفوظ کی ہو تو دوبارہ ارسال کر دیں' ہم دلی طور پر آپ کے شکر گزار ہوں گے۔

☆ ہماری سینئر لکھاری مسز نگہت غفار کراچی سے احوال میں شریک ہیں۔ قابل احترام محترم ناصر بھائی' السلام علیکم! سلامت رہیں' بڑے دنوں کے بعد جب مجھے علم ہوا کہ آپ سچی کہانیاں میں لوٹ آئے ہیں بڑی خوشی ہوئی' میں نے ایک کہانی تیار کر لی تھی' اب ارسال کر رہی ہوں اس امید واثق کے ساتھ کہ ناامیدی نہیں ہوگی۔ اس ماہ کی سچی کہانیاں نہیں پڑھ سکی اس وجہ سے تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں لیکن انشاء اللہ تعالیٰ اگلے ماہ میں زندگی باقی رہی تو ضرور شرکت کروں گی ورنہ آپ کو یہ خط میری بات یاد دلا دے گا۔ اس مختصر خط کے ساتھ اجازت چاہوں گی اگلے ماہ آپ کا زیادہ وقت لوں گی۔

﴾ میری اچھی بہن مسز نگہت غفار صاحبہ! اللہ آپ کو صحت کے ساتھ زندگی دے' آپ کی تحریر جلد سچی کہانیاں کی زینت ہوگی۔ آئندہ ماہ کہانیوں پر تبصرے کے ساتھ احوال میں آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔

☆ شیخ معظلم الٰہی لاہور سے شامل احوال ہوئے ہیں۔ ناصر رضا صاحب السلام علیکم! پُراسرار نمبر کے لیے دو کہانیاں ارسال کر رہا ہوں۔ اِن میں سے جو بھی زیادہ اچھی کہانی ہو اسے شائع کرا دیں۔ اگر ان میں کوئی غلطی وغیرہ ہو تو آپ اُن کی نوک پلک کر سکتے ہیں۔ اللہ پاک آپ کا حامی و ناصر ہو۔ اِس کے علاوہ میرے حوالے سے یہ دو دکھ کی خبریں بھی ہیں' برائے کرم انہیں احوال میں شائع کر دیں۔ بہت افسوس ناک خبر یہ ہے کہ میرے بڑے بھائی جناب شیخ شوکت الٰہی طویل علالت کے بعد گزشتہ دنوں وفات پا گئے ہیں۔ میں سب لکھاریوں اور احوالیوں سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے بڑے بھائی کے لیے دعائے مغفرت کر دیں۔

'سچی کہانیاں' میں ایک نہایت ہی مقبول' کامیاب
ترین سلسلے وار ناول 'تاشون' کے بعد'
معروف ومقبول کہانی کار شازلی سعید مغل' ایک نیا
تہلکہ خیز سلسلے وار ناول لے کر آرہی ہیں۔
"املتاس" سحر واسرار کا ایک ایسا انوکھا
سلسلہ' جو آپ نے آج تک پڑھا نہیں ہوگا۔ یہ
ہمارا صرف ایک دعویٰ ہی نہیں یقین بھی ہے......!

بس ذرا انتظار کیجیے

'سچی کہانیاں' کے پُراسرار نمبر' شمارہ اکتوبر
2017ء سے "املتاس" کا آغاز ہوگا......!

ایک بہت ہی خاص، منفرد موضوع پر سلسلے وار ناول، معروف لکھاری

''روشانے سبعین مہاروی'' کے ہفت رنگ قلم سے



نام اور دیگر تفصیلات کے لیے

بس ذرا سا انتظار کرلیجیے......!

میرے بہنوئی جناب شیخ غضنفر علی بہت علیل ہیں اُن کے شانے کا آپریشن ہونے والا ہے۔ اُن کے لیے دعائے صحت کی درخواست ہے۔

☆ بھائی شیخ معظلم الٰہی! ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور آپ کے بڑے بھائی کے لیے مغفرت کی دعا کے ساتھ آپ کے بہنوئی کی مکمل صحت یابی کے لیے دعا گو ہیں۔

☆ بارش علی ثمر چک جیوے والا سے 'احوال میں تشریف لائے ہیں۔ ناصر صاحب! آداب! چھ اگست کی صبح سچی کہانیاں ملا جسے دیکھ کر دل غنچے کی طرح کھلا' سرورق والی حسینہ تو جان لیوا ہے۔ پانچ منٹ تو مجھے سرورق پر ہی لگ گئے کیونکہ چرا بھی تو ایک مکمل کتاب ہوتا ہے نا بھئی' مطالعے پر ٹائم تو لگتا ہے' میڈم منزہ صاحبہ کا اداریہ 'شکرانہ' نے یہ احساس دلوایا کہ میں تو بہت ہی ناشکرا بندہ ہوں۔ ضمیر نے تھوڑی ملامت تو کی پر اب تھوڑی ملامت سے اپنا کچھ نہیں بنتا' جب احوال میں پہنچا تو پتا چلا اِس بار تو بہت سے یار دوست غائب ہیں' صفیہ سلطانہ آپ کو حج کی سعادت بہت بہت مبارک ہو' عبدالغفار عابد نے لاجواب شعر لکھا ہے' افضل خان کی پسند گلزار جی کی آزاد نظم بھی اچھی تھی۔ باقی تبصرے مختصر تھے' پر خوب رہے۔ کہانیاں ویسے تو سبھی اچھی تھیں۔ پر مجھے توبہ توحیرت'' بہت پسند آئی ہے اس کے علاوہ بازارِ عشق اور تم میری ہو زبردست رہیں' ویسے تبصرہ تو مجھے بالکل بھی نہیں کرنا آتا بس چند لائنیں لکھ کر ارسال کر رہا ہوں امید ہے کہ احوال کی رونق کو دوبالا کریں گی۔

☆ بارش علی ثمر صاحب! سرورق آپ کو پسند آیا' شکریہ' اور آپ جیسا ضمیر اگر ہمارے

سیاستدانوں کا بھی ہو جائے تو پاکستان واقعی پاکستان بن جائے آئندہ بھی احوال میں آپ کا چند کے ساتھ نہیں' کافی زیادہ لائنوں کے ساتھ انتظار رہے گا۔

☆علی اصغر الانصاری احوال کے لیے لکھتے ہیں۔ ناصر صاحب! پہلے تو ویلکم بیک' سر ہنستے مسکراتے رہیں' جناب عبدالغفار عابد صاحب سے آپ کی علالت کا پتا چلا' میں آپ کی کامل صحت کے لیے دعا گو ہوں' شمارہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی لیٹ ملا' آپ نے صفحہ نمبر تیرہ پر رائے مانگی ہے بس جی اگر ماضی والے پرانے سلسلے شروع ہو جائیں تو اچھا ہے۔ مثلاً تاریخ کہانی' آپ کی ڈائری' اس ماہ کا شاعر وغیرہ ناصر صاحب مجھے پتا ہے کہ آپ جو بھی سلسلہ شروع کریں گے وہ یقیناً اچھا ہی ہوگا ویسے میرا ذاتی ووٹ خیال آرائی کے لیے ہے' کیونکہ یہ ماضی کا بہت مقبول سلسلہ تھا اور کوئی اور جریدہ یہ موقع فراہم نہیں کر رہا' جس میں قاری اپنی سوچ کا اظہار کر سکے' اس سے لوگوں کی منفرد سوچ کا پتا چلتا ہے' تمام بہن بھائیوں کے تبصرے بہت اعلیٰ تھے۔ سلطانہ آپا کو حج کی بہت بہت مبارک باد' افضل خان کی منتخب کی گئی نظم دل کو بھا گئی' کہانیاں ابھی پڑھی نہیں لہٰذا تبصرہ ابھی نہیں کر سکتا' مسئلہ یہ ہے والے بابا جی کے لیے بہت سی دعائیں اور اُن سے دعا کے لیے پرزور اپیل' بابا جی بہت اچھا کام سرانجام دے رہے ہیں۔

﴿ بھائی علی اصغر الانصاری! زیرِنظر شمارے سے بہت سی تبدیلیاں کی جا رہی ہیں' ان میں آپ کی ڈائری بھی شامل ہے۔ جس کا حصہ 'خیال آرائی' بھی ہوگی۔ بابا جی واقعی بہت اچھا کام سرانجام دے رہے ہیں۔ آپ کے لیے دعا کا پیغام اُن تک پہنچ گیا ہے' ویسے تو وہ تمام قارئین کے لیے ہمیشہ ہی دعا گو رہتے ہیں۔

☆ڈاکٹر فرمان علی بھٹی' منڈی صادق گنج سے احوال میں تشریف لائے ہیں۔ محترم بھائی ناصر رضا شکر اللہ کا کہ آپ سچی کہانیاں میں واپس آ گئے ہیں۔ یہ کہاں ہماری قسمت کے وصال یار ہوتا' اگر اور جیتے تو یہی انتظار ہوتا۔ سرورق لاجواب ہے۔ شمارہ اگست کا ماہ آزادی سب کو مبارک ہو' شکرانہ پر منزہ صاحبہ کا شکریہ' سید سرور ندیم کے خاکے کا مجھے انتظار رہے گا' صفیہ سلطانہ صاحبہ کو حج مبارک ہو' ناصر بھائی کی کامل صحت کے لیے آپ نے وہاں ضرور دعا کرنی ہے' روشانے سبعین' پرویز احمد دولو' اسماء غفور' اور افضل خان آپ سب احباب کے خطوط پسند آئے' عبدالغفار عابد کا شعر لاجواب تھا زندگی رہی تو آئندہ ماہ' کہانیوں پر تفصیلی تبصرہ کروں گا اس شعر کے ساتھ اجازت دیں۔

﴿ ڈاکٹر صاحب! اتنی زیادہ تعریف بندے کا دماغ خراب کر دیتی ہے' سو ناچیز پر رحم کریں۔ آئندہ ماہ شمارے پر' آپ کے تفصیلی تبصرے کا انتظار رہے گا۔ شعر کا خیال اچھا ہے' یہ ہے کس کا؟

☆رفعت شبنم کی احوال میں بہاولپور سے آمد ہوئی ہے۔ ناصر انکل آداب' کیا حال ہے آپ کا مزاج کیسا ہے امید کرتی ہوں سب ٹھیک ٹھاک اور خیر و عافیت سے چل رہا ہوگا' ایک لمبے عرصے بعد اچانک آپ کی واپسی کسی سرپرائز سے کم نہیں' مجھے تو جیسے ہی آپ کی واپسی کا پتا چلا فوراً قلم اٹھا لیا' ویسے تو میں خود ہی ایک لمبے عرصے سے احوال میں غیر حاضر ہوں لیکن پھر بھی اس بار مجھے محفل میں حاضر ہونے سے روکا گیا پتا نہیں کیوں؟ آپ کی واپسی کے بعد سچی کہانیاں کا پہلا شمارہ دیکھا' احوال میں اہلِ ادب کے خطوط محفل کو چار چاند لگا رہے تھے' آپا صفیہ سلطانہ کو حج کی بہت بہت مبارک یاد روشانے سبعین اب تو ناصر انکل واپس آ گئے ہیں' آپ کی حاضری یقینی ہوگی نا ہر ماہ؟ بھائی عبدالغفار

ہاہا آپ کے شعر نے بہت کچھ کہہ دیا' آپ اتنے باغی کیوں ہو؟ آپ کے جواب کی منتظر رہوں گی'

افضل خان' اشعر جواد سید سرور ندیم کے خطوط بہت اچھے تھے' کہانی نو بہ نو حیرت یوم آزادی کے موقع پر بہترین رہی' روپ بہروپ' موجودہ دور پر مبنی تھی' ایسا بھی ہوتا ہے آج کے دور پر سو فیصد سچی کہانی ہے ایسا اکثر جگہ پر دیکھا گیا ہے۔ غم مقدر ٹھہرے ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ جب مان ٹوٹتا ہے تو انسان اندر سے مرجاتا ہے' انکل سچی کہانیاں میں تحریر شائع ہونے کے لیے اب کیا شرائط ہیں کیونکہ پہلے تو نون لیگ کی طرح اپنے بندوں کو ہی نوازا جاتا تھا' اس سے پہلے میں نے ادارے کو کہانی ارسال کی تھی شائع کرنا تو دور کی بات مجھے تو کسی نے یہ بھی بتانا ضرور نہیں سمجھا کہ یہ قابل اشاعت ہے یا پھر نا قابل اشاعت' انکل اگر آپ عجیب واقعات کے نام سے کوئی سلسلہ شروع کر دیں تو کیا ہی بات ہو' آپ کے کہنے پر میں نے اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے اب آپ کے جواب کی طالب ہوں۔

❀ رفعت شبنم! ہمارے مزاج ٹھیک ہیں اور سچی کہانیاں کا کام خیر و عافیت سے چل رہا ہے۔ پلیز ذرا یہ تو بتاؤ آپ کو احوال کی محفل میں آنے سے کس نے روکا؟ سچی کہانیاں میں تحریر شائع ہونے کی صرف ایک شرط ہے۔ اچھی تحریر اپنی کہانی دوبارہ ارسال کردو' عجیب واقعات کے حوالے سے تمہاری تجویز اچھی ہے۔ اس سلسلے میں پہلی تحریر آپ خود روانہ کر دو تو اچھا رہے گا۔

☆ خواجہ حسین منچن آباد سے تشریف لائے مکرمی ناصر رضا صاحب السلام علیکم! یہ 2007ء کی بات ہے ایک روز مشہور لکھاری سرور شاز صاحب کی لائبریری پر جانے کا اتفاق ہوا' وہاں میری نظر سچی کہانیاں پر پڑی تو لفظ سچی کہانیاں نے بہت متاثر کیا' اور میں نے فوراً شمارہ خرید لیا' اس رسالے کے ساتھ یہ میرا پہلا تعارف تھا' اس سے پہلے میں نے اپنی والدہ صاحبہ (جو کہ حال ہی میں وفات پا گئی ہیں) کو رسالے پڑھتے دیکھا تھا' میری والدہ صاحبہ کو مطالعے کا بہت شوق تھا' خیر تو میں عرض کر رہا تھا کہ زندگی میں پہلی بار میں نے رسالہ خریدا' جب رسالے کا مطالعہ شروع کیا تو اس امر کا اندازہ ہوا کہ سچی کہانیاں اپنی نوعیت کا انتہائی منفرد رسالہ ہے اور یہ اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا' اس میں ہر وہ تحریر ہے جس کا مطالعہ ضروری ہے۔ خیر گزرتے وقت کے ساتھ سچی کہانیاں میں لکھنے کا بہت من چاہا' لیکن یہ ممکن نہ تھا' پھر ایک دن میں نے پسند اپنی اپنی میں ایک شعر بھیجا اور وہ رسالے کی زینت بنا' لیکن سوال تو خود کچھ لکھنے کا تھا اور شعر انتخاب کیا ہوا تھا۔ اور ظاہری سی بات ہے کہ پہلی مرتبہ بندہ قلم اٹھائے اور کہانی لکھ دے' یہ تو کسی طور بھی ممکن نہیں' اور پھر پہلی بار لکھنے کا موقع بھی مجھے سچی کہانیاں نے ہی دیا اور میں نے 2011ء شمارہ ستمبر میں خیال آرائی سلسلے میں اپنی سوچ کو قلم بند کیا۔ اور پھر وقت کے ساتھ سچی کہانیاں کا یہ سفر جاری رہا' پھر بیچ میں ایسا دور بھی آیا کہ رسالے کا معیار کم ہو گیا بعض اوقات کچھ کہانیاں ایسی بھی شائع ہوئیں جن کا ادب کے ساتھ تعلق کم اور انٹرنیٹ کے ساتھ زیادہ ہوتا تھا' قابل احترام مائیں بہنیں اس ماہنامے کو بہت ذوق و شوق کے ساتھ پڑھتی ہیں' اخلاقیات کو ملحوظ خاطر رکھنا ایڈیٹر صاحب کا کام ہے' خیر ماضی کو اب کیا یاد کرنا' یکم جنوری 2016ء سے میں مستقل محفل میں حاضر ہو رہا ہوں کئی دفعہ میری حوصلہ شکنی بھی ہوئی' لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری' چلیں گلے شکوے بہت ہوئے' مالک کا لاکھ کرم ہے کہ اب آپ لوٹ آئے ہیں' ماہِ آزادی کا شمارہ بہت خوبصورت ہے۔ ناصر صاحب جو سلسلے آپ نے بند کر دیے ہیں بہت اچھا کیا' اور جو سلسلے آپ شروع کرنے جا رہے ہیں

مجھے اُن کا بہت انتظار ہے۔ خیال آرائی اگر دوبارہ شروع ہو جائے تو بات بن جائے۔ اور جہاں تک میرا اندازہ ہے آپ نے احوال کا فونٹ سائز بڑھا دیا ہے جو کہ کمال ہی کر دیا ہے۔ ماہِ آزادی کا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے' اداریہ شکرانہ منزہ سہام صاحبہ نے بہت گہرا نقطہ اٹھایا ہے' یہاں ساری بات اپنی ذات کی تو آ جاتی ہے' اس موقع پر مجھے رفیع الدین راز صاحب کا یہ شعر یاد آ رہا ہے

ہمارے عہد کے لوگوں کی آنکھیں غور سے دیکھو

ہجوم آرزو اتنا نہیں' وحشت زیادہ ہے

سید سرور ندیم مختصر احوال کے ساتھ محفل میں پہلی نشست پر براجمان تھے۔ کہانی کی سرخی کے ساتھ شعر والی بات دل کو لگی' محترمہ پروفیسر صفیہ سلطانہ صاحبہ آپ کو حج کی بہت بہت مبارک باد' جب تک آپ کو ستمبر کا شمارہ ملے گا یقیناً آپ حج کی سعادت حاصل کر کے واپس آ چکی ہوں گی' میری والدہ صاحبہ کے لیے دعائے مغفرت کر دیں' آپ کی شاعری کے مجموعے کا مجھے انتظار رہے گا' بھائی اشعر جواد آپ کا تبصرہ بہت شاندار ہے سلسلہ آپ کی ڈائری سے میں بھی اتفاق کرتا ہوں' بہن روشانے سبعین مہاروی آپ کے مختصر تبصرے سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ابھی تک مصروف ہیں۔ بھائی پرویز احمد دولو' بہن اسماء غفور صاحبہ اور عثمان علی صاحب آپ احباب کا تبصرہ بہت اچھا تھا۔ بھائی عبدالغفار عابد صاحب' آپ کا تبصرہ اپنی جگہ لیکن منتخب شعر کا جواب نہیں۔ احوال میں آخری خط بھائی افضل خان کا تھا مختصر تبصرہ پر خوب رہا۔ ناصر صاحب میں شروع سے ہی اختلافی باتوں سے اجتناب کرتا ہوں۔ لیکن اس بار تو حد ہی ہو گئی بہت سے اہل ادب نے مجھے سچی کہانیاں سے بائیکاٹ کا حکم دیا وجہ صرف آپ ہیں کچھ لوگوں کو آپ کی آمد ہضم نہیں ہو رہی۔ کہانیوں میں پہلی کہانی نو بہ نو حیرت کدے بہت اچھی ہے۔ شاہدہ ذاکر کی تحریر عروج و زوال آج کے دور کا عکس لاجواب تحریر ہے۔ محترم بھائی شفاعت علی آپ نے آر ڈی ہیرن کے تعارف کو کہانی کی صورت میں بہت ہی اچھا رنگ دے دیا' جناب نجیب عمر صاحب بارش بہت عمدہ ترجمہ ہے۔ جن احباب کی کہانیوں پر تبصرہ نہیں کر سکا ان سے معذرت' میں نے آپ کو ایک کہانی بنام سسکتے ارمان ارسال کی تھی۔ اگر آپ اُس کی نوک پلک سنوار کر قابل اشاعت بنا دیں گے تو مجھے بہت خوشی ہو گی۔ بس آخر میں دعا ہے مالک دو جہاں امت مسلمہ کا حامی و ناصر ہو' زندگی رہی تو اگلے ماہ پھر حاضری ہو گی۔

☆ بھائی عبدالغفار عابد چیچہ وطنی سے احوال میں شریک ہیں' محترم ناصر رضا السلام علیکم! امید ہے آپ اور محفل احوال کے تمام ممبران خیریت سے ہوں گے۔ اگست کا آزاد سچی کہانیاں پڑھا' پہلے کی نسبت فرق واضح تھا۔ معیار اور میرٹ کو اہمیت دی گئی اور اصولوں پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا گیا۔ باجی منزہ سہام بتا رہی تھیں کہ ہمیں ہر حال میں اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ ایک نعمت کا شکر دوسری نعمت کا ذریعہ بنتا ہے۔ احوال میں پرانے ساتھیوں کی آمد شروع ہو چکی ہے۔ اس بار احوالیوں کی تعداد کم تھی پر تھی اصلی..... اشعر جواد' سید سرور ندیم اور بھائی عثمان کی رائے سے میں اتفاق کرتا ہوں۔ آپ کی ڈائری کا سلسلہ جلد شروع کیا جائے۔ مہر پرویز احمد دولو! آپ ادب سے بے خبر لوگوں کی منفی تنقید پر دل چھوٹا نہ کریں۔ شور کھلاڑی نہیں تماشائی کرتے ہیں۔ پروفیسر صفیہ سلطانہ فریضہ حج کی مبارکباد قبول فرمائیں۔ سسٹر اسماء غفور' آپ اس محفل میں اپنی حاضری یقینی بنائیں۔ پرچہ انشاء اللہ آپ کو معیاری ملے گا۔ ہر دلعزیز رائٹر محترم سلیم اختر کی تحریر بازارِ عشق لاجواب تحریر تھی اس شعر سے اس کی

وضاحت کرتا ہوں۔

آدمی اک بار ہی محبت کرتا ہے
باقی ہوتی ہیں سب اس کو بھلانے کے لیے

محترمہ باجی راحت وفا راجپوت کی 'مجرم کون' پڑھی ایسے زاویے اور ایسے کردار ہی انسانیت کی توہین کرتے ہیں۔ جب انسان ہی شیطان بن جائے تو پھر شیطانیت جیت جاتی ہے۔ مرد عورت کو وہ حقوق دینے کے لیے تیار نہیں جو اسلام نے اُسے دیے ہیں۔ سنبل ناہید کی دکھوں کے سائے' جہانہ آفتاب کی 'غیرت کے نام پر' اُم عادل کی 'مظلوم کی آہ' اور عائشہ نور عاشا کی 'مہرباں یہ کیا کیا تُو نے' پڑھ کر یقین ہوگیا کہ مرد کے اس معاشرے میں عورت کی ہر جگہ تذلیل ہوتی ہے۔ کوثر پروین اور عظمیٰ نعیم نے اپنی تحریروں میں ماں کی محبت کو موضوع بنایا۔ حساب دو اور دو چار کا نام ہے لیکن ماں کی مامتا پر ہر حساب مات کھا جاتا ہے۔ سلسلے وار ناول 'خانقاہ' اور 'نواب' سسپنس برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ امید کرتا ہوں سچی کہانیاں میں نئے شروع ہونے والے سلسلے اس کی مقبولیت میں اضافہ کریں گے اور میں یہ بھی امید رکھتا ہوں کہ یہاں قارئین کی رائے کو بھی اہمیت دی جائے گی۔ ناصر بھائی میں ادارے کی پالیسی سے اختلاف تو نہیں کرسکتا لیکن یہاں یہ ضرور کہوں گا کہ آپ نے میرے خط کا آپریشن بہت خوبصورت انداز میں کیا۔ اس کی وضاحت کے لیے اپنی غزل کا دوسرا شعر حاضرِ خدمت ہے

لب کشی یہاں جرم کے زُمرے میں گنی جاتی ہے
اگر یہ وقت شہادت ہے تو پھر سوچتے ہیں

اس دعا کے ساتھ اجازت اللہ رحیم و کریم آپ کی زندگی میں اطمینان قلب کے ایسے دیے روشن کرے جن کی روشنی بھی مدھم نہ ہو آمین۔

☆ بھائی عبدالغفار عابد! آپ کا 'سچی کہانیاں' پر سیر حاصل تبصرہ اور 'بامعنی' فقروں سے آباد خط بہت اچھا لگا۔ آئندہ بھی ایسے ہی تبصرے اور 'فقروں' کا انتظار رہے گا۔ آپ کی تمام تر محبت اور شکایت کے حوالے سے ایک شعر پیش خدمت ہے۔

میری بساط شب و روز کا تھا حال عجب
پیادہ اچھی طرح تھا نہ شاہ اچھی طرح

☆ اسماء غفور چیچہ وطنی سے احوال میں شریک ہیں۔ اچھے انکل ناصر رضا! السلام علیکم! اگست کا سچی کہانیاں پڑھا احوال میں اپنا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ کی حوصلہ افزائی سے ہی میں دوبارہ قلم اٹھا رہی ہوں۔ احوال میں اگرچہ احوالیوں کی تعداد کم تھی پر سب کی رائے اور باتیں بامقصد تھیں۔ امید ہے نئے شروع ہونے والے سلسلے سچی کہانیاں کی مقبولیت میں اضافہ کریں گے۔ جس سے احوالیوں اور قارئین کی تعداد میں یقینی اضافہ ہوگا۔ باجی پروفیسر صفیہ سلطانہ اللہ تعالیٰ آپ کا حج اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے آمین۔ آپی منزہ پروردگار نے انسان کو بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے ہمیں چاہیے کہ ان نعمتوں کا ہر وقت شکر ادا کرتے رہیں۔ آپی راحت وفا کی تحریر 'مجرم کون' پڑھی۔ مرد کے اس معاشرے میں مجرم بھی مرد ہی ہوتے ہیں۔ نینا خان کی روپ بہروپ پڑھ لی آپ کو میری بات کا یقین کرنا پڑے گا۔ مرد کے اس معاشرے میں بھی کچھ لوگ عورت ذات پر انگلیاں اٹھاتے ہیں۔ عائشہ نور عاشا نے بھی اپنی تحریر 'مہرباں یہ کیا کیا تُو نے' میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس معاشرے میں اگر جینے کا حق ہے تو

صرف مرد کو ہے۔ مرد کی خواہشیں بے لگام ہوتی ہیں۔ عورت ان خواہشوں کو پورا کرنے پر مجبور ہوتی ہے اگر نہیں کرتی تو اس کو ناکردہ گناہوں کی سزا ملتی ہے' میری رائے سے کسی کو اختلاف ہے تو جہانہ آفتاب کی تحریر غیرت کے نام پر پڑھیں' یقین کریں ہر جگہ عورت کی توہین ہوتی ہے۔ اس کے باوجود عورت مرد کی عزت کرتی ہے۔ اس کا ہر حکم ماننا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ اسلام نے عورت کو جو حقوق دیے ہیں اس کو وہ مرد کے معاشرے میں حاصل نہیں۔ ماں کا پیار دیکھنا ہے تو کوثر پروین کی 'کاش وہ لوٹ آتے' کا مطالعہ ضرور کریں۔ انکل سلیم اختر نے حسب معمول ایک اچھی تحریر پڑھنے کو دی۔ اس کے علاوہ نسرین اختر نینا کی 'تم میری ہو' نفیسہ سعد کی 'کنویں والی عفریت' اور شاہدہ ذاکر کی عروج و زوال بھی اچھی تحریریں تھیں۔ جتنا پڑھا اس پر اپنی رائے دے دی۔ انکل ناصر رضا کی محبت کو 21 توپوں کی سلامی جنہوں نے میرے خط کا پوسٹ مارٹم کیا۔ خیر اللہ آپ کو صحت والی لمبی زندگی دے آمین۔

بیٹا اسماء غفور! آپ نے احوال بہت ہی اچھا خط تحریر کیا ہے۔ آپ جیو بیٹا...... آئندہ بھی ایسے ہی خط کا انتظار رہے گا۔ آپ کی خط کے پوسٹ مارٹم والی بات کے حوالے سے بس اتنا ہی کہوں گا۔

ہاں! حسابِ غم دوراں تو بہت مشکل ہے
اور پھر اِس کا اعادہ ہو ضروری تو نہیں

بھائی خواجہ حسین! آپ کا تبصرہ اچھا ہے' لیکن آپ سے ایک شکایت بھی ہے آپ نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ وہ کون سے اہلِ ادب بھائی ہیں جنہوں نے آپ کو ہماری وجہ سے سچی کہانیاں کے بائیکاٹ کا حکم دیا' امید ہے آئندہ خط میں آپ اُن کی نشاندہی ضرور کر دیں گے...... اور ہاں! زیر نظر شمارے میں آپ کی کہانی موجود ہے' آپ اچھا لکھتے ہیں آئندہ بھی آپ کی تحاریر کا انتظار رہے گا...... اور ذرا یہ تو بتائیں کہ ہمارے دوست جیسے بھائی سرور شاز کہاں ہیں؟ اور کس حال میں ہیں' ملیں تو انہیں ہمارا محبت بھرا سلام ضرور دیجیے گا۔

☆ احوال کی محفل میں اِس بار بھی یہ آخری خط کراچی سے محمد افضل خان کا ہی ہے' لکھتے ہیں محترم ناصر بھائی' آپ کا خلوص اور محبت ایک بار پھر مجھے احوال میں لے آئی ہے امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ اگست کا شمارہ جب دیکھا تو سرورق سے اندازہ ہو گیا کہ تحریریں بھی جاندار ہوں گی۔ مگر میر حسن اور نسیم سکینہ صدف کی تحاریر تو ناقابل یقین ہی رہیں' ہاں البتہ کوثر پروین نے اپنی تحریر کاش وہ لوٹ آئیں سے آنکھوں کو نم کر دیا۔ باقی سب تو حسب روایت رہا' لیکن نینا خان کی 'روپ بہروپ' جب نظر سے گزری تو ایک شعری خیال ذہن میں گردش کرتا رہا کہ......

یہ کب کہا تھا کہ بہاروں سے خوف آتا ہے
مجھے تو چاند ستاروں سے خوف آتا ہے
میں دشمن کے کسی وار سے نہیں ڈرتا
مجھے تو اپنے ہی یاروں سے خوف آتا ہے

محمد افضل خان صاحب! آپ احوال میں آئے شکریہ' مگر آپ کا مختصر سا خط تبصرہ ہمارے لیے تشنگی کا باعث ہے اگر آئندہ ایسا نہ ہو تو کیا ہی اچھا ہو!

اور اب احوال کے آخر میں اپنے اُن تمام قارئین اور لکھاری دوستوں سے' جو ایک عرصہ دراز سے یا پھر گزشتہ ایک دو ماہ سے رابطہ توڑے بیٹھے ہیں' خصوصاً احمد سجاد بابر' افتخار چوہدری' ارم ناز' شیما عبدالقیوم'

ایڈیسن ادریس مسیح، عبدالعزیز جی آ، بلال فیاض افتخارانی، وقاص حسین، عمران مظہر، نعمان اسحاق، جاوید راہی، ریحانہ آفتاب، نسیم نیازی، فصیحہ آصف، فریدہ خانم، فریدہ جاوید فری، بشریٰ سعید احمد، عطیہ ہدایت اللہ ضرغام محمود، نادیہ ملک، ملک صفدر عباس اعوان، سیدہ عطیہ زہرہ، ریاض حسین شاہد، نزہت جبیں ضیاء، فوزیہ احسان رانا، صداقت حسین ساجد، عاطر شاہین، نیّر شفقت، ثمینہ طاہر بٹ، سباس گل، محفوظ عطاری، رابیل محفوظ عطاری، محمد فہیم (اور باقی تمام دوست جو سچی کہانیاں سے کسی صورت بھی وابستہ رہے ہیں) بہت محبت اور احترام بھری گزارش ہے کہ آ جاؤ پلیز آ جاؤ......تو پھر آپ آ رہے ہو نا......!

دل کا دروازہ کھلا رکھا ہے
وقت مل جائے تو زحمت کرنا

اجازت سے پہلے ڈاکٹر وزیر آغا کی ایک طویل نظم 'اک کتھا انوکھی' سے اقتباس، آپ کی بصارتوں کے رزق کی صورت حاضر ہے۔ اسے پڑھیے اور آئندہ ماہ اپنے خطوط میں یہ ضرور بتایئے گا کہ......آپ نے اِس نظم کے اقتباس کے حوالے سے 'خاص طور پر کیا محسوس کیا؟

جب دھرتی پر
آوازوں کا شور اٹھا تھا، اور فولاد کا راج ہوا تھا
انساں سارے، لوہے کے روبوٹ بنے تھے
بے چہرہ، بے نام ہوئے تھے
کالے، پیلے ہندسے بن کر
لفظوں کے آنکھوں پر جیسے ٹوٹ پڑے تھے
اک اک 'لفظ' پہ ثبت ہوئے تھے
اور اب، ہندسے ہی ہندسے ہیں
جمع کرو تو دگنے تگنے ہو جاتے ہیں
لاکھوں کا اک لشکر بن کر، آگ اور خون کے کھیل کا منظر دکھلاتے ہیں
ضرب لگے تو بھنور سا بن کر تیز ہوا کا، پاگل بھوتوں کے
وحشی گرداب کی صورت
ایک ہی پل میں دھرتی اور آکاش سے اونچے اٹھ جاتے ہیں
کرو اگر تفریق، صفر ہو جاتے ہیں!
تو کہتا ہے
چپ کی تہہ در تہہ سلوٹ میں، انسانوں پر کیا بیتی ہے
کس نے ان کی رکھشا کی ہے؟
میں کہتا ہوں ان کو رکھشا کی حاجت ہی کیا ہے
یہ سب، نسلی پاگل پن کی رکھشا میں ہیں!

تاخیر سے ملنے والے خطوط جو احوال میں شامل نہ ہو سکے۔
ایم حسن نظامی قبولہ شریف، اشعر جواد کراچی، ارشد اقبال چوہان فیصل آباد، سید ضمیر شاہ کراچی اور روشانے سبعین فیصل آباد۔

پھر ملیں گے گر خدا لایا

ناصر رضا

پُراسرار کہانی نمبر

'سچی کہانیاں' کا شمارہ اکتوبر 2017ء پُراسرار کہانی نمبر ہوگا۔ اس یادگار نمبر میں نامور لکھاریوں کی ایسی کہانیاں شامل ہوں گی' جنہیں آپ عرصہ دراز تک فراموش نہیں کرسکیں گے۔

جناتی کہانیاں' ارواح کہانیاں' خوف اور دہشت سے بھری ڈراؤنی کہانیاں ہی اِس پُراسرار نمبر کا حصہ نہیں ہوں گی' روحانیت کے اسرار اور تصوف سے جڑی نہایت ہی اعلیٰ اور خصوصی کہانیاں بھی اِس کا حصہ ہوں گی۔

ایجنٹ حضرات سے درخواست

برائے کرم اپنے آرڈر سے ادارہ سرکولیشن کو فوری طور پر آگاہ کریں

تاریخ کے جھروکوں سے جھانکتی علم سے آباد ایک زندہ تحریر

ایوب بن حبیب

حسرت موہانی کا خیال

اے زہد عشق تیری ہدایت کے واسطے
سوغاتِ عشق لا رہے ہیں کوئے بتاں سے ہم

م۔ن۔خ

•"اے مومنو! مشرک عورتوں سے جب تک وہ ایمان نہ لائیں' نکاح مت کرنا کیوں کہ مشرک عورت خواہ تم کو کیسی ہی بھلی لگے' اس سے مومن لونڈی بہتر ہے اور اسی طرح مشرک مرد جب تک کہ ایمان نہ لائیں' مومن عورتوں کو ان کی زوجیت میں نہ دینا کیوں کہ مشرک مرد سے خواہ وہ تم کو کیسا ہی بھلا لگے' مومن غلام بہتر ہے۔ یہ مشرک تم کو دوزخ کی طرف بلاتے ہیں۔" (سورۃ البقرہ۔۲۲)

اندلس کا نیا امیر عبدالعزیز بن موسیٰ بن نصیر اپنے خاص گھوڑے پر سوار دارالمستقر اشبیلیہ کی جانب تیزی سے سفر کر رہا تھا۔ اس کے ہم رکاب مشیر ایوب بن حبیب اور فضل بن عمرو تھے۔ یہ دونوں موسیٰ بن نصیر کے قریبی رشتے دار اور بچپن کے دوست تھے اور اب اس کے ساتھی اور مشیر بھی مگر اس وقت وہ دونوں خاموش تھے۔ عبدالعزیز بن موسیٰ نے اچانک ہی اس سفر کا پروگرام بنایا تھا اور ان دونوں کو کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ اس وقت یہ نوجوان خوبرو اور توانا امیر کچھ اس طرح خاموش تھا کہ خاصا سفر طے ہو جانے کے باوجود بھی دونوں مشیروں میں سے کوئی بھی کچھ دریافت کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ ایوب بن حبیب کی کشادہ جبیں پر شکنیں نمایاں تھیں اور آنکھیں فکر و تردد میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اس نے امیر کے ساتھ ساتھ گھوڑا دوڑاتے ہوئے دوسری جانب فضل بن عمرو کو دیکھا اور فضل بن عمرو نے بھی ایوب بن حبیب کو دیکھا۔ دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہا۔ اس کے کچھ دیر بعد ایوب بن حبیب نے قدرے احترام کے ساتھ امیر عبدالعزیز کو مخاطب کیا۔

"محترم امیر! اشبیلیہ کی جانب سفر کا مقصد القصر کا قصد تو نہیں ہے؟"

امیر عبدالعزیز نے گردن کو خم دے کر ایوب بن حبیب کو دیکھا اور بولا۔

"کیا ہم نے روانگی سے قبل یہ وضاحت نہیں کی تھی کہ ہم شاہ لرزیق کی بیوہ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں؟"

"نہیں۔" ایوب بن حبیب نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "آپ نے بہ وقت روانگی کچھ نہیں فرمایا تھا لیکن اب اگر اجازت ہو تو کچھ عرض کروں؟"

امیر عبدالعزیز نے تعجب سے اسے دیکھا اور بولا۔

''کچھ بھی دریافت کرنے سے قبل ذرا یہ وضاحت کرو کہ ہم تینوں کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟''

ایوب بن حبیب اور فضل بن عمرو مسکرا دیئے اور امیر کی تقلید میں گھوڑوں کی رفتار قدرے سست کرلی۔ امیر کے سوال کا جواب دینا ضروری تھا لہٰذا ایوب بن حبیب بولا۔

''جنابِ امیر! میری والدہ آپ کی پھوپی اور میرے والد آپ کے چچا تھے۔ اس طرح میں دونوں رشتوں سے آپ کا بھائی ہوں۔ اس کے علاوہ میرے رشتے کے چچا اور سگے ماموں جناب موسیٰ بن نصیر مجھے آپ کا مشیرِ خاص مقرر فرما کر اندلس سے گئے ہیں۔ اب میرا فرض ہے کہ حقِ دوستی بھی نبھاؤں' صائب مشورے بھی دوں اور ایک مشیر کی حیثیت سے امیر کی عزت بھی کروں۔ ان ہی تمام فرائض کے پیشِ نظر میں نے آپ سے یہ سوال کیا تھا۔'' یہ سن کر امیر عبدالعزیز کھلکھلا کر ہنس دیا اور بولا۔

''خدا کی قسم! جب قسامِ ازل نے گویائی کی دولت تقسیم فرمائی تھی تو ایوب بن حبیب کو بے اندازہ عطا فرمائی تھی۔ کس قدر لچھے دار باتیں کرتے ہو۔ ہم نے ایک چھوٹا سا سوال کیا تھا' اس کا اتنا طویل جواب مگر جس بات پر ہمیں اعتراض تھا' اس کا جواب اب بھی تم نے نہیں دیا۔ اچھا بتاؤ' ہمیں تمہاری کس بات پر اعتراض تھا؟''

''آپ کو یہی اعتراض ہے نا کہ میں نے ایک دم سے بچپن کے دوستوں کی طرح بات چیت ختم کر کے آپ کا احترام کرنا شروع کر دیا ہے؟''

امیر عبدالعزیز نے اس کی ذہانت سے متاثر ہو کر اسے دیکھا اور بولا۔ ''اگر میں کہوں کہ واقعی مجھے یہی اعتراض ہے تو......؟''

''تو میں یہی عرض کروں گا کہ بچپن کی دوستی قائم ہے اور رشتے داری بھی مگر میں امیر اور مشیر کے فرق کو خوب پہچانتا ہوں۔'' ایوب بن حبیب نے دھیرے سے کہا۔

''ایوب! ہم تمہارے جذبات کی قدر کرتے



ہیں۔'' امیر عبدالعزیز نے تعریفی انداز سے اسے دیکھا اور اپنی بات جاری رکھی۔ ''ساتھ ہی ہم خدائے واحد کا شکر ادا کرتے ہیں جس نے ہمیں تم جیسا دوست' ساتھی اور مشیر عطا فرمایا۔ ہم نے تمہاری بدولت بہت سی مشکلات پر قابو پایا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بابا جان کے اندلس سے چلے جانے کے بعد اتنے بہت سے شہروں کو اطاعت کے لیے مجبور کر دینا خاصا دشوار کام تھا۔ اس موقع پر تم نے اور فضل بن عمرو نے ہمارا ساتھ دیا ہے۔ ہم اس کا اعتراف بار بار کریں گے۔'' امیر عبدالعزیز اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔

فضل بن عمرو جو خاموش تھا' اس مرحلے پر بولا۔ ''امیرِ محترم! ہم اندلس کے تمام شہروں کو بہت پہلے اطاعت کے لیے مجبور کر دیتے مگر دشواری محض اتنی تھی کہ یہاں کے علاقوں میں مقیم ہمارے حکمرانوں کے پاس اسلحے کی کمی تھی۔ اسی وجہ سے ان علاقوں کے باشندے انہیں کم قوت تصور کرتے ہوئے باغی ہونے لگے۔''

''ہوں......'' امیر عبدالعزیز نے تائید کی۔ ''دراصل کسی قوم کو اپنے اخلاق میں ڈھالنے اور اسے اعتماد میں لینے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے' ہمیں بھی اگرچہ وقت لگا مگر خدا کا شکر ہے کہ یہاں کے باشندے بہت حد تک مطیع ہوگئے ہیں۔''

''محترم امیر!'' فضل بن عمرو نے کہا۔ ''اس کی بھی دو وجوہ ہیں' اول تو مسلسل ناکامی کے بعد اب ان لوگوں کو یقین ہوگیا ہے کہ مسلمان اندلس کو چھوڑنے والے نہیں' دوسرے اب یہ لوگ دل کی گہرائیوں سے اسلامی حکومت کو اپنی پرانی گاتھ حکومت سے بہتر سمجھنے لگے ہیں۔''

امیر عبدالعزیز نے تائیدی انداز میں فضل کی بات سنی اور خاموش ہوگیا۔ اسے خاموش دیکھ کر یہ دونوں بھی کچھ نہ بولے اور اپنے متعدد ساتھیوں سے آگے سفر کرتے رہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب موسیٰ بن نصیر اندلس کی فتح کے بعد دربارِ خلافت سے اچانک طلبی پر اپنے فرزند عبدالعزیز بن موسیٰ کو اندلس کا امیر مقرر کر کے اسے امن وامان قائم رکھنے' انصاف کرنے اور عیش وعشرت سے بچنے کی ہدایت کر کے یہاں سے جا چکے تھے۔ مسلمانوں سے قبل اندلس پر گاتھ قوم حکومت کرتی تھی۔ اس کی بدولت رومیوں میں کئی برائیاں رواج پا چکی تھیں جن میں سے دو برائیوں نے متعدد خرابیوں کو جنم دیا تھا' اول یہ کہ ان کا دستور تھا کہ رعایا نہ تو بغاوت کی جرأت کر سکتی تھی اور نہ ہی لب کشائی کی' دوسرے غلام خریدے جاتے اور وہ نسل در نسل آقاؤں کی بے دام خدمت انجام دیتے۔ ان دو باتوں سے عیسائیوں میں تشدد پسندی عام تھی۔ کاشت کاروں اور غلاموں کی زندگیاں سب سے زیادہ تلخ تھیں۔ شروع میں امراء نے ان ہی کو ہتھیار بنا کر بغاوت پر اکسایا مگر موسیٰ بن نصیر اور ان کے چلے جانے کے بعد اب امیر عبدالعزیز کا ہر فیصلہ جو اسلام کے عین مطابق تھا' ان مظلوموں کو اپنی حمایت میں نظر آیا۔ آہستہ آہستہ یہ لوگ اطاعت کرتے اور اسلام سے متاثر ہوتے گئے۔ اس اطاعت کی بدولت نوجوان امیر کے نصف مسائل حل ہو گئے۔ ان حالات سے سب ہی واقف تھے۔ فرصت کے اوقات میں یہ حالات امیر ومشیر کے موضوع بھی بنتے تھے۔ وہ اس وقت بھی اسی بحث میں الجھ جاتے کہ اچانک سفر کرتے ہوئے نوجوان امیر نے اپنے مشیر کی طرف دیکھا اور دریافت کیا۔

''ایوب بن حبیب ہمیں یاد آیا۔ تھوڑی دیر قبل تم نے ہم سے کچھ دریافت کرنے کی اجازت طلب کی تھی۔ تم کیا کہنا چاہتے تھے؟'' یہ سن کر ایوب بن حبیب ہنس دیا اور قدرے توقف کے بعد بولا۔

''حقیقت میں تو صرف یہی دریافت کرنا چاہتا تھا کہ یہ اچانک القصر کا پروگرام کیسے بن گیا؟''

''بس ہم نے سوچا کہ جب دیگر مسائل حل ہو چکے ہیں تو کیوں نہ القصر میں داخل ہو کر وہاں کے ان افراد سے گفتگو کی جائے جنہیں ہم نے ابھی تک نہیں دیکھا اور نہ ہی انہوں نے اسلام کے بارے میں کچھ سنا ہے۔ شاید کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ یہ

لوگ اسلام کی طرف مائل ہو جائیں۔'' ایوب بن حبیب نے تعریفی نظروں سے امیر کی طرف دیکھا اور کہا۔

''خدا کرے کہ امیرِ محترم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں اور خداوندِ عالم آپ کو ان لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے جو دوستی کے پردے میں مخالفت کرتے ہیں۔''

ابھی گفتگو یہاں تک ہی پہنچی تھی کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس کے معنی تھے کہ ان کے دوسرے تمام ساتھی جو کافی پیچھے تھے' اب سفر کرتے ہوئے قریب آ گئے تھے۔ ان میں سے بیشتر وہ لوگ تھے جو موسیٰ بن نصیر کے زمانے سے ہی خیر خواہ اور دوست تصور کیے جاتے تھے اور آج بھی اس نوجوان امیر کے دوست تھے۔ ان میں جنرل الفہدی محمد بن حنیف' زیاد بن بدر' اسمع بن مالک اور اسمٰعیل بن عبیدہ شامل تھے۔ ان کو دیکھتے ہی امیر نے کہا۔

''ہم نے یہاں پہنچ کر رفتار سست کر دی تھی اور تمہاری آمد کے منتظر تھے۔''

''امیر کی عزت افزائی ہے۔'' جنرل حبیب الفہدی نے کہا۔ ''یہ ہی سڑک آگے جا کر القصر کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ ہمیں یہاں سے ساتھ ساتھ سفر کرنا ہے۔''

امیر عبدالعزیز بن موسیٰ نے قدرے مسکرا کر یہ بات سنی اور گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اب مسلمان جماعت اور اُن کا نوجوان امیر آہستہ آہستہ القصر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اگرچہ ابھی فاصلہ کافی تھا مگر القصر کی بلند و بالا عمارتیں اور اونچے اونچے کنگرے دور ہی سے نظر آ رہے تھے۔ صبح کی روشنی اس کی عظمت اور حسن کو نمایاں کر رہی تھی۔ کچھ لوگ اس منظر کو عقیدت سے دیکھ رہے تھے اور کچھ اس کی عظمت سے مرعوب تھے۔

تھوڑی دیر بعد یہ جماعت القصر جانے والی سڑک پر پہنچ چکی تھی۔ جونہی وہ اس سڑک پر آئے تو باجے اور گیتوں کے شور نے انہیں اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ نصاریٔ اندلس کے نغموں کی صداؤں سے فضا گونج رہی تھی۔ گیتوں اور سازوں کی یہ مترنم آوازیں قصر کی جانب سے بلند ہو رہی تھیں۔ امیر نے تعجب سے اپنی جماعت کے کچھ داناؤں کی طرف دیکھا مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ ان کے چہرے کا تحیر اور نظروں کی حیرت اس صورتِ حال کے بارے میں استفسار کر رہی تھی۔ یہ دیکھ کر حبیب الفہدی جو عرصۂ دراز سے اس علاقے میں رہ رہا تھا اور ان لوگوں کی عادات واطوار سے واقف تھا' دھیرے سے بولا۔

''محترم امیر! یہ اندلس کے وہ مسیحی ہیں جو آپ کے استقبال کے لیے راگ رنگ کی محفلیں سجا کر اپنی خوشی کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔''

''کیا یہ لوگ واقعی اپنے خوش ہیں؟'' امیر عبدالعزیز نے دریافت کیا۔

''ہمارا مطلب ہے کہ کل تک یہ لوگ اپنی تمام قوت آزما کر ہمیں اندلس سے دھکیل دینا اور ہمیں پسپا کر دینا چاہتے تھے لیکن آج یہی لوگ ہدیۂ تہنیت پیش کر رہے ہیں۔''

''یہ سب آپ کے والدِ محترم موسیٰ بن نصیر کے عزت آمیز سلوک کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے ان لوگوں کو عزت دی جنہیں ان کے سابق حکمران ذلیل تصور کرتے تھے۔ آج یہ لوگ اسلامی حکومت میں اپنے جان و مال کو محفوظ تصور کرتے ہوئے ہار جانے کے باوجود فتح و نصرت کے شادیانے بجا رہے ہیں کیوں کہ ان کے خیال میں شکست انہوں نے نہیں' ان کے آقاؤں کھائی ہے۔ ان کے تو آقا بدل گئے ہیں۔ پہلے ظلم وستم کرنے اور ذلیل گردانے والے آقا تھے' اب عزت دینے والے آقا آ گئے ہیں۔'' حبیب الفہدی کی بات اگرچہ طویل تھی مگر حقیقت پر مبنی تھی لہٰذا سب نے اس کی تائید کی۔

سفر ختم ہوا اور وہ القصر کے دروازے پر پہنچ گئے' یہاں انسانوں کا ہجوم تھا۔ نوجوان امیر اور مسلمان انہیں دیکھ کر رک گئے۔ انہیں دیکھتے ہی ایک جیسی وضع قطع کے لباس پہنے ہوئے مسیحی لڑکیوں نے گھنٹیوں اور باجوں کی آواز کے ساتھ اس گیت کی آواز بلند کی جو امیر کی شان میں ایک قصیدہ تھا۔ اس قصیدے میں اس کے حسن و وجاہت' دلیری اور

بلند اخلاقی کی تعریف کی گئی تھی۔ اس وقت حسین رقاصائیں بڑے بڑے طشت اپنے سروں پر رکھے رقص کر رہی تھیں۔ رقص کا یہ انداز عجیب وغریب تھا۔ گیت کے ہر جملے کے ساتھ رقص کرتی لڑکیاں طشت سے پھول نکال نکال کر امیر پر نچھاور کر رہی تھیں۔ دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ رقاصائیں اور گانے والیاں اپنا اپنا کمال دکھاتی رہیں یہاں تک کہ امیر عبدالعزیز نے ہاتھوں کے اشارے سے انہیں روکا تو یک لخت خاموشی چھا گئی۔

اِس استقبال کے بعد سَلام کا سلسلہ شروع ہوا۔ غریب' مزدور' کاشت کار' غلام اور دیگر لوگ آتے' جھک کر امیر کو سَلام کرتے اور آگے بڑھ جاتے۔ اس وقت یہاں موجود ہر نفس اس کوشش میں تھا کہ امیر کی قربت حاصل کر سکے۔ امیر خود بھی ان سب کے سَلام کا جواب بڑی شفقت سے دے رہا تھا۔ یہ سلسلہ بھی کافی دیر تک چلتا رہا یہاں تک کہ القصر کے اندرونی حصے سے آنے والے ملکہ کے خاص دستے کے سپاہی نے امیر کے قریب آ کر سَلام کیا اور کہا۔

''جناب! ملکۂ عالیہ نے کہا ہے کہ ہم فاتحین کے منتظر ہیں۔''

یہ پیغام گویا القصر میں داخل ہونے کی اجازت تھی۔ امیر کو یہ سمجھنے میں نہ دیر لگی کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ اس وقت مجاہدین منتظر تھے کہ امیر قدم بڑھائیں تو وہ بھی آگے بڑھیں لیکن امیر عبدالعزیز بن موسیٰ نے قصر کی جانب قدم بڑھانے کی بجائے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور کہا۔

''ہم القصر داخل ہونے سے قبل نمازِ شکرانہ اَدا کرنا چاہتے ہیں۔'' یہ سن کر ساتھیوں نے عقیدت سے سر جھکا دیئے۔ یہ وہی کام تھا جو مدتوں قبل فتحِ ایران کے موقع پر حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے کیا تھا اور اُن میں سے بہت سے لوگوں نے بہ چشمِ خود اِس عظیم فتح کو دیکھا تھا۔ بہت سے ایسے بھی تھے جنھوں نے یہ سب واقعات اپنے بزرگوں سے سنے تھے اور اُن کے دل عقیدت کے جذبات سے بھرے ہوئے تھے۔ اِسی جذبے اور عقیدت کے ساتھ جب یہ نوجوان اُمیر اس کام کی آرزو کر رہا تھا تو سب احترام وعقیدت اور خوشی کے عجیب انداز سے اُسے دیکھ رہے تھے۔

امیر عبدالعزیز بن موسیٰ بن نصیر نے نمازِ شکرانہ اَدا کرنے کا حکم دیا تو اچانک رقاصاؤں کے قدم' مغنیوں کی بلند ہوتی ہوئی آوازیں اور سازندوں کے ساز رک گئے' آوازیں مدہم ہوئیں اور لاتعداد افراد کی موجودگی کے باوجود خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر بعد اندلس کے لاکھوں مفتوحین' خداوندِ عالم کے رُوبرو جھکے ہوئے اُن فاتحین کو دیکھ رہے تھے جن کے اتفاق واتحاد اور دلیری نے اندلس میں انقلاب بپا کر دیا تھا مگر اپنی اِس عظیم فتح کے بعد بھی وہ مغرور نہ تھے۔ اُس وقت یہ لوگ اپنے ملک میں ہر انقلاب کے بعد کی تباہیوں کو یاد کر رہے تھے جو ان پر نازل ہوتی رہتی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے حکمراں بھی حاوی آ جاتے تو نہ مال ودولت محفوظ رہتا نہ عزت وآبرو ہی بچتی مگر مسلمان فاتحین تو کچھ اور ہی تھے۔ نہ ظلم وتشدد تھا نہ غرور وتکبر بلکہ وہ خود سر جھکائے خدائے بزرگ وبرتر کا شکر اَدا کر رہے تھے۔ جب تک وہ نماز پڑھتے رہے' یہ لوگ تعجب سے دیکھتے رہے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد امیر عبدالعزیز بن موسیٰ نے اپنی جگہ کھڑے ہو کر ان سب کو مخاطب کیا اور کہا۔

''میرے دوستو! تمام تعریف اور ستائش اس خدائے بزرگ وبرتر کو زیبا ہے جس نے ایک لفظ ''کُن'' سے تمام موجودات کو شرفِ وجود عطا فرمایا پھر ہزاروں دُرود اس ہستی پر جو شمعِ رہبری لائے اور آدم کی گم کردہ راہ اولاد کو صراطِ مستقیم سے آشنا کیا۔ اس رَبِّ عظیم کے کرم سے آج تمام بغاوتیں فرو ہو گئیں۔ بغاوت کرنے والے مطیع اور مظلوم نجات پا گئے۔ میرے دوستو! تم لوگ جو مدتوں سے غلط رسموں کا شکار تھے' آج سب مصائب سے چھٹکارہ پا گئے۔ اَب تم لوگ خواہ کسی بھی طبقے اور کسی بھی عقیدے سے تعلق رکھتے ہو' مذہبی طور پر بالکل آزاد ہو۔ تم مجھے اندلس کا فاتح یا امیر نہیں بلکہ اپنا دوست سمجھو۔ تمہاری عزت' دولت' مال وجان اور دین کی

معاملات میرا اولین فرض ہے۔'' امیر عبدالعزیز بن موسیٰ نے یہ کہتے ہوئے اُن سب پر نظر ڈالی اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''اِسلام کے زرّیں اصولوں کو اِس سے قبل بھی تمہارے سامنے کئی بار پیش کیا جا چکا ہے لیکن آج پھر ایک مرتبہ میں تمہیں اِس کی دعوت دیتا اور اِس کے ساتھ ہی اندلس کے امیر کی حیثیت سے یہ آئین نافذ کرتا ہوں کہ جو غریب کاشت کار یا زرخرید غلام اسلام کے دامن میں آئے گا' وہ خود کو اپنے غیر مسلم آقا کی غلامی سے آزاد سمجھے پھر نہ اس پر اس آقا کی خدمت واجب رہے گی نہ آقا کا اس پر کوئی حق باقی رہے گا اور اسے وہی حق دیا جائے گا جو میرے لشکر کے ہر فرد کو حاصل ہے۔ میرے عزیزو......! یہ بات سب جانتے ہیں کہ اسلام نے آقا اور غلام' امیر غریب اور گورے کالے کے تمام فرق مٹا کر صرف تقویٰ کو عزت و بڑائی کا منبع قرار دیا ہے۔ ہم سب پر فرض ہے کہ خود کو اسی بنا پر بڑا ثابت کریں لہٰذا آج کے بعد اندلس کے جس گوشے میں کوئی کمتر شخص بھی اسلام قبول کرے گا' وہ میری نظر میں صاحبِ عزت سمجھا جائے گا۔ دنیا اور دین میں اس کے حقوق میرے برابر ہی ہوں گے۔''

اِس تقریر کے بعد امیر نے جامع مگر مختصر الفاظ میں اُن سب کے سامنے اسلام پیش کیا جسے سن کر مجمع میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ ہر فرد دوسرے سے پہلے آگے بڑھ کر دینِ حق قبول کرنا چاہتا تھا۔ اُس دن سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں نے صدیوں سے ظلم و ستم کی زنجیروں میں بندھے ہوئے خدا کے اُن بندوں نے جنہیں ذلت کے سوا کچھ نصیب نہیں ہوتا تھا' خدائے بزرگ و برتر کی وحدانیت کا اور رسول اللہ کی رسالت کا اعتراف کر کے غلامی کی زنجیریں توڑ دیں اور مسلمان انہیں مبارک باد دینے اور خوشی کے اظہار کے لیے ''اللہُ اکبر'' کے نعرے لگانے لگے اور فضا اُن آوازوں سے گونج اٹھی پھر امیرِ اندلس نے محفل برخاست کرتے ہوئے کہا۔

''اَب ہم القصر میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔'' یہ سنتے ہی ملکہ کے خاص محافظ دستے نے اس جماعت کو شاہ لرزیق کے محل میں داخل کروایا۔

•......•......•......•

اُس وقت سورج کی شعاعیں قصر کے بلند دروازوں اور اونچے کنگوروں پر نثار ہو کر بڑا حسین منظر پیش کر رہی تھیں مگر اس کی طرف توجہ دیئے بغیر سینکڑوں کی تعداد میں مسیحی اس جواں بخت امیر کے استقبال کے لیے جمع تھے۔ القصر کی کشادہ سڑک پر دور تک دورویہ قطار میں کھڑے ہوئے لوگ اسے خوش آمدید کہہ رہے تھے اور ان میں سے کسی کو بھی یہ علم نہ تھا کہ آج کے دن ملکہ یہ منظر کہاں سے دیکھ رہی ہے۔ اس وقت ہجوم مختلف جذبات کے ساتھ اس فاتح کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ انہوں نے جسے دیکھا تھا' اس کی باتیں سنی تھیں' ان کے دل عقیدت سے معمور تھے اور جو صرف فاتح سمجھ رہے تھے' اُن کے دل نفرت سے بھرے ہوئے تھے۔ اُن میں عقیدت رکھنے والے محض وہی تھے جو اَب تک صرف خدمت اور ذلت کے قابل سمجھے جاتے تھے اور نفرت ان کے دلوں میں تھی جو اپنے غلاموں کو مسلمان ہوتا دیکھ کر اپنی توہین تصور کر رہے تھے۔ وہ سب اَب تک عیش پرست امراء تھے جو آج کے بعد خود کو اس لشکر کا ایک عام آدمی سمجھنے پر مجبور تھے۔ یہ سب امیر عبدالعزیز بن موسیٰ کو اپنا مخالف سمجھتے ہوئے اسی انداز میں سوچ رہے تھے جس انداز میں مفتوحین اپنے فاتحین کے لیے سوچتے ہیں لیکن کسی کو بھی لب ہلانے کی مجال نہ تھی بلکہ وہ بھی دلوں میں نفرت چھپائے دوسروں کے ساتھ اس آنے والے امیر کو عزت دینے پر مجبور تھے۔

اِدھر امیر جواب میں خُلوص و محبت کا اظہار کرتا آگے بڑھ رہا تھا۔ ایسے میں اندلس کے بوڑھے بادشاہ لرزیق کی نوعمر بیوہ ملکہ انجیلونہ بالائی منزل سے اپنے مخصوص کمرے کی ایک کھڑکی کے مہین پردے کے عقب سے مسلمانوں کی قصر میں آمد کے منظر کو دیکھ رہی تھی۔ اس سے قبل اس نے تقریر بھی سنی تھی اور اہلِ اندلس کا قبولِ اسلام بھی دیکھا تھا۔ اسلام کے اصول بھی سنے تھے اور امیرِ اندلس کو نمازِ شکر ادا کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا' تب اس نے اپنی لونڈی

سے پوچھا تھا۔

''کیا تقریر کرنے والا یہی جوان موسیٰ بن نصیر ہے؟''

''نہیں ملکہٴ عالیہ......!'' لونڈی نے کہا۔ ''یہ جوان موسیٰ بن نصیر نہیں بلکہ اس کا فرزند عبدالعزیز بن موسیٰ ہے۔ موسیٰ بن نصیر تو اس فوج کا سپہ سالار تھا جس نے اندلس کو فتح کیا ہے اور وہ واپس چلا گیا۔ سنا ہے کہ ان کے خلیفہ نے ایک دم ہی انہیں واپس بلا لیا ہے لٰہذا یہاں سے رخصت ہونے سے قبل انہوں نے اپنے بیٹے کو اندلس کا امیر مقرر کر دیا تھا لیکن لوگ کہتے ہیں' یہ جوان امیر بہت دلیر اور صاحبِ علم ہے۔''

''تو نے اتنی بہت سی معلومات کیسے جمع کر لیں؟'' ملکہ نے بدستور نیچے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس سوال پر لونڈی جھینپ سی گئی۔ دراصل اسے یہ خبریں اپنے محبوب میکائیل سے معلوم ہوئی تھیں۔

اس وقت نیچے کا منظر کچھ عجیب تھا۔ غریب مسیحی اب بھی دوڑ دوڑ کر اسلام قبول کر رہے تھے اور ملکہ انجیلونہ کے لیے یہ منظر ناقابلِ برداشت تھا۔ اس کے دائیں بائیں دست بستہ کنیزیں اور لونڈیاں بھی یہ سب دیکھ رہی تھیں۔ ملکہ کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ یہ دیکھتے ہوئے اس کی منہ چڑھی لونڈی اور ہر دم ساتھ رہنے والی کنیز نے کہا۔

''ملکہٴ عالیہ......! حضور نے القصر کے تمام باشندوں کو نئے امیر کا استقبال کرنے کی اجازت کیوں دی؟''

ملکہ نے ایک نگاہ اپنی اس بے باک کنیز رونیکا کی طرف ڈالی اور بولی۔

''امیر عبدالعزیز اندلس کا امیر اور فاتح ہے۔ ہم استقبال نہ بھی کرتے تو بھی وہ قصر میں داخل ہونے کا حق رکھتا ہے۔''

''لیکن حضور......!'' رونیکا نے کہا۔ ''اس استقبال میں مجبوری نہیں' خوشی شامل ہے۔ کیا اندلس کے لوگ اتنے بے غیرت ہیں کہ لوٹنے والوں کو محافظ گردان رہے ہیں؟ غور کیجیے' آج اندلس پر صلیب کی جگہ ہلال لہرا رہا ہے۔ ارغوانی پرچم اتار کر مسلمانوں نے سفید پرچم لگا دیا ہے۔ آج ہر طرف انہی کے نعرے گونج رہے ہیں۔ یہ لوگ ہماری محفلوں میں گھس کر اپنے دین کی دعوت دے رہے ہیں اور مسیحیوں کو مسلمان بنا رہے ہیں اور ہم خوش ہو رہے ہیں' کیا ہم میں سے کسی میں انہیں پسپا کرنے کی قوت نہیں؟''

''نہ قوت ہے نہ صلاحیت' بس اب تُو خاموش رہ......'' ملکہ نے کنیز کو جھڑکا۔ ''تیرا خیال ہے کہ مجھے ان باتوں کا احساس نہیں ہے؟''

''اسی احساس کو سمجھتے ہوئے تو میں نے اپنے جذبات بیان کیے ہیں۔'' رونیکا روہانسی ہو کر بولی۔ ''آیا کوئی ایسی تدبیر نہیں کہ ہم اس قوم کو نیچا دکھا سکیں؟''

بے باک کنیز خاموش ہو گئی مگر ملکہ کے خوابیدہ احساسات کو جگا گئی۔ کل تک وہ ملکہ تھی مگر اب اندلس کے تمام شہر غرناطہ' قرطبہ' مالقہ' طلیطلہ اور ماروہ سب ہی ہاتھ سے جا چکے تھے۔ اب وہ ملکہ نہیں' بوڑھے بادشاہ کی نوعمر بیوہ تھی۔ 'بیوہ......' وہ مضطرب ہو گئی۔

یکایک نیچے شور بلند ہوا۔ امیر عبدالعزیز کی تقریر سن کر لوگ جوش و خروش کے ساتھ تعریفی جملے کہتے ہوئے تالیاں بجا رہے تھے پھر ملکہ نے دیکھا' نوجوان امیر کی پیشانی چمک رہی تھی۔ دراز قد' مضبوط اور خوب صورت جسم والا یہ نوجوان کسی کو بھی متوجہ کر سکتا تھا اور انجیلونہ متوجہ ہو چکی تھی۔ جوں ہی امیر عبدالعزیز نے القصر میں داخل ہونے کا اعلان کیا' ملکہ نے حکم دیا۔ ''امیر پر بالائی منزل سے پھول برسائے جائیں۔''

اس حکم کے پسِ پردہ کون سے جذبات کارفرما تھے' کوئی نہ جان سکا۔ رونیکا بے بسی سے دیکھ کر رہ گئی مگر نوجوان ملکہ کے چہرے پر اس وقت وہ خاص چمک اور آنکھوں میں وہ روشنی تھی جو رونیکا نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ اس نے پھول برسانے کا حکم دے کر پلٹتے ہوئے کہا۔ ''ہم خود امیر کو خوش آمدید کہنا چاہتے ہیں۔''

اس وقت امیر عبدالعزیز پر بالائی منزل سے پھول نثار ہو کر قدموں میں ڈھیر ہو رہے تھے۔ وہ اور

اس کے ساتھی ان پھولوں کو روندتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ اس راہ میں قطار در قطار کھڑے ہوئے نصاریٰ امیر کی خدمت میں سلام پیش کررہے تھے۔ امیر ان نعروں کے جواب دیتا اور خوب صورت مطربوں کی آوازوں میں نغمہ ہائے نشاط سنتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ ابھی تک اس کی نظریں قصر کے حسن اور ارد گرد جمع ان استقبال کرنے والوں پر تھیں جن میں سے بہت سے واقعی خُلوصِ دل سے خوش آمدید کہتے ہوئے مسلمانوں کو اپنا نجات دہندہ گردان رہے تھے۔

امیر عبدالعزیز کے خیال میں یہ سب مدتوں ظلم سہنے والے مظلوم تھے جنھوں نے اسلام کے دامن میں پناہ لی تھی۔ وہ ان سب کو محبت و خُلوص سے دیکھتا ہوا اور ان کے سلاموں کا جواب دیتا ہوا قصر کی عمارت میں داخل ہوا۔ چند قدم کے فاصلے پر سیڑھیوں پر ایک مجسمے کے روبرو پہنچ کر جیسے وہ ٹھٹک گیا۔ آخری سیڑھی پر رکھے ہوئے اس مجسمے کو دیکھ کر وہ یوں کھڑا رہ گیا جیسے زمین نے اس کے قدم پکڑ لیے ہوں یا اس میں خود حرکت کرنے کی سکت باقی نہ رہی ہو۔ یہ سفید سنگ مرمر کا مجسمہ تھا یا کوئی جیتا جاگتا سراپا؟ پہلی نظر میں تو وہ فیصلہ ہی نہ کرسکا مگر دوسری نگاہ پڑتے ہی اسے محسوس ہوا کہ یہ انسانی کمال نہیں بلکہ قدرت کا حسین شاہکار ہے جو نگاہوں کے راستے دل میں سما چکا ہے۔ سیاہ ماتمی لباس میں ملبوس، کھلے ہوئے گیسو، گلے میں چھوٹی سی صلیب اور صبح کی روشنی سے زیادہ روشن چہرہ، یہ کون تھی؟ امیر اندلس کو اس کا علم نہ تھا مگر اس کی حسین آنکھیں خیرہ ہوگئی تھیں۔ ایک نگاہ میں اس مکمل حسن کا جائزہ لینا ممکن نہ تھا یا پھر اس امیر کی شرافت کا تقاضا تھا کہ اس حسنِ عالم تاب سے نظریں چرائی جائیں۔

اسی وقت ایک مسیحی سردار آگے بڑھا اور بولا۔

''امیرِ اندلس......! یہ شہنشاہِ لرزیق کی بیوہ ملکہ انجیلونہ ہیں۔''

''بوڑھے شہنشاہ کی نوعمر ملکہ......!'' امیرِ اندلس نے تعجب سے یہ الفاظ دہرائے۔ ملکہ کو دیکھ کر اس کی نظریں حیرت کا اظہار کیے بغیر نہ رہیں۔ اس کی نظروں میں ہمدردی بھی تھی، شوق بھی، چاہت بھی اور حیرت بھی۔

اِن تمام جذبوں کو سمجھنے میں ملکہ کو ذرا بھی دیر نہ لگی۔ ابھی ان جذبوں کا اثر کم نہ ہوا تھا اور اس کے بے پناہ حسن کا تاثر ٹوٹا بھی نہ تھا کہ ملکہ نے گہرا سانس لیا۔ امیرِ اندلس ایک دم سے سنبھلا اور بڑے ہی احترام کے انداز سے بولا۔

''معزز ملکہ......! مزاج بہ خیر......!''

ملکہ نے بڑے سوگوار انداز سے اسے دیکھا اور دل سے نکلنے والی آہ نے لبوں پر دم توڑ دیا۔ وہ قدرے توقف کے بعد دھیمے اور شائستہ لہجے میں بولی۔

''اندلس کے نئے شہنشاہ......! ہم آپ کو مبارک باد دیتے ہیں۔''

امیر عبدالعزیز تعجب سے دیکھتا رہ گیا۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ اپنی کامیابی پر ملکہ سے مبارک باد لے یا اس کی تباہی پر اظہارِ افسوس کرے۔ شاید اس کے پاس وہ الفاظ نہیں تھے کہ ان متضاد جذبوں کا اظہار کرسکتا مگر ملکہ بڑے اہتمام اور تیاری کے بعد اسے خوش آمدید کہنے کے لیے آئی تھی۔ وہ جذبات کی ملکہ تھی اور اس کے خزانے میں خوب صورت الفاظ کی بھی کمی نہ تھی لہٰذا اس نے تمام جذبات جمع کرتے ہوئے اس موقع پر بڑے پراثر الفاظ کا سہارا لیا۔

''اندلس کے امیر......!'' وہ گویا ہوئی۔ ''ہمیں اپنی بربادی پر آپ سے کوئی گلہ نہیں، نہ ہم ایسا کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ ہماری تقدیر میں یہی لکھا تھا کہ جس قصر میں ملکہ بن کر حکمرانی کریں، اس کے دروازے پر ایک لونڈی کی حیثیت سے فاتح شہنشاہ کو خوش آمدید کہیں۔ ہم آپ کو اس عظیم فتح پر مبارک باد دیتے ہیں۔''

امیر عبدالعزیز ویسے بھی ایک بامروت اور رحم دل انسان تھا اور اس وقت اس کا دل حسن کی افسردگی اور بے بسی سے کچھ اور ملول ہوگیا تھا لہٰذا ملکہ کی بات سن کر وہ بے قرار ہوگیا اور شائستگی سے بولا۔

''معزز ملکہ......! آپ ہمیں شہنشاہ یا امیر کہہ کر

مخاطب نہ کیجیے۔ مسلمانوں میں حاکمِ وقت عوام کا خادم ہوتا ہے۔ وہ جس ملک یا قوم کو فتح کرتا ہے‘ اس کا فاتح نہیں‘ محافظ ہوتا ہے۔ اس کی نظر میں مفتوح قوم کا ہر فرد باعزت اور باوقار ہوتا ہے۔ ہم بھی اندلس کے ہر فرد کو ایسا ہی سمجھتے ہیں اور آپ ہماری نظر میں لونڈی نہیں‘ شاہِ لرزیق کی بیوہ ہیں اور محترم و لائقِ تعظیم ہیں۔ ہم حکم دیتے ہیں کہ آپ ہمیشہ اس قصر میں اپنی سابقہ شان اور اعزاز کے ساتھ رہیں گی۔ تمام خدام بدستور آپ کی وہی خدمت انجام دیں گے جو اَب تک دیتے رہے ہیں۔“

امیر کا جواب اور تمام تر مہربانیاں قطعی غیر متوقع تھیں۔ سب نے ہی حیران ہوکر دیکھا‘ واقعی امیر عبدالعزیز نے ضرورت سے زیادہ ہی فراخ دلی برتی تھی۔ ملکہ انجیلونہ نے اسے محسوس کیا اور چونک کر عبدالعزیز کی طرف دیکھا۔ اس وقت اس کی سوگوار نظریں عبدالعزیز بن موسیٰ کی آنکھوں سے چار ہوئیں تو امیر کے قدم لڑکھڑا گئے۔ اس کے حواس پر ایک نشہ سا چھا گیا‘ ایسا نشہ جو صرف محسوس کیا جاسکتا تھا۔ جنگ کے تمام عرصے میں عبدالعزیز نے ہر محاذ پر دلیری کا مظاہرہ کیا تھا اور اب موسیٰ بن نصیر کے اندلس سے چلے جانے کے بعد وہ ایک امیر کی حیثیت سے ہر جگہ گیا تھا۔ اس نے حسین بھی کئی دیکھے تھے اور جوانیاں بھی مگر ایسا نشہ کبھی نہ محسوس کیا تھا‘ لگتا تھا کہ خون کی گردش بڑھ گئی ہے جو لمحہ بہ لمحہ زندگی کا احساس دلا رہی ہے‘ نظروں کے تصادم نے اسے کیا سے کیا کردیا تھا۔ وہ حواس باختہ سا‘ کیف و مستی میں ڈوبا یہ اندازہ نہ کرسکا کہ ملکہ کا یہ سوگ‘ یہ دکھ اور یہ افسردگی‘ دکھاوا ہے یا حقیقت؟ نہ جانے کتنے لمحے اس کیفیت کی نذر ہوگئے‘ نہ ملکہ نے کچھ کہا نہ امیر ہی بولنے کی جرأت کرسکا۔

یہ صورتِ حال جنرل حبیب الفہدی‘ ایوب بن حبیب اور دیگر مجاہدین سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ انہوں نے چونک کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ امیر عبدالعزیز بن موسیٰ کے قدم شاید زندگی میں پہلی بار لڑکھڑائے تھے جن کی لغزش کو اس نے محسوس کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر اس کے ساتھی ضرور محسوس کرگئے تھے۔ اسی احساس کے تحت ایوب بن حبیب نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور شائستہ مگر تنبیہی لہجے میں بولا۔ ”امیرِ محترم......! قدم آگے بڑھائیے......“

یہ آواز امیر عبدالعزیز کو ہوش کی دنیا میں کھینچ لائی۔ ایوب بن حبیب کی آواز نے اسے بروقت چونکا دیا تھا۔ اس نے سوچا‘ کاش چند لمحے اور وہ مداخلت نہ کرتا۔ اس سوچ میں ناگواری بھی تھی اور عجیب سی جھنجلاہٹ بھی۔ اس نے بہ مشکل خود کو سنبھالا اور ساتھیوں کی معیت میں آگے بڑھ گیا‘ اس طرح جیسے وہ اپنی ہر سوچ یہاں چھوڑ گیا ہو۔

واپسی میں حبیب الفہدی اور ایوب بن حبیب اس کے دائیں بائیں چلتے ہوئے اس دن پیش آنے والے ہر واقعے پر بحث کررہے تھے مگر امیر عبدالعزیز موسیٰ کھوئے ہوئے انداز میں یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ جنرل حبیب الفہدی کی نظروں سے یہ انقلاب پوشیدہ نہ تھا۔

دوسری طرف اس رات اپنی خواب گاہ میں کروٹیں بدلتی ہوئی ملکہ انجیلونہ کو اپنا ماضی یاد آرہا تھا۔ وہ چشمِ تصور سے ایک شہزادی کو دیکھ رہی تھی جو ایک صبح سیر کے لیے نکلی تھی۔ اس وقت موسم بہت خوشگوار تھا۔ شہزادی نے محسوس کیا کہ سمندر میں تموج ہمیشہ سے بہت کم ہے لہٰذا اس نے کشتی رانی کا فیصلہ کیا اور اپنی کنیزوں کے ساتھ کشتی میں سوار ہوکر ملاحوں کو بادبان کھولنے کا حکم دیا۔ انہوں نے تعمیلِ حکم کی اور دیکھتے ہی دیکھتے شاہی کشتی روانہ ہوگئی۔ اس وقت اس کشتی کا رخ بحیرۂ روم کی جانب تھا۔ کشتی سطحِ آب پر موجوں سے چھیڑ چھاڑ کرتی آگے بڑھ رہی تھی۔ شہزادی کا خیال تھا کہ چند گھنٹے سیر کرنے کے بعد محل میں واپس لوٹ آئے گی لیکن سیر کرتے ہوئے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اچانک خوشگوار ہواؤں میں شدت پیدا ہونے لگی۔ یہ ہوائیں آنے والے طوفان کی خبر دے رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی بونداباندی نے اس کو مزید خطرے سے آگاہ کیا۔ شہزادی بری طرح گھبرا گئی۔ اس نے ملاحوں کو کشتی کا رخ محل کی جانب

لینے کا حکم دیا۔ ملاحوں نے کشتی کا رخ موڑنے کی کوشش کی مگر بارش اور ہوا نے تیزی اختیار کر لی۔ سمندر میں تلاطم بپا ہوگیا۔ اَب واپسی کی کوشش کے لیے ملاحوں نے مستول و بادبان سنبھالے مگر ہر کوشش ناکام ہوتی چلی گئی۔ ہوا اور بارش نے ہر چیز کو بے کار کردیا تھا۔ رسیاں ٹوٹ گئیں‘ بادبان گر گئے‘ لہریں بلند ہوکر کشتی میں آنے لگیں۔ شہزادی اور کنیزیں بری طرح چلا رہی تھیں‘ فرار کا کوئی راستہ نہ تھا۔ ہرچند کہ خدام کشتی کا پانی نکال نکال کر اسے ہلکا کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر طوفان کے زور کے سامنے ہر زور بے کار تھا۔ کشتی کبھی ادھر کا رخ کر رہی تھی تو کبھی اُدھر کا۔ اس میں سوار ہر شخص کو موت اپنے سامنے نظر آ رہی تھی۔ یوں تمام دن گزر گیا‘ نہ انہیں واپسی کا راستہ ملا اور نہ ہی طوفان کم ہوا۔ شام ہوتے ہوتے کشتی دانیہ کے ساحل تک جا پہنچی۔ یہاں طوفان کے زور سے پاش پاش ہو جانے والی کچھ اور کشتیاں پڑی ہوئی تھیں۔

ساحلی علاقے کو طوفان نے تباہ کر دیا تھا۔ شہزادی کے اپنے کئی ساتھی لقمۂ اَجل بن چکے تھے مگر وہ خود معجزانہ طور پر زندہ تھی اور اپنی تباہ حالی پر زار و قطار رو رہی تھی۔ شام کے وقت جب تمام علاقہ سیلاب کے پانی سے بھرا ہوا تھا اور امدادی جماعت ساحل کے قریب مصروف تھی‘ ایسے میں شہزادی کی کشتی بندرگاہ دانیہ سے جا ٹکرائی۔ لوگ سمجھے کہ شاید عرب آ گئے لہٰذا وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے لگے۔ کچھ نے تلواریں کھینچ لیں مگر اس علاقے کے قائد نے ان سب کو روکا‘ صورتِ حال معلوم کی پھر یہ جان کر کہ یہ تباہ شدہ کشتی دراصل شاہی کشتی ہے اور اس میں مغربِ اقصیٰ کی شہزادی سوار ہے‘ اسے بطورِ مہمان خوش آمدید کہا اور اندلس کے بادشاہ لرزیق کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ لرزیق نے یہ اطلاع پا کر ان مصیبت زدہ لوگوں کو اپنے دربار میں طلب کیا اور شہزادی کے بے پناہ حسن سے متاثر ہوکر اس سے شادی کر لی۔ اس طرح سے یہ نوعمر شہزادی بوڑھے بادشاہ سے وابستہ ہوکر اندلس کی ملکہ بن گئی اور ہر لمحہ سفر و حضر میں بادشاہ کے ساتھ رہنے لگی پھر آہستہ آہستہ پرانی زندگی کو فراموش کر کے نئی زندگی کی عادی ہوگئی لیکن زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ مسلمانوں سے فیصلہ کن جنگ کے لیے شاہِ لرزیق کو خود میدان میں جانا پڑا اور ملکہ تنہا رہ گئی پھر واپسی بادشاہ کا مقدر نہ تھی۔ وہ جنگ میں کام آیا اور اسی محل میں اسی ملکہ کو امیر عبدالعزیز بن موسیٰ بن نصیر کا استقبال کرنا پڑا۔

اپنے ماضی کو یاد کرتے کرتے انجیلونہ پھر بے حال ہوگئی۔ امیر سے ملاقات کے بعد سے اس کا دل کچھ عجیب انداز سے دھڑک رہا تھا۔ وہ غم کے احساس کے ساتھ ساتھ نئی کیفیت کو بھی اچھی طرح محسوس کر رہی تھی۔ اندلس کے نئے امیر کی آنکھوں میں اس کے لیے پسندیدگی تھی‘ انداز میں والہانہ پن تھا جو اسے مسرور کیے دے رہا تھا۔ بوڑھے بادشاہ لرزیق کے انداز میں بھی یہ سب کچھ ہوتا تھا لیکن انجیلونہ کو یہ خوشی کبھی حاصل نہ ہوئی جو اسے آج محسوس ہو رہی تھی۔ ان دونوں کے درمیان خاموشی کی زبان میں ایک طویل گفتگو ہوئی تھی جو بڑی ہی بامعنی تھی۔ وہ جوں جوں غور کرتی گئی‘ اس والہانہ پن اور نظروں کی وارفتگی کے معنی اس پر واضح ہوتے چلے گئے۔ اس کا دل کہتا۔ ’امیر ضرور آئے گا۔‘ اور عقل بار بار مشورہ دیتی۔ ’انجیلونہ! اس موقع کو ضائع مت کر‘ تو بڑی آسانی سے اندلس کی ملکہ بن سکتی ہے۔‘ اس مشورے پر غور کرتے ہوئے وہ خود کو یقین دلاتی۔ ’انجیلونہ‘ امیر عبدالعزیز بن موسیٰ میں اور صفات ہوں یا نہ ہوں مگر وہ اندلس کا امیر ضرور ہے اور یہی بہت بڑی صفت ہے۔‘ اس کے بعد وہ عقل کی آواز پر توجہ دیتے دیتے گم ہوتی گئی اور اپنے مستقبل کے بارے میں اہم فیصلہ کر کے پوری طرح سے مطمئن ہوگئی۔

•......•......•......•

امیرِ اندلس عبدالعزیز بن موسیٰ کئی دن کی بے قراری کے بعد کوئی خاص فیصلہ کر کے یوں تیار ہوا جیسے کسی مہم پر جا رہا ہو لیکن ان چند دنوں میں وہ ذہنی طور پر بڑے ہی انتشار کا شکار رہا تھا۔ انجیلونہ کا بے

پناہ حسن اور نظروں کا پیغام اسے دیوانہ کیے دے رہا تھا۔ جوں جوں وہ سوچتا' ایک نشہ سا طاری ہو جاتا تھا۔ دل چاہتا کہ پھر جائے اور دل بھر کر اسے دیکھے' جو کچھ وہ نظروں سے کہہ گئی' وہ سب زبان سے کہے۔ اس تمام وقت میں اس نے خود کو بری طرح گھائل محسوس کیا۔ دوسری طرف جنرل حبیب الفہدی اور ایوب بن حبیب کی تجربے کار نظریں اس سے پوشیدہ نہ تھیں۔ جس انداز میں ایوب بن حبیب نے اس وقت تنبیہی انداز میں اس سے آگے بڑھنے کی گزارش کی تھی' وہ اس نے اچھی طرح محسوس کیا تھا۔ اس کے بعد جب سے اب تک اس نے جس طرح اسے اس کے مقام سے آگاہ کر کے اس کی ذمے داریوں کا احساس دلایا تھا' وہ اپنے اس مشیر سے گریز کرنے لگا تھا۔ اب وہ پوری طرح تیار ہو کر کچھ اضطراب کے ساتھ کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ یہ کمرا کسی مجاہد یا مستعد امیر کا کمرا نظر آ رہا تھا۔ دیواروں پر آویزاں اسلحہ' تلوار' ڈھال' نیزے' تیر و کمان اور خوب صورت ترکش اپنے مالک کے سپاہیانہ ذوق کی گواہی دے رہے تھے۔ وہ اپنے ماحول سے بے خبر ٹہل رہا تھا کہ غلام نے دروازے پر رک کر اجازت طلب کی۔

''امیرِ محترم......! کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟''

''آ جاؤ' ہم تمہارے ہی منتظر ہیں۔''

امیر کی اجازت پا کر غلام اندر آ گیا اور عرض کیا۔ ''بہ موجبِ حکمِ اعلیٰ' آپ کا گھوڑا باغ کی پچھلی جانب تیار ہے۔''

''ایوب بن حبیب اس وقت کہاں ہیں؟'' امیر عبدالعزیز نے سوال کیا۔

''وہ اس وقت موجود نہیں ہیں۔'' غلام نے جواب دیا۔

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس وقت وہ کہاں ہیں؟'' امیر نے دوسرا سوال کیا۔

''جناب......'' غلام نے دست بستہ عرض کیا۔ ''میری معلومات کے مطابق اس وقت ایوب بن حبیب نصاریٰ کے ایک محلے میں تقریر کر رہے ہیں جو ابھی تک اسلام کی طرف مائل نہیں ہوا۔ ان دنوں اندلس کے عیسائیوں کو اپنی تقریروں کے ذریعے اسلام کی طرف مائل کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔''

یہ سنتے سنتے امیر اندلس کے چہرے پر ستائش آمیز جذبات ہویدا ہوئے مگر دوسرے ہی لمحے سوچیں بدل گئیں اور وہ غلام سے بولا۔ ''ہمارے جانے کے بعد ایوب بن حبیب آئیں تو بس اتنا کہنا کہ ہم موجود نہیں ہیں۔''

پھر امیر کمرے سے نکلا۔ دیکھنے والوں کی نظروں سے بے خبر وہ القصر کی راہ پر جا رہا تھا۔ یہ راہ صحیح تھی یا غلط' اسے کچھ خبر نہ تھی' بس ایک حسین تصور تھا جو اسے کھینچے لیے چلا جا رہا تھا۔ کچھ دیر سفر کرنے کے بعد وہ وہاں پہنچ گیا۔ موسم بہت حسین تھا۔ القصر کے طویل و عریض باغ میں حدِ نظر تک پھیلے ہوئے پھولوں کے تختے دعوتِ نظارہ دے رہے تھے۔ ان تختوں کے درمیان سنگِ مرمر کے بڑے بڑے بیضوی حوض میں فوارے چھوٹ رہے تھے اور اُن کی ننھی ننھی ٹھنڈی بوندوں کا اچھال بڑا ہی رُوح پرور تھا۔ امیر اندلس کو یہ منظر بہت ہی بھلا لگا۔ چند دن قبل ہی وہ یہاں آیا تھا مگر اس حیثیت میں نہیں' آج تو اس کے انداز ہی کچھ اور تھے۔ وہ اس فوارے کے قریب کھڑا اس حسین نظارے کو دیکھ رہا تھا۔ اسے اندازہ ہی نہ تھا کہ خدام اسے پہچان کر اور گرد ٹل گئے ہیں اور کسی کو روبرو آنے کی اجازت نہیں۔ اگر وہ یہ سب محسوس کر لیتا تو اپنے مقام کا خیال اسے لوٹ جانے پر مجبور کر دیتا مگر اس وقت وہ سب کچھ بھلا کر یہاں تک آ چکا تھا۔ اب انجیلونہ سے ملے بغیر لوٹ جانا اس کے لیے آسان نہ تھا۔ ابھی وہ اپنے تصورات میں ہی گم تھا کہ اچانک ایک مترنم آواز نے اسے چونکا دیا۔

''کنیز امیرِ اندلس کی خدمت میں سلام پیش کرتی ہے۔''

عبدالعزیز نے گردن موڑ کر دیکھا' یہ انجیلونہ تھی۔ عبدالعزیز نے آج اسے دوسرے لباس اور دوسرے انداز میں دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا مگر فوراً ہی اس کے نکھرے نکھرے حسن سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔ ''ہم کہہ چکے ہیں کہ ہم آپ کو لونڈی نہیں سمجھتے

"۔۔۔ بھی اپنے لیے ایسا تصور نہ کیجیے۔"
"۔۔۔ آپ کی ذرہ نوازی ہے امیرِ اندلس......!"
۔۔۔ نے خاص انداز سے کہا۔ "ورنہ حقیقت تو یہ ۔۔۔ ہم اس کے سوا کچھ نہیں ہیں۔"

اس وقت وہ کس جذبے کے تحت یہ کہہ رہی تھی، ۔۔۔ اندلس سمجھ نہ سکا مگر اس کی نظروں کی یاسیت اور ۔۔۔ کی افسردگی نے اسے مضطرب کر دیا۔ اس کا دل چاہا کہ اس کے دکھ سمیٹ لے اور اس کے دامن کو ۔۔۔ سے بھر دے۔ اس دن امیرِ اندلس اور ملکۂ انجیلونہ نے اپنا ماضی دہرایا۔ اس دوران وہ کئی بار ملول ہوئی، کئی بار اس کی آنکھوں میں ستارے چمکے اور کئی بار اس کی آواز بھرائی۔ ہر بار امیرِ اندلس خود اس سے زیادہ افسردہ ہوگیا۔ اپنے تمام حالات سنانے کے بعد انجیلونہ خاموش ہوگئی۔

"آپ کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، ہمیں اس کا بے حد رنج ہے۔" امیرِ اندلس نے کہا۔ انجیلونہ نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا اور غمگین لہجے میں بولی۔ "امیرِ اندلس......! حقیقت تو یہ ہے کہ ان تمام حالات نے ہم سے زندہ رہنے کی خواہش بھی چھین لی ہے۔ شاہ کی موت نے ہمیں کہیں کا بھی نہ رکھا۔ اب یہ سب آپ کی مہربانی ہے کہ ہمیں قصر میں اتنی شان کے ساتھ رہنے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے ورنہ نہ جانے آج ہم کہاں ہوتے؟"

"نہیں، نہیں۔" عبدالعزیز بن موسیٰ جیسے بے چین ہوگیا اور بے ساختہ اس کا نام لیتے ہوئے بولا۔ "انجیلونہ، یہ آپ کا حق ہے کہ آپ اسی شان کے ساتھ رہیں، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آیندہ بھی اسی طرح آپ کی دلجوئی کرتے رہیں گے۔"

یہ سن کر انجیلونہ ممنونیت اور خوشی سے بے قابو ہوگئی۔ اسے احساس ہی نہ رہا کہ وہ کیا کر رہی ہے، بس اس نے غیر اختیاری طور پر عبدالعزیز کے شانے پر سر رکھا اور سسک سسک کر رونے لگی۔ عبدالعزیز بن موسیٰ جس کا دل اس قرب سے زور زور سے دھڑک رہا تھا، حواس باختہ ہوگیا۔ ملکہ انجیلونہ کی یہ حرکت اسلامی تہذیب کے خلاف تھی اور عبدالعزیز خود بھی اس بات کو پسند نہ کرتا تھا مگر اس وقت وہ اسے ٹوکنے یا شانے سے ہٹا دینے کی جرأت نہ کر سکا۔ اس کے خیال میں یہ حرکت انجیلونہ کی نہیں، اس کی تہذیب کی گراوٹ تھی، یہ خطا اس کی نہیں، اس کے دین اور اصولوں کی تھی مگر وہ قابلِ رحم تھی۔ اصل چیز اس کے وہ جذبات تھے جن کے تحت وہ یہ سب کچھ کر رہی تھی لہٰذا اس نے آہستہ سے اس کا سر تھپتھپایا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ "انجیلونہ، رووٗ مت، تم جس مقام کی مستحق ہو، ہم تمہیں وہی مقام دیں گے۔" وہ دیر تک اسے تسلیاں دیتا رہا اور انجیلونہ روتی رہی یہاں تک کہ اس کی سسکیاں معدوم ہوگئیں۔

اس شام عبدالعزیز بن موسیٰ کا گھوڑا القصر سے نکل کر اپنی قیام گاہ کی طرف روانہ ہو رہا تھا تو انجیلونہ خوشی اور مسرت سے بھرپور انداز میں اسے رخصت کرتے ہوئے ہاتھ ہلا رہی تھی۔ جب اس کا گھوڑا درختوں کے جھنڈ میں نظروں سے اوجھل ہوگیا اور ٹاپوں کی آواز فضا میں معدوم ہوگئی تو انجیلونہ دوسرے دن کے انتظار کا تصور لیے واپس پلٹ آئی۔

پھر یہ ملاقاتیں ہر روز ہونے لگیں۔ عبدالعزیز بن موسیٰ جب بھی اپنی قیام گاہ سے نکلتا، اس کی سواری کا رخ القصر کی جانب مڑ جاتا۔ یہ ملاقات دو چار گھنٹوں سے کم نہ ہوتی۔ یوں بہت سے ضروری کام کل پر ٹل جاتے۔ اشبیلیہ کے گوشے گوشے میں یہ خبر تیزی سے پھیلنے لگی کہ امیرِ اندلس عبدالعزیز بن موسیٰ ملکہ انجیلونہ کو بہت وقت دیتے ہیں۔

کچھ وقت ان حالات کی نذر ہوگیا۔ آخر ایک دن غیر متوقع طور پر چند مخلصوں نے ملاقات کے لیے اچانک ہی عبدالعزیز کو گھیر لیا۔ جنرل حبیب الفہدی نے کہا۔ "امیرِ محترم......! میں چند دن سے ملاقات کے وقت کا منتظر تھا مگر آپ ان دنوں بہت مصروف رہے۔ کیا آج آپ کچھ وقت دے سکیں گے؟" یہ وہ وقت تھا جب عبدالعزیز بن موسیٰ القصر کی طرف جانے والا تھا۔ اس کا دل چاہا، ٹال دے مگر مجبوری تھی کہ آنے والے آچکے تھے۔ اس وقت ایوب بن حبیب اس کی بے قراری کو بہ غور دیکھ رہا تھا۔ یہی

اندازعبدالعزیز کواس سے گریز پر مجبور کردیتا تھا' تاہم اس وقت گریز ممکن نہ تھا۔ اس نے اخلاق سے کام لیتے ہوئے ان لوگوں کو اپنی نشست گاہ میں آنے کی دعوت دی۔ دیر تک اندلس کے مختلف حصوں کے حالات پر بحث ہوتی رہی۔ اس مصروفیت میں بھی امیر بار بار وقت کا احساس کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد جب سب ملنے والے رخصت ہوگئے تو ایوب بن حبیب نے کچھ دیر قیام کی اجازت طلب کی اور بولا۔ ''امیرِ محترم......! آپ نے مجھے ہمیشہ اپنا مخلص اور مشیر کہا ہے۔ اگر اجازت ہو تو کچھ عرض کروں؟''

اگرچہ اس انداز نے امیر عبدالعزیز کو مضطرب کردیا مگر اس نے تحمل سے کہا۔ ''ایوب......! تم کیا چاہتے ہو؟''

''مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے امیرِ محترم......! کہ آپ نے اپنے جذبات' اپنا وقت اور اپنی چاہت بڑے ہی غلط انسان کے لیے وقف کی ہے۔ ان حالات میں میرا کچھ کہنا خلافِ ادب تصور کیا جائے گا اور خاموش رہنا دوستی اور وفاداری کے خلاف ہے۔'' ایوب بن حبیب نے کہا۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو' وضاحت کرو۔'' امیر عبدالعزیز انجان بنتے ہوئے بولا۔

''میں کس طرح یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ جناب جس داستان سے متاثر اور جس حسن سے مرعوب ہیں' وہ آپ کے شایانِ شان نہیں ہے۔ ان دنوں گلی کوچوں میں مسلمان امیر کے بارے میں جو خبر گشت کررہی ہے' اگر وہ صحیح ہے تو امیر اندلس کی توہین کے سوا کچھ نہیں' معاف کیجیے' شاہِ لرزیق کی بیوہ آپ کے لیے نہ شاہانہ ٹھاٹ ترک کرسکتی ہے اور نہ اسلام قبول کرکے ایک سادہ عورت بن سکتی ہے۔ اس صورت میں اس کہانی کا انجام کیا ہوگا؟''

لمحہ بھر کے لیے امیر عبدالعزیز کو محسوس ہوا کہ ایوب بن حبیب' امیرِ اندلس کا مصاحب و مشیر نہیں ہے بلکہ اس کے بچپن کا وہی دوست اور ساتھی ہے جو غلط بات کو غلط کہنے میں ذرا بھی لحاظ نہ کرتا تھا۔ اگر یہ سوال کوئی اور کرتا تو شاید عبدالعزیز برداشت نہ کرسکتا مگر اس وقت بڑے ہی تحمل سے بولا۔

''ایوب......! تم کیا سمجھ رہے ہو؟ یقین کرو' ہم کوئی ناجائز بات نہیں کریں گے۔ ہم سب کچھ اسلام کے تحت کریں گے۔ کیا تمہیں ہم پر یقین نہیں ہے؟''

''مجھے آپ پر کامل بھروسا ہے امیر!'' ایوب نے دکھ سے کہا۔ ''لیکن آپ صرف اتنا سوچ لیجیے کہ جو ملکہ بے پناہ آسائش دیکھ چکی ہے' کیا وہ آیندہ آپ کے ساتھ سادہ زندگی بسر کرسکتی ہے؟ اگر آپ نے اپنی زندگی کے انداز بدل دیئے تو اس کا انجام جانتے ہیں؟ امیر کو دیکھ کر اور بہت سے افراد وہی زندگی اختیار کرلیں گے جو امیر کی ہوگی۔ عوام تو بادشاہوں کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں اور یہ کبھی نہ بھولیے کہ اندلس میں آپ کے مخالف زیادہ ہیں اور دوست کم۔ ان حالات میں ملکہ کی طرف رفاقت کا ہاتھ بڑھا کر آپ اپنے مسائل میں اضافہ کریں گے۔''

''ہم نے ہر پہلو سے غور کرلیا ہے' ہر رخ سے انجیلونہ کو ایک بے ضرر اور معصوم عورت پایا ہے لہٰذا تمہیں تردد کی ضرورت نہیں ہے۔'' امیرِ اندلس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور کھڑا ہوگیا۔

اس دن کے بعد سے ایوب بن حبیب میں اس موضوع پر گفتگو کا حوصلہ پیدا ہوگیا پھر وقت گزرتا رہا' ملکہ انجیلونہ' امیر عبدالعزیز کے قریب آتی گئی۔ امیر عبدالعزیز عشق کے تیر سے گھائل اور ملکہ اس کے منصب اور مردانہ وجاہت سے مسحور' اندھا دھند ایک دوسرے کی طرف بڑھتے گئے۔ اب وہی حرکتیں جو اسلام کے منافی تھیں' غیر اختیاری طور پر سرزد ہونے لگیں۔ عبدالعزیز اپنی دلیلوں سے انہیں تہذیب گردانتا رہا۔ ایسے میں موقع بہ موقع ایوب بن حبیب اسے مختلف انداز میں سمجھاتا رہا کہ امیرِ محترم......! آپ اس راہ پر جارہے ہیں جہاں خرابی ہی خرابی ہے۔'' ایسی باتوں پر عبدالعزیز بن موسیٰ چڑ جاتا۔ ''ہم نہیں سمجھ سکتے کہ آخر ایسا کرنے میں کون سی خرابی ہے؟ محبت یا شادی ہمارا ذاتی معاملہ ہے' اس سے ایسی کون سی برائی پیدا ہوسکتی ہے جسے تم غلط راہ سے تعبیر کررہے ہو؟''

آپ کا عمل اندلس کے مسلمانوں پر برا اثر ڈالے گا۔''

...عبدالعزیز نے ایک دن پوچھا۔ ''تم جس ... بار بار ذکر کرتے ہو اس کی وضاحت کرو۔''

''آپ کے سوال کا جواب دینے سے قبل میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کی فوج کا ہر سپاہی مسیحی لڑکیوں سے عشق کرنے لگے تو آپ کیا کریں گے؟'' سوال بڑا عجیب تھا مگر امیر اندلس نے فوری جواب دیا۔ ''ہم انہیں شادی کی اجازت دے دیں گے۔'' اس جواب پر ایوب بن حبیب تاسف کے انداز میں اس کا منہ دیکھتا رہ گیا پھر ملامتیہ لہجے میں بولا۔ ''آپ اپنی فوج کے ہر سپاہی کو شادی کی اجازت دے دیں گے تاکہ آپ کی آیندہ نسلیں مسیحی عورتوں کا دودھ پی کر ان کی آغوش میں تربیت پاکر اسلام سے دور ہوجائیں اور کچھ عرصے کے بعد اس قوم میں غداروں کی اکثریت ہو جائے......؟''

لہجہ بھی تلخ تھا اور بات بھی' اس وقت امیرِ اندلس کو امیر اور مشیر کے فرق کا احساس پیدا ہوا۔ دل چاہا' ایوب بن حبیب کا منہ بند کردے مگر آج ایوب بھی منصب کے فرق کو بھلا کر اسے برائی کا احساس دلانا چاہتا تھا اسی لیے اس نے یہ بات کہی تھی مگر امیرِ اندلس نے قدرے تلخ ہوکر ٹوکا۔ ''ایوب! یہ مت بھولو کہ اسلام میں اہلِ کتاب سے شادی جائز ہے اور......''

''لیکن اندلس کے امیر کو یہ بات فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اہلِ کتاب سے شادی کی اجازت دینے کے باوجود قرآنِ پاک میں خداوندِ عالم نے فرمایا ہے کہ مشرک آزاد عورت سے مسلمان کنیز بہتر ہے اور مشرک آزاد مرد سے مسلمان غلام بہتر ہے۔ یہ بھی مت بھولیے کہ اس وقت مسیحی قوم کے عقائد مشرکانہ ہیں لہٰذا ایسے میں یہ شادی جائز نہیں ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی یاد رکھیے کہ آنحضرت ﷺ نے کسی غیر مذہب عورت کو نکاح کا شرف عطا نہیں کیا۔ اس کے بعد کسی صحابیؓ نے بھی ایسی مثال قائم نہیں کی جبکہ قرآنِ پاک کے ہر حکم کو نبی کریم ﷺ نے عملی جامہ پہنایا اور صحابہ کرامؓ نے اُن کی تقلید کی پھر وہ کون سی بات تھی جو ایسا کرنے میں اُن کے لیے رکاوٹ کا باعث تھی؟''

اس سوال پر عبدالعزیز بن موسیٰ لاجواب رہ گیا مگر چند لمحے سکوت کے بعد بڑی ہی بے بسی سے بولا۔ ''ایوب! خدا کی قسم' یہ ہماری پسند کا معاملہ ہے' ہم کچھ نہیں کرسکتے۔''

''امیرِ محترم!'' ایوب نے بڑے دکھ سے کہا۔ ''آپ کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ آپ صرف ایک مرد ہی نہیں ہیں بلکہ اندلس کے مسلمانوں کے امیر بھی ہیں۔ آپ جو قدم بھی اٹھائیں گے' سب مسلمان آپ کی تقلید کریں گے۔ سوچ لیجیے' کہیں ایسا نہ ہو کہ کچھ عرصے بعد مسلمان اور نصاریٰ یوں گڈمڈ ہوجائیں کہ دوست اور دشمن کی پہچان ہی باقی نہ رہے۔ مسلمانوں میں بھی ہمارے مخالف کچھ کم نہیں ہیں۔ اس پر آپ غیر مسلموں کی طرف دستِ رفاقت بڑھا رہے ہیں۔ کل اگر ہر مسلمان کے گھر میں مسیحی بیوی ہوگی تو کیا یہ مسلمان وہ کارنامے انجام دے سکیں گے جو ان کے آباؤاجداد نے انجام دیئے ہیں؟ میرے دوست! میرے امیر! جو عظیم کام خلفائے راشدینؓ نے کیے' وہ بنی اُمیّہ کے خلیفہ انجام نہیں دے سکے' جو کچھ دمشق میں رہتے ہوئے کررہے ہیں' وہ ہم سرزمینِ اندلس میں آکر نہیں کرسکتے کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری چھوٹی سی لغزش ہماری آیندہ نسلوں کو غلط راہ پر ڈال دے۔ میرا فرض ہے کہ ایک مشیر کی حیثیت سے آپ کو یہ سب سمجھادوں۔''

جب تک ایوب بن حبیب بولتا رہا' امیر عبدالعزیز بہ غور سنتا رہا مگر اس کا تصور اب بھی کہیں اور بھٹک رہا تھا۔ آخر وہ اس خیال میں کھوئے ہوئے بولا۔ ''ایوب! بخدا' تم تقریر خوب کرتے ہو اسی لیے بابا جان نے تمہیں ہمارا مشیر مقرر کیا تھا۔ ہم ان کے انتخاب کی داد دیتے ہیں اور تمہیں اندلس کے سب سے بڑے خطیب کا خطاب دیتے ہیں۔''

اس جملے پر ایوب بن حبیب اپنی ہنسی برداشت نہ کرسکا اور بولا۔ ''اسی لیے اندلس کے اس بڑے

خطیب کی تقریر اوراقِ پریشاں کی طرح طاقِ نسیاں میں جگہ پاتی ہے۔''

یہ محفل مذاق کی نذر ہوگئی مگر اس کے بعد بھی ہر نصیحت یوں ہی نظر انداز کی جاتی رہی۔ ایوب بن حبیب جس قدر انجیلونہ کے عشق کے برے پہلو نمایاں کرتا، عبدالعزیز کا عشق اتنا ہی بڑھتا۔ آخر ایک دن اہلِ اندلس نے حیران ہوکر یہ خبر سنی کہ امیر اندلس عبدالعزیز بن موسیٰ نے شاہ لرزیق کی بیوہ انجیلونہ سے نکاح کرلیا۔ اس واقعے کے دو اثرات ہوئے وہ جو مسلمانوں کو بہ زورِ قوت زیر کرنا چاہتے تھے، اب مطمئن ہوکر بیٹھ گئے، وہ نوجوان مسلمان سپاہی جو مسیحی لڑکیوں کے عشق میں گرفتار تھے، اب ان کے ساتھ کھلے عام زندگی بسر کرنے کے عہدو پیمان باندھ رہے تھے۔ امیر اندلس نے انہیں خود ہی نئی راہ دکھائی تھی جس پر وہ چل پڑے تھے۔

.........•.........

اس شادی نے عام زندگی پر جو اثر ڈالا، وہ تو ڈالا ہی مگر عبدالعزیز بن موسیٰ کی زندگی بھی بدل دی۔ انجیلونہ کی محبت شادی کے بعد جیسے دیوانگی میں بدل گئی تھی۔ کوئی لمحہ ایسا نہ جاتا تھا کہ امیر اسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش میں مصروف نہ رہا ہو۔ سب سے پہلے اس نے قرطبہ کے باہر انجیلونہ کے لیے نیا قصر تعمیر کروایا۔ اس کے طویل و عریض باغ میں ایک خانقاہ بنوائی جہاں بیٹھ کر انجیلونہ عبادت کرتی۔ ایک عیسائی راہب عیسائیت کی تلقین کرکے اس تعلیم کو عام کرتا۔ جب تک ملکہ عبادت میں مصروف رہتی، امیر اندلس عبدالعزیز بن موسیٰ اس کی عبادت گاہ کے باہر کھڑا رہتا۔ الغرض دیگر تمام عیش و آرام کے ساتھ امیر اندلس نے انجیلونہ کو مذہبی آزادی بھی اس قدر دی کہ وہ عیسائیت کی اشاعت اور پرچار بھی کرتی تو اسے کوئی اعتراض نہ تھا، دوسری طرف ہر روز ایک یا دو سپاہی مسیحی لڑکیوں سے نکاح کی اجازت طلب کرتے۔ ملکہ و امیر کی جانب سے انہیں اجازت مل جاتی، یوں وقت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی مسیحی بیویوں میں اضافہ ہوتا گیا جن کی بدولت یہ مسلمان اسلامی اصولوں سے دور ہوتے گئے، مسلمانوں کے درمیان اختلافِ رائے بڑھتا گیا۔ ایوب بن حبیب ان سب کو اپنی تقریروں کے ذریعے ان کی حیثیتوں کا احساس دلاتا رہا مگر یہ سب اپنی حیثیت سے گرتے گئے۔ ملکہ کی خوشی امیر اندلس کی خوشی تھی۔ ملکہ ہر وہ عیش طلب کرتی جس کی وہ عادی تھی اور امیر ان سب باتوں کو اس کی معصوم ضد اور محبوبانہ ادائیں تصور کرکے پوری کردیتا۔ اس طرح جوں جوں وقت گزرتا گیا، انجیلونہ اس کے مزاج پر غالب آتی گئی۔ زندگی کا ایک برس چپ چاپ گزر گیا اور انجیلونہ، عبدالعزیز بن موسیٰ کے بیٹے کی ماں بن گئی۔

عاصم بن عبدالعزیز ایک بہت بڑی قوت تھا، بہت بڑا رابطہ تھا۔ اب انجیلونہ نہ صرف ملکہ یا امیرِ اندلس کی بیوی ہی نہیں بلکہ امِ عاصم بھی تھی۔ اب امیرِ اندلس کے ساتھ اس کا بھی نام لیا جانے لگا تھا۔ ادھر سلطنت اور دیگر مہمات میں اس کا بھی مشورہ ضروری ہوگیا تھا۔ ان سب کے باوجود وہ مضطرب رہتی۔ اس نے اندلس کے شاندار جشن دیکھے تھے اور وہ دلدادۂ عیش اپنی سابقہ زندگی سے کچھ اس طرح مسحور تھی کہ اب امیر عبدالعزیز بن موسیٰ کی مجاہدانہ اور سپاہیانہ زندگی اسے بہت ہی سادہ نظر آئی۔

یہ مسلمان بوریا نشین عرب، یہ فاتحانِ اندلس آج بھی تکلف اور بناوٹ سے پاک تھے۔ عبدالعزیز اپنے باپ موسیٰ بن نصیر کی طرح انتھک کام کرنے والا، سادہ غذا اور لباس کا عادی تھا اسی لیے ایوانِ شاہی میں ہر عیش و آرام کے باوجود ملکہ کو طبیعتوں کی دوری اور مزاجوں کا فرق بری طرح محسوس ہوتا پھر اردگرد سے آنے والی آوازیں اس فرق کو کچھ اور نمایاں کردیتیں۔ انجیلونہ، عبدالعزیز سے وہ کچھ طلب کرتی کہ وہ دیکھتا ہی رہ جاتا۔

اس دن بھی یہی ہوا، اس صبح آفتاب کی کرنیں ایوانِ شاہی پر نثار ہوکر دن کے طلوع ہونے کا پیغام دے رہی تھیں۔ عبدالعزیز بن موسیٰ اپنے سپاہیانہ لباس میں ایوان سے باہر جانے کے لیے تیار تھا۔ کنیز اس کے بیٹے عاصم کو تیار کررہی تھی۔ عبدالعزیز بن

لی تیار ہوتے ہوئے بے قراری سے انجیلونہ کا منتظر تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب بوڑھے راہب کے ہاتھ پر توبہ استغفار کر کے انجیلونہ محل میں واپس آئی تھی اور عبدالعزیز اسے الوداع کہہ کر دیوان خانے میں چلا جاتا تھا۔ آج بھی اسے بہت دیر انتظار کرنا نہیں پڑا۔ اس نے دیکھا' چست و عریاں لباس میں ملبوس' کھلے ہوئے بال اور گلے میں چھوٹی سی صلیب ڈالے انجیلونہ چلی آ رہی تھی۔ یہ دونوں چیزیں اسلام کے منافی تھیں مگر وہ مذہب کے معاملے میں سخت گیر نہ تھا۔ دوسرے یہ لباس جس قدر ناپسندیدہ محسوس ہوتا' انجیلونہ کے حسن کو اتنا ہی مسحور کن بنا دیتا تھا۔ اس وقت وہ کمرے میں داخل ہوئی' اس نے دیکھا کہ عبدالعزیز بن موسیٰ حسب معمول اپنے سپاہیانہ لباس میں تھا۔ یہ لباس اس کے قد اور جسم پر سجتا تھا مگر اسی وضع قطع کا لباس امیر کا خادم بھی پہنتا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے انجیلونہ کے چہرے سے مسرت اور فخر کا رنگ اڑ گیا اور وہ افسردہ ہوگئی۔ عبدالعزیز بن موسیٰ نے رنگ کے اس تغیر کو بغور دیکھا اور محبت پاش لہجے میں بولا۔

''ام عاصم! ہم تمہیں افسردہ محسوس کر رہے ہیں' کیا بات ہے؟''

''صد شکر کہ جو غم ہمیں ایک برس سے رنجیدہ کر رہا ہے' اسے امیر اندلس نے محسوس تو کیا۔'' انجیلونہ نے قدرے خفگی سے کہا۔

عبدالعزیز اس انداز تخاطب سے حیران رہ گیا اور بولا۔ ''ام عاصم! ہم سمجھ نہیں سکے کہ تمہیں کون سا غم ہے؟ ہم نے تمہارے لیے ایسا قصر تعمیر کرایا جو اندلس کے کسی شہنشاہ نے اپنی ملکہ کے لیے نہ کرایا ہوگا۔ اس قصر میں تمہارے لیے عیش و آرام کا ہر سامان مہیا کیا۔ اس کے باوجود بھی تم غمگین ہو' آخر کیوں؟''

یہ سنتے ہی انجیلونہ نے عبدالعزیز بن موسیٰ کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور بڑے انداز سے بولی۔ ''کیا ہمیں افسردہ کرنے کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ ہمارا قابل فخر شوہر اپنے مرتبے اور شان کے اعتبار سے زندگی بسر نہیں کرتا جس کے باعث ہم بھی متاثر ہوتے ہیں؟''

''کیا مطلب؟'' عبدالعزیز بن موسیٰ نے تعجب سے دیکھا۔ ''کیا یہ عالی شان محل' یہ سیکڑوں کنیزیں اور خدام تمہاری شان کے مطابق نہیں ہیں؟''

''ہم رہن سہن کی بات تو نہیں کر رہے۔'' ملکہ نے اٹھلا کر کہا۔ ''ہم تو یہ سوچتے ہیں کہ امیر اندلس سابقہ شاہانِ اندلس کی طرح قبا اور تاج استعمال نہیں کرتے بلکہ جو لباس خود زیب تن کرتے ہیں' وہی ان کے خادم پہنتے ہیں۔ آخر ایک عام آدمی میں اور حاکم میں کوئی نمایاں فرق ہونا چاہیے۔ آپ ایک فاتح ہیں' فرماں روائے اندلس ہیں' اس حیثیت سے قبائے ارغوانی اور تاجِ شاہی......''

''ام عاصم......!'' عبدالعزیز بن موسیٰ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ہم بار بار کہہ چکے ہیں کہ اسلام میں آقا اور غلام کے لباس میں کوئی فرق نہیں' صرف ذمے داریوں کا فرق ہے۔ غلام کی ذمے داری محدود اور آقا کی لامحدود ہے۔ جہاں تک تاج اور قبا کا تعلق ہے' خلفائے بنو امیہ تاج یا ٹوپی نہیں پہنتے بلکہ سر پر صرف عمامہ رکھتے ہیں۔ اس صورت میں ہمارا تاج پہننا ایک جرم ہے۔ ہم ان سب سے ہٹ کر تو نہیں ہیں۔''

''لیکن آپ اندلس کے امیر ہیں اور قدیم شاہانِ اندلس کے رعب و داب کو تازہ کرنا اور ان کے دساتیر کو اپنانا آپ پر لازم ہے۔'' انجیلونہ نے بحث شروع کی۔

''نہیں۔'' عبدالعزیز بن موسیٰ جھنجلا گیا۔ ''مسلمان جہاں جاتے ہیں' اپنے ہی دستور رائج کرتے ہیں کیوں کہ ان کے دستور اسلامی اصول ہیں اور ہم بھی اسلامی اصولوں اور بزرگوں کے طریقوں سے نہیں ہٹ سکتے۔ ہم کہے دیتے ہیں کہ آئندہ ایسا فضول خیال دل میں کبھی مت لانا۔''

اس دوٹوک جواب پر انجیلونہ کی آنکھیں بھر آئیں اور عبدالعزیز بن موسیٰ کو محسوس ہوا کہ وہ دریائے وادیٔ الکبیر کے کنارے کھڑا ہے اور زیر آب کشتیاں ڈوب رہی ہیں۔ وہ ان آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بے چین ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی ملول ہوا اور قدرے دھیمے لہجے میں بولا۔ ''ہم سمجھ نہیں سکتے کہ تم

اتنی چھوٹی باتوں پر کیوں اداس ہو جاتی ہو؟ ہم نے شادی کے وقت وعدہ کیا تھا کہ ہم تمہارے مذہبی معاملات میں دخل نہیں دیں گے، تم اس بات کو ذہن میں رکھنا کہ ہم اسلامی اُخوت اور سادگی ترک نہیں کر سکتے۔ ہم تو اَب بھی اپنے وعدے پر قائم ہیں مگر تم اس بات کو فراموش کر بیٹھیں۔''

انجیلونہ لاجواب ہوگئی تھی مگر اعتراف کرنے کی عادی نہ تھی، کوئی اور صورت نہ پا کر وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ اس وقت عبدالعزیز بن موسیٰ پریشان سا کھڑا تھا۔ ملکہ روتے ہوئے بولی۔

''امیر اپنے غلاموں سے برادرانہ سلوک کرتے ہیں، عام لوگوں جیسا لباس زیبِ تن کرتے ہیں، ان سب کو اپنے قریب بٹھا کر باتیں کرتے ہیں۔ ہم یہ سب کچھ گوارہ نہیں کر سکتے مگر برداشت کرتے ہیں محض آپ کے لیے، آپ کی خوشی کے لیے، ملکہ ہو کر بھی ہم عامیانہ باتیں برداشت کرتے ہیں تو کیا آپ ہماری خوشی کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ صرف تاج سر پر رکھ لیں؟''

محبوب بیوی کی اس خواہش پر عبدالعزیز بن موسیٰ کی حالت قابلِ دید تھی۔ اس نے اس فتنۂ روزگار، دلدادۂ عیش عورت کو لاچاری کے انداز میں یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ 'تم کیا جانو انجیلونہ، ہم تمہارے لیے کیا کیا کر سکتے ہیں مگر تمھیں ہماری محبت کی قدر کرنا نہیں آئی'، مگر اس نے یہ سب نہ کہا اور انجیلونہ اس کے جذبات سے بے خبر امید و بیم کی حالت میں کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

امیر عبدالعزیز نے کہا۔ ''ام عاصم! اس بوریا نشین عرب کی بیوی بن کر بھی تمہارے ذہن سے بوئے سلطنت نہ گئی؟'' اس کے انداز میں تنبیہ بھی تھی اور محبت بھی۔ انجیلونہ نے برجستہ کہا۔ ''ہم بوریا نشین عرب کی بیوی نہیں، امیرِ اندلس کی ملکہ ہیں، لیکن آج صرف ایک لونڈی بن کر فریاد کرنا چاہتے ہیں۔'' یہ فقرہ کہتے کہتے وہ جھک گئی۔ حسن کا یہ انداز بڑا ہی عجیب تھا۔ عبدالعزیز کو محسوس ہوا کہ اس کی بیوی نہیں بلکہ ماہِ کامل قدموں میں جھک آیا ہے۔ اسی لمحے ایک ساعت نے اس کی سوچوں کے رخ مو[ڑ] دیئے۔ بڑے ہی عزم کے ساتھ طویل راہوں کو پختہ قدموں سے طے کرنے والے مسافر کے قدم ایک دم سے ڈگمگا گئے اور ایک نئی راہ کی جانب اٹھ گئے۔ عبدالعزیز بن موسیٰ اسلامی اُخوت، سادگی اور صحابہ کرامؓ و خُلفائے راشدینؓ کے مسلک کو چشمِ زدن میں فراموش کر بیٹھا۔ اسے کوئی احساس تھا تو صرف اتنا کہ اس کی بیوی اس کے روبرو جھکی ہوئی فریاد کر رہی ہے۔ اس نے بڑی ہی نرمی اور لطافت کے ساتھ اسے پکڑ[کر] شانوں کے سہارے اونچا کیا اور شرارت کے انداز میں بولا۔ ''فریادی، کیا چاہتے ہو، اپنی خواہش بیان کرو۔'' اس جملے پر انجیلونہ کا دل زور سے دھڑکا۔ اس کا حسن امیر کو اسی راہ پر لے آیا تھا جہاں وہ لانا چاہتی تھی مگر اپنی بے پناہ خوشی کو چھپاتے ہوئے وہ بڑی ادا سے بولی۔ ''فریاد یہ ہے، اے اندلس کے باشندوں سے انصاف کرنے والے، اے شجاعت و سخاوت کے پیکر، صرف آج ہماری خاطر اپنے سر سے یہ عمامہ، یہ عربی صافہ اتار کر اس عظیم تاجِ شاہی کو سر پر رکھ لیں اور دیکھیں کہ آپ کیسے لگتے ہیں، مان لیجیے، آپ کو ہماری محبت کی قسم......''

عبدالعزیز بن موسیٰ کا دل اس ادا پر لوٹ گیا۔ اظہارِ خواہش کے اس انوکھے انداز پر اس نے والہانہ انداز میں اسے دیکھا اور بولا۔ ''اے خوب صورت ساحرہ، تو رومتہ الکبریٰ اور القصر کے نغمہ ہائے انبساط کی صدائے بازگشت سن چکی ہے۔ خدا کی قسم، تیرا انداز جتنا بھی حسین ہو، کم ہے۔''

''کنیز، امیر سے اپنی بات کا جواب چاہتی ہے۔'' انجیلونہ نے لوہا گرم دیکھا تو آخری ضرب لگائی۔ عبدالعزیز بھول گیا کہ مدتوں سے جس بات کو رد کر رہا ہے، ملکہ وہی بات اس سے منوا رہی ہے۔ اس نے کہا۔ ''ہم ملکہ کو اس کی آرزو پوری کرنے کی اجازت دیتے ہیں لیکن یاد رہے کہ یہ کام ان حسین ہاتھوں سے ہی تکمیل پائے۔'' یہ کہتے ہوئے عبدالعزیز نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے مگر اس وقت وہ اس کی محبت سے زیادہ اپنی بات منوا لینے پر خوش نظر آ رہی

تی۔ اس نے جلدی سے ہاتھ چھڑائے اور تالی بجائی نے سنتے ہی غلام حاضر ہوا تو وہ بولی۔ ''وہ تھال اٹھا لاؤ جس میں ہم نے تاجِ شاہی سجا رکھے ہیں۔''

یہ سن کر عبدالعزیز بن موسیٰ ایک ساعت کے لیے حیران رہ گیا' گویا وہ یہ پروگرام کئی دن سے تیار کررہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد دو مسیحی غلام ایک بڑا طشت لیے حاضر ہوئے جس میں چھتیس تاج رکھے ہوئے تھے جو نہ جانے کس طرح سے موسیٰ بن نصیر کی نظروں سے بچ گئے ورنہ وہ دیگر تمام مالِ غنیمت کے ساتھ بیت المال میں ہی ہوتے۔ عبدالعزیز کو انجیلونہ کی محبت نے یہ سب سوچنے کا موقع ہی نہ دیا۔ چشمِ زدن میں خوب صورت انجیلونہ پلٹی اور اپنے ہاتھوں سے عبدالعزیز کے سر سے عربی صافہ اتار کر سب سے خوب صورت تاج اس کے سر پر رکھ دیا اور اسے آئینے کے روبرو لے جاتی ہوئی خوشی سے چہکی۔ ''امیرِ اندلس' سچ کہیے' آپ کی شان کے مطابق یہ عربی صافہ ہے یا تاجِ شاہی؟''

عبدالعزیز بن موسیٰ نے قدِ آدم آئینے میں اپنا سراپا دیکھا' بلاشبہ اس کی شخصیت میں غیر معمولی تبدیلی آ گئی تھی۔ اب وہ ایک ایسا نوجوان شہنشاہ نظر آ رہا تھا جس کی امارت اور رعب ہر فرد کو مرعوب کردینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس نے خود کو دیکھنے کے بعد ایک نظر قریب کھڑی ہوئی انجیلونہ کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں سے مسرت کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ وہ بے خود ہوکر بولی۔ ''امیرِ اندلس' کیا یہ اعزاز آپ ہمیں نہیں بخشیں گے؟''

عبدالعزیز بن موسیٰ کو محسوس ہوا کہ وہ اس آرزو کو رد نہیں کرسکتا۔ اس نے بڑی نفاست اور آہستگی سے طشت میں سے دوسرا تاج اٹھایا اور ملکہ انجیلونہ کے سر پر رکھ دیا۔

اس شام باقاعدہ تاج پوشی کی رسم ادا کی گئی اور حکم جاری کیا گیا کہ عمائدینِ شہر مسلمان ہوں یا نصاریٰ' سب دربار میں حاضر ہوکر امیرِ اندلس اور ملکۂ اندلس کو مبارک باد پیش کریں۔

اسلامی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب ایک مسلمان امیر نے شہنشاہ کا روپ دھارا ہو۔ اس سے قبل ہر چند کہ بنوامیہ میں امارت کی شان آ گئی تھی مگر شہنشاہیت کے انداز نہ تھے لہٰذا مسلمانوں کی اکثریت چراغ پا ہورہی تھی۔ اس وقت اندلس کے مسلمانوں کی اکثریت دو گروہوں میں تقسیم ہوکر گلی کوچوں میں بحث و مباحثہ کررہی تھی۔ ایک وہ طبقہ تھا جو ہر قسم کے تصنع اور بناوٹ سے پاک' اندلس میں اسلام کی اشاعت کو اپنا فرض سمجھ رہا تھا۔ ان کے ذہنوں میں امیر کے نام کے ساتھ ہی صدیقِ اکبرؓ اور فاروقِ اعظمؓ کا تصور لہرا جاتا تھا۔ ان کے باپ دادا نے خلفائے راشدینؓ کا زمانہ دیکھا تھا لہٰذا ان کے لیے یہ صورتِ حال تشویش ناک تھی۔ مسلمانوں کا دوسرا طبقہ وہ تھا جنھوں نے امیرِ اندلس کی تقلید میں مسیحی لڑکیوں سے شادیاں کرلی تھیں۔ وہ ان تبدیلیوں کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے لہٰذا جگہ جگہ بحث و تکرار سنائی دینے لگی۔ کسی نے کہا' امیرِ اندلس نے اس کام کی ابتدا کرکے اچھا نہیں کیا۔ یہ مسیحی ملکہ چور دروازے سے حکم عدولی اور عیش پرستی کی بری رسوم کو امیر کے گھر میں داخل کرکے اسے غلط راہ پر ڈال رہی ہے۔ قبائے ارغوانی اور تاجِ شاہی کا استعمال نامناسب ہے۔ یہ سن کر ایک نصرانی بیوی کے مسلمان شوہر نے طنز کیا۔ ''تم جیسے لوگوں نے اسلام کو غلط انداز میں پیش کرکے بدنام کردیا ہے۔ لوگ اسلام کا نام سن کر الجھ جاتے ہیں۔ ارے بھائی' ہمارے دین میں قبا اور تاج کے استعمال پر پابندی نہیں ہے۔ کیا ہوا اگر امیرِ اندلس نے اسے رواج دے دیا؟'' اس پر اسلام کا ایک شیدائی گرج کر بولا۔ ''تم تو یہی کہو گے جو اب نہ مسلمان رہے ہو نہ نصرانی۔ تمہارے گھروں میں عیسائیت کے چرچے ہیں اور باہر تم مسلمان بنے پھرتے ہو' تمہاری اولادوں میں دوغلا خون ہے۔''

اِدھر یہ جھگڑے ہورہے تھے جنھیں ایوب بن حبیب سنبھالنا چاہتا تھا اور اُدھر سازشی ذہن رکھنے والے تاج پوشی کی رسم کی خبر بڑے خوب صورت انداز میں دمشق پہنچا رہے تھے جہاں سلیمان بن عبدالملک خلیفہ بنا تھا۔ ان سازشی لوگوں کا مقصد موسیٰ بن نصیر

اور اس کے فرزند کو خلیفہ کی نظروں سے گراتا تھا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے موسیٰ بن نصیر جیسے جنرل کو ایک معمولی سی لغزش پر قید کردیا تھا پھر قید خانے سے نکال کر مال و متاع ضبط کر کے وادئ القرہ میں نظر بند کر دیا تھا۔ اس خبر نے عبدالعزیز بن موسیٰ کو حواس باختہ کردیا۔ اس رات وہ افسردہ سا چشمِ تصور سے اپنے باپ کو زندان میں بے بسی کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ اسے احساس ہی نہ رہا کہ ملکہ انجیلونہ اس کے سینے پر سر رکھے کتنی دیر سے اس کی اداسی کو محسوس کر رہی ہے۔ آخر وہ خود ہی بولی۔ ''امیر' کیا سوچ رہے ہو؟ دمشق میں آپ کے باپ پر ظلم ہو رہا ہے اور آپ کچھ نہیں کر رہے؟''

''ام عاصم!'' عبدالعزیز نے بڑے دکھ سے کہا۔ ''ہم کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتے جو مسلمانوں کے لیے نقصان کا باعث بن جائے۔ دمشق کی خلافت اور اندلس کی امارت جدا نہیں ہے۔ نہ بابا جان ہی اس بات کو پسند کریں گے کہ مسلمان آپس میں ٹکرا جائیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کیا کریں؟''

ملکہ انجیلونہ نے محسوس کیا کہ عبدالعزیز بن موسیٰ کے اندر ابھی مسلمان مرد موجود ہے۔ وہ مسلمان جو بہرصورت اسلام کی حفاظت چاہتا ہے۔ انجیلونہ اسے اندلس کا وہ بادشاہ دیکھنا چاہتی تھی جو ذاتی عزتِ نفس کے لیے ہر حکم جاری کر دیتے تھے۔ وہ دھیرے سے بولی۔ ''آپ کو چاہیے کہ اپنی قوت بڑھائیں۔ اندلس کے مسلمان آپ کے ساتھ ہیں' آپ یہاں کے تمام نصاریٰ کو اعتماد میں لیجیے' میں بھی آپ کی خوشی کے لیے عیسائی امراء کو آپ کی قوت بنانے کا فرض ادا کروں گی پھر آپ اندلس کی امارت کو دمشق کی خلافت سے آزاد کرا لیجیے۔ جب آپ خود مطلق العنان حکمران بن جائیں گے تو خلیفۂ دمشق آپ کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گا۔''

عبدالعزیز بن موسیٰ نے بغور اس مشورے کو سنا اور دھیرے سے بولا۔ ''ام عاصم! تم اس بات کو سمجھ نہیں سکتیں' ہمارے اس اقدام سے مسلمان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے جو ہم نہیں چاہتے۔''

''اونہہ......'' انجیلونہ نے بڑی ناگواری سے کہا۔ ''جو مسلمان حکومت آپ کے باپ کی خدمات کا اعتراف نہیں کر رہی ہے' اتنی بڑی فتوحات پر ان کی حوصلہ افزائی کرنے کی بجائے ان پر تشدد کر رہی ہے' آپ خود بھی ہمیشہ اسی کے تحت رہنا چاہتے ہیں' میں سمجھتی ہوں' اگر آپ یوں ہی وفاداری کا ثبوت دیتے رہے تو آپ کا انجام بھی اپنے باپ سے مختلف نہ ہوگا لہٰذا جتنی جلد ممکن ہو' اپنی طاقت بڑھائیے۔''

امیرِ اندلس عبدالعزیز بن موسیٰ بن نصیر کی زندگی کے انداز ایک دم سے بدل گئے۔ مسلمانوں نے اس بات کو واضح طور پر محسوس کیا۔ اندلس کے نصاریٰ کو مذہبی آزادی کے ساتھ ساتھ مختلف شہروں کی امارت بھی دی جانے لگی۔ متعدد شہروں میں عیسائی ناظم مقرر کیے گئے جو اسے وہی حیثیت دیتے جو قدیم شاہانِ اندلس کو دیتے تھے۔ آئے دن ایوانِ شاہی میں نصرانی امراء امیر کی خدمت میں حاضر ہوتے' مختلف معاملات میں مشورے دیتے' جس بات کی تائید ملکہ کر دیتی' وہ امیرِ اندلس کے لیے لازم ہو جاتی۔ اس صورتِ حال سے مسلمانوں میں خاصی بددلی پھیلی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں مخالفین بہت تھے جو ہر خبر کو نیا رنگ دے کر خلیفہ سلیمان بن عبدالملک تک پہنچا رہے تھے۔ وہ لوگ جو دل سے عبدالعزیز بن موسیٰ کے خیر خواہ تھے' مایوس ہوتے جا رہے تھے۔ مستزاد یہ کہ شہروں کے مسیحی ناظم مزید تشویش کا باعث بن رہے تھے۔ ان دنوں امیرِ اندلس کے طرزِ زندگی پر اگر دل سے مسرور و مطمئن تھے تو صرف وہ مسلمان جن کی بیویاں نصرانی تھیں اور ملکہ انجیلونہ تک رسائی حاصل کر کے دربار میں اہم مقام حاصل کر چکی تھیں۔ ان دنوں ایوانِ شاہی گویا مسیحیوں کا گڑھ بن گیا تھا۔ ملکہ کی اجازت لے کر مسلمانوں کی مسیحی بیویاں اپنے شوہروں کے ساتھ خانقاہ جانے لگیں' یوں تثلیث کی تعلیم عام ہونے لگی ہر چند کہ مسلمانوں نے عیسائیت اختیار نہ کی مگر نصرانی بیویوں کے سبب وہ بھی اسلام سے دور ہونے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ دو سگے بھائی جن میں ایک کی بیوی مسلمان اور دوسرے کی

نصرانی تھی‘ ایک دوسرے کے شدید مخالف نظر آتے‘ اپنی اپنی بیویوں کے عقیدوں سے متاثر ہو کر وہ ایک دوسرے کو زک پہنچانے کی کوشش کرتے۔ اس طرح اختلافِ رائے نے نفرت اور بغض کی شکل اختیار کر لی تھی۔

ان تمام حالات نے ایوب بن حبیب کا صبر وقرار لوٹ لیا تھا۔ وہ عجیب وغریب حالات کا شکار تھا مثلاً موسیٰ بن نصیر کا انجام‘ اندلس کے مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت‘ اسلامی اصولوں کی پامالی اور خانہ جنگی وبغاوت کے آثار‘ مستزاد یہ کہ امیر عبدالعزیز بن موسیٰ سے ملاقات میں رکاوٹیں۔ انجیلونہ ہر دم اس کے ساتھ رہتی اور دربار میں خوشامدیوں کا جمگھٹا نظر آتا۔

ایک دن بڑی ہی کاوش کے بعد ایوب بن حبیب کو عبدالعزیز سے ملاقات کرنے کا موقع مل ہی گیا۔ اس دن صبح کے وقت انجیلونہ اپنی عبادت گاہ میں مصروف تھی اور امیرِ اندلس اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اچانک ایوب بن حبیب وہاں پہنچا اور بولا۔ ”محترم‘ کیا میں اندر آسکتا ہوں؟“ عبدالعزیز نے چونک کر اسے دیکھا اور باریابی کی اجازت دی۔ وہ اندر جا کر بلاتمہید بولا۔ ”میں اس اندازِ تخاطب پر معافی کا خواستگار ہوں مگر صرف یہ کہنے کے لیے حاضر ہوا ہوں کہ فرماں روائے اندلس غلط راہ پر جا رہے ہیں۔“

”ہم تمہاری بات نہیں سمجھے ایوب‘ وضاحت کرو۔“ عبدالعزیز بن موسیٰ نے کہا۔

”آپ نے ہر شہر اور ہر علاقے میں مسیحی ناظم مقرر کیے ہیں۔ یہ بات باعثِ خیر نہیں ہے۔ اس سے آپ کے مسلمان عرب ساتھی مایوس ہو رہے ہیں۔“ ایوب نے کہا۔

”ایوب......!“ عبدالعزیز نے صفائی سے کام لیا۔ ”ہم اپنی قوت بڑھانا چاہتے ہیں تاکہ دمشق کی حکومت کے شر سے محفوظ رہیں۔“

یہ سن کر ایوب بن حبیب نے بڑے ہی افسردہ انداز میں امیرِ اندلس کی جانب دیکھا اور کہا۔ ”امیرِ محترم‘ جن مسلمانوں نے میدانِ جنگ میں آپ کے والد کا اور آپ کا مسلسل ساتھ دیا ہے‘ کیا وہ آپ کی قوت نہیں ہیں؟ وہ آج بھی آپ کے خیرخواہ ہیں‘ دوست ہیں۔ سچ بتایئے کہ ان تمام مسلمانوں کا حق ان مسیحیوں سے زیادہ نہیں ہے جو کل تک اسلحہ لگا لگا کر میدان میں آتے اور آپ کو زیر کرنا چاہتے تھے۔ اگر آپ ان کے قابو میں آجاتے تو کیا آپ امیرِ اندلس ہوتے؟ جن مسلمانوں کی قوت کی بدولت آپ اندلس کے امیر ہیں‘ ان پر آپ نے ان نصرانیوں کو مقرر کر دیا ہے۔ یاد رکھیے کہ یہ لوگ صرف اس لیے ہیں کہ آپ امیر ہیں مگر آپ نہیں جانتے کیوں کہ آپ کو بیرونی بغاوت نہیں‘ اندرونی سازش تباہ کر رہی ہے۔ میں یہ کہنے کے لیے معافی چاہوں گا کہ حسن کے مشوروں پر کان دھرنے والے اچھے حکمران نہیں ہوتے۔“

ایوب بن حبیب نے وہ بات کہہ دی تھی کہ امیر اگر چاہتا تو بدترین سزا بھی دے سکتا تھا مگر اس وقت اس کی جبیں پر تفکرات کی شکنیں تھیں۔ وہ اس پرندے کی مانند تھا جو شکاری کے جال میں پھنس گیا ہو۔ اس نے بے چارگی سے کہا۔ ”ایوب‘ خدا کی قسم‘ ہم آج بھی مسلمانوں کے خیرخواہ ہیں لیکن اپنے مستقبل سے خائف ہو کر یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ اب تم ہمیں مشورہ دو کہ ہم کیا کریں؟“

ایوب بن حبیب نے چند لمحے غور کیا پھر بولا۔ ”امیرِ اندلس کے لیے میرا مشورہ صرف اتنا ہی ہے کہ آپ فوری طور پر خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کو اپنی اطاعت کا یقین دلائیں اور ذہن سے یہ بات فراموش کر دیں کہ وہ آپ کے باپ سے خفا ہیں۔ اگر خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کو آپ سے کوئی دشمنی ہوتی تو وہ مطلق العنان ہیں‘ آپ کو اندلس کی امارت سے معزول بھی کر سکتے تھے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے خدشات بے بنیاد ہیں۔ آپ انہیں اپنی اطاعت کا یقین دلائیں‘ میں یہاں کے برگشتہ مسلمانوں کے دلوں سے کدورت صاف کر دوں گا مگر خدارا‘ آپ خود بھی ان سے خطاب کیجیے اور ہر روز ملاقات کا وقت دیجیے۔“

یہ بات سن کر عبدالعزیز بن موسیٰ نے اطمینان کا

سانس لیا۔ بڑے عرصے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ تردد کے بادل چھٹ گئے۔ اس نے مسکرا کر ایوب بن حبیب کو دیکھا اور بولا۔ ''ایوب' تم واقعی میرے بہترین دوست ہو۔ اچھا اب تمام باتوں کو عملی جامہ پہناؤ اور صدر نشینی کے موقع پر دمشق کے خلیفہ کے لیے تحائف اور ہماری جانب سے امیر المؤمنین کی خدمت میں ایک مکتوب روانہ کرو جس میں ہماری طرف سے وفاداری اور اطاعت کا یقین دلایا گیا ہو۔'' ابھی گفتگو اسی قدر ہوئی تھی کہ انجیلونہ کی آمد نے موضوع بدل دیا اور چند منٹ رسمی گفتگو کرنے کے بعد ایوب بن حبیب رخصت ہوگیا۔

یہی زمانہ تھا جب پہلی مرتبہ اندلس کے امیر عبدالعزیز بن موسیٰ کی جانب سے دمشق کے خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کی خدمت میں قیمتی پارچہ جات اور بے شمار ہیرے جواہرات بطورِ تحفہ روانہ کیے گئے۔ اس کے ساتھ ہی وہ خط بھی تھا جس میں امیرِ اندلس نے اپنی اطاعت کا یقین دلایا تھا۔ اس وفد کو روانہ کرنے کے بعد ایوب بن حبیب نے اپنی تمام مقررانہ صلاحیتیں اندلس کے مسلمانوں کے لیے وقف کردیں۔ اس کی تقریر نے بہت حد تک مسلمانوں کو متحد بھی کردیا تھا مگر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اندلس کے امیر کو قعرِ مذلت میں دھکیل دیا۔ اس وقت ایوب بن حبیب کی ہر مخلصانہ کوشش بے کار گئی۔ اندلس کے مذہب دوست حکمران دیکھتے ہی رہ گئے اور یہ مسیحی بیوی کا حسن پرست شوہر ہمیشہ کے لیے معتوب ہوگیا۔

ایک دن ملکہ نے اپنے مخصوص اور چاہنے والے انداز میں کہا۔ ''امیرِ اندلس' آپ کو معلوم ہے کہ اندلس میں قدیم رواج کے مطابق رعایا' شہنشاہ کو جھک کر سلام کرتی ہے؟''

امیر عبدالعزیز بن موسیٰ چونک پڑا۔ اسے محسوس ہوا کہ ملکہ کے اس فقرے کے پیچھے بہت بڑی سازش پوشیدہ ہے۔ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ وہ خوف زدہ ہوگیا۔ اس نے اپنے جذبات پر قابو پایا اور لاچاری سے بولا۔ ''امِ عاصم! ہم اندلس کے ہر رواج سے واقف ہیں مگر یہ مت بھولو کہ تمہارا شوہر مسلمان ہے اور مسلمانوں میں جھک کر سلام کرنا جائز نہیں ہے۔''

''لیکن آپ اس ملک کے امیر ہیں جہاں مسلمانوں کی نہیں' نصاریٰ کی اکثریت ہے۔'' انجیلونہ نے جواب دیا۔

اس دن امیر عبدالعزیز نے پوری قوت سے اس طوفان کو روکنا چاہا مگر انجیلونہ کی دلیلوں کے سامنے سب کوششیں بے کار گئیں۔ اس ملکہ نے کبھی زبان سے قائل کرنا چاہا' کبھی اشک بہائے' کبھی بے پناہ حسن کے نت نئے انداز سے اسے منانا چاہا' یہاں تک کہ چند دن اسی بحث کی نذر ہوگئے۔ امیر عبدالعزیز نے ہار کر ایک دن حکم جاری کیا۔ ''نصاریٰ' اندلس حسبِ رواجِ قدیم' امیر کے لیے زمین بوس ہوکر کورنش بجا لائیں......'' عیسائیوں نے اس حکم کی تعمیل بلاتردد کی مگر اس نئی رسم نے مسلمانوں میں آگ لگا دی۔ اس آگ کو ایوب بن حبیب بھی ٹھنڈا نہ کرسکا۔ چند دن اسی ہنگامے کی نذر ہوگئے۔ مسیحی سردار دربار میں جا جا کر امیر عبدالعزیز اور ملکہ کو سجدہ کرتے مگر مسلمان ''اَلسلامُ علیکم!'' کہتے۔ شاید کچھ دن میں معاملہ ٹھنڈا ہو جاتا مگر ملکہ کو ایک نئی ضد لگ گئی' اس نے کہا۔

''امیرِ اندلس' رعایا میں شامل نصرانی تو آپ کو سجدہ کرتے ہیں مگر مسلمان صرف سَلام کرتے ہیں۔ یہ فرق بڑا ناپسندیدہ ہے۔''

''امِ عاصم......'' عبدالعزیز نے بڑے دکھ سے کہا۔ ''سمجھنے کی کوشش کرو' مسلمانوں میں خدا کے سوا کسی کے سامنے جھکنا شرک ہے۔ اگر ہم ایسا کرنے کا حکم دیں گے تو بغاوت ہوجائے گی۔''

''بغاوت اس لیے ہوگی کہ آپ کمزور ہیں۔'' انجیلونہ نے طنز کیا۔ ''جہاں تک جھکنے کا تعلق ہے' مسلمان اختیاری نہیں' غیر اختیاری تو جھکیں گے۔''

''کیا مطلب؟'' امیر عبدالعزیز کچھ نہ سمجھا۔

''مطلب یہ کہ دیوان خانے میں اتنی چھوٹی کھڑکی بنوایئے جس سے گزر کر اندر آنے والے مسلمانوں کو سجدے کے انداز میں جھکنا پڑے اور وہ اس کے درمیان سے ہوکر امیرِ اندلس کی خدمت میں

حاضر ہوں۔ ایسے میں وہ لامحالہ امیر کے سامنے جھک کر آئیں گے۔"

اس ترکیب پر عبدالعزیز بن موسیٰ جیسے سُن ہوگیا۔ یہ عورت غیر معمولی ذہن رکھتی تھی مگر قبل اس کے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا' اس بات کو رد کرتا' انجیلونہ امیر کے قریب آئی اور بولی۔ "ہمارے خیال میں آپ قابلِ تعظیم ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہر فرد آپ کی تعظیم کرے۔"

عبدالعزیز بن موسیٰ نے بارگاہ حسن میں ایک بار پھر ہتھیار ڈال دیئے۔ سردارانِ عرب کی آمد کے لیے دیوانِ خاص میں ایک اتنی نیچی کھڑکی بنوائی گئی کہ امیرِ اندلس کے لیے روبرو آنے کے لیے ہر مسلمان کو سر جھکانا اور گھٹنوں کے بل گھسٹنا پڑتا' یوں مسلمانوں کے جذبات مجروح ہونے لگے۔ ان میں وہ عرب بھی تھے جنہوں نے صحابہٴ کرامؓ کی محفلیں دیکھی تھیں۔ آج امیرِ اندلس کے روبرو سجدے کے انداز میں حاضر ہوتے تو دیکھنے والے چیخ پڑتے۔

عبدالعزیز بن موسیٰ کے خلاف نفرت پھیلتی گئی پھر یہ نفرت اس قدر شدت اختیار کرگئی کہ اندلس کے مظلوم مسلمانوں نے خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کے حضور فریاد لے کر جانے کا فیصلہ کرلیا۔

ایک صبح امیر عبدالعزیز بن موسیٰ ایوانِ شاہی کے باغ میں خانقاہ کے باہر کھڑا ملکہ انجیلونہ کی عبادت سے واپسی کا انتظار کررہا تھا۔ وہ حسبِ معمول توبہ واستغفار کے بعد اپنے راہب سے درس سن رہی تھی۔ اس وقت چند بڑے عہدے دار ننگی تلواریں ہاتھوں میں لیے باغ میں داخل ہوئے۔ امیرِ اندلس نے حیران ہوکر دیکھا تو کسی مسلمان عہدے دار نے دکھ سے کہا۔

"امیر...... ہماری نیت پر شک نہ کیجیے' ہم آج بھی اسلام کے' مسلمانانِ اندلس کے اور آپ کے خیر خواہ ہیں لیکن یہ دربارِ خلافت کا حکم ہے۔" امیر عبدالعزیز بن موسیٰ معاملے کو سمجھ گیا' شاید وہ اس وقت فرار کا راستہ ڈھونڈ رہا تھا۔ جنرل حبیب الفہدی نے کہا۔ "امیر فرار کی کوششیں بے سود ہیں۔ شاہی ایوان کا مکمل طور پر محاصرہ کیا جاچکا ہے۔ ہم خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کے حکم پر مجبور ہیں۔"

یہ سنتے ہی امیرِ اندلس عبدالعزیز بن موسیٰ زمین پر گر پڑا اور نوجوان سپاہیوں کی ٹولی اسے گھسیٹتی ہوئی اشبیلیہ کے چوراہے پر لے گئی۔

ایوب بن حبیب نے اس منظر کو بڑے دکھ سے دیکھا۔ اس وقت بہت سے مسلمان خانقاہ میں گھس گئے اور ملکہ انجیلونہ کو بالکل اسی انداز سے گھسیٹتے ہوئے اس چوراہے پر لے گئے جہاں امیر اندلس کا سرتن سے جدا کیا جاچکا تھا۔ ایوب بن حبیب نے ملکہ کو دیکھا اور تلخ لہجے میں بولا۔ "امیر عبدالعزیز عمر بھر ساتھ دیتے رہے' آج یہ اس حالت میں ان کا ساتھ دے گی۔" پھر ملکہ چلاتی رہی مگر اس کا سر بھی تن سے جدا کردیا گیا۔

اس وقت لوگ ایک دوسرے کو بتارہے تھے کہ دربارِ خلافت سے دو حکم جاری کیے گئے تھے' اول یہ کہ امیرِ اندلس عبدالعزیز بن موسیٰ کو قتل کردو اور اس کا سر دربارِ خلافت میں بھیج دو' دوسرا حکم یہ تھا کہ اندلس میں اپنی مرضی سے امیر مقرر کردو۔"

اس وقت کسی دانا نے کہا۔ "حسب پرست عبدالعزیز بن موسیٰ کو برائی سے روکنے اور مسلمانوں کی خوشحالی کی سب سے زیادہ کاوشیں ایوب بن حبیب نے کی ہیں لہٰذا وہی امارت کا مستحق بھی ہے۔" اُس وقت ایوب بن حبیب' خداوندِ عالم کے اِس حکم کی زیرِ لب تلاوت کرتے ہوئے اپنے ایمان اور یقین کو مستحکم محسوس کرکے عبدالعزیز بن موسیٰ بن نصیر کو عبرت کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"اے ایمان والو! مشرک عورتوں سے جب تک وہ ایمان نہ لائیں' نکاح مت کرنا کیوں کہ مشرک عورت خواہ تم کو کیسی بھی بھلی لگے' اس سے مومن لونڈی بہتر ہے اور مشرک مرد جب تک وہ ایمان نہ لائیں' مومن عورتوں کو ان کی زوجیت میں مت دینا کیوں کہ مشرک مرد سے خواہ وہ تم کو کیسا ہی بھلا لگے' مومن غلام بہتر ہے۔ یہ مشرک تم لوگوں کو دوزخ کی طرف بلاتے ہیں۔" (البقرہ آیت نمبر ۲۲۱)

☆☆......☆☆

حج بیت اللہ سے جڑی ایمان تازہ اور روح کو شاد کرنے والی رُوداد

کُھلا ہے بابِ رحمت

محمد ارشد فرہاد کا خیال

ذکر اُس رب کا جو زباں پہ آتا ہے
دل میرا اُس سے ہی سکون پاتا ہے

سیمیں غزالہ نہاں

وہ دربار سچ مچ میرے سامنے تھا
تصور تھا جس کا ابھی تک خیالی......
کعبہ پر پڑی جب پہلی نظر
کیا چیز ہے دنیا بھول گیا

وہ تمام حمد اور نعتیں زبان پر بے اختیار جاری تھیں۔ میں بچپن ہی سے نعتیں پڑھتی تھی...... اس تصور سے کہ ایک دن ضرور مکہ مدینہ جاؤں گی۔ اور وہ خواہش وہ تمنا اب پوری ہوگئی تھی۔

دل کی عجب کیفیت
جذبات کا عجب عالم
میں سچ مچ ...... اس دربار عالی کے سامنے تھی...... جو سب کا خالق سب کا مالک ہے۔
دل سے اللھم لبیک کی پکار
زبان پر اس کی وحدانیت کا اقرار
سر اُس کے آگے جھکا ہوا
نظریں شرمسار
پاؤں میں کپکپاہٹ
لب پر لبیک کی صدائیں اور دل سے شکر کے کلمات......

''اے مالک...... اے خالق...... اے پاک پروردگار تیرا شکر ہے تیرا کرم ہے تیرا فضل ہے...... تو نے اپنے گھر کی زیارت کے لیے بلایا...... اپنے حبیب ﷺ کا روضہ دکھایا۔''

''نہ میرے اعمال نہ میرے وسائل' پھر بھی تو نے مجھ پر اپنا کرم کیا۔ پہلے تو مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں اس پاک پروردگار کے گھر کے سامنے کھڑی ہوں' آنسوؤں سے نظریں دھندلا رہی تھیں مگر اُس کا نور اُس کی رحمت آنکھوں میں سما کے دل میں اتر رہی تھی' اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرتے ہوئے اپنے اعمال پر شرمسار تھی۔ پھر بھی اُس کی رحمت اور ستر ماؤں سے زیادہ محبت کے وسیلے سے دوزخ سے پناہ مانگ رہی تھی اور جنت طلب کر رہی تھی۔

اُس کے گھر کا دیوانہ وار طواف کر کے اپنی روح کو بندگی سکھا رہی تھی۔ دل سے ایک صدا نکل رہی تھی۔

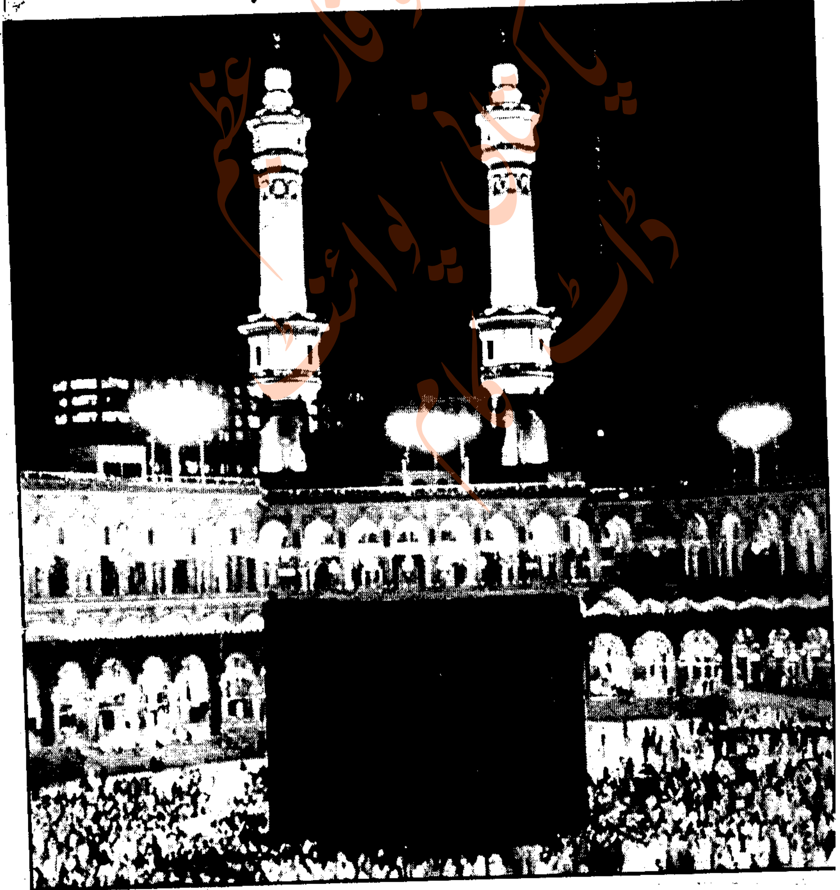
''اے اللہ میں حاضر ہوں۔''

جمعہ 7 مارچ 2014ء کا سورج میرے لیے بڑی خوش بختی اور خوشیوں کے پیغام لے کر طلوع ہوا۔ میری زندگی میں بڑے نشیب و فراز آئے۔ لیکن مجھے کبھی شکوہ نہ ہوا۔ ہر دکھ پریشانی کو میں نے اپنی

آزمائش اور اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی سزا سمجھ کر قبول کیا۔ کبھی شکوہ یا گلہ نہ کیا۔ نہ میں نے کبھی اپنی اوقات سے بڑھ کر کچھ طلب کیا۔ مگر ایک خواہش' ایک تمنا' اور ایک طلب مجھے بچپن ہی سے دل میں رہی' اور یہ یقین بھی رہا کہ وہ پاک پروردگار' جو رحمن ہے رحیم ہے ستار ہے غفار ہے جو اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ میرے گناہوں کا پردہ بھی رکھے گا۔ میری بخشش بھی کرے گا اور میری اولین خواہش اور طلب کو بھی پورا کرے گا۔ جس کے خواب میں بچپن سے دیکھتی آئی تھی۔

مجھے بچپن ہی سے مکہ مدینہ جانے کی خواہش رہی اس وقت مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ عمرہ کس کو کہتے ہیں اور حج کیسے کرتے ہیں؟ بس اتنا جانتی تھی کہ حج کے لیے مکہ کا سفر پانی کے جہاز سے ہوتا ہے۔ اور پانی سے میں بہت ڈرتی تھی اس لیے مکہ مدینہ کا خواب ہی دیکھتی رہی۔

ہماری رہائش اندرون سندھ کے ایک پس ماندہ سے گاؤں میں تھی۔ ابا ایک درمیانہ درجے کے زمیندار تھے اور ان کی زمینیں اندرون سندھ میں تھیں۔ میرا بچپن وہیں گذرا (بعد میں جب اسکول کی پڑھائی کا وقت آیا تو لاڑکانہ شہر منتقل ہوگئے) وہاں نہ کوئی پکنک پوائنٹ تھا نہ ریڈیو' ٹیلی ویژن اس وقت آیا ہی نہیں تھا۔ ہمارا سارا وقت گھر میں گزرتا تھا۔ بہت دینی اور ادبی ماحول ملا۔ ہمارے بزرگ ہم



بچوں کو مذہبی اطوار...... احادیث اور قرآن کے احکام کے مطابق اسی کے حوالے سے سکھاتے...... ہمیں دین کی باتیں...... اصحابہ کرام‘ ازواجِ مطہرات اور اہلِ بیت کے قصے سنا سنا کر ہمارا ایمان مضبوط کرتے۔ شہیدان کربلا کے ایمان افروز قصے سناتے۔

ہمیں حقوق العباد...... حقوق اللہ اور اپنے حقوق فرائض کے بارے میں بتاتے...... اسلام کی بنیادی باتیں ہمیں ہر وقت بتائی جاتیں۔

یوں مجھے بچپن ہی سے حج کرنے کی خواہش رہی‘ مگر بانی کے خوف سے صرف تصور میں مکہ مدینہ رہا۔ میں ابھی پوری طرح شعور کی منزل پر بھی نہ پہنچی تھی کہ شادی ہوگئی۔ صرف چودہ سال کی عمر تھی۔ میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ پڑھائی سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ مگر میری ساس بستر پر پڑی تھیں۔ گھر سنبھالنے کے لیے بہو چاہیے تھی۔ میں گھر بھر کی لاڈلی...... بلکہ لاڈ میں بگڑی ہوئی‘ مذہبی رجحان رکھنے کے باوجود خودسر‘ نہ گھر داری کا سلیقہ نہ سسرال میں رہنے کا طریقہ...... پھر بھی گھر سنبھالنے کے لیے...... مجھ جیسی بیوقوف اناڑی اور کم عمر لڑکی کا انتخاب کیا گیا۔

دراصل گھر سے زیادہ ’گھر والے‘ کو سنبھالنے والی کی ضرورت تھی۔ کیونکہ وہ بھی اکلوتے ہونے کی وجہ سے لاڈ میں بگڑے نواب تھے۔

میں مذہب کی دیوانی ...... وہ مذہب سے بیگانہ...... اُن کے نزدیک عورت کی عبادت صرف اور صرف مجازی خدا کی بندگی اور میرے خوابوں میں مکہ...... مدینہ...... ٹکراؤ تو ہونا ہی تھا۔

’’تم خود کو کیا سمجھتی ہو؟‘‘

’’تم کیا بی بی مریم ہو؟‘‘

’’رابعہ بصری...... بننا چاہتی ہو؟‘‘

ایسے سوالات کا ہر دم سامنا...... اور سسرال والوں کا یہ کہنا......

’’میاں کی ہر بات مانو۔‘‘

اُن کو اپنے یوسف ثانی ہونے کا زعم...... اور مجھے زلیخا بنانے کی ضد...... اور میں جو بچپن ہی سے سارے اسلاف کے کارنامے پڑھی ہوئی...... مسلم خواتین کے کردار سے متاثر ہونے کے باوجود...... اپنا آپ منوانے کا عزم بھی رکھتی تھی‘ ہر بات کا جواب قرآن وحدیث کی روشنی میں دلائل سے دیتی تھی۔ اور اُن کو صرف دو ہی حدیث یاد......

ایک چار شادی والی...... دوسری اگر شرک نہ ہوتا تو شوہر کو سجدہ کرنے کا حکم بیوی کو ملتا۔ اور میں چار شادی کی اجازت کی وجوہ پر بحث کرتی اور شوہر کی بندگی کن کن حالات میں جائز ہے وہ بتاتی...... اس کے بعد مجھے یہ جواب ملتا۔

’’خود کو بڑی عالمہ سمجھتی ہو...... بحث کرتی ہو وہ بھی شوہر سے...... جو تمہارا مجازی خدا ہے۔ بڑی ستی ساوتری بنتی ہو...... کعبہ...... کس منہ سے جاؤ گی۔‘‘

اور میں اندر ہی اندر شرمسار رہنے لگی۔ شاید وہ صحیح کہتے ہوں...... میں بھی اُن سے بے حد اُلجھتی ہوں...... مگر کم عمری اور کم عقلی میں کچھ آگے نہیں سوجھتا۔

حالانکہ انہوں نے مجھے شادی کے بعد بھی تعلیم جاری رکھنے کی اجازت دی ہوئی تھی۔ میں آگے پڑھ رہی تھی۔ مگر بیوقوف اتنی تھی کہ اپنے علم کو اُن سے بحث کرنے میں استعمال کر رہی تھی۔ وہ بھی کم نہیں تھے میرے دلائل کے جواب میں کہتے۔

’’لفظ سیکھ کر زعم کرتی ہو...... بڑی قابل بنتی ہو...... میری خدمت کرو تو جنت ملے گی...... چھوڑو مکے مدینے کا خواب شوہر کو خوش رکھو دنیا و آخرت کی بھلائی ملے گی۔ حج سے بڑا فرض شوہر کا حکم ماننا ہے۔‘‘

خیر میں خودسر ہونے کے باوجود شوہر کی حکم عدولی تو نہ کرتی تھی۔ مگر میں یہ چاہتی تھی کہ میری طرح اُن کو بھی حج اور عمرہ کی خواہش ہو۔ پھر میری خواہش میرا جنون خوابوں میں ڈھلنے لگا۔

سب سے پہلا خواب اس وقت دیکھا۔ جب پہلی بچی گود میں آگئی تھی۔ بچی رو رہی تھی اُسے چپ کراتے ذرا سی آنکھ لگ گئی۔ اس وقت پہلی دفعہ میں نے مسجد نبوی ﷺ کا دیدار خواب میں کیا۔ فوراً آنکھ کھل گئی۔ اور میں یہ ہی سوچتی رہی کہ کہاں میں اور کہاں نبی ﷺ کی مسجد...... مگر مجھے خوشی بھی بہت ہوئی

میں نے انہیں بتایا کہ مجھے مسجد نبوی ﷺ کی زیارت ہوئی ہے۔ اور ان کا پھر یہ ہی جواب......

"ارے میری اطاعت کرو...... جنت ملے گی...... مکہ مدینہ جا کر کیا کرو گی؟" اور میں خود سے شرمسار رہنے لگی...... کیا پتہ...... میرے اعمال ایسے نہ ہوں کہ میں اللہ کے گھر کی زیارت کر سکوں...... اس لیے اپنے اس اولین خواہش یا تمنا کی تکمیل کی فرمائش اُن سے نہیں کی۔ ویسے بھی مجھے کچھ مانگنے کی عادت نہیں تھی' اور میری یہ ہی عبادت اُن کو پسند بھی تھی کہ میں بیویوں والی کوئی فرمائش نہیں کرتی۔

دن یونہی گزرتے رہے...... بچے بڑے ہو گئے...... میرے خوابوں کا سلسلہ اور بڑھ گیا اور دعاؤں میں شدت آ گئی۔

"یا اللہ مجھ گناہ گار کو بھی اپنا گھر دکھا دے۔"

کبھی دیکھتی...... عمرہ کے لیے جا رہی ہوں...... اور میرا پاسپورٹ گم ہو گیا ہے...... کبھی مجھے سواری نہیں مل رہی ہے...... اور آنکھ کھل جاتی۔ پھر ایک دفعہ یہ دیکھا کہ میں عمرہ کے لیے جا رہی ہوں' اس دفعہ بیٹے کا پاسپورٹ نہیں مل رہا ہے' اور میرے شوہر ناراض ہو کر چلے گئے کہ تم دیر کر رہی ہو...... اور یہ خواب سچ ثابت ہوا۔

☆......☆......☆

"تم عمرہ پر چلی جاؤ......" ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا۔ میں نے بے یقینی سے اُن کی طرف دیکھا۔

"ہاں...... بھئی۔"

"واقعی......؟" میں مارے خوشی اور حیرت کے اچھل پڑی۔

"کب چلیں گے؟"

"تم چلی جاؤ...... میں پھر کبھی جاؤں گا۔"

"میں اکیلی محرم کے بغیر کیسے جاؤں؟"

"اکیلی کیوں؟ احد کے ساتھ چلی جاؤ۔" (احد چھوٹے بیٹے کا نام ہے)

"آپ کیوں نہیں؟"

"ارے بھئی تم دونوں چلے جاؤ...... تمہیں زیادہ شوق ہے۔" انہوں نے ہنس کر کہا۔ اُس دن میں سمجھی اُن کے طعنوں تشنوں اور ستانے کے انداز میں دراصل اُن کی محبت چھپی ہوئی تھی۔ اور میں اُسی دن پاسپورٹ بنوانے چل دی۔ اور ارجنٹ بنانے کو دیا۔

جب پاسپورٹ بنوانے جا رہی تھی تو ایک عجیب خوشی اور سرشاری کا عالم تھا۔ لب پر درود تھے اور دل میں یقین تھا کہ...... جا رہی ہوں۔

جب پاسپورٹ بن کے آیا تو میرا تو صحیح تھا مگر بیٹے کے پاسپورٹ میں اس کے والد کا نام غلط ہو گیا تھا۔ دوبارہ بننے کے لیے دیا۔ رمضان کی آمد تھی۔ جاننے والوں اور رشتہ داروں نے ڈرانا شروع کر دیا۔

"رمضان میں بہت رش ہوتا ہے...... پہلی دفعہ جا رہی ہو...... بچہ پریشان ہو جائے گا۔ اس سے اچھا ہے حج کے لیے چلی جاؤ...... حج تو فرض ہے۔"

بہرحال جب پاسپورٹ بن کر آیا تو رمضان کا مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ رمضان کا پیکیج بھی بڑھ گیا تھا۔ میرا بجٹ بھی آؤٹ ہو گیا۔ بکنگ میں بھی مشکل ہو رہی تھی۔ اسی کشمکش میں چاندرات آ گئی۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ میرے جانے میں رکاوٹ کیوں آ رہی تھی۔ بیٹے کا پاسپورٹ غلط ہونا...... بکنگ کی مشکل...... پیسوں کا بڑھ جانا...... یہ سب اللہ کی مصلحت تھی اور اُس کی نشاندہی بھی خواب کے ذریعے ہو گئی تھی۔

چاندرات کو میرے شوہر اچانک گر گئے' دماغ میں چوٹ لگی۔ ایمرجنسی میں آپریشن ہوا...... مگر چھ دن تک بے ہوشی کی حالت میں رہنے کے بعد اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئے۔

بڑا بیٹا بیرون ملک تھا۔ بیٹیاں اپنے گھر کی ہو گئی تھیں' اگر میں چلی جاتی اور میری غیر موجودگی میں اُن کو حادثہ پیش آ جاتا تو کون دیکھتا...... میرے نا جانے میں بہتری تھی۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے۔

پھر عدت کی مدت...... قانونی اور دفتری کارروائیاں پنشن کا مسئلہ...... تین سال گزر گئے...... میرا خواب سچ ثابت ہوا کہ بیٹے کے پاسپورٹ کے

مسئلے کی وجہ سے خواب میں بھی نہ جا سکی تھی۔ دل میں لگن اب بھی تھی۔

''نیت اچھی ہو...... لگن سچی ہو تو خواہش ضرور پوری ہوتی ہے۔''

☆......☆......☆

''امی آپ اور احد عمرہ کر لیں...... جرمنی سے آئے ہوئے بیٹے نے میرے ہاتھ میں یورو تھماتے ہوئے کہا تھا۔

''واقعی......'' میں خوشی سے سرشار ہوتی ہوئی بولی تھی۔

''بالکل......'' بیٹے نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ اور میں نے اسی دن اپلائی کر دیا۔ جس کے نتیجے میں 7 مارچ کو فلائٹ کنفرم ہوئی تھی۔

''میں ابھی تک اس سحر سے نہیں نکلی ہوں۔ وہاں کی فضائیں......''

وہاں کی اذانیں...... وہاں کی عبادت...... اور وہاں کے دن رات عجب پُر کیف سماں تھا۔

ایک نماز کا ایک لاکھ ثواب...... ایک نیکی پر لاکھوں اجر...... جو مجھے وہاں پہنچانے کا وسیلہ بنے اُن کے لیے دل سے ڈھیروں دعائیں کی تھیں۔

سنتے آئے تھے کہ خانہ کعبہ پر پہلی نظر پڑتے ہی جو دعا مانگی جائے...... وہ قبول ہوتی ہے...... اپنے گناہوں کی بخشش کے ساتھ حج کی سعادت حاصل کرنے کی دعا بھی مانگ لی۔

اور بالک ہٹ کی طرح تھوڑا سا لاڈ بھی کیا۔

''اے پروردگار...... اس سال حج کی سعادت بھی عطا فرما' اور وسائل بھی تو ہی مہیا کرے گا۔ تُو تو دلوں کا حال جانتا ہے۔''

اور میرے اللہ نے میری یہ دعا بھی قبول فرمالی۔ عمرہ کرنے کے صرف چھ مہینے بعد مجھے حج پر بھی بلالیا۔ نہ صرف مجھے بلکہ میں نے جس جس کے لیے دعا کی تھی۔ شکر الحمدللہ کہ اُن سب کو حج کی سعادت نصیب ہوئی اور ہو رہی ہے۔

☆......☆......☆

جب کعبہ پر پہلی نظر پڑی تو جہاں کعبہ کا جلال دل پر لرزہ طاری کر رہا تھا تو وہیں پیارے اللہ کی رحمت کا بھی خیال آ رہا تھا...... کہ وہ رحمٰن ہے رحیم ہے...... کریم ہے...... اپنے بندوں سے محبت کرنے والا ہے۔ وہ کہتا ہے مجھ سے مانگو میں دوں گا مجھے پکارو میں سنوں گا...... اس کے فرمان کے مطابق اس کے آگے ہاتھ اور دامن پھیلائے رکھا تھا۔

مکہ اور مدینہ بہت ترقی کر گیا ہے' اونچی اونچی فلک شگاف عمارتیں...... خوبصورت اور مہنگے سامان سے سجے سجائے مالز...... فاسٹ فوڈز سے بھری دکانیں...... خوبصورت آرام دہ...... سبک رفتار گاڑیاں...... غرض کہ جدید دور کی جدید سہولتوں سے بھرا مکہ دنیا کی ترقی یافتہ شہروں کا مقابلہ کر سکتا ہے...... مگر پتہ نہیں کیوں میری یہ شدید خواہش رہی کہ کاش میں مکہ اور مدینہ کو اسی دور کا دیکھتی جب پیارے نبی ﷺ وہاں رہتے تھے...... وہی کچی گلیاں وہی حجرے ہوتے...... جہاں جہاں میرے نبی ﷺ نے قدم رکھا تھا وہاں کی خاک چومتی......

جہاں میرے آقا ﷺ کے نقش قدم ہیں
میں پلکوں سے چن لوں وہ خاک مدینہ

مسجد نبوی ﷺ کا پُر کیف سماں ابھی تک نظروں میں سمایا ہوا تھا۔ ریاض جنہ میں نفل پڑھنے کی سعادت ملی...... تو خیال آیا میرا اللہ کتنا مہربان ہے ہمیں دنیا میں جنت کے ٹکڑے پر سجدہ کرنے کی توفیق عطا کر کے ہمیں جنت کا حقدار بنا دیا...... دنیا کی ہر خوبصورت جگہ سے بڑھ کر حضور ﷺ کی جالیوں کے سامنے درود پڑھ کر سعادت حاصل کرنے کی توفیق عطا کی۔ وہاں پر جو دعائیں مانگی سب قبول ہوئیں...... کئی خواب سچے ثابت ہوئے۔

یا اللہ ہر مسلمان کو زندگی میں ایک دفعہ اپنے گھر کی زیارت کروا دے...... اپنے حبیب ﷺ کا روضہ دکھا دے (آمین) وہ جگہ جہاں سب کے لیے باب رحمت کھلا ہے۔ سب کو اُس در سے رحمتیں سمیٹنے کا موقع عطا کر...... (آمین) اب بھی میرے لب پر یہ ہی دعا ہے۔

☆☆......☆☆

ماہِ حج کے حوالے سے دوسری خصوصی تحریر

گلزارِ ابراہیمی

صفیہ سلطانہ کا خیال

تیرے کرم کا کیسے کریں ذکر ہم یہاں
ہم سے گناہ گار کو لفظوں سے مات ہے

تسنیم منیر علوی

صبح سے بہت حبس تھا آسمان بادلوں سے بھرا ہوا تھا۔ کسی وقت بھی بارش برس سکتی تھی۔ ایسے میں مانو نے آواز دی۔

''امی جلدی کام ختم کریں میں نے ٹی وی لاؤنج کا اے سی آن کر دیا ہے۔ آجائیں میں ٹی وی لگا رہا ہوں۔'' اور میں نے جلدی سے چولہا بند کیا اور ٹی وی لاؤنج کی طرف دوڑ لگائی تھی۔

دراصل جب سے ہم لوگوں کو حج کی سعادت نصیب ہوئی ہے ہر سال حج کے پروگرام ذوق و شوق سے دیکھنا شروع کر دیے ہیں کہ دل وہیں رہ گیا جان وہیں رہ گئی۔ آنکھوں میں وہ مناظر گھومنے لگتے ہیں اور جب مدینے کا مسافر کوئی جا پاتا ہوں' وہ پہنچا میں رہا جاتا ہوں کی صورت حال ہو جاتی۔ ارکان حج کا آغاز ہو چکا تھا۔ ٹی وی آن ہوا۔ مگر یہ کیا...... میری تو خوف سے چیخ نکل گئی۔ اتنا خوفناک حادثہ...... چیخ و پکار آہ و بکا...... کرین کا کوئی جان لیوا حادثہ ہو گیا تھا' جانے کتنے لاپتہ اور معلوم نہیں کتنے موت کا نوالہ بن گئے۔ لوگ بھاگ رہے ہیں' ایمبولینس کے سائرن شور مچا کر راستہ مانگ رہے ہیں ...... گورنمنٹ کی پوری مشینری حرکت میں آچکی ہے...... اور میں سالوں پہلے ماضی کے دریچے وا کیے عمر گزشتہ کی کتاب کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں۔

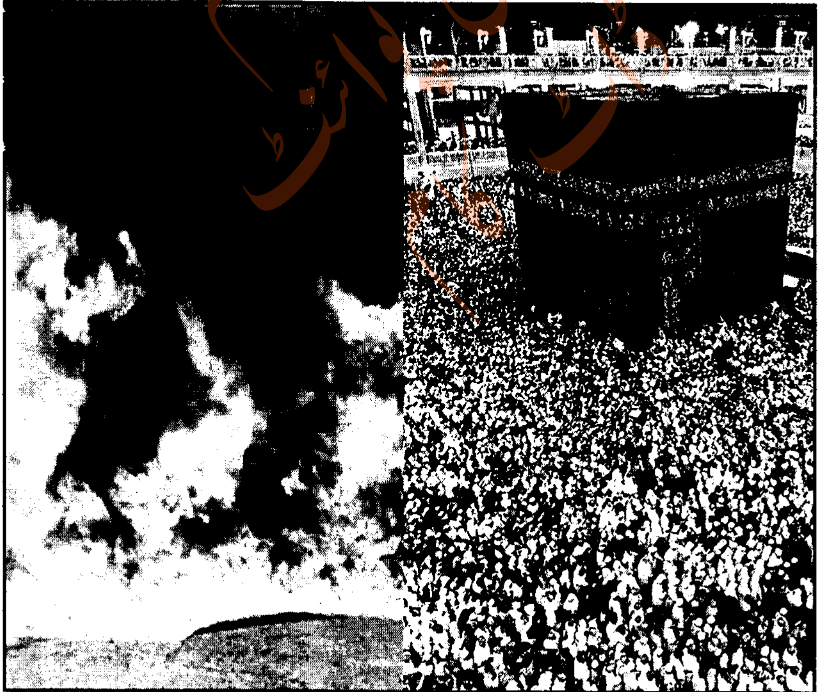
☆......☆......☆

ہم چار بھائی بہن شہر کے قدرے گنجان آباد علاقے میں رہائش پذیر تھے۔ ابا سرکاری ملازم تھے جو حال میں ریٹائرڈ ہوئے ہیں۔ چھوٹا سا گھر' مگر دل سب کے بڑے اور فراخ' اماں کفایت پسند اور ابا قناعت پسند بھائی ہمارا ایک ہی ہے اس کے لیے ابا پریشان رہتے کیونکہ اُس کا پڑھائی میں دل نہیں لگتا تھا۔ میں یعنی عفت (عفی) اپنے بہنوں میں دوسرے نمبر پر فائز ہوں۔ غازی بھائی مجھ سے بڑے ہیں' یہ ہمارے بے حد لاڈلے اور چہیتے بھائی ہیں آخر اکلوتے جو ہوئے' وہ بے شک مجھ سے عمر میں بڑے ہیں مگر سادگی اور بھولپن میں بالکل معصوم محلے میں بچوں کی لڑائی میں ہمیشہ پٹ کر آجاتے...... ایسے میں میں بہادری لڑنے پہنچ جاتی اور ایک آدھ کو دو ہاتھ جڑ کر واپس آتی یعنی میری محلے میں بڑی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ محاذ بھائی تیار کرتے مورچے پر میں موجود ہوتی' دکاندار کم پیسے دے کر بے وقوف بنا دیتا میں جا کر دو دو ہاتھ کر آتی...... اب تو میری چھوٹی بہنیں بھی مجھ سے ڈرنے لگی تھیں۔ بھائی ابا پر گئے تھے۔ ابا تو مانو ہمارے اللہ میاں کی گائے ایک دفعہ کا ذکر ہے

پھوپو کا گھر (دوسری منزل) بن رہا تھا۔
"بھائی آپ دو تین دن کے لیے آ جائیں۔ گھر میں کوئی مرد نہیں ہے چھت پڑ جائے تو چلے جایئے گا۔ آپ بس مزدوروں پر نگاہ رکھیں سامنے مصلا بچھا لیں آپ اللہ اللہ کریں، مزدور اپنا کام کریں۔" پھوپو نے ایسے رسانیت اور لجاجت سے اصرار کیا کہ ابا اُن کی التجا سے پسیج گئے۔

اب وہ تو سامنے جائے نماز پر عبادت میں مصروف، مزدور اوپر آ رہے ہیں جا رہے ہیں تیسرے دن ٹھیکیدار آیا۔
"باجی مشین آ گئی چھت پڑے گی، مگر مال تو ہے نہیں۔"
پھوپو یہ سن کر اپنے ہوش کھو بیٹھیں۔
"ارے بھائی جان آپ تو وہاں ہی بیٹھے تھے...... سیمنٹ کی بوریاں سیڑھی کے نیچے سے غائب ہو گئیں آپ کو علم ہی نہیں ہوا؟"
ابا تو مارے شرمندگی کے زمین میں گڑ گئے۔
"یا الٰہی یہ کیا ہو گیا بیوہ بہن کی کمائی یوں غائب ہو جائے۔" وہ پریشان ہو کر بولے۔

"ارے بہن! ہم کیا جانیں، وہ اپنا کام کر رہے تھے ہم اپنا، ہمیں کیا خبر کہ مال ہنا رہے ہیں کہ لگا رہے ہیں۔" سب سر پیٹ کر رہ گئے۔ اس واقعے سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ابا جب عبادت میں مصروف ہوتے تو آس پاس کی خبر نہ ہوتی۔ وہ نہایت پرہیز گار اور عبادت گزار آدمی تھے، سجدے میں گھنٹوں پڑے سسکتے رہتے اور پھر اس پر سادگی غازی بھائی ابا پر چلے گئے تھے۔ ہر ایک پر اندھا اعتماد، اماں سیدھی سادھی سی خاتون تھیں سارے گھر کا نظام میرے ناتواں کاندھوں پر تھا۔
ان دنوں غازی بھائی ملازمت کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے ایک دفتر سے دوسرے دفتر انٹرویو دیتے، سفارش کے بغیر کوئی کام بنتا نظر نہیں آ رہا تھا، ابا کا مسجد میں قیام لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ ہم بچیوں کا بوجھ اور بھائی کی ملازمت نے ابا کو نڈھال کر دیا تھا۔ کمزور اور ناتواں ہو گئے تھے ایک دن مسجد جاتے ہوئے راستے میں لڑکھڑا گئے۔ ایک فرشتہ صفت اجنبی راہ گیر نے سنبھالا اور گھر تک پہنچایا۔ ابا کی خراشوں پر فوراً مرہم پٹی ہوئی اماں نے



دوڑ کر دودھ ہلدی پلایا' ساری بہنیں جمع ہوگئیں کوئی ہاتھ سہلا رہا ہے کوئی پاؤں...... جیسے گھر میں کوئی قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ ایسے ہی موقع پر غازی بھائی اپنا لٹکا ہوا منہ لیے داخل ہوئے۔ گھر میں یہ تماشہ دیکھ کر بوکھلا گئے۔

''ہائے ابا کو کیا ہوا؟''

اب ذرا اوسان بحال ہوئے تو اجنبی کا خیال آیا' ابا نے تشکر آمیز احسانمندی سے مہربان' مہمان کی طرف اشارہ کیا۔

''بھئی ان صاحب کو چائے پلاؤ' ٹھنڈا پانی لاؤ' ان کی مہربانی ہے بیچارے بہت نیک آدمی ہیں۔'' میں نے جلدی سے چائے پیش کی وہ انکار کرتے رہے۔ پھر ابا کی مہمان نوازی نے مزید اصرار کیا۔

''ارے بیٹا صرف چائے' ساتھ کچھ بسکٹ وغیرہ۔''

سامنے بھائی کی خوبصورت فراخ پیشانی عرق آلود 'اجنبی مہمان کی آؤ بھگت دیکھ کر وہ بھی میری مدد کو لپکے' گھر میں موجود نمکو وغیرہ بھی پیش کیے مگر اس نیک انسان نے چائے کے سوا کچھ نہ لیا' وہ گھر کے پُرخلوص ماحول سے متاثر بہت ہوئے پھر وہ مہرباں ابرِ نیساں بن کر ہمارے گھر کا حصہ بن گیا۔ ابا کے ساتھ مسجد جانا ہاتھ میں تسبیح بہت سی تصویریں بھی دکھائیں جس میں احرام کے ساتھ مدینے مکے میں موجود ہے۔ اس نے ہی بتایا۔

''ایک بہن کے سوا دنیا میں کوئی نہیں ہے اپنا چھوٹا سا بزنس ہے۔ اسی سلسلے میں کسی سے ملنے آیا تھا کہ مجھے جنت جیسا گھر مل گیا۔'' غازی بھائی تو جیسے کام کاج نوکری کی تلاش چھوڑ چھاڑ اس اجنبی کے گرویدہ بن گئے۔ یہ شخص بھی بڑا متاثر کن شخصیت کا مالک تھا یعنی جو ایک دفعہ مل لے اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ میں یعنی عفی کو یہ بے غرض سادے دھیمے لہجے میں بات کرنے والا نوجوان بھی اچھا لگا کہ ابا اور بھائی کا مددگار بن گیا تھا۔ میرا کام بھی ذرا ہلکا ہو گیا تھا۔ ابا تو پہلے ہی دن سے اس کے حصار میں آ گئے تھے۔ اس کا مذہبی رنگ اور بے غرض محبت نے پور پور ابا کو بھگو دیا تھا۔ گھر میں سرگوشیاں بڑھ گئی تھیں۔ کھوج لگانے پر معلوم ہوا کہ وہ میرا ساتھ چاہتا ہے۔

مجھے بھی بظاہر کوئی اعتراض نہ تھا۔ میرے بعد دو چھوٹی بہنیں بھی اب توری کی بیل کی طرح سر دیوار آ چکی تھیں۔ والدین کو گھر بیٹھے اتنا اچھا سُگھڑ رشتہ مل جانا معجزے سے کم نہ تھا۔

سب اس کو ابا کی کرامت سمجھتے...... وہ ہی والی بات تھی کہ جو دلوں کو فتح کر لے وہ ہی فاتح زمانہ...... اس نے اپنے خلوص سے ہم سب کو فتح کر لیا تھا۔ یوں میرے ہاتھ میں ''آذر علی'' کے نام کی انگوٹھی پہنا دی گئی' کس ادا سے ایک شخص ہماری زندگی میں داخل ہو کر گھر کا حصہ بنا اس کو بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں۔ وہ ذکر رسول ﷺ کے ساتھ ساتھ نعتیں بھی بہت خوش الحانی سے پڑھتا۔ سب سبحان اللہ کرتے' ابا تو ہاتھ چومتے' یہ سب تو تھا' مگر بھائی کی ملازمت؟ ابا کے لمبے لمبے وظیفے جانے کہاں جا رہے تھے پھر ایک دن یہ مشکل بھی آذر نے آسان کر دی۔

آذر نے بھائی سے کہا۔

''تمہارے مطلب کی ایک ملازمت جدہ میں ہے میں نے معلومات کی ہے پہلے تم عمرہ کر لینا پھر اپنا کام شروع کرنا۔ میرا جاننے والا بندہ ہے اگر تم چاہو تو......''

''اندھا کیا چاہے دو آنکھیں' اظہار بھی مشکل تھا۔ صرف آنکھوں نے شکر کے آنسو لبریز ہو گئے۔ اُف وہ کیفیت لفظوں میں عیاں نہیں ہو سکتی۔ اماں ابا کا تو بس نہ چلتا تھا کہ ہونے والے بھاگوان داماد کے قدموں میں سر جھکا دیں' ایسا قدردان داماد ملا کہ گھر کے ایک ایک کر کے تمام مسائل حل ہوتے چلے گئے روزی رزق کا بھی دروازہ کھل گیا۔ سبحان تیری قدرت!

بقول شاعر ایک مہرباں نے آ کر زندگی بدل دی۔

اب تو آذر میری بساطِ دل پر پوری طرح چھا چکا تھا۔ اور اپنی خوش قسمتی پر سجدہ ریز بھی اس کے چہرے پر حد درجہ نرمی اور لہجے میں شائستگی تھی۔ وہ میرے پاس ہوتا تو میں اُس کی بے پناہ ذہانت کے آگے چاروں خانے چت ہو جاتی۔

اُس روز تو جیسے گھر میں خوشیاں اتر آئیں تھیں' بھائی کا ویزا آ گیا تھا۔ آذر تو بھائی کے جانے سے پہلے مجھ سے نکاح پر اصرار کر رہے تھے مگر بھائی نے حامی نہ بھری کہ میں سیٹ ہو جاؤں پھر انشاء اللہ آ کر یہ مبارک کام اپنے ہاتھ سے انجام دوں گا۔ وہ زندگی کا عجیب سا دن تھا شاید اسی کو کہا جاتا ہے کہ کبھی خوشی کبھی غم...... جانے کی

خوشی تھی جدائی کا غم تھا آخر ہم سب کا اکلوتا چہیتا بھائی تھا۔ ابا کی تاکید تھی جاتے ہی خیریت کا تار ارسال کر دینا پھر بے شک عمرہ کے لیے روانہ ہو جانا۔

بھائی سب کو اُداس کر کے چلے گئے۔ آذر نے سب کو سنبھالا۔ دلاسہ تسلیاں دیتے...... سب کو گھمانے تفریح کرانے لے گئے۔ مگر جب دو تین دن بھائی کی خیریت نہ معلوم ہوئی تو پھر ابا کو پریشانی شروع ہو گئی۔ آذر سمجھاتے۔

"ابا وہ ایسی ہی مبارک جگہ ہے بندہ پہنچتے ہی سب کو فراموش کر دیتا ہے‘ اب عمرے سے فارغ ہو کر ہی سب کی یاد آئے گی۔" مگر ہم سب کا دل اس بات پر آمادہ نہیں تھا۔ ابا پوسٹ آفس کے چکر لگانے لگے روز...... وہ چکر لگاتے مایوس لوٹتے ان کی کمر مزید جھک گئی۔ آذر آتے سمجھاتے کہ میں نے ایک آدمی کو معلومات کے لیے لگا دیا ہے۔ اللہ خیر کرے گا۔ وہ تو الفاظ کی گلکاریاں بکھیرتے مگر کسی کو ہنسی نہ آتی تھی۔

ہم سب حیرت سے اُن کے مطمئن چہرے کو تکتے...... وہ ماں باپ جو اپنے اکلوتے بیٹے کی ایک منٹ کی تاخیر پر دروازے پر جا بیٹھتے ہوں‘ اس کی آٹھ دس دن سے کوئی خبر نہ آئی ہو بھلا وہ کیسے جان لیتے کہ وہ وہاں خیریت سے ہے۔ بظاہر یہ مطمئن شخص جس کا مستقبل بیٹی سے بھی واسطہ ہو چکا ہے کیسے شگفتہ لہجے میں یقین دلا رہا ہے کہ سب خیریت ہے آپ لوگ فکر نہ کریں۔ بقول شاعر اک یہ بھی تو انداز علاج غم جاناں ہے چارہ گر...... مگر اس کے قہقہے ہمیں اب کھوکھلے لگتے دل کہتا بھائی کسی مشکل میں ہیں۔

پھر ایک انہونی اور ہوئی وہ متاع جاں بنا شخص بھی کئی دن سے گھر نہیں آیا۔ اُس کے بتائے ہوئے تمام علاقے چھان لیے گئے تصویر لے کر علاقہ علاقہ دیکھا...... مگر کسی نے بھی کوئی شناخت نہ بتائی۔

اب ہم سب نفلیں‘ روزے اور وظیفوں پر زندہ رہ گئے۔ اماں بستر پر جا لگیں۔ ابا دفتروں کی خاک چھاننے لگے۔ زندگی میں ملال کا موسم آن ٹھہرا۔ زندگی مانند سراب ہو گئی۔ پہلے سفر کے واسطے صحرا دیا مجھے‘ پھر خود سراب بن گیا دھوکہ دیا مجھے...... میری جرأت گفتار‘ دیدہ دری‘ گیلی مٹی کی طرح بیٹھتی جا رہی تھی۔ اب کسی ریگ مال سے اس حقیقت کو گھس گھس کر صاف نہیں کیا جا سکتا کہ جو دیکھا خواب تھا جو سنا افسانہ تھا۔

میں کچن میں ہانڈی بھونتی تو آگ سے نکلتی چنگاریاں میرے دل کو جلا کر بھسم کر دیتیں۔ جیسے راکھ میں شرر چھپا ہو۔ سارے رفاقتوں کے چراغ بجھ کر فنا ہو چکے تھے صرف راکھ رہ گئی تھی۔

ابا سارا سارا دن بھوکے پیاسے مارے مارے اس دفتر سے اُس دفتر کی خاک چھانتے۔ پاؤں میں چھالے زبان خشک‘ رات بھر مصلے پر گریہ وزاری جانے زمین نگل گئی کہ آسماں کھا گیا۔ ایسے میں مجھے نروس بریک ڈاؤن نے جکڑ دیا کیونکہ سب جیسے مجھے موردِ الزام سمجھ رہے تھے۔ سب کیا دھرا میرا ہے میں نے خود پیش قدمی کی‘ اس کے نام کی انگوٹھی پہنی‘ بھائی کو باہر نوکری کا لالچ دیا یہ سب میں نے کیا۔

سارا خاندان اور رشتے دار عجیب نظروں سے مجھے دیکھتے جیسے حالات کی ذمہ دار میں ہوں۔ جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب وہ خبیث انسان فرشتے کے روپ میں ہمارے پاکیزہ ماحول میں داخل ہوا اور اپنا شیطانیت بھرا پلان ہمارے پُرسکون گھر پر شروع کیا۔ میرے دل میں غم و غصے کی لہریں بول اٹھتیں‘ جیسے کسی گہرے پاتال میں ڈوب گئی ہوں اور پھر کوئی مجھے اچھال رہا ہے۔ وہ فسوں گر پُرکار اپنی پوری خباثت سے سامنے آ جاتا ہے۔

وہ جنوری کی ایک خنک شام تھی‘ ہوائیں شائیں شائیں کر رہی تھیں۔ کوئٹہ کی برفیلی کولڈ ویو آ گئی تھی۔ ابا سکڑے سے مصلے پر تسبیح لیے پڑے تھے کہ دروازے پر بیل پر (اب تو ہر آہٹ پر گماں ہوتا کہ شاید کوئی معجزہ ہو گیا) سب نے ایک ساتھ چھلانگ لگائی...... پوسٹ مین بھی سب کو پہچان گیا تھا۔ اُس نے ایک پوسٹ کارڈ پکڑایا‘ لکھا تھا۔

پیارے ابا اماں اور بہنیں...... میں یہاں جدہ جیل میں ہوں (کچھ نمبر لکھے تھے) بس شکر ہے زندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دیں اور اگر ہو سکے تو دعا کریں۔

آپ کا بدنصیب بیٹا
غازی صدیقی

زندگی کی نوید تو ملی...... مگر کس طرح...... ابا نے کہا۔

”شکر ہے بیٹا زندہ ہے۔“ وہ پوسٹ کارڈ لے کر اس کی کئی کاپیاں کرائیں اور مختلف محکموں میں درخواستیں روانہ کیں۔ وزیرِ اطلاعات و نشریات سے ملاقات کی‘ سب ایک دفتر سے دوسرے دفتر بھیجتے رہے۔ اور پھر اداروں کے اہلکاروں کو بھی شاید ابا پر ترس آ گیا۔

وزیر داخلہ کے سیکریٹری نے ٹائم دیا۔ ابا کا کیس ہمدردی سے سنا اور فرمایا۔

”صدیقی صاحب! کسی نے آپ کے بیٹے کو پھنسایا ہے ہمارے وزیر صاحب بہت خداترس آدمی ہیں آپ کا پورا کیس اسٹڈی کر رہے ہیں۔ وہاں کی گورنمنٹ سے بھی رابطہ کیا ہے۔ آپ جمعرات کو تشریف لائیں۔“

انہوں نے بڑی شفقت اور مہربانی سے بات کی۔ آپ سوچ سکتے ہیں ایک بوڑھا اور ناتواں شخص اکلوتا جوان بیٹا تین جوان بیٹیاں...... ذرائع آمدورفت محدود‘ خون ناپید اور گھر کے حالات کے ہاتھوں مجبور بیٹا وطن سے دور انجانے میں شکار ہو کر کہاں جا پہنچا۔

”زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

جمعرات لگ رہا تھا سال کے برابر ہو گئی تھی۔ اللہ اللہ کر کے وزیرِ اطلاعات و نشریات (مولانا کوثر نیازی) سے ملاقات ہوئی وہ بہت شریف النفس آدمی تھے‘ ابا کا حال دیکھ کر بہت متاثر ہو چکے تھے حالِ دل سنا تو خود بھی آنکھیں نم ہو گئیں۔ انہوں نے ایک پیپر نکالا اور کہا۔

”آپ کا بیٹا ایک گینگ کے ہتھے چڑھ گیا جس نے چالاکی سے سوٹ کیس میں ہیروئن رکھوائی کہ میرا دوست ایئرپورٹ لینے آئے گا اُس کو یہ تحفہ سپرد کر دینا پھر وہ تم کو آگے کے معاملات سمجھائے گا مگر اس سے پہلے ہی بیٹا آپ کا دھر لیا گیا۔ آپ کو معلوم ہے وہاں کے قانون بہت سخت ہیں ہیروئن برآمد ہو تو سر قلم ہو جاتے ہیں۔ وہ معصوم بے جرم و خطا پکڑا گیا۔ آپ کا کیس بڑی ہمدردی سے سنا جا رہا ہے‘ ہم نے ٹیمیں روانہ کر دی ہیں یہ کون لوگ ہیں ننگ ملت‘ ننگِ قوم جو اس ملک و وطن کو بدنام کر رہے ہیں۔ وہ کم عمر اور مجبور لوگوں کو ہی استعمال کرتے ہیں۔ میں بھی ایک باپ ہوں آپ کا درد سمجھ سکتا ہوں۔ وہ بڑی دردمندی سے حوصلہ دے رہے تھے۔

روتے سسکتے ابا واپس آئے حضرت یعقوب کی بیٹے کی جدائی یاد آئی۔ اُف وہ شخص کس کمال سے کھیلا عشق کی بازی...... اور ہم سب اپنی فتح سمجھتے رہے جبکہ ہمیں مات ہو چکی تھی۔

یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تو پورا خاندان ہل کر رہ گیا۔ کچھ تو گریزاں ہوئے کچھ نے بناوٹی مدد کا بہانہ کیا۔ وہ رشتے دار جن کی بڑی دور دور رسائی تھی انہوں نے رشتہ دار ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

ایک سال گزرا‘ دوسرا سال آیا تو بھائی کی تحریر نظر آئی، اُن کو خط و کتابت کی اجازت مل گئی تھی۔ ان کے نیک چال چلن اور ہر وقت تلاوتِ کلام کا صلوۃ و تسبیح دیکھ کر اہلکار کو بھی رحم آ گیا۔ گورنمنٹ نے رابطے کی اجازت دے دی ہے۔ اس خط نے امید کی نئی روح پھونک دی۔

اب مہینے دو مہینے میں ایک خط آ جاتا تھا۔

دل کو اب بھی اکثر اُس اجنبی کے نام سے ٹھیس پہنچی ایک ٹیس اٹھتی وہ اجنبی میرے ابا کی سادگی عبادت گزاری سے کھیل گیا۔ اس کا گیم پلان بڑی مہارت سے تیار ہوا‘ پہلی ملاقات میں اس نے ہماری ساری مجبوریاں‘ پریشانیاں جان لیں۔ ضرورت مند باپ‘ بیٹا‘ بے روزگاری سادگی اس نے دین کو کھیل بنایا اور محبت سے دھوکہ دے گیا۔ مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ مگر تیرانداز جانے کہاں اب دوسرے محاذ تیار کر رہا ہوگا۔ ہمارا گھرانہ اس کو اپنے کھیل کے لیے بہترین نظر آیا ہوگا۔

ابا روز مختلف اداروں سے معلومات حاصل کرتے کرتے اور بوڑھے ہو چکے تھے۔ ڈاک خانے والے سرکاری افسران ابا کو پہچان چکے تھے۔ اُن کی بزرگی عبادت گزاری اور آہ و زاری دیکھ کر اکثر تو اپنی سیٹوں سے کھڑے ہو جاتے‘ چائے پانی کی پیش کش کرتے۔ وہ بھی مجبور تھے‘ کاغذات کے پلندے لیے ابا کو ایک ادارے سے دوسرے ادارے تک بھیجتے رہے۔ رشتہ داروں نے منہ موڑ لیا۔ دوست احباب بچھڑ گئے۔ بس ایک حضرت ناصح آتے جاتے رہے یوں کر کے یہ کیوں کیا؟ بس ہمیں ہی ذلیل و خوار سمجھ رہے تھے گویا کیا دھرا سب ہمارا ہے۔

اپنے لحاظ سے شاید وہ بھی ٹھیک ہی سوچتے ہوں گے کہ ایک اجنبی شخص پر انہوں نے کیسے اعتماد کرلیا کہ وہ گھر کا حصہ ہی بن گیا۔ ہاں یہ بات غلط بھی نہیں تھی' ہماری ہی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی۔ وہ شخص تو اچھے دلوں میں بھائی کی منگنی اپنی کسی عزیزہ سے کرا رہا تھا۔ بس اسی سلسلے میں ہم سب وہاں گئے تھے' بڑا سا دو منزلہ گھر تھا' لوگ بھی اچھے تھے۔ مگر بات کچھ بنی نہیں تھی' بعد کو جب بھائی اور اس خبیث انسان کی تلاش ہوئی تو ہم لوگ اس گھر بھی گئے۔ مگر وہاں تو وہ فیملی ہی موجود نہ تھی' کوئی اور لوگ رہتے تھے انہوں نے بتایا کہ ہم ایسے کسی لوگوں کو نہیں جانتے' بس قدرت جب امتحان لیتی ہے تو انسان بے بس ہوتا ہے۔

دن مہینوں اور سالوں میں گزر رہے تھے گورنمنٹ کی وہ ہی لن ترانیاں چل رہی تھیں۔ حق دق صحرا میں تن تنہا کھڑے ہم لوگ سسک رہے ہیں' عید اور خوشی کے تہوار ہمارے لیے تو کوئی معنی ہی نہیں رکھتے تھے۔ اور پھر بھائی کا عید پر خط آیا کہ گورنمنٹ یہاں قیدیوں کو حج کرائے گی' میرا نام بھی ان خوش نصیبوں میں شامل ہے' کہتے ہیں کہ آپ کے نیک اخلاق اور اچھے چال چلن کی وجہ سے آپ کا نام شامل کیا گیا ہے۔ اب ہم لوگ کسی معجزے کے منتظر تھے کہ حج کے طفیل بھائی کی دعائیں قبول ہو جائیں اور اللہ رحم فرمادے...... اِس کے بعد تو ہم لوگ ٹی وی کے آگے جڑ گئے تھے' کیونکہ حج کے ارکان براہِ راست دکھائے جاتے تھے' کبھی کسی پر بھائی کا شبہ ہوتا کبھی ثریا چلاتی دیکھیں یہ بھائی (احرام میں سب ایک جیسے لگتے ہیں) ہیں مگر افسوس وہ سراب ہی نکلتا...... نظر کا دھوکہ کھا کر ہم لوگ پھر مایوس ہو جاتے' ابھی قافلے منیٰ میں جمع ہو کر عبادات میں مصروف تھے کہ اطلاع آنا شروع ہو گئی کہ خیموں میں آگ بھڑک اٹھی ہے۔ خوفناک آتش زدگی سے ہزاروں جاں بحق اور لاتعداد گم شدہ ہیں۔ شدید بھگدڑ' قیامت صغریٰ بپا' امی بے ہوش ہو چکی تھیں' ہم سب کلمہ پڑھ رہے تھے۔ فون' تار سب خاموش' جاں بحق ہونے والوں کی فہرستیں آنا شروع ہو چکی تھیں۔ عالم اسلام سوگوار' تعزیت کے پیغامات کی بھرمار' لاپتہ افراد کی فہرست میں بھی بھائی کا نام نہیں تھا۔ وہاں کے محکمہ جیل سے بات ہوئی ان کا جواب تھا فلاں قیدی نمبر ہمارے پاس موجود نہیں...... وہ لاپتہ ہے ہماری تو دنیا ہی ویران ہو گئی۔ ابا ڈھے گئے۔ ہم سب روز جمع ہو کر آیت کریمہ کا ورد کرتے۔ آہوں سسکیوں سے دعائیں کر رہے تھے کہ پاکستان کے وزیر اطلاعات و نشریات کے دفتر سے ابا کا بلاوا آیا' جانے کیا روح فرسا خبر سنانے والے ہیں۔ ابا غم سے نڈھال لڑکھڑاتے قدموں سے آفس تک پہنچتے پہنچتے گر گئے' کسی اہلکار نے اُٹھا کر کھڑا کیا۔ اندر بھی بھگدڑ رچ گئی تب وزیر صاحب بھی آ موجود ہوئے انہوں نے غم سے نڈھال باپ کو گلے سے لگایا اور کہا۔

''مبارک ہو صدیقی صاحب آپ کی دعائیں رنگ لائیں معجزہ ہو گیا۔''

لیجیے اُن ہی کی زبانی سنیے۔

''آگ کی شدت سے گھبرا کر لوگ جدھر منہ اٹھا بھاگ رہے تھے...... آپ کا بیٹا قیدیوں کے کیمپ کی طرف بھاگا' وہاں موجود کسی نیک دل نے اُس کو دیکھ کر کہا۔

''صدیقی تو یہاں کیوں آیا؟ زندگی تجھ کو بلا رہی ہے اور تُو موت کی جانب بھاگ رہا ہے۔ بھاگ جا تو لاپتہ ہے پاکستانی کیمپ میں جا...... جا اور غازی نے اندھا دھند پاکستانی جھنڈے لگے خیمہ کی طرف دوڑ لگائی اور کسی رحم دل نے اُس کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ اب وہ ہمارے ادارے کے پاس ہے اس کے پیپر پاسپورٹ بن گیا ہے کل بحری جہاز سے روانگی ہے۔ آپ ایک ہفتے بعد بیٹے سے ملیں گے۔ جائیں صدیقی صاحب یہ آگ آپ کے بچے کے لیے گلزارِ ابراہیمی بن گئی ہے۔ یہ آپ کی پیش بہا دعائیں اور اللہ سے لو اور بزرگی ہے کہ خدا نے سن لی۔''

کہتے ہیں وزیر صاحب خود بھی رو رہے تھے اور ابا پر خوشی سے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ ان کو گورنمنٹ نے اپنی حفاظت میں گھر تک پہنچایا تھا۔

آج اس حادثے نے مجھے ماضی کی ہولناک کہانی یاد دلا دی' اللہ جسے چاہے پھانسی کے پھندے سے اتار دے اور کسی کی عمر قید کو زندگی میں بدل دے...... واہ رے اللہ تیری قدرت' جہاں ہزاروں لوگ شہید ہوئے وہاں بھائی کے لیے گلزارِ ابراہیمی ٹھنڈی ہو کر نوید مسرت لے آئی۔

☆☆......☆☆

یوم دفاع، ماہ ستمبر 1965ء کے حوالے سے خصوصی سچی کہانی

اپنی جاں نذر کروں

منور سلطانہ کا خیال

جانِ عزیز دے کے وطن کو بچالیا
یہ وہ جری ہیں جن کا زمانے میں نام ہے

عاصم نسیم

"میرے بیٹے جاؤ، میں تمہیں اللہ کے حوالے کرتی ہوں۔ اپنے مقدس وطن کی سرزمین کی حفاظت کے لیے سردھڑ کی بازی لگادو۔ مگر یاد رکھو! اگر کوئی گولی تمہاری پشت پر لگی تو میں دودھ نہیں بخشوں گی اور تمہارے شہید باپ کی روح کو بھی دکھ ہوگا جن کی غیرت نے مرنا گوارا کیا مگر کفر کے آگے سر نہ جھکایا۔ یہ دیکھو! تمہارے باپ کی خون میں رنگی ہوئی مٹی کی سرخی تمہیں انتقام کے لیے پکار رہی ہے۔"

اپنے والد کی شہادت کا وقت یاد آتے ہی سعید کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے۔

فاطمہ پھوپھی پھر بولیں "بیٹا تم ایک بہادر باپ کے بیٹے ہو۔ بہادر وقت پڑنے پر رویا نہیں کرتے اور پھر تم تو جہاد پر جارہے ہو ہنسو اور اگر ضرورت پڑے تو ہنستے کھیلتے عروس وطن کی مانگ اپنے لہو کی سرخی سے بھر دو۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں امی خدا گواہ ہے میں اپنے ابا کا انتقام لوں گا امی ان مظلوم ماؤں بہنوں اور بچوں کا انتقام لوں گا جو ان بھیڑیوں کے ظلم وستم کا نشانہ بنے۔"

"مجھے اپنے بیٹے سے یہی امید ہے مگر بیٹا یاد رکھنا کہ تم مسلمان ہو اور جوش انتقام میں اتنا نہ بھول جانا کہ اخلاقی اقدار کو پھلانگ جاؤ۔ مسلمان عورت بوڑھے اور بچوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔"

۱۹۴۷ء کے واقعات ابھی تک سعید کی نظروں کے سامنے گھوم رہے تھے سعید کے والد ضلع جالندھر کے ایک موضع رائے پور میں رہتے تھے۔ گاؤں کے معززین میں شمار ہوتے تھے اور گاؤں کے کرتا دھرتا امر سنگھ کے بہترین دوست۔

"ہندوستان آزاد ہوگیا۔ ہندوستان آزاد ہورہا ہے۔" روزانہ خبریں مل رہی تھیں ہندو اور مسلم اب ایک دوسرے سے جدا ہونے کی قسمیں کھارہے تھے روزانہ نعرے بازی ہوتی تھی:

"گورو ہندوستان سے نکل جاؤ"

اور کبھی:

"ہندو مسلم بھائی بھائی"

ایک قادر مطلق کو ماننے والوں اور سیکڑوں خداؤں کو پوجنے والوں میں بھائی چارہ کیسے ہوسکتا ہے؟ گائے کو دیوتا ماننے والوں اور گائے کو ذبح کرنے والوں میں برادری کیسے ہوسکتی تھی یہ صرف ایک وقتی تاثر تھا۔

ہندوؤں کے دل میں بغض تھا، حسد تھا اسی لیے ملک کے بٹتے ہی ہندوؤں کی آنکھوں میں خون اتر آیا، وہی ہندو جو کل تک نعرے لگاتے تھے کہ ہندو مسلم بھائی بھائی وہی آج مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہوگئے سب سے پہلے مسلم اقلیت کے علاقوں کو ہندوؤں نے اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنایا۔

مسلمانوں پر عذاب ٹوٹ پڑا۔ بلوائی مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے متحد ہورہے تھے اور نہتے مسلمان صرف اللہ کی امید پر بیٹھے تھے بلوائیوں نے مسلم اقلیتی علاقوں کی ایسی ناکہ بندی کردی تھی کہ ان کی امداد کے لیے دوسری جگہ سے مسلمان نہ پہنچ سکیں۔ سعید کے والد شیر محمد ان تمام معاملات سے باخبر تھے۔

انہی حالات کے دوران ایک روز امر سنگھ شیر محمد کے پاس آیا اور بولا ''شیر محمد ملک کے حالات نہایت ناگفتہ بہ ہیں خون ہماری قوم کے سر چڑھ چکا ہے اپنے بچاؤ کی کچھ تدبیر کرو میرے خیال میں یہاں سے کسی مسلم اکثریتی علاقے میں نکلنے کی کوشش کرو اگر تم اکیلے اپنے بچوں کے ساتھ نکلنا چاہو تو میں انتظام کیے



دیتا ہوں۔

''دوسرے مسلمانوں کا کیا ہوگا؟'' شیر محمد نے پوچھا

''تمہیں دوسروں سے کیا واسطہ شیر محمد، رائے پور کے دوسرے مسلمانوں کو اب دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔''

''امر سنگھ کان کھول کر سن لو میں اپنے مسلمان بھائیوں کو ان حالات میں کبھی بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ تم ایک دوست اور غیر مذہب ہوتے ہوئے بھی میری جان، عزت و حرمت کی اتنی فکر کر رہے ہو تو مجھے اپنے ان بھائیوں کی عزت و حرمت اور جان و مال کی فکر کیوں نہ ہو جن سے میرا مذہبی اور خونی رشتہ ہے۔''

''ضد نہ کرو شیر محمد! حالات بہت نازک ہیں۔''

مگر شیر محمد نے اس کی بات نہ مانی اور امر سنگھ غصے سے اٹھ کر چلا گیا۔

روزانہ بلوائیوں کے ظلم و ستم کی خبریں آ رہی تھیں اب رائے پور کے باہر واقع اکا دکا گھر بھی لٹنے شروع ہو گئے تھے۔ تمام مسلمان اپنے اپنے گھروں میں محصور تھے بلوائی روزانہ کسی نہ کسی گھر کو لوٹ کر گھر والوں کو قتل کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ مظلوموں کو چیخ و پکار بھی نہ کرنے دی جاتی۔ پھر ایک روز بلوائیوں نے پورے رائے پور کو لوٹنے کا پروگرام بنا لیا امر سنگھ اپنا حق دوستی ادا کرنے ایک بار پھر شیر محمد کے پاس آیا مگر ایسی شرائط پر جن کو سن کر ہر مسلمان وہی کرتا جو شیر محمد نے کیا۔ امر سنگھ نے تمام حالات سنانے کے بعد کہا

''شیر محمد تمہارا اب بستی سے نکل جانا کسی صورت بھی ممکن نہیں۔ تم میرے عزیز دوست ہو اب صرف ایک ہی طرح میں تمہارے گھر کو بلوائیوں کے ہاتھوں سے بچا سکتا ہوں یہ لو کڑا، اسے اپنی کلائی میں پہن لو' اگر سکھ تمہیں امرت بھی پلائیں تو چکھ لینا۔ میں کہہ دوں گا کہ تم نے سکھ مذہب قبول کر لیا ہے۔ یہ ایک وقتی چال ہے شیر محمد جب بھی امن ہوگا تمہیں یہاں سے نکال دوں گا مگر یاد رکھو کسی مسلمان کی خیر خواہی میں تمہارے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلے۔ تم کو ظاہری طور پر مکمل سکھ نظر آنا ہوگا۔''

''امر سنگھ چلے جاؤ یہاں سے۔ مسلمان شہید تو ہو سکتا ہے مگر ایمان نہیں گنوا سکتا۔ ذرا سوچو، جس نے اپنے بھائیوں کی خاطر یہاں سے نکل جانا پسند نہیں کیا وہ تمہارے مذہب کو کیسے قبول کر سکتا ہے۔ مسلمان جو کرتا ہے اپنے دل سے کرتا ہے ہمارا اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے اگر اسے ہمیں زندہ رکھنا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں مار نہیں سکتی۔''

''یہ زمانہ امن کی باتیں ہیں شیر محمد! اب تمہیں کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔ اپنے بچوں پر رحم کھاؤ وقتی طور پر سکھ بن جانے سے تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔'' امر سنگھ بولا۔

''امر سنگھ دفع ہو جاؤ یہاں سے، میں تو کیا کوئی مسلمان بھی تمہاری اس شرط پر یہاں سے نکلنا پسند نہیں کرے گا۔ مسلمان حالات سے نمٹنا جانتے ہیں۔''

''اچھا تو اب تم حالات سے نمٹ لینا۔'' یہ تھے آخری الفاظ جو امر سنگھ کہہ کر چلا گیا۔

یہ 16 اگست کا دن تھا۔ بلوائیوں کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر رائے پور کے مرد اور عورتیں بھی سروں سے کفن باندھ کر نکل کھڑے ہوئے ان کی تعداد صرف 45 تھی۔ سروں پر کفن باندھے اور ہاتھوں میں کلہاڑیاں اور بانس لیے ہوئے

سعید ابھی چھ سال کا بچہ تھا۔ والدہ ایک ہاتھ میں کلہاڑی اور دوسرے بازو میں اسے اٹھائے ہوئے تھی۔ ابھی یہ مٹھی بھر مسلمان گھروں سے نکل کر مسجد کے سامنے اکٹھے ہوئے تھے کہ بلوائیوں نے ایک طرف سے حملہ کر دیا۔ مسلمان موت کے شیدائی تھے کلہاڑیوں سے ایسے ایسے وار کیے کہ دشمن کے چھکے چھڑا دیے۔ گو بلوائی ان سے تعداد میں دس گنا تھے مگر ان کو اپنی زندگیاں عزیز تھیں مسلمان صرف عزت کی زندگی چاہتے تھے یا موت اور پھر دو گھنٹے بعد ہزاروں بلوائیوں نے ان اسلام کے شیدائیوں پر رائفلوں، بندوقوں اور بموں سے حملہ کر دیا۔ مسلمان مرد عورتوں نے اپنے بچوں کو چھوڑ دیا اور مقابلہ کرتے رہے مگر کہاں تک؟ ادھر لاش تڑپی، ادھر سر گرا، یہ بچے کا سرتن

سے جدا ہوا۔ وہ شوہر نے کراہتے ہوئے جان دے دی۔ عزرائیل موت آگ خون اور درندوں کے غول کے غول!

سعید چیخ کر اپنی ماں کو بلا رہا تھا۔ قریب ہی اس کے والد ایک بلوائی سے گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ اس کی والدہ نے بھی شوہر کی مدد کی۔ ایک بانس پورے زور سے بلوائی کے سر پر دے مارا اور شیر محمد نے رائفل غنڈے کے ہاتھ سے چھین لی۔

ابھی شیر محمد نے رائفل کو سیدھا بھی نہ کیا تھا کہ ایک طرف سے دھائیں دھائیں گولیاں آئیں اور شیر محمد کے سینے میں اتر گئیں۔ یہ فائر امر سنگھ نے کیے تھے ایک دوست نے اپنا حق دوستی ادا کر دیا ایک گولی سعید کی والدہ کی ٹانگ میں لگی تھی مگر خاوند کو گرتے دیکھ کر بیوی اپنا دکھ بھول گئی اس نے گرتے کو سنبھالا مگر گولیاں اپنا کام کر گئی تھیں اور مجاہد کا خون فوارے کی طرح بہہ نکلا گرم گرم خون جس میں غیرت کی گرمی تھی۔

درندے اب لاشوں کو چھوڑ کر گھروں کو لوٹنے اور انہیں آگ لگانے لگے۔ سعید کی والدہ کچھ دیر خاوند کو دیکھ کر سسکتی رہیں اور پھر ان کا سر زانو سے اٹھا کر زمین پر رکھ دیا اور خون سے رنگے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی "اے میرے مالک میرے مولا! ہم پر کتنا ظلم ہوا ہے میرے مولا' ہم نے ان درندوں کا کیا بگاڑا تھا ؟ صرف یہی کہ ہم مسلمان ہیں! میرے مولا میں اس خون کی سرخی کو گواہ کر کے قسم کھاتی ہوں کہ ان درندوں سے بدلہ ضرور لوں گی۔ انہوں نے میرے خاوند، میری بہنوں اور میرے بھائیوں کو ناحق قتل کیا ہے۔ میرے مولا ان کو ان کے کیے کی سزا دے۔"

شاید یہ دعا کی قبولیت کا وقت تھا۔ اسی وقت بلوچ رجمنٹ کی تین جیپیں آ گئیں۔ سعید کی والدہ سمجھیں کہ شاید سکھ فوج ہے اس نے خود کو اور سعید کو جلے ہوئے مکان کے ملبے میں چھپا لیا۔ ملٹری والوں نے مسلمانوں کی لاشوں کو دیکھ کر بلوائیوں کو ہوائی فائر کر کے بھگا دیا آناً فاناً میدان صاف ہو گیا

ملٹری والے لاشوں کو اکٹھا کر رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ سعید کی والدہ انہیں اپنا ہمدرد پا کر سعید کو لے کر ملبے کے ڈھیر سے نکلیں اور اپنے خاوند کی لاش سے دیوانہ وار لپٹ گئیں۔ ایک نوجوان فوجی نے انہیں لاش سے علیحدہ کیا اور بولا "محترم بہن ہمیں احساس ہے کہ تمہیں سخت اذیت پہنچی ہے ان مظلوموں کے ساتھ جو سلوک ہوا ہے اس کا خمیازہ انہیں ضرور بھگتنا پڑے گا۔ مرحوم نے سینے پر زخم کھا کر شہادت پائی ہے۔ ایک شہید کی بیوہ کو صابر و شاکر ہونا چاہیے تم اب آنسو بہا کر شہید کی روح کو دکھ نہ پہنچاؤ۔ آؤ اب جلدی کریں' کہیں بلوائی متحد ہو کر دوبارہ حملہ نہ کر دیں۔"

سعید کی والدہ نے خاوند کی لاش پر آخری نگاہ ڈالی اور شہید کے خون سے رنگی ہوئی مٹی اٹھا کر اپنے پلو میں باندھ لی۔

فوجی جوانوں نے انہیں جالندھر کیمپ پہنچا دیا۔ رفیوجی کیمپ میں عجیب گڑبڑ تھی۔ بھوک سے نڈھال چہرے، طوفان کا شور، لٹیروں اور بلوائیوں کا زور۔"

سعید کی والدہ پندرہ روز تک کیمپ میں رہیں۔ سولھویں روز بصد مشکل ایک ٹرین میں سوار ہوئیں ننھے سعید کے ذہن پر تمام واقعات اپنا نقش چھوڑ رہے تھے۔ گاڑی لاہور پہنچی وہی جالندھر والے کیمپ کی سی حالت تھی۔ زخمیوں کی تعداد بیشمار تھی اتنے زخمیوں کی مرہم پٹی نو آزاد مملکت کیسے کرتی؟ زخمیوں کے علاوہ کوئی اپنے گھر کا ماتم کر رہا تھا تو کوئی اپنے جوان بیٹوں کی موت پر گریہ کناں تھا۔ کسی کو اپنے بیٹے کا سر نیزے پر بلند کرنے کا منظر خون کے آنسو رلا رہا تھا تو کوئی اپنی ماں بہن بیٹی کی عصمت کے ماتم میں سینہ پیٹ رہا تھا۔ پھر ان تمام مشکلات سے بچنے والوں کو وبائی امراض نے گھیر لیا ملیریا، ہیضہ اور دیگر امراض۔ مگر پھر بھی ہر ایک خوش تھا کہ وہ اب پاکستان میں ہے اور پاکستان اس کا گھر ہے۔

ان تمام کڑی منزلوں کو کاروان آزادی کے پروانوں نے طے کر لیا آبادی کاری شروع ہوئی حکومت نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا فاطمہ پھوپھی کو بھی ضلع لائل پور (فیصل آباد) کے ایک گاؤں میں

زمین الاٹ ہوگئی ۔ سعید نے اسکول جانا شروع کر دیا۔

سعید گو بچہ تھا مگر اس کے دل پر وہ تمام زخم تازہ تھے ۔وہ تمام ہولناک مناظر جو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے سعید نے مڈل اور پھر میٹرک کیا سعید کی والدہ نے اپنے خاوند کے خون میں رنگی ہوئی مٹی ایک ڈبیا میں بند کر رکھی تھی ۔ وہ گاہے گاہے سعید کو یہ ڈبیا دکھا کر کہتیں ''بیٹا یہ تمہارے غیرتمند باپ کا خون ہے جس نے جان دے دی مگر ایمان پر آنچ نہ آنے دی۔ وعدہ کرو کہ تم اپنے مظلوم باپ کا بدلہ لوگے ۔''

سعید اب جوان تھا ۔ اپنے باپ کا خون دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھتا ۔ آخر 1958ء میں سعید فوج میں بھرتی ہو گیا۔

کتنی خوش تھیں اس کی والدہ اپنے اکلوتے بیٹے کو فوج میں بھرتی کروا کر ۔ وہ ہر کسی کو بتاتیں ''میرا سعید اب فوجی ہے۔''

1964ء میں سعید چھٹی پر گھر آیا تو مجھے بھی ملا۔ اس کی باتوں میں عجیب جوش وخروش تھا ۔ اسے مظلوم کشمیریوں سے ہمدردی آئے دن کے سرحدی جھگڑوں پر غم وغصہ تھا اپنے قومی وقار پر کٹ مرنے کا عزم تھا حق یہ ہے کہ وہ بالکل ہی بدل گیا تھا جیسے اس کے جسم میں خون کے بجائے پارہ بھر دیا گیا ہو۔

اس کے بعد سعید سے دوبارہ ملاقات اگست 1965ء میں ہوئی جب وہ چھٹی پر اپنی والدہ سے ملنے آیا۔ سعید کی والدہ نے مجھے بلایا تھا سعید کی منگنی کی رسم تھی ۔ گاؤں کے ہی ایک معزز گھرانے میں سعید کی منگنی کر دی گئی جس روز سعید کی منگنی کی رسم ادا ہوئی اسی روز سعید کو لاہور ہیڈکوارٹر سے جلدی حاضر ہونے کا آرڈر ملا ار سعید نے اسی وقت تیاری کر لی اس کی الدہ کو پتہ چلا تو بولیں ''میرے بیٹے میں نے اسی روز کے لیے تمہارے جوان ہونے کی دعا مانگی تھی‘ ۔جاؤ ماں کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں ۔ ڈٹ کر مقابلہ کرو تا کہ دشمن کو معلوم ہو جائے کہ 1947ء نہیں 1965ء ہے۔

سعید اسی رز شام کو لاہور پہنچا اس کے جانے کے کچھ روز بعد اس کا خط ملا

''پیاری امی جان!

سلام قبول فرمایئے ! امی! آپ کے پاس سے آنے کے بعد مجھے واہگہ سیکٹر پر جانے کا حکم ملا تھا بھارت نے چھ ستمبر کو چوری چھپے حملہ کیا تھا مگر اسے منہ کی کھانی پڑی۔ میں اب بھی اپنے مورچوں میں بیٹھا ہوں۔

ہندوستان کا جو ٹینک یا جیپ آگے بڑھتی ہمارے جیالے توپچی اسے وہیں تباہ کر دیتے ہیں۔ صرف میں نے ان کے چھ ٹینک تباہ کیے ہیں ہماری ڈیوٹی نہر پر ہے جو جنگی اعتبار سے اس وقت لاہور کی جان ہے۔ شدید فائرنگ ہو رہی ہے مگر میرے اور میرے ساتھیوں کے حوصلے بلند ہیں۔

اسی سرحد کی طرف سے اب بھی لٹے پٹے قافلے آ رہے ہیں بالکل 1947 کی طرح بعض برہنہ سر بہنیں اور بعض لاچار بوڑھے مگر امی اب 1947ء نہیں اب شاستری کو اپنے کیے کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا کل انڈیا والوں نے بہت شدید حملہ کیا تھا مگر میرے جواں مرد بھائیوں نے اس کا بڑے جگری سے مقابلہ کیا کہ دشمن کے دانت کھٹے ہو گئے اچھا امی اب اجازت چاہوں گا گھر کی خیریت بتا دیجیے۔

آپ کا بیٹا سعید‘‘

پھوپھی فاطمہ نے جواب میں لکھا:

''میرے غازی بیٹے!

ماں کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ چھ ستمبر کے حملے کی خبر ریڈیو پر سنی ۔ اس روز ریڈیو پر مسلسل خبریں سن رہی ہوں۔ میرے بیٹے مقدس سرزمین کی ایک ایک انچ زمین کی حفاظت اور ماؤں بہنوں کی عزت و ناموس تمہارے ہاتھ میں ہے بیٹا میرا یہ پیغام تم اپنے تمام ساتھیوں کو پہنچا دو۔:

پیارے بیٹو!

آزادی کی بقا کے لیے ایسا وقت ہر قوم پر پڑتا ہے مگر تاریخ ان قوموں کو کبھی معاف نہیں کرتی جو ایسے وقت میں اپنی غیرت وعزت کو بالائے طاق رکھ کر گھٹنے ٹیک دیتی ہیں یاد رکھو مسلمان شہید ہو جاتا ہے مگر

اس کی گردن دشمن کے آگے کبھی نہیں جھکتی۔ دشمن پر کاری ضرب لگا کر قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ کردو میری اور لاکھوں ماؤں بہنوں کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔''

16 ستمبر کو سعید کا پھر خط ملا۔

''پیاری امی جان!

اپنے بچے کا سلام قبول فرمایئے!

ہم کھیم کرن کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہم سات ستمبر کو واہگہ سے کھیم کرن کی طرف روانہ ہوئے تھے کوئی اچھا راستہ نہ تھا مگر پاکستانی فوج کے جوانوں کے عزم و ہمت کے آگے کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی حتیٰ کہ روہی نالہ کے کناروں کی اونچی دیوار قطعی طور پر ناقابل گزر تھی وہ بھی ہمارا راستہ نہ روک سکی ہم نے اپنی جیپوں اور توپوں کو کندھوں پر اٹھا کر اسے عبور کیا رات کے گیارہ بجے ہم نے روہی نالہ عبور کیا تھا۔ بارہ بجے دشمن نے باخبر ہو کر ہم پر فائر کھول دیا مگر دو دو ہاتھ صبح سات بجے ہوئے دشمن ہماری بے پناہ یلغار کے آگے جم نہ سکا اور آخر اسے بھاگتے ہی بنی۔

ہم پاکستان کی بقا اور اپنی بہنوں کی عزت و ناموس کے لیے میدان کارزار میں کود ے انشاء اللہ ہمارا ہر قدم دشمن کی طرف بڑھے گا دنیا کی کوئی طاقت اس عظیم قوم کو شکست نہیں دے سکتی لاہور کے عوام کے حوصلے کتنے بلند ہیں جی چاہتا ہے اس لاہور کی رہنے والی اپنی بہن کی خاک کو آنکھوں سے لگاؤں جس نے ہمیں لاہور سے گزرتے ہوئے ٹھہرا کر کہا تھا:

''بھیا زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں دشمن پر ٹوٹ پڑو تا کہ دوبارہ اسے ہماری سرزمین کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرات نہ ہو سکے۔''

امی جان کتنا اشتعال تھا اس بہن کے الفاظ میں۔

بھارتی فوج بھاگ گئی اور کھیم کرن کی پبلک بھی۔ مگر امی جان میں نے اور میرے دوسرے ساتھیوں نے بھاگنے والوں سے کوئی تعرض نہیں کیا اور نہ ہی کسی چیز کو ہاتھ لگایا 1947ء کے وحشیانہ اور انسانیت سوز سلوک کے زخم ابھی تک ہمارے سینوں میں تازہ ہیں اور آج سے دو روز پہلے جو سلوک ہمارے سرحدی دیہات کے بچوں بوڑھوں اور عورتوں سے ہوا وہ بھی یاد ہے۔ ہم نے بربریت کے ان تمام واقعات کے باوجود کبھی اسلام کی اخلاقی اقدار و ضوابط کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

امی جان دعا کیجیے اللہ تعالیٰ ہمیں آئندہ بھی صبر و تحمل عطا فرمائے (آمین)

آپ کا بیٹا سعید''

اس خط کے بعد سعید کا کوئی خط نہیں آیا۔ آخر 17 ستمبر کو معلوم ہوا کہ سعید شہید ہو چکا ہے اس کے ایک ساتھی اور گہرے دوست شہزاد نے سعید کی ماں کو رومال میں بندھی ہوئی مٹی دیتے ہوئے کہا ''سعید نے اپنے سینے پر چھ گولیاں کھائیں۔ وہ دشمن کا تعاقب کر رہا تھا کہ باڑھ کی زد میں آ گیا۔ اس نے مرتے وقت کہا تھا ''میرے خون سے رنگی ہوئی مٹی میری والدہ تک ضرور پہنچا دینا۔''

فاطمہ نے اس مٹی کو ہتھیلی پر رکھ لیا اسے چوما پھر شوہر کے خون سے رنگی مٹی میں ملا کر بولی ''شکر ہے خدا کا کہ اس نے مجھے سرخرو کیا...... جس مٹی کی آزادی کے لیے باپ نے خون دیا تھا اسی مٹی کی حفاظت کے لیے میرے بیٹے نے بھی جان دے دی۔'' یہ کہہ کر وہ مڑی اور اپنے کمرے میں آ کر اس طرح بیٹھ گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔

پڑوس کی خالہ جیناں نے ٹوکا:

''بیٹی! باہر تیرے بیٹے کی لاش پڑی ہے اسے اٹھوانے کا انتظام کر۔''

''اماں! اپنے بیٹے کو تو میں نے عرصہ پہلے وطن کی گود میں دے دیا تھا جس پر میرا حق نہ ہو اس کے بارے میں، میں فیصلہ کیسے کروں۔ اب جو کچھ کرنا ہے وطن والے ہی کریں گے۔''

دیکھنے والوں نے دیکھا سعید کا جنازہ کس دھوم سے اٹھا۔ گاؤں ہی نہیں قریبی شہر کے لوگ بھی امڈ آئے تھے وطن والے بھی کب اپنے محافظوں کو بھولتے ہیں۔

☆☆......☆☆

سندھ کے شہر سکھر سے جڑی ایک پکی اور سچی کہانی

نہ قفس نہ آشیانہ

داغ کا خیال

مجھے آباد کرنا ہے' مجھے برباد کرنا ہے
خدایا دین و دنیا میں کرم تیرا ستم تیرا

تبسم زہرا رضوی

بیشک سردی اپنے شباب پر تھی' بیشک ہڈیوں کا گودا جم رہا تھا' بیشک سرد ہوائیں جسم کو کاٹے ڈال رہی تھی۔ مگر اُس وقت خود سے زیادہ اُسے فکر ننھے بچوں کی تھی۔ اور پھر خدا جانے کیا ہوا کہ جونہی اُس نے اُس منحوس دہلیز کو پار کیا۔ اُسے لگا کہ جیسے وہ کسی بلا کے پنجرے سے نکل آئی ہو۔ ایک عجیب سا اطمینان اُس کے اندر اتر آیا تھا۔ اس وقت صبح کے پانچ بج رہے تھے اور ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ دور سے آتی ویگن قریب آرہی تھی اور اس کی روشنیاں گھپ اندھیرے میں صبح کا پیغام تھیں۔''

یہ سندھ کا ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ جہاں اُس نے مصیبت میں پناہ لی تھی۔ پسند کی شادی بھی بعض اوقات کیا کیا قیامتیں دکھاتی ہے ویگن رک گئی۔ اور وہ ارحم کا ہاتھ تھامے ننھے شبیر کو گود میں کلیجے سے لگائے اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

''سکھر......'' کہہ کر اُس نے چادر کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹا اور سوچوں کے دریا میں غرق ہوگئی۔

یہ پسند کی شادی ہی تو تھی' جس نے اس طرح ننھے بچوں کے ساتھ اُسے دربدر کردیا تھا۔ اب اُس کے سامنے گزرا وقت بھی تھا اور اگلی کڑی منزل بھی......

اُس نے قاسم علی سے پسند کی شادی کی تھی۔ دونوں سکھر میں رہتے تھے پھر بھی وہیں کالج میں پڑھتی تھی' گھر بھی وہیں تھا گھر والوں نے شادی کی مخالفت کی تھی' لیکن اُن کے سر پر تو عشق کا بھوت سوار تھا' دوسری طرف قاسم بھی بارات لے کر آنے پر سنجیدہ تھا۔ اس طرح ایک چھوٹی تقریب میں وہ نیلوفر اعجاز سے نیلوفر قاسم بن گئی۔ اور سال کے اندر ارحم بھی گود میں آ گیا۔ قاسم کے گھر والے اُس سے خوش نہیں تھے۔ وہ زمین جائیداد والے لوگ تھے اور شادیوں کے ذریعے سے اُن کی زمین جائیداد میں اضافہ ہوتا تھا' جبکہ نیلوفر کے والد ایک درمیانے درجے کے گورنمنٹ ملازم تھے' لہٰذا انہوں نے ایک مناسب جہیز دے کر بیٹی کی شادی کردی تھی۔ ہاں اُسے تعلیم کے زیور سے آراستہ ضرور کردیا تھا۔

نیلوفر سے چھوٹی ایک بہن تھی اور اس سے چھوٹا ایک بھائی' نیلوفر کی والدہ بھی بہت پڑھی لکھی خاتون تھیں' اُن کے مزاج میں سلجھاؤ تھا۔ اس لیے گھر کا ماحول بھی سلجھا ہوا تھا۔ جبکہ اُس کے سسرال کا ماحول یکسر مختلف تھا۔ وہاں پیسا تو بہت تھا لیکن تمیز و تہذیب

کا فقدان تھا۔ وہاں کے لوگ زور زور سے باتیں کرتے، ذرا ذرا سی بات پر ہنگامہ کھڑا ہو جاتا خاص کر کھانے پر، قاسم سمیت پانچ بھائی تھے۔ قاسم تیسرے نمبر پر تھا۔ دو بڑے بھائیوں کی بیویاں انہی کے خاندان کی تھیں بڑی جٹھانی نیلوفر کی ساس کی بھتیجی تھی اور چھوٹی بھانجی، جبکہ نیلوفر نہ صرف غیر خاندان کی تھی، بلکہ اُن کے درمیان میں زبان کا فرق بھی تھا۔ بڑی بہوئیں چونکہ اُن کے خاندان کی تھیں اس لیے وہ سب ایک طرف یعنی ایک پارٹی تھیں، نیلوفر کے ساتھ صرف قاسم تھا۔ اُس کی زندگی کافی مشکل تھی۔ لیکن وہ تب آسان ہو جاتی جب قاسم کے محبت بھرے بول اُس کی تنہائی میں رنگ گھول دیتے تھے۔

قاسم نیلوفر کو بہت چاہتا تھا بہت ہی زیادہ...... خود سے بھی زیادہ اپنے وعدے کا پابند، اگر اُسے زندگی کا ساتھی بنانے کا وعدہ کیا تھا تو پورا کیا، خدا نے ارحم دیا تو جی کھول کر خوشیاں منائیں۔ اُدھر ساس شمشاد بیگم یہ سمجھتی تھیں کہ چند دن کی عاشقی ہے کچھ دن بعد عشق کا بھوت اتر جائے گا۔ اِدھر بھوت میاں کا حال یہ تھا کہ میاں بیوی روز بروز لیلیٰ مجنوں بنتے جا رہے تھے اور ساس بیگم کی تشویش سِوا ہوتی جا رہی تھی۔ وہ مستقل اِس فکر میں تھیں کہ کسی طرح یہ شادی ختم ہو جائے لیکن قاسم کی دیوانگی سے پریشان تھیں۔ نیلوفر کے دو دیور چھوٹے تھے، سسر انتقال کر چکے تھے۔ دونوں دیور نائٹ کلاسز میں میٹرک کے اسٹوڈنٹ تھے۔ ساس نے تو یہاں تک سوچا تھا کہ نیلوفر پر دیور کے حوالے سے کوئی الزام لگا کر اس کی چھٹی کریں نیلوفر سب سمجھتی تھی مگر کہتی کچھ نہیں تھی کیونکہ شروع دن ہی سے قاسم نے کہہ دیا تھا کہ میرے گھر والوں کو کچھ نہ کہنا؟ ورنہ؟ اور پھر قاسم کی دیوانہ وار چاہت نے بھی نیلوفر کو مجبور کر دیا کہ گھر والوں کو کچھ نہ کہے، قاسم کی معیت میں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں وہ ایک نہایت ہی پُرکشش مرد تھا۔ جب وہ اپنی مخمور آنکھوں سے نیلوفر کی طرف



دیکھتا تو سب شکوے مٹ جاتے تھے' مگر کہتے ہیں نہ کہ خوشیاں زیادہ پائیدار نہیں ہوتیں' نیلوفر کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ سوتے سوتے اُس کی آنکھ کھلی تھی کوئی بھیانک خواب دیکھا تھا۔ وہ پوری طرح پسینے میں نہائی ہوئی تھی۔

''کیا ہوا میری جان کیا ہوا؟'' قاسم ٹشو سے بیوی کے چہرے کا پسینہ پونچھ رہا تھا۔

''میں کبھی خواب میں اس طرح نہیں ڈری۔'' نیلوفر کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''جانو میں نے دیکھا کہ میرے ہر طرف لاشیں پڑی ہیں' چیخ و پکار مچی ہے۔'' ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ دور کہیں دھماکے کی آواز آئی۔

''خدا رحم کرے۔'' یہ کہتے ہوئے قاسم کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا تھا۔ بہت دور سے واقعی چیخ و پکار کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اور کچھ دیر بعد پتہ چلا تھا کہ قریب ہی واقع سانگی ریلوے اسٹیشن پر بہت بڑا حادثہ ہوا ہے' اور جانکاہ خبر یہ تھی کہ اس حادثے میں نیلوفر کی ماں باپ اور بہن بھائی سب ختم ہو چکے تھے۔ پھر اُسے کچھ ہوش نہ رہا تھا اور جب آنکھ کھلی تو چار جنازے کفن میں لپٹے رکھے تھے اس نے اٹھنا چاہا لیکن ہمت نے ساتھ نہیں دیا۔ اور پھر ہوش آیا تو سوائے آہ وفغاں کے کچھ بھی نہیں بچا تھا' اور یہ تو اُس کے فرشتوں کو بھی نہیں پتہ تھا کہ واقعی کچھ بھی نہیں بچا تھا۔

کیونکہ نیلوفر تو تھی میکے میں' اُدھر ساس صاحبہ رسمی سی تعزیت کر کے جانے کے بعد اسے مزید برباد کرنے کے منصوبے بنا رہی تھیں۔ اور اسی منصوبے کے تحت وہ ایک رات اپنی تمام آل اولاد کے ساتھ دبئی کے لیے روانہ ہو گئیں۔ جہاں ایک اچھا مکان ہی نہیں اُن کا خاصا کاروبار بھی موجود تھا۔ چند روز بعد قاسم کو بھی فون کر کے وہاں بلا لیا گیا۔

مرد کی فطرت یہ ہے کہ خاص کر شوہر کی کہ مصیبت میں وہ بیوی کا ایک حد تک ساتھ دیتے ہیں قاسم جب نیلوفر کے گھر جاتا اُس کا رونا شروع ہو جاتا' وہ بیوی کے روز روز کے رونے پیٹنے سے ایک حد پریشان ہو چکا تھا۔

جب اُس نے دبئی کی آزاد فضا میں سانس لی تو' تبدیلی کا احساس ہوا' حالانکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ نیلوفر کو بہت چاہتا تھا۔ لیکن آخر کب تک اُس کے ساتھ رونا روتا۔'' اب جو دبئی میں رہائش کے ساتھ کاروبار شروع ہوا تو پانچوں بھائی جی جان سے اُس میں جٹ گئے' اور ماں نے اپنی دونوں بہوؤں کے ساتھ پاکستان کا راستہ اختیار کیا۔

یہ 1990ء کی دہائی کی بات ہے اُس زمانے میں موبائل اتنے عام نہیں ہوا کرتے تھے' ہاں گھروں میں ٹیلی فون سیٹ ہوتے تھے۔ نیلوفر میکے میں تھی' ہائے افسوس کا جملہ صبح شام سنتی تھی۔ اور تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا اور پھر رفتہ رفتہ ہجوم چھٹنے لگا تو اب اُسے اپنے گھر کا خیال آیا پاپا کا گھر سرکاری تھا' اُسے خالی کرنا تھا قاسم کا فون روز رات کو دبئی سے چند منٹ کے لیے آتا تھا۔ پھر اُس نے کہا۔

''جان...... افورڈ کرنا مشکل ہو رہا ہے' میں ایک دن کے گیپ سے فون کیا کروں گا۔ پھر دو دن ہوئے اور پھر تین چار' اِدھر نیلوفر کو ممی کا گھر ختم کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ سامان بہت تھا۔ عزیز و اقربا تعزیت کے بہانے آتے اور ان کی حریص نظریں گھر کے سامان اور نیلوفر پر ہوتی تھی۔

بہت دن بعد نیلوفر نے ارحم کو غور سے دیکھا وہ بہت دبلا ہو گیا تھا۔

''بابا کاں ہے؟'' اُس نے توتلی زبان سے پوچھا تو ماں کے کلیجے پر چھری سی چل گئی۔ اب نیلوفر نے کلیجے پر پتھر رکھ کر ممی کے کپڑوں کی الماری کھولی پھر اشکوں کا سیلاب در آیا' سانس بحال ہوئی تو سوچا کہ آخر کب تک روؤں گی۔ ممی کے' پاپا کے' شہرین اور گڈو کے کپڑے سب غریبوں میں دے ڈالے' گھر کا سامان کچھ فروخت کیا کچھ یونہی دے ڈالا۔ پھر سسرال فون کیا تو ساس شمشاد بیگم نے اکھڑے لہجے میں بات کی۔

''آ جاؤ مگر قاسم تو اب اِدھر نہیں ہوتا ہے۔'' وہ حسب عادت خاموش ہو گئی۔

''آپ ڈرائیور سے کہہ دیں میں تیار ہوں۔''

''اچھا بہت جلدی گھر کی یاد آئی؟''
نیلوفر کا دل دھک سے رہ گیا' وہ یہ نہ جانتی تھی کہ ابھی تو ابتدا ہوئی ہے' آگے کتنی کڑی منزل اس کے لیے کھڑی ہے' گھر خالی ہوگیا' اُس نے ممی کے زیور سنبھال کے اٹیچی میں رکھے اور سسرال آ گئی' کوئی استقبال کرنیوالا نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گئی جہاں اُس کی و قاسم کی مشترکہ تصویر نے اُسے ویلکم کیا۔ گھر میں عجیب قسم کا سناٹا تھا دونوں جٹھانیاں بھی کچھ بدلی ہوئی نظر آ ئیں۔ چند دن گزرے تو ایک روز اچانک قاسم آ گیا۔ مگر اتنا مصروف کہ اللہ کی پناہ' اُسے یہاں سے مال دبئی بھجوانا تھا۔ یہاں کی فیکٹری بھی دیکھنی تھی اس لیے بیوی بچوں کی طرف دیکھنے کی زیادہ فرصت تھی۔ اُس پر تو نیلوفر کی سنائی ہوئی اس خوش خبری نے بھی کچھ زیادہ اثر نہیں کیا تھا کہ وہ بہت جلد ایک اور بچے کا باپ بننے والا ہے۔
دو دن رہنے کے بعد وہ واپس چلا گیا' لیکن نیلوفر کے دل میں ایک عجیب سی خلش چھوڑ گیا' ارحم کی مرتبہ تو قاسم نے اُس کا بہت خیال رکھا تھا' اب نہ ممی تھیں نہ پاپا' نہ بہن بھائی نہ قاسم' وہ اکیلی ہاسپٹل گئی' ایک میکے کی عزیزہ آنٹی فضہ جو رشتے میں اُس کی خالہ لگتی تھیں اور بہت غریب تھیں' اُن کی کھجور فیکٹری میں جاب تھی جو وقتی چھوٹ گئی تھی اُس نے انہیں بلا لیا تھا۔ وہی ارحم کو سنبھال رہی تھیں۔
جب نیلوفر نے شبیہ محمد کو جنم دیا تھا ایک مولوی صاحب اسپتال میں آئے تھے' یہ نام انہوں نے ہی تجویز کیا تھا۔ بیٹا یہ نام رکھو گی تو تمہارے دل کو سکون ملے گا۔ خیر وقت کیسا بھی کڑا ہو بالآخر گزر ہی جاتا ہے' سُو یہ قیامت کی گھڑیاں بھی گزر گئیں۔ اور وہ گود میں پیارا سا بیٹا لیے ہوئے خیریت سے گھر آ گئی' کسی نے بڑھ کر مبارکباد بھی نہیں دی۔ حتیٰ کہ نوکر ماسیوں تک کا رویہ بدل گیا تھا' اب نیلوفر کا دل کسی خطرے کی نشاندہی کر رہا تھا۔
چند ماہ اُنہی سرد رویوں میں گزر گئے' قاسم کا فون اب ہفتوں میں آنے لگا تھا' گھر کے فون سے اُسے کہیں بھی فون کرنے کی اجازت نہیں تھی' مگر کبھی کبھار وہ چھپ چھپا کے کر لیتی تھی' تو جس گھر میں پیسا پانی کی طرح بہایا جاتا تھا فون کے بل کے رونے شروع ہوجاتے' اُدھر اس کے بچوں کے خرچ کی باری آئی اِدھر کال پڑا' بچوں کے فیڈر بنانے مشکل ہو رہے تھے حالانکہ کچن میں بڑے سے برتن میں دودھ ہوتا لیکن جانے کیا تھا کہ جب نیلوفر دودھ لینے جاتی' بوا کہنے لگتیں۔
''ارے بھائی دودھ کم ہے' یہ تو پینے کے لیے کمروں میں جائے گا۔'' وہ آدھا آدھا فیڈر لے کر جب کمرے میں آتی تو خیال آتا کہ سب راج شوہر سے ہوتا ہے مگر شوہر تو بھابیوں کے بھی یہاں نہیں ہیں' یہاں آ کر اُس کا دل عجیب طرح دھڑکتا؟ اور پھر ایک دن ساس نے نیلوفر سے اُس کا کمرہ بھی لے کر اُسے تیسری منزل پر ایک ٹوٹا ہوا سا ٹھکانہ دے دیا۔
''ہمارے مہمان آ رہے ہیں امریکہ سے' جب چلے جائیں تو لے لینا۔'' سو چارو نا چار وہ اوپر آ گئی تھی۔
اوپر آنے کے بعد ارحم بھی چپ سا ہو گیا تھا۔ وہ اُسے بہلانے کی کوشش کرتی تو خود رو پڑتی' ذرا دل ٹھکانے آیا تو اُسے یاد آیا کہ آنٹی فضہ جو شبیر کے سلسلے میں اس کے پاس آتی تھیں کہا کرتی تھیں۔
''انسان کو چٹان کی طرح مضبوط ہونا چاہیے۔'' وہ خود جوانی میں بیوہ ہوگئی تھیں تب ایک بیٹا ایک بیٹی تھی بیٹا تین سال کا اور بیٹی چھ ماہ کی گود میں تھی' محنت مزدوری کر کے انہوں نے بچے پال لیے۔ بیٹی کی شادی کر دی اور بیٹا شادی کر کے الگ ہو گیا وہ پھر تنہا ہو گئیں۔ لیکن حوصلہ نہیں ہارا ہمت حوصلے سے پھر کھجور فیکٹری میں ملازمت کر لی۔ انسان جب دوسروں کے دکھ دیکھتا ہے تو اپنی مصیبت پہ صبر آ جاتا ہے آنٹی فضہ کے بارے میں سوچتے ہوئے اُسے نیند آ گئی تھی۔
دوسری صبح نیلوفر کے لیے قیامت کا پیغام لائی تھی۔ وہ کچن میں بچوں کا دودھ لینے گئی تھی گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا کہ اچانک اُس نے کچن کے سامنے سے ایک شخص کو گزرتے دیکھا' وہ چہرے سے ہی جرائم پیشہ معلوم ہوتا تھا' نیلوفر تیزی سے نیچے بیٹھ گئی اس طرح وہ اسے دیکھ نہیں پایا' وہ اس کی ساس کے

کمرے کی طرف جا رہا تھا' نیلوفر کا دل دھڑک اٹھا کچن سے ایک گلی نما راستہ اُس کمرے کی طرف جاتا تھا' وہاں ماسی جھاڑو وغیرہ رکھتی تھی۔ وہ چپکے چپکے اس طرف چل دی' کھڑکی کھلی تھی اور بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

''دولاکھ لگیں گے۔''

''دولاکھ؟''

''ہاں بی بی معاملہ ٹھکانے لگانے کا ہے۔''

''اگر ایسا ہوجاوے کہ بچے یتیم خانے میں اور ...کی ہمارے بعد کوٹھے پر تو پیسے کم ہوجائیں گے۔''

''نہیں ختم کرنا ہے۔ میرا بیٹا اس پر جان دیتا ہے' ...ں کے فون آرہے ہیں کہ بات کروادو' میں اُسے کسی ...رح ٹال رہی ہوں' یہ زندہ بچ گئی تو خطرہ ہے میں ...سری لاؤں گی تو کروڑوں کی جائیداد ساتھ لائے ...ی۔''

''بس......!'' خود کروڑوں اور ہمارے دو لاکھ ...ھی برے؟ بی بی پکڑے جاتے ہیں تو پھانسی ہوتی ...ہے۔ دو سے ایک پیسہ کم نہیں' لڑکے کو بول دینا بھاگ ...ئی۔''

''آدھے پیسے ابھی' آدھے پیسے جب کام ...و جائے۔'' یہ تمام گفتگو سن کر نیلوفر پسینے میں نہا چکی ...ی۔

''کل تین بجے میں اُسے کسی بہانے بچوں کے ...اتھ گلی کے کونے تک بھیجوں گی پھر تم نے اپنا کام کرنا ...ہے۔''

اب نیلوفر تھر تھر کانپ رہی تھی۔ لیکن وہ اُس ...لت میں بھی اپنے بچوں سے غافل نہیں تھی' بڑی ...کل سے بے آواز قدموں کے ساتھ وہ چپکے سے ...پر آگئی تھی۔ بچے سو رہے تھے اور وہ حواس باختہ۔

''میرے پاس چوبیس گھنٹے ہیں۔'' ایک ماں اس ...اندر سے بول رہی تھی۔

''دیکھو نیلوفر تم ایک پڑھی لکھی لڑکی ہو' اور اب تو نماز بھی پابندی سے پڑھنے لگی ہو خدا سے مدد مانگو' ...ں کی کپکپی ماند پڑنے لگی۔

مصیبت میں گھبرانا خود ایک مصیبت ہے' ہمت کرو' اور پھر اتفاق سے اس وقت بہت سارے مہمان آگئے خالہ ساس اپنے پورے خاندان سمیت آ پہنچی تھیں۔ نیلوفر نیچے چلی گئی اُس نے اپنے چہرے سے بالکل یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اُس پر کیا گزر رہی ہے؟ خالہ کے ساتھ اُن کے چھ بیٹے' بہوئیں' چار بیٹیاں اور پتہ نہیں کتنے پوتی پوتا نواسے نواسیاں تھیں' ماسیاں بہت سا کھانا پکا رہی تھیں' دودھ کا بھی بہت بڑا برتن بھرا ہوا تھا' سب سے بات چیت کر کے وہ اپنا کھانا و بچوں کا بہت سا دودھ سب کی نظر سے بچا کر اوپر لے آئی اوپر آکر پھر اس کی حالت خراب ہونے لگی' ہمت کر... اُس نے خود کو تسلی دی اور قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر اپنے سینے پر دم کرنے لگی' حوصلہ مضبوط ہونے لگا۔

کپڑے تو پہلے ہی اٹیچی میں رکھے تھے' اس وقت ضرورت ہے گرم کپڑے' کمبل اور پیسے' ایک لاکھ کی ایک گڈی جو قاسم نے منہ دکھائی میں دی تھی یونہی پڑی تھی' کچھ رقم پرس میں بھی تھی۔

اصل میں اُسے پیسے خرچ کرنے کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی' پاپا کے ہاں سب ممی دلواتی تھیں اور یہاں قاسم' اس لیے اتنے پیسے نکل آئے۔ نوٹوں کی گڈی اٹیچی کے خفیہ خانے میں محفوظ کی۔ ممی کے زیور بھی سنبھال کر رکھے' کمبل تہہ کیا اس کے ساتھ ہلکی سی دلائی بھی تھی۔

رات ہوتے ہی نیلوفر نے بچوں کو گرم کپڑے پہنائے' خود موٹا سوئٹر پہنا اور شال کو اچھی طرح لپیٹ کر تیار ہوگئی۔ نیچے سب کھانا کھا کر آرام کرنے لیٹ گئے تھے وہ لوگ دوسرے شہر سے آئے تھے اور جلدی سونے کے عادی تھے۔ اُس کی ساس شمشاد بیگم اپنی اِس بہن کو بہت چاہتی تھیں' وہ بھی بہن کے ساتھ باتیں کرتے سو چکی تھیں۔

☆......☆......☆

رات کے دس بج رہے تھے۔ یہ مکان پرانے وقتوں کا بنا ہوا تھا اس زمانے میں جمادارنی صفائی کرنے پچھلے دروازے سے آتی تھی' اس کے لیے لکڑی کا زینہ تھا جو اب خاصا بوسیدہ ہو چکا تھا۔ نیلوفر جانتی تھی کہ گیٹ پر چوکیدار بیٹھا ہے وہاں سے جانا

ناممکن ہوگا۔ زینہ پچھلی گلی میں اترتا تھا جو دن میں بھی سنسان رہتی تھی اور اب تو رات ہو چکی تھی، لیکن بچوں اور سامان کے ساتھ میں کیسے اتروں گی۔ اگر ایک رسی سے اٹیچی و کمبل نیچے اتار دوں تو......!

''رسی کہاں سے لاؤں......'' پھر اچانک اُسے کپڑے پھیلانے والے تار کا خیال آیا جو تھوڑی محنت کے بعد اُس نے کھول لیا' اُس میں اٹیچی کا ہینڈل باندھا' اور کمبل کے کیس کا ہینڈل بھی پھر بڑی ہی مشکل سے اُسے گلی میں اُتار کر تار چھوڑ دیا خوف سے دھڑکتے دل کے ساتھ ارحم کا ہاتھ پکڑے شبیر کو سینے سے لگائے وہ گول زینہ اترنا قیامت سے کم نہ تھا' لیکن خدا اُسے ہمت دے رہا تھا' اس کے پیروں نے زمین کو چھو لیا تھا۔ اُس نے جلدی سے اٹیچی سے تار الگ کیا تھا۔

''اصل منزل اب شروع ہوئی ہے دل پکارا......'' پرس ایک کندھے پر تھا' دوسرے پر شبیر سیدھے ہاتھ میں اٹیچی و کمبل کا ہینڈل پکڑ کر ارحم سے کہا۔

''بیٹا تم میری شرٹ پکڑو اور چلو۔'' تین سالہ ارحم ماں کی شرٹ پکڑ کر چلنے لگا' جلدی سڑک آ گئی تھی۔ ایک رکشہ آ رہا تھا۔

''اسٹیشن۔'' نیلوفر نے مضبوط لہجے میں کہا تھا۔

روہڑی اسٹیشن اُس کا دیکھا ہوا تھا۔

اسٹیشن پر رکشہ رکتے ہی ایک قلی بھاگ کر آیا تھا۔

''کہاں جانا ہے؟''

''لاہور جانا ہے۔'' اُس نے پکے لہجے میں کہا تھا۔

لاہور...... گاڑی کھڑی ہے لیکن ٹکٹ بلیک میں ملے گا۔''

''برتھ چاہیے پہلے ٹکٹ لاکر دو پھر پیسے دوں گی۔''

قلی چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ٹکٹ لے کر آ گیا۔ گاڑی میں بیٹھ کر نیلوفر کے ہوش ٹھکانے آئے مگر باوجود اس کے کہ وہ عبایا پہنے ہوئی تھی اسے ہر شخص اُس غنڈے کی طرح معلوم ہوتا' جسے اس کے اور بچوں کے قتل پر مامور کیا گیا تھا' گاڑی جب چل پڑی تو گرم کپڑ اور کمبل کی قدر بھی تب ہی پتہ چلی۔ سردی تھی کہ اللہ پناہ' کچھ کھانے کے لیے خریدا' بچوں کو دیا خود کھایا' ا پھر جو کمبل اوڑھ کر اُسے نیند آئی آنکھ کھلی تو صبح ہو تھی۔ فیصل آباد آ گیا۔ اس کے دل سے ڈر اب بہ حد تک کم ہو گیا تھا۔ اس کی برتھ اوپر کی تھی مگر ایک لڑ نے بدل اسے نیچے کی دے دی تھی۔ اس کا بچوں ساتھ جو تھا۔ اس نے بچوں کا منہ ہاتھ دھویا اپنا حل ٹھیک کیا۔ لیڈیز ڈبے میں یہ آرام ہوتا ہے۔ اب ا منزل سامنے تھی۔ ماڈل ٹاؤن میں ممی کے بھا ماموں قیصر الدین رہتے تھے' نیلوفر نے انہی کے جانے کا سوچا تھا۔ اور پھر لاہور آ گیا تھا قلی ڈبے اندر آ گئے تھے۔

ایک قلی نے اس کا سامان اٹھا لیا' باہر آ کر رک کر لیا' پتہ بھی با آسانی مل گیا لیکن اس دوران د دھڑا دھڑ دھڑک کر اپنے ہونے کا اعلان کرتا رہا' پر ممانی تھیں' بہت رسی ملیں اور مذاق میں یہ بھی ک دیا۔

''خیریت بمع ساز و سامان؟'' نیلوفر ہنس کر گئی تھی' شام کو ماموں آ گئے تھے۔ اُسے دیکھ کر خوش ہوئے۔

''بس ماموں جان! ممی یاد آ رہی تھیں' ویسے قاسم دبئی میں ہیں گھر میں سناٹا رہتا ہے تو میں سوچا کہ آپ سے مل لوں۔''

''ہاں ہاں! کیوں نہیں، خوشی سے رہو تمہار گھر ہے۔'' انہوں نے محبت سے کہا اور مامی ا گھورتی رہیں۔

نیلوفر بچپن میں سنتی تھی کہ کسی کا کسی کے گھر گز نہیں اور یہ بات اب سمجھ میں آ رہی تھی۔

ماموں کی دو بیٹیاں تین بیٹے تھے' ایک بیٹی شا ہو کر کینیڈا چلی گئی تھی۔ ایک بیٹا بھی باہر ہی تھا۔ باقی پڑھ رہے تھے بس اس لیے اس کو بیٹی کا کمرہ دے تھا۔

رات ہو چکی تھی سب سونے کے لیے لیٹ ر تھے۔ نیلوفر بھی بچوں کو لے کر کمرے میں چلی آ

تفکرات کا ایک طوفان تھا جو اس کی جانب چلا آ رہا
تھا۔ پتہ نہیں جب صبح ہوئی ہوگی تو گھر میں کیا ہوا ہوگا؟
مجھے ڈھونڈنے کے لیے ہر طرف بندے دوڑا دیے
ہوں گے، شکر تھا کہ شمشاد بیگم اس کے میکے کے لوگوں
کو زیادہ نہیں جانتی تھیں، ویسے بھی انہوں نے اسے بہو
تسلیم ہی کب کیا تھا۔ پھر تھوڑا یہ اطمینان ہی ہوا کہ
ماموں ایف آئی اے میں آفیسر تھے۔ ایک خیال آیا
تھا کہ قاسم سے بات کی جائے، مگر قاسم سے امید کم ہی
تھی، اس نے تو شادی کی رات گھونگھٹ اٹھا کر پہلی
بات ہی یہ کی تھی کہ میرے گھر والوں کو کچھ نہ کہنا؟ اور
ویسے بھی قاسم کون سا پہلے جیسا رہ گیا ہے، تو پھر کیا
کروں؟ ایک سرد آہ اس کے سینے سے خارج ہوگئی
تھی۔

دو تین دن کے اندر ہی نیلوفر کو اندازہ ہو گیا کہ
یہاں گزارہ مشکل ہے، ارحم ایسے ایسے سوال کرتا کہ
دل ٹوٹ جاتا۔

"ماما ہم بابا کے پاس کب جائیں گے؟ آپ
بس فون کریں نا؟" ارحم ایسے امید بھرے لہجے میں
بولا کہ اُس کی تسلی کے لیے نیلوفر نے نمبر نکالنے کے
لیے پرس کھولا، اور دل دھک سے رہ گیا، پھر سارا پرس
کھنگال ڈالا، پورے دس ہزار روپے غائب تھے ساتھ
ہی قاسم کا نمبر بھی، جان ہی تو نکل گئی، اُس نے دونوں
ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"ماما فون......"

"فون کہاں سے کروں بیٹا، نمبر کھو گیا ہے اور پھر
گھبرا کے اُس نے اٹیچی کھولی، خفیہ خانہ کھولا تو لاکھ
روپے اور جیولری موجود تھی۔ اُس کی جان میں جان
آئی تھی پھر اُس نے اپنی ہر شلوار میں جیب لگائی تھی،
ان چند دنوں میں اُس کو سبق پر سبق مل رہے تھے۔

ماموں کے گھر میں تیسرے روز صبح نیلوفر کی آنکھ
کھلی تو بڑی چہل پہل نظر آئی۔

کمرے سے باہر نکلی تو معلوم ہوا کہ ماموں کا بیٹا
عمیر اور بیٹی وطن واپس آ گئے ہیں۔ مامی کی خوشی کا
کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

"امی ہمارا سامان کون سے کمرے میں رکھا
جائے گا؟" عمیر کی آواز آئی تو اُس کا دل دھک سے
رہ گیا۔ سب کبھی اُس کی اور کبھی کمرے کی طرف دیکھ
رہے تھے، اُن کی خوشیوں کے درمیان حائل شرم سے
اُس کا سر جھک گیا۔

"تمہارے لیے ہم اپنا کمرہ خالی کر دینگے۔"
ماموں نے خوشدلی سے کہا تھا۔

"نہیں ماموں جان! میں لاؤنج میں سو جاؤں
گی۔" مامی کی نظروں میں ملامت دیکھ کر بے اختیار
نیلوفر کے منہ سے نکلا، یہ کہہ کر وہ واقعی کمرے سے اٹیچی
لاؤنج میں لے آئی۔

"ارے نیلو باجی! میں لاؤنج میں سو جاؤں گا۔"
عمیر بولا تھا۔

ماموں کے اشارے پر ماسی اُس کا سامان پھر
کمرے میں رکھ آئی تھی۔

رات کو یہ سوال اُس کے ذہن میں بری طرح
سے سر اٹھائے ہوئے تھا۔

کہاں جاؤں؟ بچے سو گئے اور پھر اُسے اس
طرح رونا آیا کہ ہچکی بندھ گئی، سانس آنا دوبھر ہو گیا،
کون تھا جو اُسے چپ کراتا۔

وہ لوگ جو شروع سے مصیبتیں دیکھتے ہیں۔ انہیں
اُس کا حل بھی آتا ہے، لیکن یہاں ایسا نہیں تھا، نیلوفر
اپنے والدین کی پہلی اولاد تھی، اس نے کبھی دکھ مصیبت
اور پرائے گھر کی پریشانی نہیں دیکھی تھی۔ صرف قاسم
سے شادی پر تھوڑا سا غلغلہ ہوا تھا، اور ممی پاپا کیوں منع
کر رہے تھے، یہ اُس کی سمجھ میں اب آ رہا تھا۔ اس کے
علاوہ اُس نے کوئی مصیبت نہیں دیکھی تھی۔ اب یہ
سوال کہ ننھے بچوں کے ساتھ کہاں جائے۔ دماغ ہلا
دینے کو کافی تھا۔

نیلوفر نے مامی کو اپنے اصل حالات کے بارے
میں کچھ نہیں بتایا تھا، ورنہ مامی تو مامی ماموں بھی چلتا
کرتے۔ ہفتہ ہونے کو تھا اُسے یہاں پناہ لیے ہوئے،
اب مزید پڑاؤ ممکن نہیں تھا۔

پھوپی تسلمیٰ اوباڈو میں رہتی ہیں، اُسے اچانک اُن
کا خیال آیا ہچکی رک گئی تھی۔ وہ اس پر غور کرنے لگی کہ
آنکھ لگ گئی۔ نیلوفر بچپن ہی سے خواب نہیں دیکھتی تھی،

لیٹی اور سوگئی اگر دیکھا بھی تو صبح آنکھ کھلتی تو یاد ہی نہیں رہتا تھا' بس ایک وہی منحوس خواب یاد تھا' جو اس کا سارا گھر لے گیا تھا۔

اب جو آنکھ لگی تو اُس نے خواب میں دیکھا کہ کھلا آسمان ہے' جیسے صحرا میں تخت بچھا ہے' وہ اس پر اکیلی بیٹھی ہے۔ سب گھر والے کہیں گئے ہوئے ہیں' شام کے سائے گہرے ہوئے تو پناہ کے لیے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی' بائیں ہاتھ پر ایک جھونپڑی ہے' جب اندھیرا چھانے لگا تو اُس نے جھونپڑی میں پناہ لے لی' وہاں مٹی کا چولہا بھی تھا' ایک لالٹین اور قریب ہی ماچس بھی رکھی تھی' اس نے اُسے جلالیا' کچھ ڈبے بھی تھے کھولا تو ان میں راشن رکھا تھا' سب کچھ ہے بس واش روم نہیں ہے غور سے دیکھا تو کونے میں دروازہ تھا۔ کھولا تو صاف واش روم تھا' یہ تو بہت اچھا ہے۔

اتنے میں لگا کہ بارش ہو رہی ہے' ہوائیں چلنے کی آوازیں بھی کان میں آئیں' اس کا دل دھڑک رہا ہے' پھر سوچتی ہے کہ دروازہ کھول کر دیکھے کہ باہر کیا حال ہے' دروازہ کھولنے کی ہمت نہیں ہوئی' ہاں جھری سے آنکھ لگا کر دیکھا۔ طوفانی ہوائیں اور بارش خدا کی پناہ! اگر ذرا سا بھی دروازہ کھولا سب اندر آئیں گی اور یہ جھونپڑی تنکا تنکا ہو جائے گی۔ سوائے خدا کے کوئی نہیں ہے جو طوفان میں اس جھونپڑی کو بچا سکے۔

بس یہاں اُس کی آنکھ کھل گئی۔ یا خدا! دہشت سے اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔ بس اِس وقت نیلوفر نے سوچ لیا کہ سلمیٰ پھوپی کے گھر پناہ لی جائے۔

صبح اُس نے روانگی کا اعلان کر دیا' مامی کے چہرے پر بشاشت دوڑ گئی' اُن کی بیٹی کے چہرے پر اطمینان نظر آیا ماموں گھر پر نہیں تھے۔

''اپنے ماموں سے مل لیتیں۔'' مامی نے خانہ پری کی۔

''جی مامی! انہیں فون پر خدا حافظ کہہ دوں گی۔'' وہ جانتی تھی کہ مامی نہیں چاہتیں کہ وہ ماموں کے سامنے جائے' وہ اُسے روکتے مگر اب نیلوفر کا فیصلہ اپنی جگہ پکا تھا۔ بچے اُن کا رونا' کیا پتہ کیسے آئی ہے کہیں میاں سے لڑائی تو نہیں ہوئی یہ ساری وہ باتیں تھیں جو نیلوفر کی سمجھ میں آرہی تھیں۔ اس کے رُکنے اُن کے گھر کا ماحول خراب ہو' یہ اُسے منظور نہیں تھا۔

''اچھا مامی! رانی' عمیر سب کو خدا حافظ۔''

''سب سامان رکھ لیا؟ ویسے بیٹیاں سسرال م ہی اچھی لگتی ہیں۔'' مامی نے دوبارہ آنے کا راستہ کیا تھا۔ اُن کا ڈرائیور مسلسل ہارن دے رہا تھا۔

ٹرین میں بیٹھ کر نیلوفر کی آنکھیں بری طر چھلک پڑیں' اب دیکھو سلمیٰ پھوپی کے ہاں کیا ہ ہے؟ بچپن میں ایک بار ممی پاپا کے ساتھ اُن کے گھر تھی۔ بڑا سا گھر تھا کچا پکا؟ وہ ملی بہت محبت سے تھیں اسی لیے اس کڑے وقت میں اُن کا خیال آیا تھا' سارے گھر کے مرنے پر بھی آئی تھیں اور اُسے گلے کر بہت دیر روتی رہی تھیں' یہی وہ باتیں تھیں جو نیلو کے لیے اُن کا دروازہ نظر آیا تھا۔ ٹکٹ تو اُس نے سکو کے منگوائے تھے لیکن اترنے کا فیصلہ ڈہرکی پر تھا۔

ساری رات کے سفر کے بعد ڈہرکی آگیا ا سفر آسان نہیں ہوتا' دل بہت دھڑک رہا تھا جب ا نے اسٹیشن پر قدم رکھا' تانگہ تیار تھا' بس اڈے پ کر وین میں بیٹھے ہوئے وہ پسینے میں نہا چکی تھ کنڈیکٹر کی اوباڑوا باڑو کی آوازوں کے ساتھ س کی نظریں اس پر بھی تھیں' ننھے شبیر کو گلے لگا کر ارحم ہاتھ سختی سے پکڑے' نیلوفر کے کان میں ایک ہی جم گونج رہا تھا۔

''لڑکی ہم سے گزر کر کوٹھے پر، بچے یتیم خا میں۔'' پھر قرآنی آیات کا خیال آیا تو دل سکون پا لگا۔ کچھ دیر گزری تو اس کی منزل آگئی۔ شکر ہے کہ گ اسٹاپ کے بالکل نزدیک ہی تھا' لیکن یہ لوگ ا حلیے سے الگ معلوم ہوتے تھے اس لیے مقامی لوگ غور غور سے دیکھ رہے تھے کہ گھر آگیا۔

''امی دیکھیں کون آیا ہے؟'' ثنا کی آواز پر سا گھر جمع ہو گیا۔ استقبال بہت اچھا تھا' دل کو قرا آگیا۔ گھر تو بہت بڑا تھا لیکن کمرہ ایک ہی تھا' سا گھر دن زیادہ تر صحن میں وقت گزارتا' رات کو کمر میں ہوتے' لیکن سردی کا زمانہ تھا' بچوں کی عادت تھی پھر کمرے میں صرف افراد خانہ ہی کی گنجائش

پھوپو کے سات بچے تھے چار بیٹیاں‘ تین بیٹے‘ پھوپا کا مزاج انتہائی کڑوا تھا‘ لیکن سب اسی کمرے میں کیسے سوتے تھے اسے روز حیرت ہوتی‘ پھوپو کی دو بیٹیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں‘ وہ اپنے گھروں میں خوش تھیں باقی حنا اور ثنا تھیں۔ جواد‘ فواد اور چھوٹا عماد کمرے میں کل پانچ چارپائیاں بچھتی تھیں۔ ایک پر پھوپو چھوٹے عماد کو لے کر سوتیں‘ ثنا سے چارپائی لے کر اسے دے دی تھی‘ ایک پر پھوپا ایک پر فواد ایک پر جواد‘ اب حنا اور ثنا ایک چارپائی پر سوتیں تو اُن کی لڑائی ہوتی جگہ کم تھی اور افراد زیادہ‘ خود اُسے دو بچوں کو سلانے کے بعد اپنے لیے جگہ نکالنی مشکل ہوتی۔

دو تین دن اسی عالم میں گزر رہے‘ چوتھے دن نیلوفر نے دیکھا ان کے صحن کے ایک کونے میں موجود ایک جھونپڑی کی پھوپی صفائی کر رہی تھیں۔

”ہائیں پھوپو یہ کیا کر رہی ہیں؟“

”ارے جگہ کم ہو جاتی ہے ہم یہاں سو جایا کریں گے‘ پہلے یہاں بکریاں باندھی جاتی تھیں‘ پھر وہ بک گئیں تو آمنہ یہاں پڑھائی کرنے لگی۔“

”ارے نہیں پھوپو اچھی بھلی جگہ ہے میں بچوں کے ساتھ یہاں رہ جاؤں گی۔“

پھوپو کا شاید پروگرام ہی یہ تھا‘ تھوڑی دیر میں نیلوفر نے اپنی اٹیچی یہاں رکھ لی۔ لائٹ کے نام پر پھوپو کے ہاں صرف دو پیلے بلب تھے۔ اور ہوا کے لیے ایک پیڈسٹل فین‘ خیر ابھی تو سخت سردی تھی‘ دسمبر کا مہینہ تھا‘ لیکن بہت بڑی پریشانی یہ تھی کہ اس کی جھونپڑی لائٹ سے محروم تھی‘ ایک بلب پھوپو کے کمرے میں ایک صحن میں جلتا تھا‘ صحن بہت بڑا تھا۔ شام ہونے لگی‘ کیا ہم اندھیرے میں رہیں گے؟ بچے بہت ڈریں گے۔ پھر فوراً ہی نیلوفر کا دھیان اس کی طرف چلا گیا جو ستر ماؤں سے زیادہ شفیق و مہربان ہے۔ اُس نے دُکھے دل سے اس سے مدد طلب کی اور اسی وقت پھوپو لالٹین لے کر آتی ہوئی نظر آئیں۔

”لو بیٹا! اندھیرا ہو رہا ہے یہاں بلب نہیں ہے تمہارے ابا نہ لگاتے ہیں نہ لگانے دیتے ہیں۔“ اسے پھوپا کی خونی آنکھیں یاد آ گئیں۔

لالٹین سے کچھ اجالا ہوا اس کا دل عجیب انداز سے دھڑک رہا تھا‘ جیسے کوئی بہت بڑی مصیبت منہ کھولے کھڑی ہو‘ آنکھیں بھیگیں‘ رخسار تر ہوئے دامن نم ہو گیا۔ ارحم خوفزدہ نظروں سے مما کو دیکھ رہا تھا‘ اُس نے سامنے نظریں دوڑائیں پھوپو کے باورچی خانے میں سب کھانا کھا رہے تھے۔ خوب رونق تھی پھوپا بھی اپنے بچوں میں خوش تھے‘ ہنس رہے تھے۔

”یہ تمہارے کمرے سے نکلنے کا جشن ہے۔“ اس کے اندر سے آواز آئی۔ کوئی کسی کے گھر میں کب تک رہ سکتا ہے؟ ویسے میری جگہ اگر پھوپو کی بیٹی ہوتی؟ اُسے اس طرح اندھیری جھونپڑی میں رکھا جاتا؟

پھوپو کے بچے کھانا کھا کر سونے جا رہے تھے‘ پھوپو اُسے ٹرے میں کھانا دے گئیں بچا ہوا۔ نیلوفر کا دل بھر آیا تھا اور پھر جب وہ سونے لیٹی آنسو رُکنے کے آثار ہی نہیں تھے یہاں سردی بہت تھی۔ ارحم بھی پہلے اس کی طرف دیکھتا رہا‘ پھر اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رویا کہ ماں کا کلیجہ شق ہو کر رہ گیا‘ اس بات سے بے خبر کہ ابھی تو اس کے مقدر کے ترکش میں بہت سے تیر باقی تھے۔

”ماما گھر چلیں‘ بابا کب آئیں گے؟“ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ دوسری صبح پھوپو کی بڑی بیٹی آمنہ بمعہ دادی اماں تشریف لے آئیں‘ اس کی دادی اماں تشریف لے آئیں‘ اُس کی دادی یعنی پھوپو کی ساس اس کے ساتھ (سوئی) میں رہتی تھیں‘ اُسی کے دوسرے بھائی سے دوسری بہن ضامنہ کی شادی ہوئی تھی‘ وہ دوسرے گھر میں رہتی تھی۔ اس کا بھی فون آ گیا تھا کہ پہنچنے والی ہے‘ گھر میں خوب رونق ہو گئی تھی۔ حنا اور ثنا اُن کے بچے اٹھائے خوش خوش پھر رہی تھیں‘ نیلوفر کے دل میں کچھ ٹوٹ رہا تھا کسی نے اس طرح اس کے بچے کبھی نہیں اٹھائے۔

”کوئی بات نہیں...... یہ اُن کی سگی بہن ہے۔“

ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ چاروں بہنیں‘ نیلوفر سے کچھ جیلس بھی تھیں اس کی وجہ وہی شہر گاؤں کا پرانا مسئلہ تھا‘ دوسری جانب نیلوفر کے گھر کا اسٹینڈرڈ اُن

سے الگ تھا‘ مگر اب وقت بگڑ گیا تھا‘ خدا نے اسے اُن کے دروازے پر لا پھینکا تھا تو بدلا لینے کے لیے اس سے بہتر کون سا وقت ہوتا‘ ایسی طنزیہ باتیں کی جاتیں کہ دل‘ بادِ مخالف کے تھپڑے برداشت نہیں کر پاتا‘ اور کرچی کرچی ہو جاتا۔ باوجود اس کے نیلوفر اپنی ضرورت کی ہر چیز اپنے پیسوں سے منگواتی لیکن پھر بھی دادی یونہی کہتیں۔

”ہاں بھئی لنگر خانہ کھلا ہے۔“ ارحم اور شبیر روتے رہتے‘ کوئی گود میں نہیں اٹھاتا۔ نیلوفر سمجھتی تھی کہ یہ سب اشارے تھے‘ ہمارے گھر سے جاؤ۔ ان کے گھر کھانے میں مرچیں بہت ڈالی جاتی تھیں نیلوفر سے کھائی نہیں جاتی‘ پھوپو پہلے جو چینی میں تھوڑا سا اصلی گھی ڈال کے دے دیتی تھیں۔ اب ساس کے ڈر سے خاموش تھیں۔ سالن دیکھ کر ہی اس کی سرخی سے اُسے خوف آتا وہ چپ چاپ کھانا چھوڑ کر اٹھ جاتی‘ کوئی یہ بھی نہیں کہتا کہ بھوکی کیسے رہو گی؟“

یہ میدانی علاقہ تھا آندھیاں آتیں، ایک دن اس زور کی آندھی آئی کہ صحن میں رسی پر لٹکے ہوئے سب کپڑے اور چولہے کے قریب رکھے سب برتن اڑ گئے‘ نیلوفر حیران رہ گئی‘ اُس نے ایسی آندھی کبھی نہیں دیکھی تھی‘ جلدی سے بچوں کو کس کر پکڑ لیا کہ کہیں اڑ نہ جائیں‘ اب جھونپڑی کی بھی فکر ہوئی‘ مگر خدا نے رحم کیا۔ کچھ دیر کے بعد حالات معمول پر آ گئے۔

رات کو لالٹین میں تیل نہیں تھا‘ اُس نے بھی روشنی سے انکار کر دیا۔ شکر ہے یہاں رات جلدی ہو جاتی تھی اس لیے بچے سو گئے تھے۔ مارے خوف کے وہ دونوں بچوں سے لپٹ گئی تھی۔

”قاسم اور کتنی ٹھوکریں کھلواؤ گے؟“ اُس کے دل سے صدا نکلی پھر اُسے غندے سے ساس کا یہ کہنا یاد آیا کہ قاسم روز بیوی بچوں کا پوچھتا ہے‘ اس کا مطلب قاسم ہمیں بھولے نہیں لیکن اب کوئی نمبر‘ کوئی ایسا نہیں تھا جس سے قاسم کا اتہ پتہ مل سکے‘ اگر کہیں پتہ کرنے نکلوں بھی تو بیچ میں ساس‘ اُن کے رشتہ دار ہیں‘ کون بتائے گا؟“ سرد آہ نے کلیجہ ہی ہلا دیا تھا۔

اگلی صبح پھوپو جھونپڑی میں آئیں‘ لگتا تھا کچھ کہنا چاہتی ہیں؟“ جی پھوپو بولیں۔ نیلوفر نے ڈگمگاتے دل کے ساتھ کہا۔

”نہیں بس وہ......“ پھوپو کچھ ملول سی بولیں۔

”اگر تم برا نہ مانو تو اپنا کھانا یہاں پکا لیا کرو‘“ انہوں نے کونے کی طرف اشارہ کیا۔

”تم اتنے پیسے بھی خرچ کرتی ہو‘ پھر بھی بھوکی رہ جاتی ہو‘ کمزور ہو گئی ہو۔ ہم تمہیں برتن دے دیں گے۔“ پھوپو واقعی کچھ برتن لے آئیں اور اینٹوں کا چولہا بھی بنا دیا۔ نیلوفر نے چولہا جلا لیا‘ اُسے کہیں پڑھا ہوا قول یاد آیا۔

”ہر بلا کے پیچھے رحمت ہے۔“ اپنے ہاتھ سے پکایا ہوا کھانا زمانے کے بعد پیٹ بھر کر کھایا‘ اور تو اور بچوں نے بھی سیر ہو کر دودھ پیا‘ اُس نے کھیر پکا دی تھی خوب خوش ہو کر کھائی تھی۔

نیلوفر کو یہاں آئے بیس روز کے قریب ہو رہے تھے۔ اب ہر روز ایک نئی کہانی اُس کی منتظر ہوتی‘ پھوپو کی ساس نے اس کے یہاں رہنے پر پتہ نہیں کیا کیا فسانے تراش کر محلے میں پھیلا دیے تھے۔ اُس نے اپنی ساس کو مارا ہے تب ہی انہوں نے گھر سے نکال دیا ہے‘ میاں نے چھوڑ دیا ہے جب ہی یہاں رہتی ہے۔ مجھے لگتا ہے دیور سے چکر تھا۔ واقعی اُن کا دماغ بے حد غلیظ تھا۔

یہ سب باتیں اُن کی طرف ہوتیں‘ تھوڑی بہت آوازیں اِدھر آتیں تو وہ سر تھام لیتی یا اس کی کوئی ہمدرد بتا دیتی تھی۔

پھوپو کے پوچھنے پر اُس نے بتایا تھا کہ قاسم کا دبئی میں بزنس ہے‘ وہ وہیں ہیں‘ گھر کی مرمت ہو رہی ہے اس لیے ساس اپنے میکے اور جٹھانیاں بھی اپنے اپنے میکے گئی ہیں‘ میرا میکہ چونکہ ختم ہو چکا ہے اس لیے میں آپ کے گھر آ گئی ہوں۔“ لیکن قاسم کے خیر خبر نہ لینے پر انہیں بھی تشویش تھی۔

کبھی کبھی تو نیلوفر کا دل چاہتا کہ جھونپڑی سے قدم نہ نکالے‘ لیکن لکڑیاں فروخت کے لیے اونٹ پر آتیں‘ خریدنے دروازے پر جانا پڑتا۔ پانی کے لیے صحن میں ہینڈ پمپ تھا‘ ایسا لگتا جیسے وہ پتھر کے دور میں

سفر کر رہی ہو۔ اُدھر پھوپا صاحب کا حال یہ تھا کہ وہ اپنی اولاد سے ہی عاجز تھے۔ تو پھر اس کا وجود سالے کی بیٹی! انتہائی نفرت بھری نگاہ سے دیکھتے' اُن کے آتے ہی گھر میں سناٹا چھا جاتا' اُن کے بچے کونے کھدروں میں چھپتے پھرتے' پھر آج کل تو بیٹیاں آئی ہوئی تھیں' خرچ بڑھ گیا تھا لہٰذا ان کا چڑچڑا پن عروج پر تھا۔

ایک رات جب ہولناک سناٹا چھایا ہوا تھا سوتے ہوئے تمام خیالات ہجوم بنا کر اس کے سامنے رقص کر رہے تھے۔ اُس کو خیال آیا بیشک کہ پھوپا نفرت کرتے ہیں لیکن بدنظر نہیں ہیں' اگر خراب نظر ہوتے تو یہاں رہنا کتنا مشکل ہو جاتا' پتہ نہیں کب اُس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

صبح شور سے آنکھیں کھلیں تھیں۔ رات چور آئے تھے انہوں نے بڑی نقب لگائی تھی لیکن شکر خدا کا سب بچ گیا تھا۔ اس کے پاس اپنے جہیز' بری اور ممی کے زیورات یعنی کل جیولری کم از کم ڈیڑھ کلو سونا تھا' سونے موٹے ٹھوس کڑے سونے کی پازیب قاسم بڑے شوق سے لایا تھا۔ اُس نے اٹیچی چیک کی روپے اور جیولری سب موجود تھا۔ اُس نے تو کسی کو بتایا بھی نہیں تھا کہ میرے پاس اتنی بڑی مالیت کے زیورات موجود ہیں۔ دل بہت پریشان ہوا کہ ابھی تو بچ گئے آگے کیا ہوگا؟

لوگ کہہ رہے تھے چوروں نے پاڑ یعنی نقب لگائی تھی لیکن بچوں کی آوازوں سے بھاگ گئے ہوں گے۔ آمنہ کے بچے رات بہت رو رہے تھے' خیر اب وہ چاروں بہنیں انتہائی طنزیہ باتیں کرتیں۔

''انسان کو خدا کے قہر سے ڈرنا چاہیے' بڑے بڑے بنگلے کوٹھی والے جھونپڑی میں رہنے لگے۔'' حنا کہتی تنا ٹھٹھہ لگاتی۔ نیلوفر دل میں سوچتی کہ ''ڈرنا چاہیے تو پھر ڈرو؟''

دادی کی زبان ہری مرچ تھی لیکن ہر انسان میں بری دونوں طرح کی خوبیاں اور خامیاں ہوتی ہیں ایک دن دادی نے اسے پاس بٹھایا پھر کلام پاک کا چھوٹی موٹی غلطی ہوئی اُسے ٹھیک کر دیا' یہ تو بہت بڑا احسان تھا لیکن اس کے اگلے دن وہ ہوا جو نیلوفر کی سوچ سے باہر تھا۔ جواد بھائی کسی کام سے اُس کی جھونپڑی میں آئے ہزار کا کھلا درکار تھا' اس نے دے دیا عین اسی وقت دادی اُدھر آ گئیں اور اُسے ایسی نظروں سے دیکھنے لگیں کہ اللہ کی پناہ!

نیلوفر کو اپنی حالت پر بہت رونا آیا رات کو اُس پر بخار چڑھ دوڑا' وہ بھی ایک سو چار ڈگری! اُسے کچھ ہوش نہ رہا' ہوش آیا تو صبح سے شام ہو گئی تھی' بچے بھوک سے بلبلا رہے تھے' کوئی حلق میں پانی ڈالنے والا نہیں تھا' وہ بمشکل نلکے تک آئی' حنا پانی بھر رہی تھی۔

''ابھی ٹھہریں پہلے میں بھرلوں۔'' یہ دیکھ کر بھی بولی کہ اس میں کھڑے رہنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔

اُن کی طرف سے آوازیں آ رہی تھیں۔

''یہ آخر کب جائے گی؟''

''یہ پانی جواد بھائی کے لیے لے جا رہی ہیں؟''

یہ کہہ کر حنا بے اختیار ہنس پڑی۔ نیلوفر نے ایک لفظ نہیں کہا۔ حنا کے جانے کے بعد پانی پیا جھونپڑی میں آئی چولہا جلایا دلیہ پکایا اور روتے ہوئے ارحم کے ساتھ اپنی بھوک بھی مٹائی شبیر کو دودھ پہلے ہی دے چکی تھی۔ بخار اتر گیا تھا لیکن اُس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ زبان کے زخم گھائل کر چکے تھے۔

اب رات تھی بچے سو گئے تھے۔ اُن کی ساری باتیں دماغ میں گھوم رہی تھیں۔ جواد بھائی کو وہ سگے بڑے بھائی کی جگہ سمجھتی تھی اور وہ سب' اُس کا رواں رواں رو رہا تھا۔

''نیلوفر چل خدا کے لیے یہاں سے چل' پیسے بھی ختم ہو رہے ہیں۔'' دل نے آواز دی تھی۔

''کہاں جاؤں۔'' یہ کہہ کر اُسے اِس بری طرح رونا آیا تھا کہ سانس اکھڑی جاتی تھی پھر حواس ٹھکانے آئے تھے۔

''کراچی چلتے ہیں پاپا کہتے تھے کہ کراچی کی زمین ماں کی گود کی طرح ملک کے بچوں کو سمیٹ لیتی ہے۔'' ذہن نے مشورہ دیا تھا۔

''سردی بہت ہے بچے چھوٹے ہیں۔'' اندر سے

آواز آئی۔

''بچوں کے لیے ہی تو یہ سوچا ہے' مر ہی تو رہی تھی بخار سے' کسی نے حلق میں پانی بھی نہ ڈالا۔ چل ہمت کر خدا کی ذات بہت بڑی ہے' اس کی زمین بہت بڑی ہے نیلوفر کو جمال چچا کا خیال آیا' وہ ڈرگ روڈ پر رہتے تھے' اُسے ان کے گھر کا راستہ بھی تھوڑا بہت یاد تھا۔ نمبر 4 میں پہنچ کر تو راستہ زبانی یاد تھا۔

نیلوفر اللہ کا نام لے کر اٹھ گئی سامان پیک کیا' تقریباً دو کلو دودھ بڑے تھرماس میں رکھا چھوٹے تھرماس میں چائے اور کھانے پینے کا کچھ سامان پیک کر کے بچوں کو بستر سے اٹھایا اور کمبل دلائی پیک کر لیے' ارحم کو تیار کیا خود بھی چینج کیا ڈبل ڈبل سوئٹر خود پہنے اور بچوں کو پہنائے' اٹیچی بستر گھسیٹ کر دروازے تک لے آئی۔

''پھوپا اسٹیشن کے لیے گاڑی روک دیں۔''

اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے' پھوپو واش روم کے لیے اٹھی تھیں۔

''جا رہی ہو؟''

''جی پھوپو۔'' پھوپا دروازہ کھول کر نکل گئے تھے۔

''پھوپو یہ رکھ لیں۔'' اس نے دودھ کے پیسے اُن کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ ''دودھ والا آئے تو اسے دے دیجیے گا۔''

''اچھا......'' کہہ کر انہوں نے پیسے رکھ لیے تھے۔ یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ بے خانماں مسافر کہاں کا ارادہ ہے۔

''گاڑی آ گئی ہے...... اچھا خداحافظ خداحافظ۔'' بس یہی وہ احساس تھا جسے وہ زندگی بھر بھلا نہیں سکتی تھی۔ اتنی پریشانی کے باوجود نیلوفر نے جونہی قدم گھر سے باہر نکالا' لگا منوں بوجھ اتر گیا۔ حتیٰ کہ ساس شمشاد بیگم کا خوف بھی جو ہر وقت اُس کے وجود کا احاطہ کیے رہتا تھا وہ پورے اعتماد سے بچوں کو لے کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ روہڑی دو گھنٹے میں آ گیا' ابھی اندھیرا تھا' کراچی کے لیے گاڑی تیار تھی۔ اکیلے سفر کر کے اس کا اعتماد بحال ہو گیا تھا۔ قلی سے ہی سیٹ لے لی' سیٹ پر بیٹھ کر بچوں کو فیڈر دی' بچے بھی خوش تھے' ارحم نے خود بھی تالی بجائی' بھائی کو بھی سکھائی' وہ

غزل

اکیلا ہوں کہ تنہائی بہت ہے
کسی کی یاد بھی آئی بہت ہے

مجھے ہر جائی آنکھوں نے بنایا
مری آنکھوں میں بینائی بہت ہے

محبت...... اور یہ عمرِ گریزاں
تعارف اور شناسائی بہت ہے

تعلق توڑنا آساں ہے لیکن
جدا ہونے میں رسوائی بہت ہے

تری سوچوں سے عاجز ہوں میں جاوید
تری سوچوں میں گہرائی بہت ہے

عبداللہ جاوید

بھی بجانے لگا۔ نیلوفر نے آیت الکرسی پڑھ کر اپنے سینے پر دم کیا اور بچوں پر بھی' پھر تو لگا کہ جیسے کچھ وزن ہی نہ ہو' سارا وجود ہلکا ہو گیا۔

اللہ کہتا ہے...... میری رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو' پر میں نے تو کوئی رسی نہیں دیکھی جو آسمان سے لٹکتی ہو' یہی وہ رسی ہے انسان کا اپنے رب سے واسطہ' اس کے نور کی رسی' ہمارے قلب تک پہنچتی ہے۔ بس میرے رب تو میری مدد فرما اپنے نبی ﷺ کے صدقے میں معصوم بچوں پر رحم فرما۔ نیلوفر نے قبلے کا تعین کر کے نماز کے لیے نیت باندھ لی۔ ٹرین چل پڑی تھی۔ نماز تمام کر کے تھرماس سے چائے نکالی' پرس سے بسکٹ' غذا شکم میں پہنچی تو سکون ملا...... ''اب دیکھو کیا ہوتا ہے۔''

کراچی آ گیا تھا۔ وہ تو خیر پور کے بعد ہی سو گئی تھی' شبیر ایک زانو پر دوسرے پر ارحم' پھر جو آنکھ کھلی ٹرین کراچی کی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔ لانڈھی آ گیا تھا۔ لوگ اتر رہے تھے۔ اس نے بھی سامان سمیٹ لیا۔

''اب ڈرگ روڈ ہے۔'' کوئی بولا۔ اور واقعی کچھ ہی دیر میں اُس کی منزل آ گئی تھی۔

جمال چچا کا گھر بھی آسانی سے مل گیا تھا۔ وہ بہت اچھی طرح ملے' چچی راحت بھی خوش تھیں۔ رات کو انہوں نے نیلوفر سے کہا۔

''ہاں بھئی اب صاف صاف بتاؤ کیا بات ہے؟''

نیلوفر نے کہنا شروع کیا۔ جھوٹ نہیں' بالکل سچ اور بری طرح اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ چچی راحت لیکچرار تھیں۔ مقامی کالج میں پڑھاتی تھیں۔ انہوں نے اُس کا مسئلہ سنا اور کھردرے لہجے میں بولیں۔

''نہ یہاں کوئی کسی کے بچے رکھتا ہے نہ کسی کو اپنے گھر میں رکھتا ہے۔ میں تمہارے لیے کل کوئی مکان دیکھوں گی' اور بچے ٹیوشن کے لیے۔''

صبح چھٹی تھی انہوں نے فون گھمانا شروع کیا پھر اُس کو لے کر نکلیں محلے ہی میں ایک کمرے کا مکان مل گیا' تھا چھوٹا لیکن ہوادار تھا۔ نیلوفر اسی رات اُس گھر میں شفٹ ہو گئی تھی۔

وہ پھوپو کی جھونپڑی تھی یہ کرائے کا مکان' لیکن دل کی حالت اب بہت بہتر تھی۔ بچوں کو ٹیوشن پڑھانا آسان نہیں تھا لیکن راحت چچی نے اس کی صحیح معنوں میں مدد کی تھی' ان کے لیے اس کے دل سے دعا نکلتی' گھر میں گیس بجلی پانی فون سب موجود تھا۔ زندگی بہت مشکل نہیں رہی تھی۔ لیکن رات کو اسے جب تنہائی میں اس غنڈے کا خیال آتا تو ڈر لگتا اور وہ قاسم سے ملنے کی دعا کرتی۔ ہر بلا کے پیچھے رحمت ہے' مصیبتوں نے اسے اللہ سے بہت قریب کر دیا تھا اب وہ پابندی سے نماز پنجگانہ کے ساتھ تہجد بھی پڑھنے لگی تھی۔ اس کی شہابی رنگت بھی لوٹ آئی تھی۔ پڑوس میں میلاد تھا' وہ جانے کے لیے تیار ہوئی راحت چچی نے اُسے دیکھا تو بس دیکھتی رہ گئیں۔ پھر کہنے لگیں۔

''میں نے جو بھی مشورے تمہیں دیے سب کار آمد تھے' اب آخری مشورہ یہ ہے کہ کسی اچھے عالم سے مشورہ کر کے فسخ نکاح کا فتویٰ لے کر دوسری شادی کر لو۔''

''چچی...... ! اللہ نے میرے بچوں کو باپ سے الگ کر دیا ہے' میں ماں بھی چھین لوں۔''

''میرا کام سمجھانا تھا سمجھا دیا۔'' وہ اسی لہجے میں بات کیا کرتی تھیں۔

نیلوفر اب نماز کے بعد سجدے میں پڑی روتے ہوئے پہلے اللہ کی ہر نعمت کا شکر ادا کرتی پھر دعا۔

''اے اللہ تو قادر ہے' سب کچھ کر سکتا ہے تو کوئی معجزہ کر دے کسی بھی طرح کسی بھی صورت مجھے میرے شوہر میرے بچوں کے باپ قاسم سے ملا دے۔''

☆......☆......☆

ارحم اب اسکول جانے لگا تھا۔ وہ شام کو بچوں کے ساتھ کھیلتا تھا۔ اس شام وہ بہت تیزی سے بھاگتا ہوا گھر میں داخل ہوا تھا اور کچن میں گھس گیا تھا۔

''ارحم بیٹا کیا ہوا؟'' مگر وہ تو ماں کی بات سنی ان سنی کر کے ایک جگ میں پانی بھر کے باہر نکل گیا تھا۔

نیلوفر نے دروازے سے جھانک کر باہر گلی میں دیکھا تھا۔ ایک گاڑی گلی کے کونے پر کھڑی تھی۔

''کسی آدمی نے پانی مانگا ہے' اس کی گاڑی بند ہوگئی ہے۔'' پڑوس کی خالہ نے کہا تھا۔ ارحم بھاگتا ہوا واپس آرہا تھا۔

''ماما......!'' اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

''ماما وہ بابا ہے۔'' یہ کہہ کر ارحم پھر جگ بھر کر نکل بھاگا تھا۔ نیلوفر تو جیسے اپنی جگہ پتھر ہوگئی تھی۔

''بیٹے! تم تو بڑے پیارے ہو تمہارا نام کیا ہے؟'' گاڑی والے شخص نے پوچھا تھا۔

''محمد ارحم اور میرے بابا کا نام قاسم علی شیخ ہے۔''

''یہ یہ ارحم کیا کہہ گیا ہے؟'' نیلوفر گومگو کے عالم میں گھر کے دروازے پر گئی تھی۔ اور باہر گلی میں جھانکا تھا۔ اُسے ایک شدید جھٹکا لگا تھا۔ گویا معجزہ رونما ہوگیا تھا۔

قاسم نیلوفر کا اپنا قاسم' اپنے سات سالہ بیٹے ارحم کو گود میں اٹھائے چلا آرہا تھا۔

''ق......ق......قاسم!'' اور پھر قاسم کے لیے اُس نے دل و مکان کے دروازے کھول دیے تھے کوئی لحاظ کیے بغیر وہ بے ساختہ اُس سے لپٹ گئی تھی آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔

راحت چچی دم بخود یہ سارا منظر دیکھ رہی تھیں۔

''خوش رہو نیلوفر' ابھی میں چلتی ہوں' تم لوگوں کی تنہائی میں مخل ہونا نہیں چاہتی۔'' انہوں نے مسکرا کر نیلوفر کو دیکھا تھا۔

''تمہاری لگن واقعی سچی تھی' تمہاری دعا میں بڑی طاقت ہے۔'' یہ کہہ کر وہ چلی گئی تھیں۔

اُس رات دونوں نے اپنی کہانی سنائی تھی۔

''میں ہر فون میں امی سے تمہارا اور بچوں کا پوچھتا تھا؟ تم میری جان تھیں اور ہو' بچے میری زندگی میرا اثاثہ تھے اُن کے بغیر میری زندگی لاحاصل تھی' شروع میں تو وہ بات نہیں کرواتی تھیں' پھر کہا کہ تم بچوں کو لے کر کہیں چلی گئی ہو' میں پہلی فلائٹ سے گھر آگیا' انہوں نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھالی۔ میں نے تمہیں بہت ڈھونڈا سب جگہ۔ پتہ کیا مجھے جب بھی کوئی تمہارا سراغ ملتا میں بڑی امید لے کر وہاں جاتا اور مایوس لوٹ آتا' دل میں طرح طرح کے وسوسے جنم لیتے' دوسری طرف ہمارے کاروبار میں ترقی تو بہت ہوئی لیکن یہ پیسا بری چیز ہے' ہم بھائیوں میں پھوٹ پڑ گئی' میں اپنا حصہ لے کر پاکستان آگیا' اُدھر ماں نے سکھر والی کوٹھی بیچ دی تو ہم کراچی شفٹ ہوگئے' میں نے یہیں کورنگی میں ایک چھوٹی آئل مل لگالی ہے۔

کچھ عرصے پہلے مجھے کہیں سے بھنک ملی تھی کہ تم لاہور ماموں کے گھر پر ہو' میں وہاں گیا تو وہ دنگ رہ گئے' کہا کہ تم تو سکھر کے لیے روانہ ہوئی تھیں' انہوں نے بھی بہت ڈھونڈا' وہ بھی بہت پریشان تھے کہ آپا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ خیر شکر ہے اللہ کا لاکھ بار کہ تم لوگ یوں مل گئے۔'' اور پھر نیلوفر نے اپنی کہانی سنائی تو قاسم مرد ہوکر رو پڑا۔ خاص کر جھونپڑی والی روداد سن کر......!

''قاسم! پتہ نہیں کتنے لوگ ہیں جنہیں یہ بھی میسر نہیں ہے' پھر یہ دیکھیں اتنی بارش ہوئی' آندھی آئی' طوفان آیا' جھونپڑی میں پانی نہ آنا اس بات کی دلیل تھی کہ خدا ہم پر مہربان ہے۔''

''مہربان نہ ہوتا تو آج ہم اکٹھے کیسے ہوتے؟'' قاسم نے اپنی بیوی اور بچوں کو گلے لگاتے ہوئے کہا تھا۔

دوسری صبح قاسم نے کہا۔

''تیار ہو جاؤ چلنا ہے، میں تمہیں ایک بار امی سے ملوانا چاہتا ہوں۔'' نیلوفر نے جواب میں کچھ نہ کہا اور خاموشی سے تیار ہوگئی۔

کوٹھی کے اندر سناٹا تھا' ایسا کہ دل ہول جائے' قاسم نے ماسی کو آواز دی۔

''ماں کو لاؤ۔'' اور وہ جو آئی تو نیلوفر کا منہ کھلا رہ گیا۔ وہیل چیئر پر ایک بڑھیا' ہوش و حواس سے عاری سر پر ایک بھی بال نہیں' سیاہ رنگ دواؤں کے نشے سے سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ یہ اُس کی ساس شمشاد بیگم تھیں۔ بے شک اللہ ظالم کو ڈھیل ضرور دیتا ہے معاف کبھی نہیں کرتا ہے۔

☆☆......☆☆

اُن جیتے جاگتے کرداروں کی کہانیاں‘ جو ہمارے اردگرد آج بھی سانس لے رہے ہیں

سسکتے رہے ارمان

تلوک چند محروم کا شعر

ہوگیا آخر تلف وہ کاروانِ آرزو
مدتوں جس نے اڑائی دل کے ویرانوں کی خاک

حسین خواجہ

میں کچن میں کھڑی شام کی چائے بنا رہی تھی‘ صحن میں امی اور پھوپو بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک میرے کانوں نے ایسی بات سنی کہ میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور میرا دل خون کے آنسو رونے لگا‘ یقین نہیں آ رہا تھا کہ امی ایسی بات کر سکتی ہیں‘ خیر خود کو کنٹرول کیا اور دو کپ چائے ٹرے میں رکھ کر پھوپو اور امی کے آگے رکھ کر واپس کچن میں آ گئی‘ میں گہری سوچوں میں گم تھی‘ کچھ حد تک دماغ بھی شل ہو چکا تھا‘ پتا ہی نہ چلا کہ کب پھوپو چلی گئیں‘ سوچوں کا تسلسل تب ٹوٹا جب امی کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

’’نصرت چائے والے برتن اٹھا لو۔‘‘

جب میں امی کے پاس برتن اٹھانے کے لیے گئی تو امی نے بتایا کہ پھوپو اپنے بیٹے یاسر کی شادی کے لیے سوچ رہی ہیں‘ میں نے امی سے پوچھا پھر آپ نے مشورہ دیا۔ امی یاسر کی تعریفیں کرتے ہوئے بولیں۔

’’بہت ہی اچھا بیٹا ہے۔ میرے خیال میں اس کے لیے اُس کے تایا کی بیٹی بہت مناسب رہے گی‘ میں نے تو تمہاری پھوپو کو تجویز پیش کر دی‘ باقی جیسے اُن کی مرضی۔‘‘

اس سے پہلے کہ میری آنکھیں اشکبار ہوتیں‘ میں جلدی سے چائے والے برتن اٹھاتے ہوئے کچن کی طرف دوڑی‘ برتن دھونے سے پہلے آنکھوں کے راستے خوب دل کا غبار نکالا۔ پھر برتن دھوتے ہوئے سوچتی رہی کہ امی نے ایسا کیوں کیا ہے‘ امی تو سب جانتی ہیں کہ یاسر مجھے اور میں یاسر کو پسند کرتی ہوں‘ اور نہ تو یاسر میرے لیے غیر ہے اور نہ ہی میں یاسر کے لیے‘ ویسے بھی اپنوں سے بڑھ کر کون ہوتا ہے‘ اب ایسی بات بھی نہیں کہ امی پھوپو کو اچھا نہیں سمجھتیں‘ ہم لوگوں اور پھوپو میں فرق صرف دولت کی دیوار کا تھا‘ اُن کی دیوار تھوڑی اونچی تھی اور ہماری دیوار اس قدر چھوٹی تھی کہ اکثر اُس کا سایہ کم پڑ جاتا تھا۔

گھر میں میرے علاوہ تین بھائی اور چار بہنیں تھیں‘ جن میں سے دو اپنے گھر کی ہو چکی تھیں‘ ایک بھائی بھی شادی شدہ تھا جو کہنے کو تو ہمارے ساتھ ہی رہتا تھا لیکن حقیقت میں اس کو ہم سے کوئی سروکار نہ تھا‘ اُس کی دنیا اور تھی اور ہماری دنیا اور......

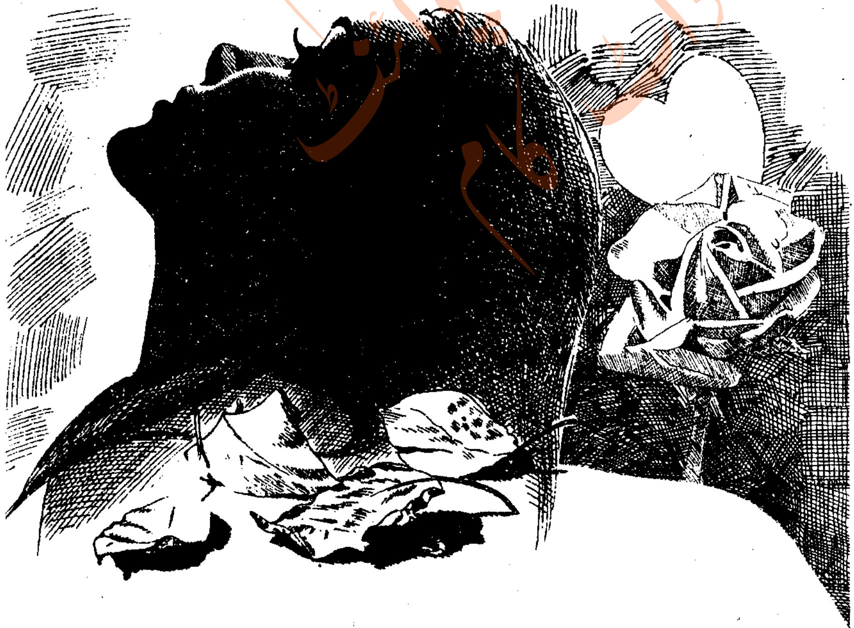
اب میرا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا کہ میں کیسے امی کو کہوں کہ آپ میرا اور یاسر کا رشتہ کر دیں یہ لڑکی ہونا بھی کتنا عذاب ہوتا ہے میں تو کھل کر اپنی خواہش کا

اظہار بھی نہیں کرسکتی' یہ معاشرے اور دین میں اتنا تضاد کیوں ہے؟ جس چیز کی دین اجازت دیتا ہے معاشرہ اس کو غلط کیوں کہتا ہے؟

میں خود امی کو کہہ دوں کہ مجھے یاسر پسند ہے؟ نہیں میں ایسا نہیں کرسکتی' یہ بہت غلط بات ہوگی' ویسے بھی میں اپنے اندر ہمت و جرأت کہاں سے لاؤں گی جو امی کی تربیت کا مقابلہ کرے۔

ایک طرف یاسر تھا' جو مجھے پسند کرتا تھا اور دوسری طرف میری اپنی ذات کا سوال تھا کہ میں بھی تو یاسر کو پسند کرتی ہوں' اگرچہ آج تک ہم دونوں نے ایک دوسرے سے اس چاہت کا اظہار نہیں کیا تھا' لیکن ایک دوسرے کے ساتھ اس قدر کھل کر بات ضرور کرلیتے تھے کہ جس سے صاف صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ہم دونوں کے دلوں میں کچھ ہے اور یقیناً یہ بہت غلط بھی ہوتا اگر محبت کا اظہار کیا جاتا کیونکہ وہ محبت' محبت ہی نہیں جو اظہار کی طلب گار ہو، محبت وہ پاک جذبہ ہے جو اعتبار اور اخلاق کے سائے تلے پیدا ہوتا ہے' ویسے بھی محبت تو اُس احساس کا نام ہے جو یہ یقین دلاتا رہتا ہے کہ اس خودغرض دنیا میں ایک فرد ایسا ہے جو میرے لیے پوری دنیا کے ساتھ لڑ سکتا ہے۔ یعنی کہ اب میں یاسر سے اپنی محبت کا اظہار کروں اور پھر وہ اپنی امی کو ہمارے گھر بھیجے' اور ساتھ ہی اس خیال نے بھی ذہن میں جنم لیا کہ اگر وہ بھی میری طرح اندر سے کمزور نکلا تو آخر میں کیا کروں گی' میرے پاؤں میں تو زمانے کی بیڑی ہے' سو دل میں یہ خواہش دبائی کہ کہیں یہ نہ ہو کہ میں یاسر سے اپنی محبت کا اظہار کرکے اپنا بھرم کھو بیٹھوں۔ میں گہری سوچ میں گم اپنے بستر پر تھی اور پتا نہیں کب نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔

صبح وہی میں تھی اور وہی معمول کے کام' لیکن سوچ میں آج کچھ اضطراب زیادہ تھا بس یہی سوچ رہی تھی کہ میں نے اپنی محبت کا دفاع کیسے کرنا ہے بہت غور و فکر کے بعد یہ نتیجہ نکلا کہ کڑوا گھونٹ تو پینا ہی



پڑے گا اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں‘ اب تو بس نظریں اس فردِ واحد کی تلاش میں تھیں۔ جو میری ڈوبتی ہوئی کشتی کو کنارے لگا دے اگرچہ ہم بہنوں میں بہت پیار اور بے تکلفی تھی لیکن میں اُن کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کرتی یہ نہیں ہوسکتا تھا پیار اور بے تکلفی اپنی جگہ اور حیا کے تقاضے اپنی جگہ کہیں میری وجہ سے ان کے ذہن میں غلط سوچیں نہ جنم لینا شروع ہو جائیں۔

دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ کوئی مسیحا آئے اور میری بیٹری پار لگا جائے پر افسوس یہ مسیحا والا کردار تو صرف کہانیوں میں ہی ہوتا ہے‘ بھلا حقیقی زندگی میں ایسا کہاں ہوتا ہے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ خالہ نسرین کے ساتھ بات کی جائے۔

خالہ نسرین ہمارے محلے میں رہتی ہیں‘ بڑی ہمدرد اور نیک خاتون ہیں‘ خداوند کریم نے انہیں ہر نعمت سے نوازا ہے سوائے اولاد کے اُن کی زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں‘ ہمارا وہ بہت خیال رکھتی ہیں ممکن ہے اگر اُن کی اپنی بھی اولاد ہوتی تو وہ انہیں اتنا پیار نہ دیتیں جتنا ہمیں دیتی ہیں‘ خالہ نسرین کے ساتھ ہمارا صرف نسانیت کا رشتہ تھا لیکن پھر بھی بہت مضبوط تھا اگرچہ خالہ نسرین کے ساتھ میری زیادہ بے تکلفی نہ تھی لیکن یہ مید ضرور تھی کہ خالہ نسرین میرا مسئلہ بہت اچھی طرح سمجھ جائیں گی‘ ویسے بھی خالہ نسرین کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا‘ بس میں نے اب دل میں ٹھان لی تھی کہ خالہ نسرین کو اپنا سارا مسئلہ بتانا ہے‘ اور ساتھ ہی کہنا ہے کہ خالہ میرا نام نہ آئے بس آپ امی کو کہیں کہ یاسر کے ساتھ میرا رشتہ کر دیں۔“

معمول کے تمام کام نمٹا کے میں نے امی سے چھا۔

”کیا آج میں خالہ نسرین کے گھر چلی جاؤں۔ و تین دن ہوگئے ہیں خالہ ہمارے گھر نہیں آئیں۔“

ی نے اجازت تو دے دی لیکن مجھ سے چھوٹی کو یرے ساتھ بھیج دیا‘ خالہ نسرین بڑی باذوق خاتون ھیں‘ اپنے فارغ اوقات میں کوئی نا کوئی کتاب اُن کے ہاتھ میں ہوتی‘ ہمارے گھر سے چار گھر چھوڑ کر ے سے گیٹ والا گھر خالہ نسرین کا تھا‘ دروازے سے داخل ہوتے ہی آداب کہا تھا۔

خالہ نے ہمیں برآمدے میں بڑی محبت کے ساتھ خوش آمدید کہا تھا‘ انہوں نے ہمارے سر پر ہاتھ ہی نہیں پھیرا تھا بلکہ ہم دونوں بہنوں کے ماتھے بھی چومے تھے۔ خالہ کے گھر میں ٹی وی تھا‘ میری چھوٹی بہن جاتے ہی ٹی وی کے سامنے جا بیٹھی تھی۔

میں نے رسما حال احوال کے بعد خاموشی اختیار کی تھی۔ سوچا تھا خالہ پوچھیں گی کیا مسئلہ ہے آج تم کچھ پریشان سی لگ رہی ہو۔ تو میں سارا غبار باہر نکال دوں گی لیکن شاید خالہ نسرین نے میرے چہرے پر کوئی پریشانی محسوس ہی نہیں کی تھی۔ اور میں مایوس واپس لوٹ آئی تھی مگر میں ہمت ہارنے والی تو تھی نہیں‘ لہٰذا ایک دو دن ٹھہر کر پھر خالہ کے گھر جانے کا سوچا تھا‘ اور ساتھ ہی یہ بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر خالہ نے میری پریشانی کا سبب نہ بھی پوچھا تو میں خود ہی بتا دوں گی۔

معمول کے سب کام جو میرے حصے میں آتے تھے نمٹا کے امی سے اجازت لی تھی۔ امی نے اس مرتبہ پھر چھوٹی کو میرے ساتھ بھیج دیا تھا‘ مگر ہائے افسوس خالہ نسرین کے گھر کو تالا لگا ہوا تھا۔ میں مایوس گھر واپس لوٹ آئی تھی اور سوچا تھا مجھے اب کوئی اور ہستی تلاش کرنی چاہیے۔ جو میرے مسئلے کو حل کر سکے لیکن پہلے ہی خالہ نسرین بڑے غور و فکر کے بعد ذہن میں آئی تھیں‘ اب اور کون ایسا ہو دماغ کے گھوڑوں کو بہت دور تک بھگایا‘ لیکن ہٹ ہٹا کر خالہ نسرین سے زیادہ مناسب اور کوئی نظر ہی نہ آیا۔

بس پھر صبر کا دامن تھامے رکھا اور تیسری مرتبہ خالہ نسرین کے گھر جانے کا سوچا‘ جلدی جلدی اپنے اور چھوٹی کے حصے کے کام نمٹا کے امی سے اجازت مانگی تو امی نے کہا تھا۔

”خیر تو ہے آج کل آپا نسرین پر بہت پیار آ رہا ہے‘ اُن کے گھر زیادہ مت جایا کرو ایسے اچھا نہیں لگتا کہیں وہ برا نہ مان جائیں۔“

میں نے امی کو مناتے ہوئے کہا۔

”خالہ نسرین تو ہمیں ہماری سگی خالاؤں سے بھی

زیادہ پیار کرتی ہیں۔ بھلا انہوں نے کیا برا منانا ویسے بھی پچھلی مرتبہ جب میں خالہ کے گھر گئی تھی تو وہ گھر پر نہیں تھیں' اب کے بار مجھے جانے دیں۔'' امی نے کہا۔

''اچھا چلی جاؤ' میرا اسلام بھی کہنا اور پوچھنا کافی دن ہو گئے آپ ہمارے گھر کیوں نہیں آئیں۔'' میں نے چھوٹی کو ساتھ لیا اور خالہ نسرین کے گھر پہنچ گئی خالہ وہی اپنے ذوق کے عین مطابق کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھیں' چھوٹی جاتے ہی ٹی وی پر ٹوٹ پڑی تھی اور میں خالہ کے پاس بیٹھ گئی تھی' پھر بہت کوشش کی تھی لیکن اندر دبے الفاظ اور جذبے باہر آ ہی نہیں رہے تھے۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اپنے اندر وہ ہمت کہاں سے لاؤں جو میری ڈوبتی کشتی کو کنارے پر لے آئے خیر پاس پڑے فریج میں سے پانی کی بوتل نکالی اور ایک ہی سانس میں آدھی سے زیادہ پی گئی' پھر خالہ کے قریب ہو کر بیٹھ گئی اور آہستہ سے بولی۔

''خالہ وہ میں پہلے بھی آپ کے گھر آئی تھی' پر آپ گھر پر نہیں تھیں۔'' اس سے پہلے کہ میں کچھ اور بولتی خالہ نسرین بولی تھیں۔

''تمہارے انکل آتے ہیں تو اُن سے کہتی ہوں مجھے ایک اور ٹی وی لا دیں۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرانے لگیں۔

میں نے بے تکلفی سے پوچھا۔

''خالہ نیا ٹی وی کیوں؟ تو خالہ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی تھیں۔

''اپنی بیٹی کے لیے...... بھئی تم لوگوں کو بار بار چکر لگانے پڑتے ہیں اور مجھے یہ بات بالکل اچھی نہیں لگتی۔''

''ہائے افسوس! خالہ کیا سمجھ رہی ہیں اور مسئلہ کیا ہے؟'' فوراً ہی خیال آیا کہ میرے پاس اب صرف ایک ہی چانس ہے اور اسے گوانا نہیں ہے۔ میں نے اور التجا آمیز لہجے میں کہا۔

''خالہ! ٹی وی کا مسئلہ نہیں ہے' دراصل میں نے آپ کے ساتھ ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

خالہ نے میری بات سن کر فوراً کتاب بند کر دی'

غزل

روشنی کا استعارہ کرلیا
دل نے ہر آنسو ستارا کرلیا

بے وفا دنیا سے کچھ تو نبھ گئی
ساتھ کیا تھا بس گزارا کرلیا

گلستاں اُس نے کیا تھا آگ کو
ہم نے شبنم کو شرارہ کرلیا

کم نہیں ہم بھی ثمود وعاد سے
کیوں لحاظ آخر ہمارا کرلیا

تیری وحدت سے سمجھ پائے تجھے
اور کثرت میں نظارہ کرلیا

کون ہے پھر اب مرے دُکھ کا سبب
خواہشوں سے تو کنارا کرلیا

آج حیدر موڈ ہی کچھ اور تھا
سو غزل میں استخارہ کرلیا

حیدر قریشی (جرمنی)

اور مجھے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے میری پیشانی چومی اور کہا۔
''میری بچی کیوں پریشان ہے۔'' یہ وہ لہجہ تھا جس میں اپنائیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی' بس پھر کیا تھا۔
میں نے اپنے دل کا سارا غبار نکال کر باہر پھینک دیا۔
''خالہ وہ میں یاسر کو پسند کرتی ہوں اور وہ مجھے پسند کرتا ہے، پھوپو آئی تھیں ہمارے گھر' امی سے کہہ رہی تھیں کہ یاسر کے لیے لڑکی تلاش کرنی ہے۔ تو امی نے کہا کہ آپ یاسر کی شادی اُس کے تایا کی بیٹی کے ساتھ کردیں' خالہ آپ امی کو راضی کرو کہ وہ یاسر کا رشتہ میرے ساتھ کردیں۔''
خالہ نے مجھ سے پوچھا۔
''کیا یاسر نے تم سے کہا ہے کہ وہ تمہیں پسند کرتا ہے؟'' میں نے نفی میں سر ہلایا تو خالہ نے سوال کیا۔
''کبھی تم نے اُسے بتایا ہے کہ تم اس کو پسند کرتی ہو؟'' میں نے دوبارہ نفی میں سر ہلایا تو خالہ نسرین نے مجھے سمجھایا۔
''بڑے جو فیصلہ کرتے ہیں مناسب کرتے ہیں۔'' مگر میں نے خالہ کو بہت مجبور کیا کہ وہ امی کے ساتھ بات کریں' بالآخر خالہ مان گئیں اور اسی روز شام کو وہ ہمارے گھر آئی تھیں۔
صحن میں امی اور خالہ نسرین باتیں کررہی تھیں میں کچن میں چائے بنانے آگئی پہلے تو امی نے خالہ نسرین کے ساتھ بہت گلے شکوے کیے پھر خود ہی یاسر کی بات کرتے ہوئے کہنے لگیں۔
''آپا چار پانچ دن پہلے میری نند آئی تو کہنے لگی۔ یاسر کی اب شادی کرنی ہے کوئی لڑکی تلاش کرو میں نے سوچا کیوں نہ آپ سے کہہ دوں آپ کا تو کافی گھروں میں آنا جانا ہے۔'' خالہ نسرین سے مسکراتے ہوئے کہا۔
''تو تم اپنی بیٹی انہیں کیوں نہیں دے دیتیں' ضرور غیروں کی ہی دلوانی ہے۔'' اس دوران کچن کی کھڑکی میں کھڑی یہ ساری باتیں سن رہی تھی۔ امی نے ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے کہا تھا۔
''آپا آپ ذرا سوچو کہ میری نند کے منہ پر یہ بات سجتی ہے کہ وہ مجھے کہے کہ میں یاسر کے لیے لڑکی تلاش کروں کیا اُس کو خود اپنے بھائی کی جوان اولاد نظر نہیں آتی' ویسے کس ماں کا دل نہیں چاہتا کہ اُس کی بچیاں عیش کریں' تو چلو اگر میں خود کہہ بھی دوں کہ وہ ہمارے ساتھ رشتہ کرلے اور وہ نہ کرے تو اس میں میری ناک کٹتی ہے۔ وہ تو ہمیں ذلیل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے ہی نہیں دیتی۔ یہ تو اپنی توقیر خود ہی کم کرنے والی بات ہے آپا' مجھے پتا ہے کہ یاسر میرے گھر کو پسند کرتا ہے بہت ہی پیارا اور باادب بچہ ہے لیکن میں تو ان کے معیار کا اپنی بچی کو جہیز ہی نہیں دے سکتی' باقی معاملات تو دور کی بات ہیں۔'' امی نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے مجھے آواز دی تھی۔
''نصرت جلدی چائے لاؤ۔'' وہ چائے جو میں نے اپنے بہتے آنسوؤں کے دوران تیار کی تھی' اب پیش کرنے کے لیے تیار تھی اور ساتھ ہی میں دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ ماں تو ماں ہوتی ہے اپنی اولاد کو بہت اچھی طرح سے سمجھتی ہے میرا یہ خیال غلط ثابت ہوچکا تھا کہ امی کو میری اور یاسر کی کوئی خبر نہیں ہے۔ ماں تو سب جانتی ہے۔

☆......☆......☆

میں نے اُس روز پھر وہی سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا جو اب سے پہلے چار شادیوں میں پہن چکی تھی' اُس روز یاسر کی شادی تھی' وہ میرے سامنے اسٹیج پر اپنی دلہن کے ساتھ دلہا بنا بیٹھا تھا اور میں سب سے آخر والی کرسی پر بیٹھی کولڈ ڈرنک پی رہی تھی ایک ایک کرکے سبھی رشتہ دار اسٹیج پر جارہے تھے' جبکہ امی تو یاسر کے ساتھ ہی بیٹھی تھیں اور اسٹیج سے اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ...... زبردستی ہنسنے سے جبڑے ہی نہیں دل بھی دکھتا ہے۔ وہ اُدھر ہنسے جارہی تھیں اور اِدھر میں دل ہی دل میں امی کو داد دیے جارہی تھی کہ امی آفرین ہے آپ پر آپ کی ہمت پر مجھ میں تو اتنا حوصلہ نہیں کہ میں یاسر کو دلہا کے لباس میں آنکھ بھر کر بھی دیکھ سکوں۔

☆☆......☆☆☆

کراچی سے دوسری جیتی جاگتی کہانی

وائے مقدر

داغ کا خیال

جو گزرے ہیں داغ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

سید محمد ابو آزاد

سرفراز احمد ایک گاؤں کے اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان کے پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ ماسٹر صاحب نیک دل' ایماندار اور سادہ زندگی گزارنے کے حامل انسان تھے۔ اپنی حلال کمائی سے اپنی اولاد کو علم کی دولت سے مالا مال کیا اور تربیت بھی اچھی دی۔ ہر شخص اُن کی شرافت اور انسانیت کا قائل تھا۔ اس مہنگائی کے دور میں ماسٹری کی قلیل آمدنی میں اتنے کثیر نفس کی پرورش ناممکن تھی اور وہ وہ بھی تعلیم یافتہ گھرانہ' لباس' خوراک اور اُن کی پڑھائی کے اخراجات کا سوچ کر ہی سر چکرا جاتے ہیں۔ ماسٹر صاحب نے اپنی اولاد کو معاشرے کا کامیاب انسان بنانے کے لیے دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھا۔ انہوں نے کسی کام کرنے میں کبھی عار نہ محسوس کیا۔ جہاں دو پیسے ملے اس کو بخوشی کیا۔

ماسٹر صاحب کے پاس Herculus نام کی ایک سائیکل ان کے طالب علمی کے دور کی تھی۔ اُس دور میں یہ اُن کے ٹیوشن کرنے میں مددگار تھی اور اب ان کی نسل کو پروان چڑھانے میں مددگار ہے۔ اس سائیکل پر کوسوں دور ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے بچوں کو صبح ساڑھے سات سے ساڑھے آٹھ بجے تک پڑھانے کے لیے جاتے۔ وہاں سے نو بجے صبح اپنے اسکول میں فرائض منصبی ادا کرتے۔ اسکول کے بعد مشکل سے گھٹے ڈیڑھ گھنٹے اپنے اہل خانہ کے ساتھ گزارتے۔ اس کے بعد ان کے ایک مخصوص کمرے میں ان کے مختلف کلاس کے طالب علم ٹیوشن پڑھنے آتے۔ درس و تدریس کا یہ سلسلہ رات دس بجے تک جاری رہتا۔ ماسٹر صاحب کی زندگی جہد مسلسل سے عبارت رہی۔ اتنی محنت کے باوجود کئی مرتبہ بچوں کے حصول علم میں مالی پریشانی آئی۔ اُن کا بڑا بیٹا ندیم جب میڈیکل کر رہا تھا تو عین موقع پر اُس کی فیس کی ادائیگی میں ماسٹر صاحب کو بہت دشواری پیش آئی۔ دوست احباب ہونے کے باوجود جب مسئلہ حل نہیں ہوا تو مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق مسئلے کو حل کرنے کے لیے اپنی چھوٹی سی زمین گروی رکھنی پڑی۔ اس طرح ان کا تیسرا بیٹا ایاز انجینئرنگ' تھرڈ ایئر کر رہا تھا۔ اس کی فیس کا مسئلہ آن پڑا۔ بے حد انتھک کوشش کے باوجود ہاتھوں میں کچھ نہ آیا تو بیگم سرفراز کے زیورات بیچ کر ضرورت پوری کی گئی۔ بیٹیوں کی بھی تعلیم جاری تھی۔ بڑی بیٹی سلیقہ ماسٹر صاحب کے منع کرنے کے باوجود چھوٹی موٹی ٹیوشن کر رہی تھی۔ اس کے ایم بی

اے کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی' منجھلی بیٹی رافعہ نے ماسٹر اِن اسپیشل ایجوکیشن کیا۔ اللہ نے ماسٹر صاحب کو محنت کا خوب ثمر دیا۔ پانچوں بیٹے اور بیٹیوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے۔

ماسٹر صاحب جہاں اور بہت ساری خوبیوں کے مالک تھے وہاں اُن کو جنم بھومی اپنے پرانے سے آبائی گھر سے بہت گہرا لگاؤ تھا۔ حقیقت میں خوشحالی و ترقی متقاضی تھی کہ وہ کسی پوش علاقے میں منتقل ہو جائیں مگر وہ کسی حال میں وہاں سے ٹس سے مس ہونے کو تیار نہ تھے۔ اُن کا اپنے گھر سے اتنا گہرا تعلق تھا کہ ان ہی پر یہ محاورہ صادق آتا ہے۔ ''زمین جبنہ نہ جبنہ گل محمد۔''

قدرت نے کو ہر طرف سے حالات کو ان کے لیے موافق کر دیا تھا کہ وہ اپنے پرانے مکان سے کسی نئے مکان میں منتقل ہو جائیں۔ ان کے پانچوں بیٹے برسر روزگار ہو چکے تھے۔ ان کا بیٹا ندیم ایک فارماسیوٹیکل کمپنی میں بحیثیت انجینئر لگا ہوا تھا۔ بیٹے اور بیٹیوں کے اچھے رشتے بھی آ رہے تھے۔ قدرت ان کو بہو اور داماد جیسے رشتے سے بزرگی کی بلندی پر پہنچانا چاہتی تھی۔ بالآخر وہ دن آ ہی گیا کہ ماسٹر صاحب نے اپنے بیٹے ندیم کو کسی پوش علاقے میں اچھا سا مکان رہائش کے لیے ڈھونڈنے کے لیے کہہ دیا۔ وہ اب پرانے مکان کو چھوڑنا چاہتے تھے۔ یہ سن کر گھر والے فرطِ حیرت میں ڈوب گئے کہ اُن کے پاپا کیسے دوسرے مکان میں جانے کے لیے تیار ہوئے۔

لاہور میں کئی پوش علاقے ہیں' ندیم کو ماڈل ٹاؤن پسند آیا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد سات سو گز پر کرائے پر ایک کوٹھی مل گئی۔ یہ ویسٹ اوپن ڈبل اسٹوری کوٹھی تھی۔ ہفتہ دس دن میں رینٹ ایگریمنٹ ندیم کے نام ہو گیا۔ کوٹھی دیکھنے کے لیے ندیم کے والدین اور بہنیں گئیں۔ کوٹھی کیا تھی ایک محل معلوم ہو رہا تھا۔ ایک بڑا سا لان سبزہ اُگا ہوا جس پر رنگ برنگ پھول کھلے ہوئے' اُس کے درمیان میں



فوارہ جو پانی کی موٹی دھار کو چھوٹے چھوٹے قطروں کی صورت میں اوپر اچھال رہا تھا۔ بڑا خوبصورت منظر تھا۔ نظر کو خیرہ کررہا تھا۔ ماسٹر صاحب کی زندگی بہت خوشگوار اور سکون سے گزرنے لگی۔ سال ڈیڑھ سال کے عرصے میں دو بیٹیوں اور بیٹوں کی شادی کے رشتے آئے۔ پانچوں بیٹے برسرروزگار' نیک اور فرمانبردار تھے۔ ایک دو بچوں کی شادی کے لیے ماسٹر صاحب کے پاس رقم پسماندہ تھی۔

آپس میں مشورے کے بعد یہ طے ہوا کہ بڑی بیٹی سلیقہ اور ندیم کی شادی کردی جائے۔ رشتے کرانے والی ایک بڑی بی بیگم سرفراز کے پاس اکثر آتی تھیں۔ اُن کے توسط سے دونوں بیٹے اور بیٹی کے لیے رشتے مل گئے۔ مذکورہ رشتوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے دونوں فیملی نے ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے سلسلہ جنبانی شروع کردی۔ ماسٹر صاحب کی بیگم کے ہمراہ اُن کی بیٹیاں فائزہ وغیرہ اپنے بھیا ندیم کے لیے لڑکی دیکھنے گئیں۔ بیگم پراچہ اور اہل خانہ نے آنے والے مہمانوں کا استقبال کیا اور ایک دوسرے سے معانقہ کے بعد بیگم پراچہ اپنے مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ انہوں نے بیگم سرفراز سے رشتے کے موضوع پر گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔ اسی اثنا میں لڑکی انگوری رنگ کے سوٹ میں مہمانوں کو سلام آئی۔ کچھ دیر بیٹھ کر واپس چلی گئی لڑکی کیا تھی حسن کی پیکر حسیناؤں میں حسینہ نظر آرہی تھی۔ بیگم سرفراز اس کے حسن و جمال کو دیکھتی رہ گئیں۔ فائزہ سے رہا نہ گیا تو وہ سارے اداب محفل کو چھوڑ کر ہونے والی دلہن کے پیچھے لپکتے ہوئے کمرے میں چلی گئیں۔ وہاں اُس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی وہیں بستر پر تصویروں کے البم رکھے ہوئے دیکھے تو وہ نظر بچا کر اس میں سے دلہن کی تصویر نکال لی۔

بیگم سرفراز اور ان کی بچیوں کو پراچہ صاحب کی بچی ندیم کے لیے پسند آئی۔ چند دنوں کے بعد پراچہ صاحب ہمراہ بیگم سرفراز سے ملنے آئے۔ اتفاق سے ندیم گھر پر تھے۔ دونوں باپ بیٹے نے مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور بیگم سرفراز نے اپنے مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور بیگم پراچہ سے ان کی بیٹی کا رشتہ اپنے بیٹے ندیم کے لیے مانگا۔ بیگم پراچہ نے مسکراتے ہوئے رشتے کو قبول کیا۔ اور دونوں طرف سے ایک دوسرے کو مبارکباد پیش کی گئی۔ پراچہ صاحب نے اپنی بیگم کے مشورہ کے بعد سرفراز صاحب سے شادی کی تاریخ مانگی۔ تاریخ کے تعین کے لیے سرفراز صاحب نے ایک ہفتہ کی مہلت مانگی۔ ایک ہفتہ کے بعد دونوں فریق نے متفقہ طور پر تاریخ مقرر کردی۔ شادی کی تیاری دونوں طرف زور سے شروع ہوگئی۔ وقت مقرر پر ندیم کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوگئی۔ کوٹھی پر رنگ برنگے قمقمے سے سجائے گئے تھے۔ ان کی بیٹیاں اپنی ہونے والی بھابی اور دیگر خواتین مہمان کا خیر مقدم کیا۔ ان میں فائزہ بہت پُرجوش آرہی تھیں۔ وہ دن سرفراز صاحب کو پہلی بہو دے کر ان کی بزرگی کو دوبالا کررہا تھا۔ واقعی اللہ ان کی محنت مشقہ کا ثمر دے رہا تھا۔

سرفراز صاحب کی بہو کیسی ہے اس کے حسن کی بازگشت ہر چہار طرف سنی جارہی تھی۔ اس کے حسن کی جتنی تعریف کی جائے وہ کم ہے۔ واقعی وہ حسن کی پیکر ہے۔ جوں جوں عزیز و اقارب (جو شادی میں شریک نہ ہوسکے تھے) کو اس کے حسن کی خبر ملتی گئی وہ ایک بار اسے دیکھنے ضرور آئے۔ اس کے حسن کی بازگشت ایک عرصہ تک سرفراز صاحب کے خاندان میں سنی جاتی رہی۔

سرفراز صاحب و بیگم سرفراز کے شب و روز بدل گئے تھے۔ ان کی ساری اولاد بیٹے اور بیٹیاں سب اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں۔ سال ڈیڑھ سال کے اندر وہ سارے بیٹے اور بیٹیوں کی شادی سے فارغ ہوچکے تھے۔ انسان کی فطرت ہے وہ اپنی مٹی یعنی جہاں وہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کی سوندھی خوشبو کبھی نہیں بھولتا۔ ماسٹر سرفراز صاحب کا گھر جہاں وہ پیدا ہوئے اور Herculus سائیکل کی سواری جو ذریعہ معاش تھی بھلائی نہیں جاسکی۔ جبکہ اب آرام و آسائش کی زندگی تھی' محل نما کوٹھی میں رہائش پذیر تھے۔ بیٹے بیٹیوں کی شادی کی ذمہ داری سے فارغ تھے۔ مگر یہ اپنے پرانے مکان کو

یاد کر کے کبیدہ خاطر تھے۔

کچھ دنوں سے نہ جانے کیوں بڑی بہو اپنی ساس سے کچھ کھنچی کھنچی سی تھی۔ کچھ عرصہ بعد اس کا احساس سرفراز صاحب کو بھی ہوا۔ حالانکہ بیگم سرفراز جوڑنا جانتی تھیں توڑنا اِن کو نہیں آتا تھا۔ وہ کام جو گھر کی ماسی کرتی تھی اس کے ہونے نہ ہونے کی ذمہ داری اب بہو نے ساس کے سر تھوپ دی تھی۔ کہتے ہیں تربوز کا رنگ دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ آہستہ آہستہ دیگر بہوئیں بھی گھر کے کام کاج کی ذمہ داری ساس کے سر تھوپتی چلی گئیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر تکرار شروع ہوگئی۔ گھر میں گھٹن بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ وہ کام جو گھر کا ملازم کرتا تھا یعنی بازار سے سودا سلف لانا' اب سرفراز صاحب کی ذمہ داریوں میں دے دی گئی۔ حالات کے جبر سے پہلے ہی وہ کبیدہ خاطر تھے۔ اب وہ دوآتشہ ہوکر اپنے دل و دماغ کو مفلوج کررہے تھے۔

جن ناگفتہ بہ حالات سے سرفراز صاحب گزر رہے تھے' اب بیٹے بہوؤں کے ساتھ رہنا بہت مشکل تھا' تو پھر وہ کیا کرتے۔ اپنے گھر واپس ہوجاتے تو پھر احباب کے طعن تشنہ کا ڈر تھا۔ وہ شاگرد جنہوں نے ان سے والدین کے ساتھ صلہ رحمی' فرمانبرداری اور محبت کا درس حاصل کیا ہے اُن کی ہمیشہ کے لیے گھر واپسی جان کر ان کی اولاد کی نافرمانی کا گمان ہوگا۔ ان ساری باتوں نے انہیں کشمکش میں مبتلا کیا ہوا تھا۔ مگر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق انہوں نے اپنے گھر واپس جانے کا فیصلہ کرلیا۔ اور اپنے بیٹے کو اپنے گھر لوٹ جانے کے متعلق بذریعہ رقعہ مطلع کردیا جب اُن کی روانگی ہونے لگی تو صرف چھوٹی بہو گلنار نے جانے سے روکا۔ تب تک تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

☆......☆......☆

ماسٹر سرفراز احمد جب اپنے آبائی گھر پہنچے تو سارا گاؤں اِن سے ملنے آیا۔ جوں جوں اُن کی آمد کی خبر ملتی گئی لوگ آتے رہے' ان کی ہردلعزیزی اور انسانیت نوازی کا یہ عالم تھا کہ گاؤں کا ہر فرد اپنے لیے اعزاز سمجھ رہا تھا کہ آپ اس کی دعوت قبول فرمائیں۔

ماسٹر صاحب کی دعوتیں ایک عرصہ تک چلتی رہیں' بالآخر یہ عمل کہیں نہ کہیں تو رکنا تھا۔

صاحب علم ماسٹر سرفراز احمد صاحب کے اردگرد علم کے پیاسے پھر سے جمع ہوتے گئے اور علم کی روشنی جو کچھ عرصے کے لیے معدوم ہوگئی تھیں وہ پھر سے آب و تاب کے ساتھ ماحول کو روشن کرنے لگی۔ اُن کا خاص کمرہ جو مکتب کی حیثیت رکھتا تھا وہ پھر طالب علموں سے آباد ہوگیا۔

اپنے گھر میں آکر ماسٹر سرفراز کا دل اور روح اب مطمئن ہوگئی ہے۔ ان کا گھر تو دیہات کا گھر ہے' مگر یہاں کے ماحول میں والدین کا احترام موجود ہے۔ جبکہ محل نما گھر بزرگوں کے احترام سے خالی ہے۔ گو خوشنما گھر میں وہ منتقل ہوگئے تھے مگر وہ ہر وقت اپنی جنم بھومی کو یاد کرتے رہے تھے۔ اُس نئے گھر میں ان کی بزرگی کو بری طرح مجروح کیا گیا تھا۔ ان کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ ان کی اولاد ایک دن شفقت و محبت کا صلہ نافرمانی سے دے گی۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

''جس گھر میں بزرگوں کی عزت نہیں ہوتی اس گھر کے لوگ تتر بتر ہوجاتے ہیں۔''

حال کو کامیاب بنانے کے لیے ماضی سے رہنمائی حاصل کرنا دانشمندوں کا شعار ہے۔ ماضی زندگی کو وہ راہ دکھاتا ہے جو ہر قسم کے خطرے سے پاک ہو۔ لیکن ماضی کے بعض پہلو اتنے تلخ اور تکلیف دہ ہوتے ہیں کہ اچھی سے اچھی قوت برداشت رکھنے والے اسے یاد کرنے سے احتراض کرتے ہیں جبکہ ماسٹر سرفراز احمد کا ماضی بہت شاندار اور تابناک ہے۔ انہوں نے محنت و مشقت سے پانچ بیٹے اور چار بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی مگر اس پہلو سے بہت تکلیف دہ اور دردناک ہے کہ اس کا ثمر اُن کو کیا ملا۔ ان کی بزرگی کی تذلیل کی گئی اور بالآخر وہ اپنے لختِ جگر اولادوں سے دور ہوگئے۔ اِس حوالے سے شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی اِس گھر کے چراغ سے

☆☆......☆☆

ڈیرہ اسماعیل خان سے تیسری جیتی جاگتی کہانی

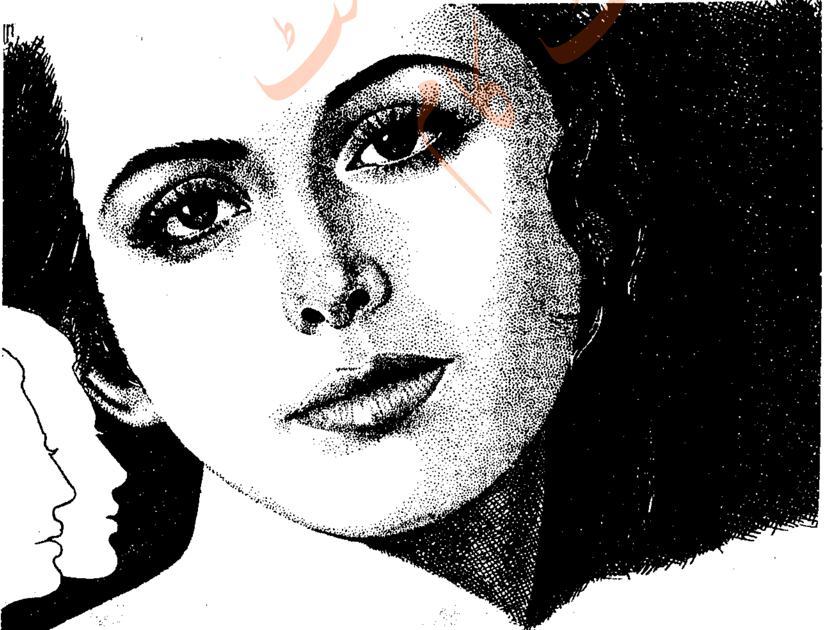
نیلگوں

اختر انصاری کا خیال

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

سید عبادت کاظمی

ہرانسان کے کئی شوق ہوتے ہیں اور یہ شوق اکثر جنون کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ مجھے نیلا رنگ بچپن سے پسند تھا۔ دادی کہتی تھیں جب میری پیدائش ہوئی تو میرا وجود نیلے رنگ کا ہو رہا تھا اور جب ہوش سنبھالا تو مجھے نیلے رنگ میں بے پناہ کشش محسوس ہونے لگی تھی۔ شعوری طور پر میں اپنے ارد گرد نیلا رنگ ہی دیکھنا چاہتی تھی۔ مجھے کپڑوں سے لے کر جیولری، جوتے، گھر کی کھڑکیاں، دروازے غرض ہر چیز نیلے رنگ کی چاہیے ہوتی تھی۔ میرے ابا جی میری نیلی رنگ سے بے تحاشہ رغبت دیکھ کر مجھے نیلی پکارنے لگے تھے اور پھر اُن کی دیکھا دیکھی سب ہی مجھے نیلی کہنے لگے تھے اور میرا اصل نام ایمانے زارہ شاہ کہیں کھو گیا تھا۔



میرے ابا جی حاجی دین بخش کا فرنیچر کا کاروبار تھا اور ان کی قریشی موڑ پر کئی دکانیں' کارخانے اور ملازم تھے۔لیکن پھر بھی وہ اپنے ہاتھ سے کام کرنا پسند کرتے تھے۔اُن کے ہاتھ میں ایسی صفائی تھی کہ لوگ حیران رہ جاتے ،لوگ اُن کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔سچ کہتے ہیں کہ ہنر ایک بہت بڑی طاقت ہے۔

میرا کوئی بھائی بہن نہیں تھا' کیونکہ میری امی میری پیدائش کے کچھ دن بعد وفات پا گئی تھیں اور میری پرورش میری دادی نے کی تھی۔ابا صبح سویرے دکان پر چلے جاتے اور شام کو واپس آتے ۔میں نے میٹرک تک اسکول میں پڑھا،کوٹلہ قائم شاہ کے اکلوتے گرلز ہائی اسکول میں نیلے رنگ سے میرے عشق کے خوب چرچے ہوتے۔لڑکیاں مجھ پر خوب ہنستیں، میں پورے اسکول کے مذاق اور تنقید کا نشانہ بنتی ۔لیکن جانے کیا بات تھی کہ نیلے رنگ سے میری محبت بڑھتی ہی چلی گئی۔اسکول کے بعد میں نے آگے پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔کیونکہ دادی بیمار رہنے لگی تھیں اور گھر کے کام مجھے کرنا پڑتے تھے۔اسی دوران مجھے ڈائجسٹ پڑھنے کا چسکا لگا۔سرورق پر اگر ماڈل کے کپڑے نیلے رنگ کے ہوتے یا آنکھیں نیلی ہوتیں تو میں اسے کاٹ کر اپنی ڈائری میں لگا لیتی تھی۔

خیر یہ تو تھی میرے جنون کی کہانی' لیکن محبت مجھے اپنے ابا جی سے ہی سے زیادہ تھی۔

☆......☆......☆

اُس روز موسم بڑا سہانا سا تھا۔سفید سفید روئی کے جیسے بادل نیلے رنگ کے آسمان کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔بارش کی ہلکی ہلکی بوندیں ٹپ ٹپ کرتی صحن میں گر رہی تھی۔میں نے ایف ایم ریڈیو آن کر کے گلوبل ایف ایم ریڈیو لگایا ہوا تھا۔ جہاں

R-J مہران خان اپنی سریلی آواز میں گا رہا تھا

ماہی رو رے سکون کر میری چاہت قبول

کر قبول رے سکون مائے رومائے رو

میں گانے کی آواز فل کر کے ساتھ ساتھ گنگناتی ہوئی دوپٹہ کمر کے گرد کس کے فرش سے پانی صاف کرنے لگی ہوئی تھی کہ مجھے خیال آیا تھا کہ آج تو میں چوزوں کو ڈربے سے نکالنا بھول گئی ہوں۔میں نے صحن کے وسط میں رکھے ڈربے کا دروازہ کھولا تھا۔ ننھے منے چوزے جن پر میں نے پینٹ سے نیلا رنگ کیا ہوا تھا اور مرغی نے' جس کی شکل میرے نیلا رنگ لگانے سے بگڑ کر عجیب سی ہو گئی تھی۔

صحن میں دوڑ لگا دی تھی۔ذرا ہی دیر میں بارش تیز ہو گئی تھی اور میری مرغی اور چوزے بارش میں نہا کر اصلی رنگ و روپ میں آ گئے تھے۔اور میں دھوپ نکلنے کا انتظار کرنے لگی تھی کہ مرغی اور چوزے سوکھیں تو میں انہیں دوبارہ نیلا رنگ کر دوں......

ہو سکتا ہے آپ قارئین! اب تک میری نیلے رنگ کی جنونیت سے بے زار ہو چکے ہوں' میری دادی تو میری اس پسند سے بہت بیزار تھیں۔اور مجھے اکثر ٹوکا کرتی تھیں۔

ایک صبح میری دادی اچانک مر گئی تھیں۔وہ سوتی کی سوتی رہ گئیں تھیں۔ میں بہت روئی تھی کہ اب مجھے کون نیلے رنگ پر ٹوکے گا۔تب مجھے احساس ہوا تھا کہ انسان نیلے رنگ سے زیادہ اہم ہیں۔وقت ہر زخم کا مرہم ہے، بڑے سے بڑے صدمے کو بھلا دیتا ہے۔

جمعرات والے دن میں میٹھا بنا کر محلے کے بچوں میں تقسیم کرتی تھی۔ اُس جمعرات بھی میں معمول کے کاموں میں مصروف تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی تھی ۔میں نے دروازے کے اندر سے پوچھا تھا۔

''کون......؟''

''جی مجھے حاجی دین بخش صاحب سے ملنا ہے۔'' مقابل کی آواز آئی تھی۔

''لیکن بابا تو گھر پر نہیں ہیں،وہ دکان یا کارخانے میں ہوں گے۔''میں نے دروازہ کھولے بغیر جواب دیا تھا۔

''جی میں ابھی وہیں سے آ رہا ہوں ،وہ وہاں نہیں ہیں، میں سمجھا وہ گھر آ گئے ہوں گے ،آپ پلیز انہیں میرا یہ کارڈ دیجیے گا، مجھے ان سے بہت ضروری کام ہے۔''

میں نے کارڈ لینے کے لیے دروازہ کھولا تھا اور میری نظر اس کی نیلی آنکھوں پر پڑی تھی وہ آنکھیں دیکھ کر میری جو کیفیت ہوئی وہ معلوم نہیں میری نیلے رنگ سے محبت تھی' یا مقابل کی آنکھوں کی کشش' ایک لمحے کے لیے تو میں جیسے سب کچھ بھول گئی پھر اچانک خیال آنے

پر میں نے جلدی سے کارڈ لے کر دروازہ بند کر دیا تھا۔
یہ کیسا احساس تھا جس نے میرے رگ رگ میں بے چینی بھر دی تھی۔ رات کو اباجی گھر آئے تو میں نے انہیں کارڈ دے دیا۔ عجیب بات یہ تھی کہ میں نے ابھی تک اُس کارڈ کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ ابا کو کارڈ دیتے وقت میں نے اس کے نام پر نظر دوڑائی تھی۔ اُس کا نام گوہر تھا۔
اس رات ابا نے خاصی تشویش سے پوچھا تھا۔
''نیلی بیٹا طبیعت تو ٹھیک ہے؟ آج کوئی نیلا قصہ نہیں سنایا۔''
میں ہنس دی تھی لیکن مجھے محسوس ہوا تھا میری ہنسی کھوکھلی ہے۔
پھر گوہر اکثر ہمارے گھر آنے لگا تھا اور میں چوری چوری اسے دیکھا کرتی تھی۔ نہ جانے کب اور کیسے ہم ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ اتنے قریب کہ دل ایک دوسرے کی لے پر دھڑکنے لگے تھے۔ ابا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ایئرفورس میں ملازم ہے اور بہن کی شادی کے لیے فرنیچر ابا سے بنوا رہا تھا۔ میرے دل میں جلترنگ بجنے لگے تھے کوئی انوکھی سی لذت کوئی انوکھا سا احساس دل میں چٹکیاں لینے لگا تھا۔
گوہر کی بہن کی شادی میں ہم لوگ بھی گئے اور اُس شادی کے کچھ دن بعد گوہر کے گھر والے ہمارے گھر رشتہ لے کر آ گئے تھے۔ انہوں نے ابا سے میرا ہاتھ مانگا تھا اور ابا نے مجھ سے پوچھنے کے بعد ہاں کر دی تھی۔
باضابطہ طور پر رشتہ ہو جانے کے بعد گوہر کے ساتھ اکثر میری بات ہو جاتی، وہ بھی نیلے رنگ سے میری جنونیت دیکھ کر حیران ہو جاتا۔
''چلو شکر ہے میری آنکھیں نیلی ہیں، ورنہ میں تمہیں کیسے پسند آتا۔'' وہ شرارت سے کہتا۔ میں ہنس دیتی۔
کچھ ماہ بعد ہماری شادی کے دن مقرر ہوئے۔ تیاریاں عروج پر تھی، ہماری گھنٹوں فون پر بات ہوتی، میری خواہش کے مطابق عروسی لباس نیلے رنگ کا ہی لیا گیا تھا۔ زیورات میں بھی نیلے رنگ کے نگینے جڑے ہوئے تھے۔
شادی والے دن میرا دل عجیب وسوسوں میں گھرا ہوا تھا۔ میری آنکھیں بار بار بھر آ رہی تھیں۔ بارات چار بجے آنی تھی سب تیاریوں میں مصروف تھے۔ ابا اپنی بیٹی کو بڑی شان سے وداع کرنا چاہتے تھے۔ مجھے محلے کی روبینہ آنٹی نے تیار کیا تھا کہ اچانک باہر سے چیخ و پکار کی بہت سی آوازیں ابھری تھیں اور ان میں سب سے زیادہ بلند ابا کے رونے کی آواز تھی۔ میرا دل انجانے خدشے کے تحت لرز اٹھا تھا۔ میں بھاگ کر باہر آئی تھی۔ ابا اپنی پگڑی اتارے صحن کے بیچوں بیچ بیٹھے زور زور سے رو رہے تھے۔
''ارے نیلے رنگ کی نحوست میری بیٹی کے سہاگ کو کھا گئی۔ بیچارے کو شادی والے دن سانپ نے ڈس لیا۔
''لوگ بتا رہے ہیں' اُس کا پورا وجود نیلگوں ہو گیا ہے، بہت ہی زہریلا سانپ تھا' ہسپتال لے گئے ہیں بیچارے کو مگر......''
مجھے جیسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ میں ابا کے پاس آئی تھی تو وہ مجھے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگے تھے۔ میں الٹے قدموں اٹھ کر بھاگی تھی۔ سڑک پر لوگوں نے حیرت سے نیلوں نیل دلہن کو دیوانہ وار بھاگتے دیکھا تھا۔ جس وقت میں نے اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں قدم رکھا تھا' گوہر اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے چکا تھا۔ اُس کا وجود نیلا ہو گیا تھا۔ اُس کی آنکھیں جیسے مجھ پر جمی ہوئی تھیں' جیسے کہہ رہی ہوں۔
''دیکھ لو نیلی تمہیں نیلا رنگ پسند تھا نا...... میں نے تمہاری پسند پوری کر دی۔''
میں وہیں غش کھا کر گر پڑی تھی۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہ رہا تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں گھر اپنے بیڈ پر تھی۔
''زندگی رکتی نہیں' لیکن مجھے لگتا ہے میری زندگی ایک نقطے پر جامد ہو چکی ہے۔ میں اب زیادہ باہر نہیں نکلتی' اکثر کمرے میں ہی بند رہتی ہوں۔ مجھے اب ہر رنگ سے خوف آتا ہے' لیکن نیلے رنگ سے تو وحشت ہوتی ہے۔ میں نے اپنی ہر وہ چیز جلا دی' اجاڑ دی جو نیلے رنگ کی تھی۔ میری زندگی سے اب نیلے رنگ کی اہمیت ختم ہو چکی ہے' میری نیلے رنگ والی جنونیت اب ختم ہو گئی ہے لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ گوہر کی نیلی آنکھیں آج بھی میرے تصور میں مسکراتی ہیں۔

☆☆......☆☆

محبت جل گئی تھی

شباب کیرانوی کا خیال

محبت میں سارا جہاں جل گیا
زمیں جل گئی آسماں جل گیا

نوشین آراء

''رضیہ خالہ! آپ سے کافی سال بعد ملاقات ہو رہی ہے۔ٹھیک تو ہیں۔'' خالہ مجھ سے جب بھی ملتی بہت تپاک سے ملتی تھیں اور ہم کافی دیر تک ایک دوسرے سے گپیں لگاتے تھے۔ وہ رشتے میں تو خالہ تھیں۔لیکن ہم سہیلوں کی طرح ملتے تھے۔

خالہ آپ کی ایک بہت پیاری سی دوست تھی نفیسہ' وہ کہاں ہیں آج کل اور کیسی ہیں؟'' خالہ میرے منہ سے نفیسہ کا ذکر سن کر اُداس ہوگئیں اور بولیں۔

''وہ تو اب اس دنیا میں نہیں ہے۔'' یہ سن کر مجھے بھی بہت دکھ ہوا اور پھر خالہ نے اپنی دوست نفیسہ کی جو کہانی مجھے سنائی اُس نے مجھے بھی بہت زیادہ دکھی کر دیا تھا۔

مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے جب امی اور ہم سب بہن بھائی نانی کے گئے ہوئے تھے۔نانی دوپہر میں ہمارے لیے دستر خوان لگا ہی رہی تھیں کہ خالہ کی دوست نفیسہ اچانک ہی آگئی تھیں۔ اور سب نے اصرار کر کے انہیں بھی کھانے میں شریک کرلیا تھا۔

وہ کھانا کھانے بیٹھی تھیں تو اپنا رومال نکال کر اپنے پاؤں کو ڈھانپ لیا تھا۔رضیہ خالہ نے پوچھا تھا۔ یہ کیا ہوا ہے تو وہ بولی تھیں۔

''میرا پاؤں جل گیا ہے آپ لوگوں کو کراہیت ہوگی اس لیے میں نے ایسا کیا ہے۔'' وہ واقعی اپنے نام کی طرح نفیس تھیں۔بہت اچھے گھرانے سے تعلق تھا' دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ اُس نازک سی سانولی سلونی لڑکی میں نہ جانے کیا بات تھی جو ایک بار اُسے دیکھتا وہ دیکھتا ہی رہ جاتا' بات کرتی تو لگتا منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں۔جی چاہتا کہ وہ باتیں کرتی رہیں اور سننے والا سنتا ہی رہے۔

☆......☆......☆

خالد صاحب کے دو بیٹے تھے اُن کی بیوی کی خواہش تھی کہ اس بار بیٹی ہو اللہ نے اُن کی یہ خواہش نفیسہ کی صورت پوری کردی تھی۔وہ بہت خوش تھیں اب اُن کی فیملی مکمل ہوگئی تھی' گھر میں ہر آسائش تھی کمی تھی تو بیٹی کی۔وہ بھی پوری ہوگئی تھی۔

دونوں بھائی بھی گڑیا سی بہن نفیسہ کی آمد پر بہت خوش ہوئے تھے۔ وہ اکثر چھوٹی بہن کو چھیڑتے' وہ رونے لگتی تو بڑے لاڈ پیار سے اُسے مناتے' نفیسہ جب بڑی ہوئی تو اُس نے بھائیوں کے ساتھ اسکول جانا شروع کیا وہ پڑھائی میں بھی بہت اچھی تھی۔اُس زمانے میں لوگوں کو فلموں کا بہت شوق تھا۔ ٹی وی

وغیرہ تو تھے نہیں لوگ فلموں سے دل بہلایا کرتے تھے۔ نفیسہ کو بھی فلموں کا شوق تھا۔ اس کے گھر میں کسی چیز کی کمی تو نہیں تھی' جب بھی وہ فرمائش کرتی۔
''ممی مجھے فلم دیکھنے جانا ہے۔'' دونوں ماں بیٹی فلم دیکھنے چلی جاتیں' سنیما بھی ان کے گھر سے قریب ہی تھا۔ نفیسہ کو وحید مراد کی فلمیں دیکھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ وہ اُس کی فلمیں دیکھ دیکھ کر اپنے آپ کو بھی ایک ہیروئن سمجھنے لگی تھی۔ نفیسہ نے بی اے کرنے کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی بھائی اکثر کہتے۔
''اب تمہیں کیا کرنا ہے پڑھ کر' شادی وادی کرو اور اپنے گھر جاؤ۔'' تو وہ چڑ جاتی ماں سے شکایت کرتی۔
''ممی بھائی مجھے گھر سے نکالنے کا سوچ رہے ہیں۔'' ممی اس کی بات سن کر مسکراتی رہتیں۔
نفیسہ نے شادی کے لیے شوہر کے حوالے سے اپنا ایک آئیڈیل بنا رکھا تھا۔ وہ اکثر کہتی۔
''جب تک مجھے اپنا آئیڈیل نہیں ملے گا میں نہیں کروں گی شادی۔''
نفیسہ کی ممی چاہتی تھیں کہ اُس کی شادی اپنی ہی برادری میں' اپنے ہی جیسے کسی اچھے گھرانے میں ہو' وہ جس برادری سے تعلق رکھتی تھیں وہ بہت امن پسند لڑائی جھگڑے اور سیاست وغیرہ سے دور رہنے والی تھی۔
وہ اپنی بیٹی کو بھی محبت' امن پسندی اور خلوص کے ساتھ رہنے کا درس دیتی رہتی تھیں۔ ممی اکثر نفیسہ کو یہ سمجھاتی رہتیں۔
''بیٹی کوئی آئیڈیل نہیں ہوتا حقیقت کی دنیا میں آؤ اور اپنی ہی برادری میں شادی کے لیے راضی ہو جاؤ۔''
نفیسہ کی سمجھ میں ممی کی بات نہیں آتی تھی۔ وہ اپنی خیالی دنیا میں مگن تھی کہ فلموں کی طرح اُس کی پسند کا ہیرو آئے گا اور اسے بیاہ کر لے جائے گا۔
ایک روز وہ اپنی ممی کے ساتھ شاپنگ کے لیے گئی تھی کہ اُس کی نظر وہاں بائیک سے ٹیک لگائے کھڑے ایک بہت خوبصورت نوجوان پر پڑی تھی۔



نفیسہ اُسے بس دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ وہ نوجوان پہلی ہی نظر میں اُس کے دل کو بھا گیا تھا۔
نفیسہ گھر آنے کے بعد بھی اُس نوجوان کا خیال اپنے دل و دماغ سے نہ نکال سکی تھی۔ رہ رہ کر اُس کا چہرہ نظروں کے سامنے آ جاتا تھا۔ اب وہ اُس مقام سے اکثر گزرتی کہ شاید نوجوان پھر نظر آ جائے لیکن وہ دوبارہ نظر نہ آیا تھا۔
اس واقعہ کے تقریباً ایک ماہ بعد نفیسہ اپنی ایک بہت قریبی دوست فرزانہ سے ملنے اس کے گھر گئی تھی اور وہ دونوں باتوں میں مصروف تھیں کہ وہاں فرزانہ کے بھائی سلیم اور اس کے ایک دوست کی آمد ہوئی تھی وہ اچانک اپنے سامنے اُسی نوجوان کو دیکھ کر حیران ہو گئی تھی۔ جو اُسے شاپنگ کے دوران نظر آیا تھا۔ نفیسہ کے دل میں تو ایک ہلچل سی مچ گئی تھی۔ اس کے منہ سے کچھ نکل نہیں پا رہا تھا وہ دونوں نفیسہ کو سلام کر رہے تھے' اور وہ جیسے سکتے کے عالم میں بیٹھی تھی۔ یہ صورت حال دیکھ کر اُس کی دوست فرزانہ نے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلایا تھا۔ تو نفیسہ چونک گئی تھی۔
فرزانہ ہنس کر بولی تھی۔
''کیوں بھئی کہاں کھوئی ہوئی ہو؟ کیا ارادہ ہے؟'' نفیسہ اُن تینوں کے سامنے جیسے شرمندہ سی ہو گئی تھی۔
فرزانہ کے بھائی سلیم نے اپنے دوست کا تعارف کروایا تھا۔
''اِس کا نام شیراز ہے۔ اس نے میرے ساتھ ایم بی اے کیا ہے۔ اب جلد ہی اِس کی امی شادی کی شکل میں اِس کے پاؤں میں زنجیر ڈالنے والی ہیں۔ بے چاری لڑکیوں کی شامت آئی ہوئی ہے' ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نقص نکالتی رہتی ہیں۔''
نفیسہ یہ ساری باتیں سن کر سوچ رہی تھی۔
''کاش میں ہی اِس کی پسند ہوتی یہ میرا شوہر ہوتا' وہ خدا سے دعا مانگنے لگی۔''
''اے اللہ یہ شخص میرا ہو جائے۔'' شاید ہو قبولیت کی گھڑی تھی کہ فرزانہ بولی۔
''ارے سلیم بھائی آپ میری دوست نفیسہ کو دیکھا دیجیے اِن کی امی کو شاید یہی شیراز بھائی کی دلہن بن جائے' ویسے بھی لگتا ہے شیراز بھائی اسے زیادہ پسند آ گئے ہیں' جو اِس کی بولتی بند ہو گئی ہے۔''
اُدھر شیراز بھی نفیسہ کو دیکھتے ہی دل ہار گیا تھا نہ جانے اِس لڑکی میں کیا بات تھی جو اُسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی' کون سی کشش تھی کہ اُس کا دل بھی نفیسہ کے لیے مچلنے لگا تھا۔
وقت گزرنے کے ساتھ نفیسہ اور شیراز آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے قریب گئے تھے۔ اکثر فون پر محبت بھری باتیں ہوتی رہتیں اکثر ساتھ گھومنے پھرنے بھی جاتے رہتے۔ شیراز نے اپنی امی کو اپنی پسند بتائی تھی تو وہ لڑکی دیکھنے کے لیے راضی ہو گئی تھیں۔ مگر جب دونوں فیملیز ایک دوسرے سے ملی تھیں تو دونوں کو کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی' کیونکہ وہ مختلف ذات برادری کے لوگ تھے۔ وہ دونوں فیملیز اِس رشتے کے لیے راضی نہیں تھیں' لیکن دوسری جانب دونوں کے والدین اپنی اپنی اولاد کی محبت کے آگے مجبور بھی تھے۔ نفیسہ کی امی نے کہہ دیا تھا۔
''تم اپنی ضد کے آگے ہماری بات نہیں مان رہی ہو' اُن کا رہن سہن' زبان' سب کچھ تو الگ ہے اور سب کچھ الگ ہو تو پھر ساتھ زندگی گزارنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔''
نفیسہ نے ماں کی بات سُنی اَن سُنی کر دی تھی۔
''آپ ہی تو ہر ایک سے محبت کا درس دیتیں ہیں۔ تو اب کیوں مخالفت کر رہی ہیں؟''
''بیٹی ہم تو ہر ایک بات کو نظر انداز کر سکتے ہیں لیکن دوسری طرف سے بھی تو ہمیں یہی توقع ہو کہ وہ بھی ہماری طرح سوچ رکھتے ہیں۔''
می بالکل ٹھیک کہہ رہی تھیں دوسری طرف اِس رشتے کے لیے سخت مخالفت چل رہی تھی' وہ بھی اپنے بیٹے کو سمجھا رہی تھیں۔
''بیٹے تم الگ برادری سے لڑکی لا رہے ہو۔ یہ شادی ہماری آگے کی نسل پر اثر انداز ہو گی' اور پھر ہماری برادری کے لوگ کیا کہیں گے' ویسے بھی بچے ماں کی تربیت کا اثر لیں گے۔''

بہت مخالفت' کافی بحث و مباحثے کے باوجود' نفیسہ اور شیراز اپنی جگہ اٹل رہے تو دونوں کے والدین اِس شادی پر مجبور ہو گئے تھے۔ اُن کے دلوں میں کوئی خوشی نہیں تھی۔ اور آخرکار یہ شادی ہو گئی تھی۔

شیراز کے گھر اُس کی دلہن بن کے آنے کے تیسرے دن سے ہی ساس نے نفیسہ کو گھر کے کام سے لگا دیا تھا۔ وہ ساس کی خوشی کے لیے گھر کے تمام کام کرنے لگی تھی' جبکہ اپنے گھر میں تو ماں بھائیوں کی لاڈلی ہونے کی وجہ سے وہ کوئی کام نہیں کرتی تھی' اب یہاں پر نفیسہ ساس کی خوشی کے لیے ہر کام پر رضامند ہو جاتی' وہ چاہتی تھی کہ ساس اور تمام گھر والے مجھ سے خوش رہیں' وہ اپنے پیار' محبت' خلوص سے اُن سب' خاص کر ساس کا دل جیت لے۔

نفیسہ کی تمام تر کوشش کے باوجود بھی ساس اس کے ہر کام میں نقص نکالتی رہتیں اور اس کی برادری کو بنیاد بنا کر طعنے دیتی رہتی تھیں' نفیسہ کبھی بھی اپنے شوہر سے کسی بھی بات کی شکایت نہیں کرتی تھی وہ سارا دن کام میں لگی رہتی اپنے شوہر کے سامنے مسکراتی رہتی اور جب وہ آفس جاتا تو چپکے چپکے آنسو بہا کر اپنے دل کا بوجھ کم کر لیتی' وہ اپنے والدین کو بھی کچھ نہیں بتا سکتی تھی' کیونکہ اس تمام صورت حال سے تو اُس کی ممی نے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا' لیکن اُس وقت وہ محبت میں اندھی ہو چکی تھی' اُسے اُس وقت کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

محبت میں تو نفیسہ اب بھی اندھی تھی' سارے ظلم خاموشی سے برداشت کر رہی تھی۔ سارے گھر کا کام' کپڑے دھونا' استری کرنا' برتن دھونا' کھانا پکانا اور اس کے باوجود اپنے ماں باپ کے گھر جانے کی اجازت نہ ملنا' اوپر سے ساس کی جھڑکیاں اور طعنے سننا یہ سب برداشت کرتی رہی تھی' اُس کی زبان پر کبھی حرفِ شکایت نہ آیا تھا۔

☆......☆......☆

نفیسہ کو اِس ظلم کی چکی میں پستے ہوئے سات ماہ کا عرصہ گزر گیا تھا۔ نفیسہ کی ساس کے لیے یہ صورت حال ناقابلِ قبول تھی' کیونکہ وہ تو یہ سمجھ رہی تھیں کہ دھان پان سی لڑکی پر زیادہ ظلم کروں گی تو یہ میرے

سردیوں کی بارش

سردیوں کی بارش بھی
کیا عجیب بارش ہے
آتم ہیں نہ جھولے ہیں
بھیگنے کی خواہش بھی
جاگتی نہیں دل میں
بند بند کمرے میں
گرم گرم بستر میں
چسکیوں کی آوازیں
ہیٹروں کی گرمائش
اور بند کھڑکی سے
جھانکتی ہوئی بوندیں
جیسے کہتی ہوں آؤ
اس طرح نہیں کرتے
سردیوں کی بارش میں
اس طرح نہیں ڈرتے

قاضی اعجاز محور

بیٹے کو چھوڑ دے گی، پھر میں اپنے بیٹے کی اپنی ہی برادری میں شادی کر دوں گی۔

اُس روز نفیسہ صبح ناشتہ بنانے کے لیے کچن میں گئی تھی اُس نے چائے بنانے کے لیے پتیلی میں پانی گیس والے چولہے کا ایک برنر جلا کے رکھا تھا اور پتی چینی وغیرہ ڈال کر اپنے کمرے میں شوہر کو اٹھانے کے لیے گئی تھی یہ اُس کا روز کا معمول تھا وہ شوہر کو اٹھا کر کچن میں واپس آئی تو اُس نے اپنی ساس کو کچن سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔

''امی آپ کچن میں کیوں آئیں، کچھ چاہیے تھا تو مجھے کہہ دیا ہوتا۔''

''میں یہ دیکھنے آئی تھی تم نے چائے بنانے کے لیے رکھ دی ہے یا نہیں؟'' یہ کہہ کر وہ کچن سے باہر نکل گئی تھیں۔ چائے تیار ہو گئی تھی۔ نفیسہ نے چائے نکالنے کے لیے پتیلی چولہے کے ایک برنر سے اٹھائی ہی تھی کہ دوسرا برنر خود بہ خود بھڑک گیا تھا اور نفیسہ کے دوپٹے نے آگ پکڑ لی تھی، اُس نے گھبراہٹ میں چائے کی پتیلی ہاتھ سے چھوڑی تھی تو ساری چائے اُس کے اوپر گر گئی تھی۔ وہ بری طرح سے چیخ رہی تھی سب دوڑتے ہوئے کچن میں آئے تھے، نفیسہ کے شوہر نے جلدی سے اس کے اوپر پانی ڈالا تھا۔ آگ تو بجھ گئی تھی لیکن اس عرصے میں اُس کا جسم بہت زیادہ جل چکا تھا، اُسے بہت بڑی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا تھا، جہاں نفیسہ کے والدین بھی آ گئے تھے اور اپنی بیٹی کی بری حالت دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ اسپتال کی انتظامیہ کے بلانے پر پولیس بھی پہنچ چکی تھی۔ نفیسہ سے پولیس نے پوچھا تھا کہ آگ کیسے لگی۔

نفیسہ نے بیان دیا تھا کہ چائے بناتے ہوئے اپنی غلطی سے جل گئی۔

بھائی اور والدین کو شک تھا کہ یہ حادثہ نہیں تھا اُسے جلایا گیا ہے لیکن اُن کی بیٹی ہی اس بارے میں کچھ اور بتانے کو تیار نہیں تھی، نفیسہ اپنے شوہر شیراز سے بہت پیار کرتی تھی، اُس نے تو شیراز کو بھی یہ نہیں بتایا تھا کہ حادثے سے پہلے اس نے اپنی ساس کو کچن سے نکلتے دیکھا تھا صرف اس لیے کہ وہ پریشان ہو جائے گا۔

نفیسہ بہت زیادہ جلنے کی وجہ سے زیادہ بات نہیں کر پا رہی تھی۔ پولیس کے بار بار پوچھنے اور کہنے کے باوجود بھی اس نے اپنا بیان نہیں بدلا تھا، آخری وقت تک وہ یہی کہتی رہی تھی کہ میں چائے سے جلی ہوں، میرے اوپر چائے گر گئی تھی۔ پولیس کو اس بیان پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن وہ نہ جانے کیوں سچ چھپا رہی تھی اس لیے پولیس کی کارروائی بھی نہیں ہو سکی تھی۔ اُس کے والدین بھی خاموش ہو گئے صبر کر کے بیٹھ گئے تھے کہ جب اُن کی لڑکی ہی کچھ نہیں کہہ رہی تھی تو وہ بھی کیا کرتے صبر تو کرنا ہی تھا۔ اور پھر تین دن شدید اذیت کی کیفیت میں رہنے کے بعد نفیسہ اس دنیا سے اپنی موت کا راز ساتھ ہی لے گئی تھی۔ اُس نے سب کو بچا لیا تھا، وہ مرتے وقت بھی محبت کا درس نہیں بھولی تھی۔ شاید یہی بات اُس کی بخشش کا سبب بن گئی ہو۔

نفیسہ نے تو سب کو بچا لیا تھا لیکن قدرت تو سب دیکھ رہی تھی۔ کچھ عرصے بعد شیراز کی دوسری شادی ہو گئی وہ اپنی بیوی کو لے کر ملک سے باہر چلا گیا۔ رفتہ رفتہ سب بچے الگ ہو گئے تھے اب ساس گھر میں اکیلی رہ گئی تھیں اور پھر لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ ساس اب جب بھی کچن میں جاتیں فوراً ہی خوف زدہ سی باہر آ جاتیں آہستہ آہستہ وہ نفسیاتی مریضہ بن گئیں، چیخنے لگتیں۔

''مجھے نفیسہ کی چیخوں کی آواز آ رہی ہے مجھے سونے نہیں دیتی ہیں یہ آوازیں کچن میں کام نہیں کر سکتی، مجھے لگتا ہے میں اُسی طرح آگ میں جل جاؤں گی۔'' وہ زور زور سے چیخنی چلاتی رہتیں خود ہی بڑبڑاتی رہتیں اِسی بڑبڑاہٹ نے اُن کا راز کھول دیا تھا اب وہ اپنے ضمیر کی عدالت میں کھڑی ہوتیں اور منہ ہی منہ میں نفیسہ کی روح سے معافی مانگتی رہتیں چند سال بعد اُن کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔

نفیسہ کے والدین بھی زیادہ عرصہ اپنی بیٹی کا صدمہ برداشت نہ کر سکے، اور جلد ہی وہ اپنی بیٹی سے جا ملے، نفیسہ کے بھائی آج بھی اپنی پیاری بہن کو یاد کر کے روتے ہیں۔

☆☆......☆☆

اودھا سے پانچویں جیتی جاگتی کہانی

دیر آئے درست آئے

احسان دانش کا خیال

شاید اِسی مقام کی مجھ کو تلاش تھی
دریافت کر رہی ہے یہاں زندگی مجھے

ممتاز احمد

میں نے جب بس کو لاری اڈے سے نکالا تو اُس وقت آٹھ یا دس سواریاں بیٹھی تھیں' چنانچہ ہر اسٹاپ سے سواریاں بٹھانی شروع کر دیں' شہر سے پندرہ کلومیٹر دور تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ اب تیس کے قریب سواریاں بیٹھ چکی تھیں لہٰذا میں نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ کنڈیکٹر نے سواریوں سے کرایہ لینا شروع کر دیا۔

مجھ سے پچھلی سیٹ پر ایک جوان' خوبصورت اور خوبرو لڑکی اپنے ایک سال کے بیٹے کے ساتھ بیٹھی تھی اور اپنے بچے کو پیار کر رہی تھی' جب کنڈیکٹر نے اُس سے کرایہ طلب کیا تو وہ اپنا پرس بیگ میں تلاش کرنے لگی۔ پورے پانچ منٹ تک اُس نے اپنے بیگ کو ٹٹولا مگر اُس کا پرس نہیں مل رہا تھا۔ وہ پریشانی کے عالم میں کہنے لگی۔

''اپنا پرس گھر بھول آئی ہوں۔'' کنڈیکٹر نے فوراً جواب دیا۔ ''بی بی ڈرامہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جلدی سے کرایہ دو۔'' وہ لڑکی کہنے لگی۔

''بھائی میں سچ بول رہی ہوں میرا پرس گھر رہ گیا ہے۔'' اس پر کنڈیکٹر کچھ غصے سے بولا۔

''بی بی اگر کرائے کے پیسے نہیں ہیں تو چلو گاڑی سے نیچے اترو۔'' اور ساتھ ہی مجھے گاڑی روکنے کا کہا۔

میں نے اپنے اوپر لگے شیشے سے لڑکی کی طرف دیکھا تو وہ حقیقتاً پریشان نظر آ رہی تھی' اب تو اُس کے بچے نے بھی رونا شروع کر دیا تھا۔ میں چند سیکنڈ تک اُس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا مجھے وہ سچی معلوم ہو رہی تھی۔ کنڈیکٹر نے مجھے دوبارہ آواز دی۔

''استاد جی گاڑی روکو۔'' مگر میں نے گاڑی روکنے کے بجائے کنڈیکٹر سے کہا۔

''تم اس لڑکی کا ٹکٹ کاٹ دو اور پیسے مجھ سے لے لینا۔'' جس پر اُس نے ٹکٹ کاٹ کر لڑکی کو دے دیا۔ لڑکی نے احسان مند نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی اُس کے بیٹے نے زور زور سے رونا شروع کر دیا اور وہ اُسے چپ کرانے میں لگ گئی۔

میرا نام صفدر ہے اور میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔ میرا باپ ایک غریب آدمی تھا وہ سارا دن محنت مزدوری کرتا اور شام کو اتنا کما کے لاتا کہ ہم گھر کے تین افراد بمشکل تین ٹائم کا کھانا کھاتے' میری عمر اُس وقت سات یا آٹھ سال تھی جب میرے ابا کا انتقال ہو گیا۔ میری ماں بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی

اب اتفاق سے میرے ددھیال اور ننھیال میں سے کوئی بھی نہ تھا میرے ماں باپ دونوں اکیلے تھے تو باپ کی وفات کے بعد ہم ماں بیٹے پر تنگی اور مصیبت کے پہاڑ گر گئے' پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے میری ماں نے عدت میں بیٹھنے کی بجائے لوگوں کے گھروں میں کام کرنا شروع کر دیا۔ میں اُس وقت تیسری کلاس میں سرکاری اسکول میں پڑھتا تھا۔ میری ماں صبح کی گئی شام کو تھک ہار کر گھر آ کر چارپائی پر گر جاتی' جبکہ میں دن ایک بجے اسکول سے آ جاتا تھا اور اپنی ماں کا انتظار کرتا تھا۔ دوپہر کا کھانا ماں بنا کر رکھ جاتی جسے میں آ کر کھالیتا۔ ہمارا گھر لاری اڈے کے بالکل قریب تھا' تو اسکول سے واپس آ کر میرا زیادہ تر ٹائم لاری اڈے میں گزرتا' جب ماں کے آنے کا ٹائم ہو جاتا تو میں گھر چلا جاتا۔ ماں گھر آ کر پورا ایک گھنٹہ چارپائی پر لیٹی رہتی' پھر وہ اٹھ کر رات کا کھانا بناتی۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد میری ماں بہت جلد سو جاتی جبکہ میں دس بجے تک پڑھتا رہتا۔ اسکول اور محلے میں میرا کوئی دوست نہ تھا شاید ہماری غربت کی وجہ سے میری دوستی کسی بھی لڑکے کے ساتھ نہ ہو سکی تھی یہی وجہ تھی کہ میں بچپن سے ہی ایک بہت حساس دل رکھنے والا بندہ تھا۔

☆......☆......☆

وقت پر لگا کر اڑتا رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے سات سال کا عرصہ اسی روٹین میں گزر گیا میرا میٹرک کا سالانہ امتحان سر پر آ گیا تو میں نے دل لگا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ اب میں اسکول سے سیدھا گھر آ کر دوپہر کا کھانا کھا کر تھوڑی دیر آرام کرتا پھر پڑھنے لگ جاتا۔ میری ماں پورا مہینہ لوگوں کے گھروں میں کام



کرتی' اُس کی کوئی چھٹی نہیں تھی۔ صبح سے لے کر رات تک وہ کام کرتی۔ اُس وقت ماں کی عمر اڑتیس سال تھی مگر دیکھنے میں وہ پچاس پچپن کی نظر آتی تھی۔ سارا دن وہ اپنے مالکوں کی باتیں تو خاموشی سے سنتی رہتی مگر گھر آ کر وہ اُن باتوں کا سارا غصہ مجھ پر نکالتی۔ میں چونکہ اپنی ماں کے حالات سے بخوبی واقف تھا تو ماں کی جلی کٹی باتیں بڑی خاموشی سے سن لیا کرتا تھا۔

ماں بہت چڑچڑی ہوگئی تھی' ایک تو شروع سے ہی غربت دیکھی تھی دوسرا وہ جوانی میں بیوہ ہوگئی اور تیسرا یہ کہ بغیر چھٹی کیے پورا مہینہ وہ کام کرتی' تو یہی وجہ تھی کہ اُسے کئی چھوٹی موٹی بیماریوں نے گھیر لیا تھا چڑچڑی ہونے کے باعث وہ بات بات پر لڑنے لگی تھی۔ اسی لیے وہ پورے محلے میں لڑاکی ماسی کے نام سے مشہور ہوگئی۔

میں نے میٹرک کا امتحان پوری محنت کے ساتھ دیا' جس دن میرا آخری پیپر تھا اُس روز میں نے اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا اور اُسی دن سے لاری اڈے جانا شروع کر دیا۔ وہاں اپنے ہی جیسے ایک بندے' جس کا نام خدا بخش تھا سے دوستی ہوگئی وہ گاڑیوں کی مرمت وغیرہ کرتا تھا۔ میٹرک کا رزلٹ چار ماہ کے بعد آنا تھا تو رزلٹ آنے تک میں نے ڈرائیونگ سیکھ لی۔ میں صبح سے لے کر شام تک خدا بخش کے پاس رہتا۔

جب میٹرک کا رزلٹ آیا تو اُس وقت میری عمر سترہ سال تھی' میں نے ہائی سیکنڈ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ جس دن رزلٹ آیا اُس روز میری ماں بہت خوش ہوئی اُس نے مجھے اپنے گلے لگا کر خوب پیار کیا اور مٹھائی منگوا کر محلے میں تقسیم کی۔ میں نے سرکاری کالج میں فرسٹ ایئر میں داخلہ لے لیا' کالج جانے کے ساتھ ساتھ میرا لاری اڈے میں خدا بخش کے پاس آنا جانا بھی رہا۔ خدا بخش کے پاس پولیس کے ایک بندے ساجد کا آنا جانا بھی تھا۔ وہ ٹریفک پولیس میں ڈرائیور تھا اور اپنی گاڑی کا کام خدا بخش سے کروانے آتا تھا تو اسی نسبت سے میری دعا سلام بھی ساجد سے ہوگئی۔ جب میری عمر اٹھارہ سال ہوگئی تو ساجد نے ہی میرا شناختی کارڈ بنوایا تھا۔

کچھ دن گزرے تو ساجد کہنے لگا۔

''یار میں تمہارا ڈرائیونگ لائسنس نہ بنوا دوں؟''

تو میں نے کہا۔

''میں نے کیا کرنا ہے لائسنس بنوا کر اور دوسرا یہ کہ اِس پر اچھی خاصی رقم خرچ ہوتی ہے۔'' ساجد کہنے لگا۔

''تم رقم کی فکر نہ کرو۔ میں تمہارا ڈرائیونگ لائسنس بنوا دیتا ہوں۔ تمہارے کام ہی آئے گا۔''

میرے نہ نہ کرنے کے باوجود ساجد نے میرا LTV اور HTV ڈرائیونگ لائسنس بنوا دیا اور مجھ سے ایک روپیہ بھی نہ لیا' میں نے ڈرائیونگ لائسنس گھر لا کر رکھ دیا اُس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد ساجد کا تبادلہ کسی اور شہر میں ہوگیا۔

جب میں سیکنڈ ایئر میں پڑھ رہا تھا تو ایک روز میری ماں جلد گھر آ گئی اور نڈھال ہو کر چارپائی پر گر گئی۔ میں نے اپنی ماں کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو اُسے بہت شدید بخار تھا اور اسے جوڑوں کا شدید درد بھی لاحق تھا۔ پورا مہینہ ماں گھر میں رہی اور اُس کا علاج ہوتا رہا۔ جب اُس کی حالت کچھ بہتر ہوئی اور وہ چلنے پھرنے کے کچھ قابل ہوئی تو دوبارہ اپنے کام پر گئی تب پتہ چلا کہ سب گھروں نے نئی کام والیاں رکھ لی تھیں۔ میری ماں کو جواب مل گیا تھا۔ پاس ایک روپیہ نہ تھا جس کی وجہ سے اُس کا علاج چھوٹ گیا' اُدھر کالج والے ایف اے کا داخلہ بھیجنے کے لیے فیس مانگ رہے تھے' ہمارے پاس پھوٹی کوڑی تک نہ تھی تو میرا داخلہ کالج والوں نے نہ بھیجا' میں نے کالج جانا چھوڑ دیا اب میں سارا دن خدا بخش کے پاس لاری اڈے میں بیٹھا رہتا تھا۔

میں اُن دنوں بہت پریشان رہتا تھا۔ میری پریشانی کی وجہ خدا بخش نے پوچھی تو میں نے اُسے اپنے سارے حالات بتا دیے۔ اُس نے مجھے کچھ روپے دیے جن سے گھر میں راشن ڈالا۔ دو یا تین دن گزرے تو اخبار میں' آرمی میں ڈرائیورز کی بھرتی کا

اشتہار شایع ہوا تھا۔ میری پڑھائی تو چھوٹ گئی تھی' ماں بیمار تھی تو میں نے کچھ سوچ کر درخواست دے دی۔ بہت جلد مجھے کال آ گئی۔ جب میں بھرتی کے لیے پیش ہوا تو میرا شناختی کارڈ اور ڈرائیونگ لائسنس چیک کیے گئے جو کہ بالکل ٹھیک تھے میرا قد بھی لمبا تھا میٹرک پاس تھا اور جب میری ڈرائیونگ چیک کی گئی تو وہ بھی بالکل پرفیکٹ تھی' چنانچہ مجھے پاک آرمی میں ڈرائیور بھرتی کر لیا گیا تھا۔

اتفاق سے میری پوسٹنگ میرے ہی شہر میں ہوئی تھی۔ روزانہ آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی ہوتی جو کہ میں بہت اچھے طریقے سے کر رہا تھا' میں نے اپنی ماں سے کہا کہ اب آپ کو کہیں بھی کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے' بس آپ آرام سے گھر رہو۔ ویسے بھی میری ماں جس نے ساری زندگی محنت مشقت کی تھی' اب وہ مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو گئی تھی' سب سے بڑا مسئلہ اُسے جوڑوں میں شدید درد کا تھا۔ وہ بمشکل واش روم تک آ تی جاتی تھی' سارا دن چارپائی پر پڑی چیختی چلاتی رہتی' میں جیسے ہی گھر آتا وہ بولنا شروع ہو جاتی اور بے تکان بولتی رہتی۔ میری کیونکہ اب ملازمت لگ گئی تھی تو میری ماں کو میرے بیاہ کی فکر لاحق ہوئی اور اُس نے میرے لیے لڑکی تلاش کرنا شروع کر دی' مگر میرے رشتے میں میری ماں کا لڑنا جھگڑنا اور بہت زیادہ بولنا آڑے آتا' جو رشتہ بھی آتا وہ میری ماں کی بدمزاجی دیکھ کر پلٹ کر نہ آتے تھے۔

وقت کا کام ہے گزرنا اور وقت گزرتا جا رہا تھا' اسی دوران میری پوسٹنگ دوسرے شہروں میں بھی ہوتی مگر جلد ہی کینسل ہو جاتی اور میں واپس اپنے شہر میں آ جاتا' اسی طرح اٹھارہ سال کا عرصہ بیت گیا۔ میری ماں میرا رشتہ تلاش کرتی رہی مگر ہر طرف سے ناکامی ہوئی۔ اب میری عمر تقریباً چھتیس سال ہو گئی تھی' مگر میں ابھی تک کنوارہ ہی تھا' اور پھر ایک دن میری پوسٹنگ کے آرڈرز کوئٹہ کے آ گئے' میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح یہ آرڈر کینسل ہو جائیں۔ مگر میرے آرڈرز کینسل نہ ہوئے' چنانچہ میں نے کوئٹہ جانے کی بجائے اپنی ماں کی وجہ سے ریٹائرمنٹ

غزل

زندگی خاموش پلکوں پر دھری رہ جائے گی
دیکھنا اک روز دنیا دیکھتی رہ جائے گی

خواب ہو جائیں گے سارے چاہتوں کے سلسلے
روشنی تاریک غاروں میں پڑی رہ جائے گی

کوچ کر جائے گا اک دن آخری ہمدرد بھی
اور پھر تا عمر کھڑکی ادھ کھلی رہ جائے گی

تیرا ملنا آخری خواہش ہے لیکن دیکھنا
تجھ سے مل کر بھی عجب سی تشنگی رہ جائے گی

بند کر دوں گی میں اک دن روح کی سب کھڑکیاں
اور پھر اک رات مجھ میں بھاگتی رہ جائے گی

عکاشہ سحر

اپلائی کردی۔ میری ریٹائرمنٹ کی درخواست منظور کرلی گئی اور مجھے ریٹائرڈ کردیا گیا۔ مجھے گریجویٹی کی مد میں پانچ لاکھ روپے ملے اور ماہانہ بارہ ہزار پنشن مقرر ہوئی۔ میں نے پانچ لاکھ روپے بینک میں جمع کروادیے تھے۔اب میں بالکل فارغ ہوتا تھا تو سارا دن اپنی ماں کی بک بک جھک جھک سنتا رہتا جس سے میں چندروز میں ہی اُکتا گیا اور دوبارہ لاری اڈے جانا شروع کردیا۔

میرا پاک آرمی میں اٹھارہ سالہ ڈرائیورنگ کا تجربہ تھا اور انیس سال پرانا ایل ٹی وی اور ایچ ٹی وی کا ڈرائیونگ لائسنس تھا جو کہ میرے بہت کام آیا اور مجھے خدا بخش کے توسط سے ایک بڑی گاڑی میں ڈرائیوری کی نوکری مل گئی۔

میں صبح نو بجے گاڑی کو لاری اڈے سے نکالتا اور دوسرے شہر لے جاتا جس کی مسافت چار گھنٹے کی تھی وہاں ایک گھنٹہ رُکتا اور پھر گاڑی واپس لے آتا اس طرح مجھے روزانہ شام کے چھ ساڑھے چھ بج جاتے۔ معقول تنخواہ تھی بارہ ہزار روپے پنشن ہر ماہ مل جاتے تو گزر بسر بہت اچھی ہو رہی تھی۔

اتفاق سے ابھی تک کوئی لڑکی یا عورت میری زندگی میں نہ آئی تھی۔ خدا بخش میرا ہم عمر ہی تھا مگر اُس کے چار بچے تھے جو کہ اب جوان ہو رہے تھے مگر میری ابھی تک شادی نہ ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

اب جو میں نے گاڑی میں اپنا پرس گھر بھول آنے والی لڑکی کو دیکھا تھا تو وہ پہلی نظر میں ہی میرے دل کو بھا گئی تھی' حالانکہ اُس نے ایک سال کا بچہ بھی اٹھایا ہوا تھا۔ جس سے لگتا تھا کہ وہ شادی شدہ ہے مگر وہ میری آنکھوں کے رستے میرے دل میں اتر گئی تھی۔ میں گاڑی چلانے کے دوران وقفے وقفے سے اپنے سامنے لگے شیشے میں اُسے دیکھتا رہا' تقریباً ایک بجے کے قریب ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے میں نے گاڑی لاری اڈے میں کھڑی کی تو سواریاں اترنے لگیں مگر وہ لڑکی اپنی سیٹ پر بیٹھی رہی۔ جب ساری سواریاں اتر گئیں تو اُس نے میرا شکریہ ادا کیا اور بیگ لے کر گاڑی سے اترنے لگی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ آگے اُس نے کدھر جانا ہے' تو اُس نے اُس شہر کی ایک بستی کا نام بتایا میں نے اُسے دوسو روپے دیے کہ رکھ لو کیونکہ آپ اپنا پرس گھر بھول آئی ہو تو اُس نے ہلکی سی مسکان کے ساتھ وہ روپے لے لیے اور ساتھ ہی میرا موبائل نمبر مانگا جو کہ میں نے اُسے دے دیا' اُس نے میرا نمبر اپنے موبائل میں محفوظ کیا اور کہنے لگی۔

''ایک ہفتے بعد میں اِن روپوں اور جو کرایہ آپ نے ادا کیا ہے اتنی مالیت کا موبائل بیلنس آپ کو بھیج دوں گی۔'' مگر میں نے اُسے منع کردیا۔

''پلیز آپ ہرگز مجھے موبائل بیلنس نہیں بھیجیں گی۔'' تو وہ چپ کرکے گاڑی سے اتری اور ایک رکشے میں بیٹھ کر چلی گئی۔

اس واقعے کے بعد آٹھ دس دن خاموشی رہی تھی' اُس لڑکی کی طرف سے کوئی کال یا میسج نہ آیا۔ مجھے بہت مایوس ہوئی میں نے سوچا کہ وہ لڑکی فراڈ ہی تھی۔ گیارہویں روز اُس لڑکی کی کال آگئی تو اُس نے میرا نام پوچھا جو میں نے اُسے بتادیا' پھر فوراً ہی اُس نے اپنا نام شازیہ بتایا میں نے اُسے پہچان لیا تھا۔ وہ کہنے لگی۔

''اب وہ مجھے موبائل بیلنس بھیجنے لگی ہے تو میں نے اُسے سختی سے منع کیا کہ پلیز آپ ایسا نہ کریں۔'' تو وہ بولی۔

''کیوں ایسا نہ کروں؟'' تو میں نے کہا۔

''بس چھوڑیں آپ رہنے دیں۔'' اس پر ہماری ہلکی سی تکرار ہوئی اور بالآخر وہ بیلنس نہ بھیجنے پر آمادہ ہوگئی۔ جب وہ کال ختم کرنے لگی تو میں نے اُس سے ریکوئسٹ کی کہ کبھی کبھی بات کرلیا کریں۔ وہ تھوڑی دیر خاموش رہی اور پھر کہنے لگی۔

''اچھا سوچوں گی۔'' یہ کہہ کر اُس نے کال کاٹ دی تھی۔ میں نے شازیہ کے نام سے اس کا نمبر اپنے موبائل میں محفوظ کرلیا تھا۔

کوئی دو دن گزرے تھے تو رات کے گیارہ بجے شازیہ کی کال آگئی' مجھے اُس کی کال کا آنا بہت اچھا لگا

پہلے تو اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس کا خاوند کیا کرتا ہے؟" اس پر وہ بولی

"میرا خاوند؟" میں نے کہا۔
"جی ہاں آپ کا خاوند......" تو وہ ایک دم ہنس پڑی اور کہنے لگی۔
"ابھی اُس کی شادی نہیں ہوئی یہ خاوند کہاں سے آ گیا۔" اُس نے خوشی اور حیرانگی سے پوچھا۔
"کیا واقعی آپ کی شادی نہیں ہوئی۔" تو وہ کہنے لگی۔
"جی ہاں صفدر صاحب میری شادی نہیں ہوئی۔" تو میں نے پوچھا۔
"وہ بچہ کس کا ہے۔" تو اُس نے بتایا کہ وہ بچہ اُس کا بھانجا ہے۔ اس پر اُس نے بتایا کہ پانچ سال قبل اُس کی بڑی بہن کی شادی ہوئی تھی' تین سال تک اُس کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی اور ایک سال پہلے اللہ نے اُسے بیٹا دیا۔ جب بیٹا دو ماہ کا ہوا تو اُس کی بہن' خاوند' اُس کی ساس اور ایک نند ایک ٹریفک کے حادثے میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔
یہ بچہ معجزانہ طور پر بچ گیا اِسے خراش تک نہ آئی۔
میری بہن کا سارا سسرال اُس حادثے کی نظر ہو گیا' ایک دن میں چار جنازے اٹھے تو کہرام مچ گیا۔ اُن چاروں کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ میری بہن کا خاوند ہت اچھا انسان تھا' وہ میری بہن سے بہت پیار کرتا ھا' چنانچہ بہن بہنوئی کے مرنے کے بعد وہ بچہ اب ں پال رہی ہوں۔
جب وہ اپنی بہن کے بارے میں بتا رہی تھی تو وہ ہت غمگین ہو گئی اور رونے لگی۔ میں نے اُسے چپ روایا اور تسلی دی کہ جن کا کوئی نہ ہو اُن کا خدا ہوتا ہے' ں کے بعد بہت جلد ہماری دوستی ہو گئی اور یہ دوستی ار میں بدل گئی۔
شازیہ نے اپنے بارے میں مزید بتایا تھا کہ اُس ا عمر بتیس سال ہے' اُس کے باپ کا انتقال دس سال لے ہو گیا تھا۔ وہ صرف دو بہنیں ہی تھیں' اب وہ اپنی ں کے ساتھ رہتی ہے۔ غربت کی وجہ سے اُس کی شادی اب تک نہ ہو سکی ہے۔ وہ میٹرک پاس ہے اور سلائی کڑھائی کی بہت ماہر ہے وہ سارا دن گھر میں بیٹھ کر لوگوں کے کپڑے سیتی ہے یہی اُن کا ذریعہ آمدنی ہے۔ جس میں وہ اپنے بھانجے کو پال رہی ہے۔
میں نے بھی اُسے اپنے سارے حالات شروع سے لے کر اب تک بتا دیے تھے۔ اور سچ سچ بتایا تھا کہ میری ماں کی بدمزاجی کی وجہ سے اب تک میری شادی نہ ہو سکی تھی۔ اس پر شازیہ بولی تھی۔
"جن حالات کا شکار آپ کی والدہ ہوئیں تو اُن حالات میں کوئی بھی عورت ایسے ہو جاتی ہے۔ اس میں آپ کی والدہ کا بھی کوئی قصور نہیں ہے وہ بے چاری تنہائی کا شکار ہیں کسی کے ہاں اُن کا آنا جانا نہیں ہے تو اس وجہ سے وہ بدمزاج ہو گئی ہیں۔

☆......☆......☆

اس کے بعد حالات بہت جلد تبدیل ہوئے' میں نے سب سے پہلے اپنا مکان تبدیل کیا اور نسبتاً بہتر آبادی میں تین کمروں کا گھر کرائے پر لیا، پھر ایک شام انتہائی سادگی سے میرا نکاح شازیہ سے ہو گیا تھا۔ ہم شازیہ کی ماں کو بھی اپنے ساتھ لے آئے تھے' شازیہ کا بھانجا جس کا نام فیضان ہے' وہ بھی ہمارے ساتھ رہتا ہے' حیرت انگیز طور پر میری ماں کی بدمزاجی ختم ہو گئی ہے' شادی کے چھ ماہ بعد شازیہ کے مشورے سے ہم نے ایک بوتیک سینٹر کھول لیا۔
شازیہ کے پاس سلائی کڑھائی کا دس سالہ تجربہ ہے جس کی وجہ سے اُس نے نت نئے ڈیزائن کے کپڑے تیار کیے تو الحمدللہ بوتیک سینٹر بہت اچھا چل رہا ہے اور کافی منافع بخش کاروبار ہے۔ میں ڈرائیوری کرتا ہوں ساتھ آرمی کی پنشن بھی مل رہی ہے۔ تو ہمارا گزارا بہت اچھا ہو رہا ہے۔ اب میں نے اپنے ذاتی مکان کے لیے پانچ مرلے کا پلاٹ بھی لے لیا ہے۔ جب سے شازیہ میری زندگی میں آئی ہے تو سچ پوچھیے کہ بہار آئی ہے کسی نے سچ کہا ہے کہ دیر آئے درست آئے۔

☆☆......☆☆

ان کہانیوں میں پڑھنے والے کے لیے عبرت کا کوئی نہ کوئی سامان ضرور موجود ہے

قسمت کی لکیریں

عبداللہ جاوید کا خیال

ہمیں پہچان ہوتی ہے خدا کی
ارادے جب ہمارے ٹوٹتے ہیں

رضوانہ آفتاب

دروازہ مسلسل بج رہا تھا' ظہر کی نماز ادا کر کے شکیلہ بیگم تھوڑی دیر ستانے کی غرض سے لیٹی تھیں' مسلسل بجتے دروازے کی وجہ سے انہوں نے دروازے تک جا کر نو وارد سے استفسار کیا تھا۔

''کون ہے؟''

''شکیلہ دروازہ تو کھولو۔'' زبیدہ بیگم کی آواز شکیلہ کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

''ارے آپا' کیسے مزاج ہیں آپ کے؟'' شکیلہ بیگم نے بڑی بہن کو گلے لگاتے ہوئے گرم جوشی سے کہا تھا۔

''بس ٹھیک ہی ہوں۔'' زبیدہ بیگم کے انداز میں بیزاری تھی۔

''آئیں آپا بیٹھیں۔'' اُن کے ہاتھوں سے چادر لیتے ہوئے شکیلہ بیگم نے برآمدے میں بچھی چارپائی کی جانب اشارہ کیا تھا۔

''حرم بیٹی کہاں ہے؟'' چارپائی پر بیٹھتے ہوئے زبیدہ بیگم نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تھی۔

''حرم! آؤ تمہاری خالہ آئی ہیں۔'' شکیلہ بیگم نے بیٹی کو آواز دی تھی' انداز بے حد مسرور تھا۔ سلائی کرتی حرم نے ماں کی پُر جوش آواز بغور سنی تھی۔ مشین اور کپڑے سائیڈ کیے تھے اور دوپٹہ سر پر لیا تھا۔

''آ گئی حرم......'' حرم کو کمرے سے نکلتا دیکھ شکیلہ بیگم گویا تھیں۔

''السلام علیکم خالہ جان کیسی ہیں آپ؟'' ا[س] نے نہایت گرم جوشی سے کہہ کر خالہ کا ہاتھ اپنے سر رکھوایا تھا۔

''وعلیکم السلام! میں ٹھیک ہوں بیٹا جیتی رہو میر بچی اللہ تمہارے نیک نصیب کرے۔'' حرم کے سر ہاتھ رکھتے زبیدہ بیگم کا انداز والہانہ تھا۔

''بیٹا خالہ جان کے لیے شربت بنا لاؤ۔'' شکی[لہ] بیگم نے بیٹی کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے [کہا] تھا۔ حرم نے فوراً ہی کچن کا رخ کیا تھا۔

''ارے شکیلہ رہنے بھی دو۔'' زبیدہ بیگم [کے] انداز میں انکساری تھی۔

''آپا دیکھو نہ کتنی گرمی ہے' آپ تو پسینے پسینے ہو ر[ہی] ہیں' ایسے موسم میں تو آپ کا بی پی لو ہو جاتا ہے۔'' شکیلہ بیگم کے انداز میں شیرنی گھلی تھی' وہ ہو[لے] ہولے بہن کو پنکھا کر رہی تھیں۔

''آپا آپ نے اتنے دنوں بعد چکر لگایا۔'' شکی[لہ]

ہگم نے استفسار کیا تھا۔

''بس کیا بتاؤں' جواد کی طبیعت کچھ خراب تھی میں ٔ گھر کی ہی ہو کر رہ گئی۔'' زبیدہ بیگم نے چارپائی پر ؤں پھیلاتے اپنا مدعا بیان کیا تھا۔

''کیوں کیا ہوا جواد بیٹے کو؟'' شکیلہ بیگم کے انداز میں تشویش کے ساتھ ساتھ محبت بھی تھی۔

''ہونا کیا ہے' وہی موسمی بخار ذرا سا بخار ہو جائے تو یہ لڑکا مجھے پریشان کر دیتا ہے۔'' زبیدہ بیگم نے تفصیلات گوش گزار کیں۔

''اللہ بچے کو شفا دے۔'' شکیلہ بیگم نے محبت سے لندھے لہجے میں کہا تھا۔

''بس دعا کیا کرو میں تو چاہتی ہوں جلد از جلد راد کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں' اُس کی شادی رواکے پُرسکون ہو جاؤں۔'' زبیدہ بیگم نے سرد آہ رتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ تو بہت خوشی کی بات ہے آپا۔'' شکیلہ بیگم رور ہوئی تھیں۔

''کوئی لڑکی ہے نظر میں؟'' شکیلہ بیگم کا انداز پُرتجسس تھا۔

''خالہ یہ لیں شربت۔'' شربت کا گلاس ماں اور زبیدہ بیگم کو تھماتے دیگر لوازمات چارپائی پر رکھتے حریم ماں اور خالہ کے درمیان براجمان ہو گئی تھی۔

''مجھے تو اپنے جواد کے لیے ہمیشہ سے حرم ہی پسند ہے' مجھے دیدو حرم کو۔'' حرم کو شفقت بھری نظر سے دیکھتے زبیدہ بیگم بہن سے ہمکلام تھیں۔

''آپا حرم آپ ہی کی تو ہے۔'' شکیلہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

زبیدہ بیگم نے بٹوے سے ایک نیلا نوٹ نکال کر حرم کے ہاتھوں میں تھما دیا تھا' اور اس کے ماتھے پر بوسہ لیتی وہ خاصی خوش تھیں۔

''حرم آج سے تمہارے گھر میں میری امانت ہے۔'' حرم کو اپنائیت سے دیکھتے' وہ شکیلہ بیگم سے مخاطب تھیں۔

''بالکل آپا۔'' شکیلہ بیگم بے حد خوش تھیں جبکہ حرم



کا چہرا ہر تاثر سے مبرا تھا' وہ بے دھیانی میں اپنے ناخنوں کو دیکھ رہی تھی۔

☆......☆......☆

زبیدہ اور شکیلہ بیگم سگی بہنیں تھیں۔ زبیدہ کے گھر جواد کی پیدائش ہوئی تھی' جب جواد دو سال کا تھا اُسی وقت جواد کے والد مبشر رحمانی ایک حادثے سے دوچار ہوئے اور یہ حادثہ اُن کے لیے جان لیوا ثابت ہوا تھا۔ وہ جانبر نہ ہوسکے اور خالق حقیقی سے جا ملے۔ زبیدہ بیگم اب بالکل تنہا ہوگئی تھیں۔ اُن کے ماں باپ تو بچپن میں ہی فوت ہوگئے تھے' میکے کے نام پر صرف ایک بہن تھی' جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ مبشر رحمانی نے ہی اُن کی شادی اپنے ایک عزیز دوست مظہر احمد سے کروائی تھی۔ شکیلہ اور مظہر احمد نے اس کڑے وقت میں زبیدہ بیگم کا ہر طرح سے ساتھ دیا تھا۔ مظہر احمد کی مدد سے ہی زبیدہ بیگم کو گارمنٹس فیکٹری میں معقول ملازمت مل گئی تھی۔ جواد کو وہ شکیلہ بیگم کے سپرد کر کے ہی جاتی تھیں۔

شکیلہ بیگم نے جواد کو بہت محنت سے پالا تھا' اسی دوران شکیلہ بیگم کے یہاں حرم کی آمد ہوئی تو زبیدہ بیگم کی یہ دلی خواہش تھی کہ وہ حرم کو جواد کے لیے مانگ لیں۔ اور وہ مناسب موقع کا انتظار کرنے لگیں۔ جواد نے انٹر کے بعد ہی ماں کو نوکری کرنے سے منع کر دیا تھا اور خود پڑھائی کے ساتھ ساتھ ملازمت بھی کر رہا تھا۔ اب وہ ایم کام کر چکا تھا اور ایک اچھی فرم میں ملازمت کر رہا تھا۔ حرم کا رشتہ مانگنے کے لیے اس سے بہترین موقع زبیدہ بیگم کو نہ ملتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ شکیلہ بیگم کے گھر دامن پھیلانے چلی آئی تھیں۔ برسوں سے دل میں دبی خواہش کو بالآخر انہوں نے زبان دے ہی ڈالی تھی۔

بہن کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا اور مظہر احمد کو بھی وہ خوب جانتی تھیں کہ وہ بھی انکاری نہ ہوں گے' وہ آج بے تحاشا خوش اور مطمئن تھیں انہیں شدت سے جواد کی آمد کا انتظار تھا۔

☆......☆......☆

جواد رحمانی کو آج آفس سے آنے میں تاخیر ہوگئی تھی۔ وہ بائیک صحن میں پارک کر کے ماں کی جانب بڑھا تھا جو کچن میں مصروف تھیں۔

''کیا ہوا آج دیر ہوگئی تمہیں۔'' اپنے عقب میں جواد کی موجودگی پا کر زبیدہ بیگم نے استفسار کیا تھا۔

''بائیک خراب ہوگئی تھی خیر ان سب باتوں کو چھوڑیں آپ بتائیں آج اتنی خوش کیوں ہیں۔'' جواد نے ماں کے مسرور انداز کو ملاحظہ کرتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

''ہاں آج تو میں واقعی خوش ہوں۔'' زبیدہ بیگم نے برنر جلاتے ہوئے جواد کی تاکید کی تھی۔

''اوہو آخر وجہ کیا ہے کچھ پتا تو چلے۔'' جواد نے بھی گرمجوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔

''سب بتاؤں گی پہلے ہاتھ منہ دھولو' کھانا لگاتی ہوں۔'' (امی سے آج نتاشہ کے متعلق بات کر ہی لینی چاہیے) جواد نے سوچا تھا۔

''امی آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

''آخر ایسی کیا بات ہے بیٹے؟'' زبیدہ بیگم کا انداز استفہامیہ تھا۔

''امی آپ نتاشہ کو جانتی ہیں ناں' جو میرے ساتھ جاب کرتی ہے؟'' جواد نے خاصے دھیمے لہجے میں پوچھا تھا۔

''ہاں جانتی ہوں کیا ہوا اُسے؟'' چائے کا پانی چولہے پر رکھتے زبیدہ بیگم نے استفسار کیا تھا۔

''امی اسے کچھ نہیں ہوا آپ باہر آئیں۔'' برنر بند کرتے وہ ماں کا ہاتھ پکڑے باہر لے آیا تھا۔ اور زبیدہ بیگم حیرت سے بیٹے کو تک رہی تھیں۔

''امی مجھے نتاشہ سے شادی کرنی ہے۔ آپ اس کے گھر رشتہ لے کر جانا ہوگا۔'' جواد نے نظریں جھکا کر نہایت عاجزی سے اپنا مدعا بیان کیا تھا۔

''تم پاگل تو نہیں ہوگئے؟'' زبیدہ بیگم نے جواد کا ہاتھ جھٹکا تھا۔

''امی اس میں پاگل ہونے والی کیا بات ہے؟ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔'' جواد کے انداز میں عاجزی تھی۔

''مگر مجھے وہ لڑکی ذرا پسند نہیں ہے' جو تمہارا

ناسازی طبیعت میں پھول لے کر آئی تھی اُسی کی بات کر رہے ہو نا؟'' زبیدہ بیگم کا انداز استفامیہ تھا۔ انہوں نے بیٹے سے تصدیق چاہی تھی۔

''جی امی......'' جواد نے تائیدی لہجے میں جواب دیا تھا۔

''اُسی وقت سے کھٹک رہی تھی وہ مجھے تجھے اپنے جال میں پھنسالیا' شکل سے ہی چالاک لگ رہی تھی۔'' زبیدہ بیگم کے انداز میں نفرت تھی' ان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے' جواد انگشت بدنداں رہ گیا' اس نے ماں کا یہ روپ پہلی بار دیکھا تھا۔

''امی وہ بے حد اچھی لڑکی ہے۔'' اُس نے ایک بار پھر انہیں منانے کی سعی کی تھی۔

''مگر وہ مجھے ذرا بھی پسند نہیں ہے' میں آج ہی تمہارا رشتہ حرم سے طے کر آئی ہوں' بہت پیاری اور نیک بچی ہے میری بھانجی۔'' زبیدہ بیگم کا انداز فخریہ تھا۔

''مگر میں نتاشہ کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کروں گا۔'' جواد نے ہٹ دھری سے کہا تھا۔

''ٹھیک ہے کرلو اس سے شادی' اگر تم نے اس سے شادی کی تو میرا مرا ہوا چہرہ دیکھو گے۔'' زبیدہ بیگم ہتھے سے اکھڑ گئی تھیں جواد کے لیے یہ سب برداشت کرنا بے حد مشکل تھا' وہ شعلے برساتی آنکھوں سے اُسے گھورتے تن فن کرتی اپنے کمرے میں بند ہوگئی تھیں۔ جواد نے بند دروازے کو دیکھ کر بے اختیار مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔

☆......☆......☆

جواد کو آتا دیکھتے ہی نتاشہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ دیگر اسٹاف کی توجہ اپنے کام پر مرکوز تھی۔ جواد نتاشہ کو بے حد اُلجھا بکھرا لگا تھا۔

''کیسے ہو جواد؟'' نتاشہ کے انداز میں اپنائیت تھی۔

''ٹھیک ہوں۔'' جواد نے نظریں چرائی تھیں اور اپنی سیٹ کی جانب بڑھا تھا۔

''ٹھیک لگ تو نہیں رہے۔'' نتاشہ اس کے پیچھے آئی تھی۔ جواد نے اپنی نشست سنبھالی تھی اور نتاشہ کو دیکھنے سے گریز کیا تھا۔

''کچھ پریشان لگ رہے ہو؟'' نتاشہ کے انداز میں محبت کے ساتھ فکرمندی چھلک رہی تھی۔

''پرسوں میرا نکاح ہے۔'' جواد کا انداز ندامت سے لبریز تھا۔

''کیا؟'' نتاشہ نے متحیر نظروں سے جواد کو دیکھا تھا اسے اپنی سماعت پر شبہ ہوا تھا۔

''امی نے میری خالہ کی بیٹی سے میری بات طے کردی ہے۔ میں نے تمہارے متعلق ان سے بات کی تھی' مگر وہ یہ سب سن کر خاصی برہم ہوگئی تھیں۔'' جواد کے انداز میں پریشانی تھی۔

''میں تو کب سے کہہ رہی تھی امی کو بتاؤ مگر تم نے ہی کہا تھا امی فوراً مان جائیں گی۔'' نتاشہ نے خفگی سے کہا تھا' اس کے انداز میں برسوں کی تھکن تھی' جواد کو اُس کی آواز کسی گہری کھائی سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

''میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ امی ایسے ری ایکٹ کریں گی۔'' جواد کا انداز متفکر تھا۔

''خیر اب ہم کیا کرسکتے ہیں' بڑوں کی رضا میں راضی ہوجاؤ' کیا پتا اسی میں ہماری بھلائی پوشیدہ ہو۔'' نتاشہ نے تحمل سے جواد کو سمجھایا تھا اور اپنی سیٹ کی جانب بڑھ گئی تھی۔ مگر اس کے دل میں اک پھانس سی چبھ رہی تھی' آنکھوں کو ہتھیلی کی پشت سے رگڑتے' اُس نے اپنے ٹوٹے ہوئے دل کو سنبھالنے کی حتی الامکان کوشش کی تھی۔ جواد نے بے بس مردگی سے نتاشہ کو خود سے دور جاتا ہوا دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی درد رقم تھا۔ کچھ پاکر کھودینے کا گہرا رنج اُس کی آنکھوں میں ہلکورے لے رہا تھا۔

☆......☆......☆

جواد دولہا بنا بیٹھا تھا' حرم اس کے برابر براجمان تھی۔ جواد کا چہرا بے تاثر تھا' وہ کبھی بنی حرم کو دیکھنے سے گریز کررہا تھا۔ اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھ رہی تھی' جبکہ زبیدہ بیگم بہو کی بلائیں لیتے نہیں تھک رہی تھیں۔ ان کے ہر اک انداز میں والہانہ محبت پنہاں تھی۔ جواد نہایت کوفت میں مبتلا تھا' ماں کو بہو پر واری صدقے جاتا دیکھ کر اس کی پیشانی میں لکیروں کا جال بن آیا تھا(کیا جاتا اگر حرم کی جگہ میری من پسند

لڑکی نتاشہ موجود ہوتی تو) رہ رہ کر وہ یہی سوچے جا رہا تھا اور حرم پر اسے شدید غصہ آ رہا تھا۔

☆......☆......☆

شادی ہوئے آج تیسرا دن تھا۔ جواد صحن میں موجود واش بیسن میں نصب آئینے کے سامنے شیو بنا رہا تھا' حرم کو کچن سے چائے کی ٹرے لیے نکلتا دیکھ کر اسے کوفت محسوس ہوئی تھی۔

''خالہ چائے۔'' حرم نے تخت پر بیٹھی زبیدہ بیگم کے آگے چائے رکھی تھی۔

''میری بچی دو دن بھی نہیں ہوئے تجھے اس گھر میں آئے ہوئے اور کام کرنے لگی' مجھے تو کسی کام میں ہاتھ ہی لگانے نہیں دیتی جیتی رہو میری بچی۔'' حرم کے سر پر ہاتھ رکھتے زبیدہ بیگم نے وارفتگی سے کہا تھا۔

''خالہ جان آپ کی عمر کام کرنے کی نہیں بلکہ آرام کرنے کی ہے۔'' حرم نے ان کے پیر دباتے ہوئے محبت سے کہا تھا۔

''میری بچی مجھے معلوم تھا اسی لیے تو میں تمہیں بیاہ کر لائی ہوں' ٹکے ٹکے کی نوکریاں کرنے والیوں کو خوب جانتی ہوں لڑکوں کو اپنے جال میں پھنسا کر گھر میں آ جاتی ہیں' اور لڑائی جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں اپنی تو آخر اپنی ہی ہوتی ہے۔'' جواد پر ایک کاٹ دار نظر ڈالتے ہوئے انہوں نے طنز کیا تھا۔

جواد کو شیشے میں ماں کا واضح عکس نظر آ رہا تھا' اس نے جھلا کر ریزر رخساروں پر پھیرا تھا' عجلت کی وجہ سے گہرا کٹ آ گیا تھا۔ رخساروں سے ذرا نیچے نکلتے خون کو وہ بس دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

☆......☆......☆

''حرم' جواد کب آئے گا بیٹا؟'' زبیدہ بیگم کچھ دیر قبل ہی نماز عشا سے فارغ ہوئی تھیں' وہ تخت پر لیٹی تسبیح پڑھتے ہوئے حرم سے استفسار کر رہی تھیں' جو کچن میں رات کے لیے سالن تیار کر رہی تھی۔

''خالہ آج اُن کو دیر ہو جائے گی' صبح بتا کر تو گئے تھے۔'' حرم نے نرمی سے جواب دیا تھا' مگر آواز میں کی گھبراہٹ بھی تھی۔

''اچھا بیٹا......'' زبیدہ بیگم نے آنکھیں موندے

جواب دیا تھا۔ عین اسی وقت دروازہ بجنے لگا تھ
پاؤں میں چپل اڑستے زبیدہ بیگم نے دروازے کا ر
کیا تھا۔

''کون ہے؟'' زبیدہ بیگم نے دروازہ کھو
سے قبل نو وارد سے استفسار کیا تھا۔

''خالہ دروازہ کھولیں' میں جواد کا دوست ہوں۔
آنے والے نے نہایت تحمل سے جواب دیا تھا۔

زبیدہ بیگم نے جیسے ہی دروازہ وا کیا' چھ سا
لڑکے گھر کے اندر داخل ہو گئے' ایک لڑکے نے انہی
اس قدر بری طرح سے دھکیلا تھا کہ وہ اپنا توازن قا
نہ رکھ سکیں اور بری طرح دیوار سے ٹکرا کر فرش پر گر
تھیں۔ سر بری طرح ٹکرانے کی وجہ سے وہ بے ہو
ہو چکی تھیں۔

☆......☆......☆

اسپتال کے کمرے میں زبیدہ بیگم بے ہوش پڑ
تھیں' جواد خاصا پریشان تھا۔ شکیلہ بیگم اور مظہر احمد
مضطرب کھڑے تھے۔ اسی وقت زبیدہ بیگم کو ہوش
تھا' انہوں نے بوجھل آنکھوں سے باری باری سب
دیکھا تھا مگر حرم انہیں کہیں بھی نظر نہ آئی تھی۔

''میری حرم بیٹی کہاں ہے؟'' زبیدہ بیگم
دکھتے سر کو پکڑے بہت دقت سے استفسار کیا تھ
شکیلہ بیگم نے فوراً ہی زور و شور سے رونا بلکنا شرو
کر دیا تھا' زبیدہ بیگم کے سوال کا جواب کسی کے پا
بھی نہ تھا۔

''سب لوگ باہر جائیں مریضہ کو رو کر پریشان
کریں' وہ پہلے ہی خاصی ڈپریس ہیں۔'' زبیدہ بیگم
نیند کا انجکشن لگاتی نرس نے معمولی خفگی سے کہہ کر س
کو باہر بھیج دیا تھا۔

☆......☆......☆

جواد اسپتال کے ریسیپشن میں بیٹھا تھا مگر اُس
ذہن کہیں اور ہی پرواز کر رہا تھا' اُس کا دماغ مستق
ہچکیولوں کی زد میں تھا۔ ناپسندیدہ ہستی ہی سہی' مگر
تھی تو اس کی بیوی' کچھ دنوں کا ہی ساتھ رہا تھا۔ مگر
اس کے نام سے منسوب تھی' وہ بہت زیادہ پریشا
تھا۔ اسے حرم کی فکر تھی' وہ پولیس میں رپورٹ بھی در

کروا چکا تھا اور اسے اپنے تئیں بھی تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی تھی، مگر اس کا کہیں اتا پتا نہ تھا، بظاہر وہ ایل ای ڈی میں نیوز چینل دیکھ رہا تھا، مگر اس کی سوچ کا محور حرم ہی تھی۔ اسی اثناء میں اس کا موبائل فون بج اٹھا اسے تھانے سے کال موصول ہوئی تھی۔

''السلام علیکم!'' کال پک کرتے ہی جواد نے سلام کیا تھا۔

''وعلیکم السلام! مسٹر جواد میں ایس ایچ او اظہر بات کر رہا ہوں، آپ نے اپنے گھر میں ڈکیتی کی واردات اور اپنی اہلیہ کے اغواء کا مقدمہ درج کروایا تھا۔'' انداز پیشہ وارانہ تھا اور تصدیقی لہجے میں استفسار ہوا تھا۔

''جی ایس ایچ او صاحب۔'' جواد نے اٹکتے ہوئے حامی بھری تھی۔

''وہ ڈکیتی کروائی گئی تھی، سارا منصوبہ آپ کی اہلیہ اور ان کے آشنا زاہد کا تھا اور اس زاہد نامی شخص نے آپ کی اہلیہ سے تمام زیورات چھین لیے اور اُسے گولی مار کر فرار ہو گیا، فی الحال پولیس اس کے تعاقب میں ہے، جبکہ اس کا ایک ساتھی ارشد ہماری تحویل میں ہے۔ دوران ریمانڈ اس نے ہمیں تمام تفصیلات سے آگاہ کیا ہے، آپ تھانے آکر مزید معلومات حاصل کرلیں۔'' ایس ایچ او نے تمام تفصیلات جواد کے گوش گزار کر کے فون بند کر دیا تھا۔ یہ تمام تفصیلات سن کر وہ گم صم بیٹھا رہ گیا تھا، جیسے اسے اپنی سماعتوں پر یقین نہ آیا ہو۔

☆......☆......☆

زبیدہ بیگم تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ اُن کے چہرے پر ندامت کے گہرے سائے تھے، نتاشہ ان کی مزاج پرسی کے لیے آئی تھی۔ وہ متواتر اسپتال میں بھی ان کی تیمارداری کرتی رہی تھی۔ وہ نتاشہ کو اس طرح خدمت کرتا دیکھ کے زارو قطار رونے لگی تھیں۔

''اماں جی ایسے کیوں رو رہی ہیں؟'' انہیں چپ کراتی نتاشہ نے پریشانی سے استفسار کیا تھا۔

''میں تم دونوں کی گناہ گار ہوں بیٹا، ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔'' زبیدہ بیگم نے نتاشہ کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

غزل

پیار دل میں میرے رہا ہی نہیں
تجھ سے ملنے کا حوصلہ ہی نہیں

ڈھونڈتا ہے وہ جس ڈگر پہ مجھے
وہ مرے گھر کا راستہ ہی نہیں

جس کو اک بار ہم نے چھوڑ دیا
اُس سے پھر رکھا رابطہ ہی نہیں

دل لگاتا پھرے کسی سے بھی
اب ہمیں اُس سے واسطہ ہی نہیں

اس نے پھیری ہیں اس طرح نظریں
جیسے وہ مجھ کو جانتا ہی نہیں

کوئی مظلوم مر بھی جائے اگر
کوئی بھی اُس کو دیکھتا ہی نہیں

ذہن نے تو بھلا دیے وعدے
دل شگفتہ کا مانتا ہی نہیں

شگفتہ شفیق

''اماں جی آپ تو شرمندہ کر رہی ہیں جو ہوتا ہے اللہ کی رضا سے ہوتا ہے' آپ خواہ مخواہ پریشان نہ ہوں' آپ تو بالکل میری امی جیسی ہیں۔'' نتاشہ نے ان کے جڑے ہاتھوں کو نرمی سے کھولتے ہوئے انہیں حوصلہ دیا تھا۔

''نہیں بیٹا! میں غلط تھی' میرا انتخاب غلط تھا' جواد کی خوشی کا خیال کر لیتی تو شاید حرم بھی جسے پسند کرتی تھی اُسی سے شادی کر لیتی تمہارا بھی نقصان نہ ہوتا' سب میری وجہ سے ہی ہوا ہے۔'' زبیدہ بیگم سخت نادم نظر آ رہی تھیں۔

''اماں جی آپ فکر نہ کریں میرا تو کوئی نقصان نہیں ہوا' اور جہاں تک بات حرم کی ہے اگر وہ شخص حرم سے محبت کرتا تو کب کا اس سے شادی کر لیتا اور ایسی بے دردی کے ساتھ اسے موت کے گھاٹ تو نہ اتار دیتا۔ حرم نے جو کچھ کیا' وہ نادانی میں کیا' وہ جسے اپنا رہبر سمجھ رہی تھی وہ راہزن نکلا' آپ خود کو موردِ الزام نہ ٹھہرائیں۔'' نتاشہ نہایت ہلکے پھلکے انداز میں انہیں سمجھا رہی تھی۔

''ہم نادان لوگ اکثر اوقات جسے اپنا رہبر تصور کیے ہوتے ہیں' وہ دراصل رہبر کے لبادے میں رہزن ہوتے ہیں اور ہمیں اس بات کا گمان تک نہیں ہوتا کہ رہبری کے سائے میں ہمیں دھوکہ دیا جا رہا ہے۔ جب محبت و اعتبار کا بت پاش پاش ہوتا ہے تب حقیقتوں کا در ہم پر وا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس وقت ہمیں ہماری اوقات پتا لگتی ہے' اور اس وقت ہمارے پاس کوئی جائے پناہ نہیں ہوتی سوائے اللہ کے بے شک اللہ نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

زبیدہ بیگم پر بھی نتاشہ کے سمجھانے کا اثر ہوا تھا اور اب وہ خاصی پُرسکون نظر آ رہی تھیں۔

''بیٹا میں تمہارے گھر والوں سے ملنا چاہتی ہوں۔'' زبیدہ بیگم نے نتاشہ سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

''میری تو فیملی ہی نہیں ہے میری پیدائش کے ایک ماہ بعد ہی امی ابو ایک ٹریفک حادثے میں انتقال کر گئے تھے' مجھے نانی امی نے پالا ہے' میں انہی کے ساتھ رہتی ہوں' فیملی کے نام پر اک عدد نانی ہی ہیں۔ گھر کے مالی حالات کی وجہ سے مجھے باہر نکل کر جاب کرنے کی ضرورت پیش آئی' ورنہ میں کبھی گھر سے باہر قدم نہ نکالتی یہ جاب میری مجبوری تھی۔ نانی امی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی' میری ٹیوشنز کی آمدنی سے میں ان کی اتنی مہنگی ادویات نہیں لا سکتی تھی۔''

نتاشہ نے اپنا آپ کھول کر بیان کر دیا تھا۔

زبیدہ بیگم کو نتاشہ کے حالات جان کر گہرا رنج ہوا تھا اور انہیں اپنا وقت یاد آیا تھا جب ان پر بیوگی کی چادر تنی تھی تو انہوں نے بھی چار دیواری سے باہر قدم نکالا تھا' انہیں نتاشہ کے متعلق اپنی سابقہ سوچ پر بے طرح شرمندگی ہوئی تھی۔

''بیٹا! مجھے معاف کر دینا' میں نے تمہارا دل دکھایا' میں جلد ہی اس سلسلے میں تمہاری نانی امی سے ملاقات کروں گی۔ انشاء اللہ اب تم اور تمہاری نانی ہمارے ساتھ اسی گھر میں رہیں گی۔'' زبیدہ بیگم نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھامے یقین دلایا تھا۔

نتاشہ نے تشکر بھری نظروں سے زبیدہ بیگم کو دیکھا تھا۔ جواد کچھ وقت پہلے ہی گھر آیا تھا' ماں کے الفاظ اس نے بغور سنے تھے۔ یہ سن کر جواد بھی قدرے مطمئن ہوا تھا' اُسے اپنے دل سے اک بھاری بوجھ سرکتا ہوا محسوس ہوا تھا اس کی دلی آرزو یوں پوری ہوگی' اسے تو گمان تک نہ تھا۔ اسے نتاشہ کی کہی ہوئی بات یکدم یاد آئی تھی۔

''بڑوں کی رضا میں راضی ہو جاؤ یقیناً اسی میں ہماری بھلائی پوشیدہ ہوگی۔'' اس نے مسکراتی نگاہ نتاشہ پر ڈالی تھی جو ہولے ہولے زبیدہ بیگم کا سر دبا رہی تھی' اور وہ نیند کی گہری وادیوں میں جا کھوئی تھیں' زبیدہ بیگم پر چادر ڈالتے اس نے اپنے گھر کا رخ کیا تھا۔ اسے اب شدت سے زبیدہ بیگم کی آمد کا انتظار تھا۔ اسے یقین تھا جواد کی ہمراہی میں وہ ایک پُرمسرت زندگی بتائے گی اس کی بدلتی قسمت نے اسے خوشی سے سرشار کر دیا تھا۔ اور پھر بس دو روز بعد ہی نتاشہ کا انتظار بھی ختم ہو گیا تھا۔ زبیدہ بیگم نے موسم بہار کی آمد کی صورت اس کے دروازے پر دستک دی تھی۔

☆☆......☆☆

انجام تو یہی تھا

نعیم فاطمہ توفیق کا خیال

صرف شیطان کی دوستی کے سبب
یہ اپنے خالق سے کفر کرتا ہے

عبدالغفار عابد

رشید ایک معمولی سرکاری آفیسر تھا جو اپنے سینئر آفیسروں کا اعتماد حاصل کرنے میں بہت جلد کامیاب ہوگیا۔ وہ آفیسروں اور ایجنٹوں کے درمیان ڈیل کرا کے اپنا کمیشن وصول کرتا' دولت کے نشے نے اُسے حیوان بنا دیا تھا۔ جیسے غریب کے گھر سے سکھ' بیوہ کے مکان سے رونق اور جھوٹے کے چہرے سے نور ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی اُس کا دل انسانیت سے خالی ہوگیا تھا۔ کہتے ہیں ہر برائی کی ایک حد ہوتی ہے' جب آدمی وہ حد عبور کرتا ہے تو زوال کی سرزمین کا آغاز ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی رشید کے ساتھ بھی ہوا تھا۔

☆......☆......☆

دینو کمہار راوی کنارے ایک جھونپڑی نما مکان میں رہتا تھا' وہیں پر اس نے مٹی کے برتن بنانے والا 'چاک' لگا رکھا تھا۔ یہاں اُسے اس کام کی ہر سہولت حاصل تھی۔ اعلیٰ معیار کی مٹی دریا سے مل جاتی' جب پانی کناروں سے ٹکرا کے واپس ہوتا تو پختہ چکنی مٹی کے ڈھیر چھوڑ جاتا' دینو کمہار اس مٹی کو اکٹھا کرتا اور پھر اچھی طرح گوندھنے کے بعد 'چاک' پر چڑھا کر مختلف برتنوں کی شکل میں ڈھال لیتا' جب کافی تعداد میں برتن تیار ہو جاتے تو پھر ان کو پکانے کے لیے بھٹی کا اہتمام کیا جاتا۔ جسے مقامی زبان میں 'آوی' کہتے ہیں یہ آوی زمیندار مہر شاہ دین کی زمین پر بنائی جاتی تھی' آوی کو جلانے اور برتنوں کو پختہ کرنے کے لیے جانوروں کے گوبر کی تھاپیاں اور لکڑی وغیرہ مہر شاہ دین کے ڈیرے سے حاصل کی جاتی اور پھر جب برتن پک کر تیار ہو جاتے تو ضرورت کے مطابق کچھ برتن مہر شاہ دین کی حویلی میں بھی پہنچائے جاتے' اسی طرح اِرد گرد علاقے کے گھروں میں برتن دیے جاتے' بدلے میں پیسے یا گندم لی جاتی تھی۔

☆......☆......☆

دینو کمہار کی بیوی پروین اور بیٹی بشریٰ مہر شاہ دین کی حویلی میں کام کرتیں' جبکہ بیٹا رشید اسکول سے آنے کے بعد باپ کا ہاتھ بٹاتا' اپنے ذاتی کام سے فارغ ہو کر دونوں باپ بیٹا مہر شاہ دین کی حویلی کی صفائی کرتے' مہمانوں کے لیے کھانا لانا بھی اُن کی ڈیوٹی تھی' دینو کمہار اپنی زندگی سے پوری طرح مطمئن تھا۔ مگر اس کا بیٹا رشید اس زندگی سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ میٹرک میں پہنچا تو اس کی خواہشات کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ میرے پاس بھی بہت ساری

دولت ہو، جس طرح ہم مہر شاہ دین کی حویلی میں کام کرتے ہیں اسی طرح ہمارے گھر میں بھی نوکر ہوں، جب وہ اپنی خواہش کا اظہار اپنے باپ سے کرتا تو وہ اسے سمجھاتا کہ...... ''بیٹا ایسا کبھی نہیں ہوسکتا، تم اونچے محلوں کے خواب نہ دیکھا کرو، میں نے بھی ایسے بہت سپنے دیکھے تھے، جو کبھی تعبیر سے خالی نکلے جس طرح میں اپنے غریب باپ کا بیٹا تھا اسی طرح تم بھی غریب باپ کے بیٹے ہو اپنے کام میں دلچسپی رکھو میرے بعد تم نے یہی کام کرنا ہے۔''

☆......☆......☆

مقامی اسکول سے رشید نے امتیازی نمبروں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اُسے مزید پڑھانے کی دینو کمہار میں سکت نہ تھی، اُس نے مہر شاہ دین کی منت کی کہ آئے دن آپ کے ڈیرے پر وزیر، منسٹر اور دیگر افسران آتے رہتے ہیں آپ میرے بیٹے کو کہیں نوکری دلوادیں، اور پھر سفارش سے رشید کو ایک سرکاری محکمے میں اس کی قابلیت سے زیادہ کی ملازمت مل گئی اور پھر جلد ہی رشید نوکری کے سارے گر سیکھ گیا اور رشوت سے جیبیں بھرنے لگا۔ گھر میں روپے پیسے کی ریل پیل ہونے لگی تو سب سے پہلے اس نے اپنے باپ کے برتن بنوانے کا کام بند کروایا اور اس جگہ کو چھوڑ کر کسی اور علاقے میں شفٹ ہوگیا کچھ عرصہ کرائے کے مکان میں رہا، اس دوران رشید نے دس مرلے کا پلاٹ خرید کر خوبصورت کوٹھی بنوائی اور مستقل طور پر وہاں رہائش اختیار کرلی۔ رشوت کی ریل پیل نے اُس کی حیثیت ہی بدل دی تھی۔

☆......☆......☆

رشید نے آسیہ نامی ایک لڑکی سے پسند کی شادی کی تھی۔ آسیہ ایک پرائیویٹ ادارے میں نوکری کرتی تھی۔ اُسے پیسا اور شہرت حاصل کرنے کا جنون تھا،



☆......☆......☆

وقت گزرنے کے ساتھ رشوت خور افسران نے درخت کی شاخوں پر موجود پتوں کی طرح رشید پر سایہ کرنا شروع کر دیا۔ وہ ایجنٹ اور افسران کے درمیان رابطے کا کام سرانجام دیتا اور اپنا حصہ وصول کرتا۔ رشوت خور آفیسر اکثر رشید کے گھر کی رونق بڑھانے آتے' آئے روز ان آفیسروں کے اعزاز میں پارٹیاں منعقد ہوتیں' شراب' شباب کا جی بھر کر اہتمام اور استعمال کیا جاتا' ساری رات شور وغل میں گزر جاتی' اب تو ان پارٹیوں میں جسم فروش تتلیوں نے حصہ لینا شروع کر دیا تھا آفیسر اِس موج میلے میں خوب لذت انداز ہو رہے تھے' ہر ہفتے کے اختتام پر ایک شاندار پارٹی کا اہتمام ہوتا ناجائز کام کروانے والے پارٹی کی خوب رونق بڑھاتے' وقت گزرنے کے ساتھ رشید نے محسوس کیا کہ ایجنٹ تو مجھ سے زیادہ ترقی کر رہے ہیں۔ یہ سوچ آتے ہی اس نے ایجنٹ کے فرائض بھی خود ادا کرنے شروع کر دیے۔ پیسا انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے رشید اور اس کی بیوی آسیہ کو بس پیسا چاہیے تھا۔ اس پیسے کی خاطر وہ کچھ بھی کرنے کو تیار رہتے اور پھر اسی حوالے سے رشید اور اس کی بیوی نے راتوں رات لاکھوں کی وصولی کا ایک منصوبہ بنایا تھا۔

☆......☆......☆

''ڈاکٹر صاحب! میری بیوی کے پیٹ میں سخت تکلیف ہے اسے فوراً اپنے اسپتال میں داخل کر کے ٹریٹمنٹ کریں۔'' رشید ایک منصوبے کے تحت اپنی بیوی کو ایک اسپتال کے مالک مشہور ڈاکٹر کے حوالے کر کے چلا گیا تھا۔ رات کو آسیہ نے اپنے پرائیویٹ روم میں ایک مخصوص جگہ خفیہ کیمرہ فٹ کیا اور شدید درد کی ایکٹنگ کر کے چیخنے چلانے لگی۔ نرس وغیرہ بھاگ کر آئے تو انہیں کہا کہ ڈاکٹر کو بھیجو مجھے بہت سخت تکلیف ہے' جو صرف ڈاکٹر ہی دور کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر کمرے میں آئے تو مریضہ کو آرام آنا شروع ہو گیا کچھ دیر بعد ہی وہ کافی حد تک سنبھل کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ پھر اچانک ڈاکٹر کو کھینچ کر اپنے ساتھ بٹھا لیا اور اُن کے ساتھ اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنے لگی' ڈاکٹر اُس کی حرکتیں دیکھ کر گھبرا گیا بڑی مشکل سے جان بچا کر کمرے سے باہر آیا۔ جبکہ آسیہ کے کیمرے میں یہ سب مناظر ریکارڈ ہو گئے تھے۔ اُسی رات آسیہ نے اپنے شوہر رشید کو فون کیا تھا کہ ہمارا کام ہو گیا ہے آپ مجھے صبح آ کر لے جائیں۔'' اور اگلی صبح رشید اپنے دو جعلی ویڈیوز بنانے کے ماہر دوستوں رئیس اور انعام کے ساتھ اسپتال آیا۔ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر گھر آ گیا' گھر آتے ہی کیمرے میں موجود مواد سے ہیرا پھیری کی اور یوں ڈاکٹر کو بلیک میل کرنے کا منصوبہ مکمل ہو گیا۔

ایک ہفتے بعد رشید اپنے چند دوستوں کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس اسپتال آیا اور تنہائی میں ملنے کو کہا۔ ڈاکٹر نے اُن کو الگ کمرے میں بٹھایا' چائے پانی وغیرہ سے خدمت کی رشید نے اپنی جیب سے موبائل نکالا اپنی بیوی کی فحش فلم چلا کر موبائل میز پر ڈاکٹر کے سامنے رکھ دیا۔ یہ سب دیکھتے ہی ڈاکٹر کے تو اوسان خطا ہو گئے تھے۔

''اگر یہ سارا مواد ہم میڈیا والوں کو دے دیں کہ تم اپنی خواتین مریضاؤں کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہو۔ تو بتاؤ تمہارا اور تمہارے اسپتال کا کیا بنے گا؟'' ان ثبوتوں کی بنا پر ہم تمہارے خلاف پولیس میں کیس دائر کرنے کا حق بھی رکھتے ہیں۔ تم اگر اپنی بہتری اور روشن مستقبل ڈاکٹری کے شعبے کو یونہی جاری و ساری رکھنا چاہتے ہو تو پندرہ لاکھ روپے دے دو' ہم یہ سارا مواد تمہیں کو دے کر یہ قصہ یہیں ختم کر دیں گے۔''

ڈوبتی ناؤ کو کنارے لگانے اور آنے والی مشکلات سے بچنے کے لیے ڈاکٹر نے فوری طور پر رشید اور اس کے ساتھیوں کو پانچ لاکھ روپے نقد بینک سے نکلوا کر دیے' اور باقی دس لاکھ کے لیے ایک ہفتہ کا وقت مانگا۔ رشید نے بڑی رحم دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر کو دس دن کا وقت دے دیا تھا۔

☆......☆......☆

اُن لوگوں کے روانہ ہونے کے بعد ڈاکٹر سخت پریشانی کے عالم میں اس مصیبت ناگہانی سے نجات کا راستہ سوچتا رہا' ڈاکٹر کا ایک بھائی وکیل تھا اُس نے بھائی کے ساتھ براہِ راست بات کرنے کے بجائے

بھائی کے دوست ایک دوسرے وکیل سے یہ بات کی‘ اُس نے فوراً ڈاکٹر کے بھائی کو تمام معاملہ بتایا تھا۔

تمام وکیل سر جوڑ کر بیٹھ گئے کہ اس مسئلے کو کس طرح حل کیا جائے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے‘ اگر تو اُسے بلا کر مار پیٹ کی جائے تو وہ حالات و واقعات سے مکر جائے گا۔ منصوبہ ایسا بنایا جائے کہ اُس کا بچ کر نکلنا مشکل ہو جائے‘ آخر کار فیصلہ یہ ہوا کہ رشید کو کلینک بلایا جائے کہ اپنے بقایا دس لاکھ لے جاؤ اور جب اس کو پیسے دیے جائیں تو ویڈیو بنالی جائے پھر بلیک میلنگ کا کیس درج کروایا جائے۔

پروگرام کے تحت اگلے دن ڈاکٹر نے رشید کو فون کیا کہ اپنے بقایا دس لاکھ لے جاؤ۔ دوسرے دن رشید کے آنے سے قبل پانچ وکیل ڈاکٹر کے کمرے میں آ کر پردوں کے پیچھے چھپ گئے۔ رشید آیا ڈاکٹر سے سلام دعا کی اور پیسے مانگے‘ ڈاکٹر نے میز کی دراز سے پیسے نکال کر رشید کو دیے۔ ابھی وہ پیسے گن ہی رہا تھا کہ پردوں کے پیچھے چھپے وکیل باہر آ گئے‘ پہلے تو اُس سے روپوں کے بارے میں پوچھا۔

”یہ کس سلسلے میں لیے ہیں۔“ ڈاکٹر نے فوراً ہی بتا دیا کہ یہ رقم کس سلسلے میں لی اور دی جا رہی ہے۔ بس اتنا سننا تھا کہ وہ رشید پر ٹوٹ پڑے‘ مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا تھا۔ رشید پاؤں جوڑ کر معافیاں مانگ رہا تھا۔

”میری گاڑی اور یہ پیسے بھی رکھ لو‘ دس لاکھ بینک اکاؤنٹ میں پڑے ہیں وہ بھی نکلوا کر دیتا ہوں‘ مجھ سے لکھوا لو کہ میں اپنی مرضی سے دے رہا ہوں‘ لیکن مارنا بند کر دو اور تھانے میں رپورٹ درج نہ کروانا۔“ مگر وہ اِس ناسور کو ہمیشہ کے لیے معاشرے کے جسم سے کاٹ دینا چاہتے تھے۔ جب مار مار کر تھک گئے تب تھانے فون کیا۔

پولیس آئی اور رشید کو گرفتار کر کے تھانے لے گئی۔

دورانِ تفتیش رشید نے کتنے ہی گناہوں کا اعتراف کیا تھا۔ اس کے خلاف باقاعدہ کیس رجسٹرڈ کر کے عدالت میں پیش کیا اور پھر جلد ہی اُسے سزا بھی ہو گی اور جیل بھیج دیا گیا۔

☆☆......☆☆

غزل

اک خواب ہے‘ اِس خواب کو کھونا بھی نہیں ہے
تعبیر کے دھاگے میں پرونا بھی نہیں ہے

لپٹا ہوا ہے دل سے کسی راز کی صورت
اک شخص کہ جس کو مِرا ہونا بھی نہیں ہے

رکھنا ہے سرِ چشم اِسے ساکت و جامد
پانی میں ابھی چاند بھگونا بھی نہیں ہے

ہر چند ترے نقشِ کفِ پا میں ہے لیکن
یہ دل کسی بچے کا کھلونا بھی نہیں ہے

وابستہ ہے مجھ سے کہ تُو ہے بھی کہ نہیں ہے
جب میں نہیں تجھ میں‘ ترا ہونا بھی نہیں ہے

یہ عشق و محبت کی روایت بھی عجب ہے
پایا نہیں جس کو‘ اُسے کھونا بھی نہیں ہے

جس شخص کی خاطر ترا یہ حال ہے خاور
اُس نے ترے مرجانے پہ رونا بھی نہیں ہے

ایوب خاور

تیسری عبرت اثر کہانی ملتان سے

عذاب آیا تو یوں آیا

آسناتھ کنول کا شعر

ہوس نے بنائی ہیں سب داستانیں
ایسی راہ میں لوگ پاگل ہوئے ہیں

مجید احمد جائی

وہ بہت شور شرابے اور مارا ماری کے بعد پکے فرش پر بیٹھا اپنی اُنگلیوں سے زمین پر اُلٹی ترچھی لکیریں کھینچ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ بندھے اور پاؤں میں بیڑیاں ڈالی گئی تھیں۔ اُس کا چہرہ اجاڑ باغ کی طرح ویران تھا۔ سر کے بال آپس میں کسی جال کی طرح اُلجھے ہوئے تھے' شیو بڑھی ہوئی تھی اور لباس بھی میل کچیل سے اٹا ہوا تھا۔

یہ پاگل خانے کی بیرک ہے، جس کی سلاخوں کے پیچھے یہ شخص قید بیٹھا ہے۔ سلاخوں کے پیچھے قید ہونے کے باوجود اُس کے ہاتھ، پاؤں جکڑے ہوئے ہیں کیونکہ یہ وحشی پاگل شخص ہے۔ اس کی حالت اچانک بگڑ جاتی ہے اور پھر بیٹھے بیٹھے اُٹھ بھاگتا ہے' اپنی بیرک میں دوسرے پاگلوں کو مارنے لگتا ہے۔ دانتوں سے کاٹنے لگتا ہے۔ پاگل خانے کے عملے نے مجبوراً اِسے بیڑیوں میں جکڑ دیا ہے۔ سلطان نامی اس قیدی کی زندگی کی روداد بہت عجیب اور عبرت آمیز ہے۔ اس بیرک میں آئے ہوئے اسے تیسرا دن ہے۔ اب شام ڈھلنے کو ہے، یہ دوروز پہلے صبح دس بجے کے قریب یہاں لایا گیا تھا۔ سارا دن اِس نے اُدھم مچائے رکھا' پھر یہاں کے عملے نے اِسے زنجیروں میں جکڑ دیا۔

سلطان اپنے علاقے، گاؤں کا امیر ترین سلطان' لوگ اِس کے نام سے کانپتے تھے۔ ڈرتے تھے' اِس کے نام کی طرح اس کا رُوپ تھا۔ اس کی مربعوں زمینیں تھیں۔ دولت کی ریل پیل تھی، اور یہ قدرتی امر ہے جس کو اللہ تعالیٰ دولت سے مالا مال کر دے، وہ بمشکل اسے سنبھال پاتا ہے۔ اکثر کو پٹری سے اُترتے دیکھا ہے۔ دولت کو دُرست استعمال کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ یہ دریا' عذاب کا دریا' اس میں جو ڈوب جاتا ہے وہ ذلیل وخوار ہو جاتا ہے۔ لیکن جس نے اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھامے رکھا وہ سُرخرو ہوتا ہے ورنہ زمانے نے بڑے بڑے دولت مند فنا ہوتے دیکھے ہیں۔

دولت کا نشہ شراب سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ انسان اس کے نشے میں ڈوب کر غرور، تکبر کے آخری اسٹیج پر پہنچ جاتا ہے۔ دولت زہر ہی تو ہے جو رگ رگ میں سرایت کر جاتا ہے اور پھر انسان کو عقل وشعور سے بیگانہ کر دیتا ہے۔ اُس کی دُنیا اور آخرت برباد کر دیتا ہے۔ آنکھوں پر ہوس کی پٹی بندھ جاتی ہے کہ پھر نیکی کا راستہ نظر نہیں آتا۔ انسان دولت سے ہر

چیز خریدنے کی کوشش کرتا ہے‘ وہ اپنے منصب سے ہٹ کر خُدا بننے لگتا ہے‘ تب وہی خُدا اُن کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔

دوسری طرف ایک طبقہ وہ بھی ہوتا ہے‘ جو دولت کے نشے میں نہیں رہتا، وہ دولت کو حقیر سمجھتا ہے‘ اور اس کو دامن میں نہیں بھرتا۔ دو وقت کے لیے روٹی کی جدو جہد میں مگن رہتا ہے‘ اور حق سچ کی باتیں کرتا ہے۔ وہ اپنے پاس کھوٹے سکے نہیں رکھنا چاہتا‘ جو کچھ رب دیتا ہے‘ وہ اُسی کے نام پہ لٹانے پر مگن رہتا ہے۔

سلطان کا باپ بھی ایسے ہی طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ بہت رحم دل اور انسانیت سے محبت کرنے والا تھا۔ اُس کی سخاوت اور دریا دلی کے پورے گاؤں بلکہ آس پاس کے گاؤں تک چرچے تھے۔ غریبوں کی مدد کے لیے ہر دم تیار رہتا‘ جس کسی کو کوئی بھی مجبوری ہوتی‘ مسئلہ ہوتا‘ وہ اُس کے پاس بے خطر و خوف چلا آتا‘ اور اپنا مسئلہ حل کروا کر جاتا۔ چھوٹے بڑے کے لبوں پر اُسی کا نام رہتا‘ اور وہ اللہ کا نام لیوا تھا۔ اُس کے دور میں گاؤں میں ہر سہولت موجود تھی اور گاؤں کا ہر مکین، غریب، کمی کمین سکون کی زندگی بسر کر رہا تھا۔

سلطان کی ماں بہت پہلے فوت ہو چکی تھی‘ سلطان



کا بچپن بہت عیش و آرام میں گزرا تھا۔ گھر میں ہر شے میسر تھی، کسی چیز کی کوئی کمی بیشی نہ تھی اور اُس کے ایک اشارے پر نوکر چاکر بھاگتے پھرتے تھے۔ لیکن حد سے زیادہ پیار بھی بچے کو بگاڑ دیتا ہے اور اِسی طرح سلطان بھی بگڑ گیا۔ وہ جو جوانی کی سیڑھی چڑھا تو اِس کی شادی، اس کی چاچازاد ایمان سے ہوگئی۔

جس روز سلطان دُلہا بنا تھا اُس دن غریبوں، مسکینوں، کمی کمین لوگوں کو نذر و نیاز سے خوب نوازہ گیا۔ درجنوں بیل ذبح ہوئے۔ انواع و اقسام کے کھانے پکے اور عام و خاص کو کھلائے گئے' یہ ولیمہ دو دن چلتا رہا اور اِسی جشن میں موج و مستی کی محفلیں بھی جمتی رہی تھیں۔

شادی کے ڈیڑھ سال بعد سلطان کے ہاں بیٹی کی پیدائش ہوئی تھی۔

اور بچی کی پیدائش کے چھ ماہ بعد ہی سلطان کا باپ وفات پا گیا تھا۔ سلطان ماں باپ کا اُکلوتا تھا اور اُس کی جائیداد میں کوئی شریک نہیں تھا۔

کہتے ہیں بزرگ گھر کی برکت ہوتے ہیں۔ سلطان کا باپ فوت ہوا تو تمام برکت اُٹھ گئی' اور بُرائیوں نے اِس گھر کی راہ دیکھ لی۔ شیطان اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا' سلطان اُس کے جال میں پھنس چکا تھا۔ سلطان کی دوستیاں ایسے بُرے کردار کے لوگوں سے تھیں' جو شراب کے رسیا تھے۔ ایسے میں سلطان کا ماموں زاد بھائی عرفان لندن سے لوٹ آیا تھا۔

عرفان وہاں کے آزاد ماحول میں پلا بڑھا تھا' جہاں خاندان کی کوئی روایت نہیں، جہاں ماں باپ، بہن، بیٹی کی تمیز نہیں' جہاں بچے پہلے پیدا ہوتے ہیں اور شادیاں بعد میں ہوتی ہیں۔ جہاں عزت، عصمت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اِس گندے ماحول میں پلا بڑھا عرفان جب مشرق کی سرزمین پہ آیا تو یہاں کے حُسن کو دیکھ کر تو جیسے دیوانہ ہی ہوگیا۔

سلطان بھی کچھ اِسی کردار کا مالک تھا' دونوں نے مل کر بے شرمی اور بے غیرتی کی انتہا کر دی تھی۔ ایک روز دن دیہاڑے عرفان نے بخشو کمہار کی بیٹی کا راستا روکا تھا۔ بخشو کی بیٹی قرآن کی حافظہ تھی۔ وہ گاؤں کے بچوں' بچیوں کو قرآن پڑھاتی تھی۔ اُس دن بھی بچیوں کو قرآن کا سبق دے کر اپنے گھر کو جا رہی تھی کہ اس خبیث عرفان نے راستا روک لیا تھا۔ یہ کمینہ کئی دِنوں سے بخشو کی بیٹی کے لیے مورچے لگائے ہوئے تھا' اور اُس نصیبوں جلی کو یہ خبر نہ تھی۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے لیکن بخشو کی بیٹی گھر نہ پہنچی تو ماں باپ کو فکر ہوئی۔ اُنہوں نے وہاں پتا کیا جہاں وہ بچیوں کو پڑھانے جاتی تھی لیکن جب یہ سُنا کہ یہاں سے تو کب کی جا چکی ہے اُن کی فکریں بڑھ گئیں۔ انجانا خوف اُن کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ دیوانگی میں وہ اپنی بیٹی کو ڈھونڈتے رہے اور پھر یہ خبر پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ گاؤں والے بھی اس تلاش میں شامل ہو گئے۔ شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا جب اُس کی لٹی پٹی لاش کھیتوں سے ملی تھی۔ تب قیامت برپا تھی۔

گاؤں بھر میں کہرام مچ گیا۔ سب کو یقین تھا کہ اس پاک دامن لڑکی کی عزت سے کھیلنے والے سلطان اور اُس کا ماموں زاد عرفان ہیں۔ مگر گاؤں والوں کو سانپ سونگھ گیا تھا کیونکہ وہ سُلطان کے خلاف آواز بلند نہیں کر سکتے تھے۔ رو دھو کر خاموش ہو گئے تھے' جبکہ بخشو اور اُس کی بیوی کے ہاتھ نیلے آسمان کی طرف اُٹھے ہوئے تھے اور لبوں سے دُعا کر رہے تھے۔

''اے رحمان، ہماری بیٹی تیری ہی پاک کتاب، پاک کلام کی تعلیم دیتی تھی، اُس کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہوا ہے' ہماری بیٹی کی عزت سے کھیلنے والوں کو عبرت کا نشان بنا دے' اُنہیں تباہ و برباد کر دے۔''

وقت کا سفر جاری رہا' دن ہفتوں' ہفتے مہینے اور مہینے سالوں میں بدلتے رہے۔ سلطان اور عرفان کی نظر میں عورت مرد کے پاؤں کی جوتی سے بھی گئی گزری تھی۔ عورت تو صرف عیش و عشرت کے لیے بنائی گئی تھیں' سلطان کی بیوی ایمان شوہر کی اِن حرکات کے سخت خلاف تھی۔ مگر وہ اپنی جگہ مجبور تھی۔ اُس کی ایک نہ چلتی تھی۔ اکثر سلطان کو اِن کاموں سے منع تو کرتی مگر سلطان کب کان دھرتا تھا۔ سلطان

تو گناہوں کی اِس دلدل میں دھنستا ہی چلا جا رہا تھا۔
دوسری طرف گاؤں والے بھی خاموش تھے کیونکہ وہ غربت کی چکی میں پس رہے تھے بیچارے دو وقت کی روٹی کو ترستے تھے۔ پیٹ کا دوزخ بھرتا نہیں تھا، اس فکر سے آزاد ہوتے تو دوسری طرف سوچتے۔ جن کو روٹی کے لالے پڑے ہوں وہ کر بھی کیا سکتے ہیں۔

ایک شام سلطان کی بیوی ایمان شہر میں کسی عزیز کے گھر گئی ہوئی تھی' اور اُس کی جواں سال بیٹی گھر میں رہ گئی۔ اُس روز اُس کی طبیعت خراب تھی' سو ماں کے ساتھ شہر نہ گئی۔ نوکرانیاں شام ہوتے ہی اپنے گھروں کو چلی گئی تھیں۔ قدرت خُدا کی اُدھر ایمان کو گھر آنے میں دیر ہو گئی اور سلطان ڈیرے کی محفل میں عیش کر کے گھر لوٹ آیا۔ اُس نے شراب پی رکھی تھی' اور نشے میں دُھت تھا۔ شراب کا جادو تو سر چڑھ کر بولتا ہے' اور یہ اِنسان کو ہر رشتے سے بیگانہ کر دیتا ہے، اپنے پرائے کی تمیز نہیں رہتی' یہاں تک کہ بیٹی، بہن، بیوی، ماں کی تمیز مٹ جاتی ہے۔ سلطان گھر آیا تو گھر میں اُس کی بیٹی اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔

سلطان اپنے کمرے میں جانے کی بجائے اپنی بیٹی کے کمرے کی طرف چلا آیا تھا۔ جب کمرے میں داخل ہوا تو اُس کی آنکھیں پتھرا گئیں' اپنی بیٹی بھی اُسے گاؤں کی الہڑ مٹیار لگی اور اُس نے اپنی بیٹی کو ڈبوچ لیا۔ بیٹی، باپ کے شکنجے میں تھی ...... نہیں ...... نہیں ایک عورت درندے کی قید میں تھی۔ سلطان اُس وقت باپ نہیں شکاری تھا۔ اُس کی بیٹی اُس کے ہاتھوں اجڑ گئی' جو دوسروں کی بیٹیوں کی زندگیاں برباد کرتا تھا' اُس کی بیٹی اُس کے ہاتھوں برباد ہو رہی تھی۔

سلطان کی بیٹی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اُس کا باپ اُس کی یوں عزت داغ دار کر دے گا۔ جب عزت کا رکھوالا عزت کی دھجیاں اُڑا دے تو زندگی جینے کا رنگ ڈھنگ ماند پڑ جاتا ہے۔ بیٹی نے باپ کے ہاتھوں برباد ہونے کے بعد خود کو دل میں چھری مار کر ہلاک کر لیا تھا۔

اُدھر رات گئے جب بعد ایمان گھر لوٹی تو اُس کی دُنیا اجڑ چکی تھی۔ سلطان بیٹی کے بستر پر بے ہوش پڑا تھا اور اُس کی بیٹی نیچے فرش پر مُردہ پڑی تھی۔ اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور اُس کے دماغ کی نسیں پھٹنے لگیں۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں بیٹی کے لاشے پر گر پڑی تھی۔

جب سلطان کو ہوش آیا تو گھر کا نقشہ بدل چکا تھا۔ اُس کا نشیمن اُس کے ہاتھوں برباد ہو چکا تھا۔ تب اُسے ہوش آیا کہ یہ میں نے کیا کر دیا لیکن اُس وقت، پانی سر سے گزر گیا تھا۔ سلطان اپنے بالوں کو نوچنے لگا، خود کو مارنے لگا اور پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔ وہ عقل و خرد سے بیگانہ ہو گیا تھا۔

یہ قدرت کا عذاب ہی تھا کہ اُسی رات جب سلطان اپنے ڈیرے سے گھر کی طرف آیا تھا تو کہیں سے جنگلی وحشی کتوں کا غول ڈیرے پر آ گیا تھا۔ سلطان کا ماموں زاد عرفان اور اُس کے دوست وہاں نشے میں دھت پڑے تھے۔

کتوں نے اُن پر حملہ کر دیا اور اُن کو اپنا شکار سمجھ کر چیر پھاڑ کرنے لگے۔ اُن کے جسم میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ کتوں سے مقابلہ کرتے اور اپنی جان بچا سکتے۔ چند گھنٹے پہلے عیاشیاں کرتے' ان درندوں کی لاشوں کے ساتھ وحشی جنگلی کتوں کا غول انصاف کر رہا تھا۔

ایمان ہسپتال میں تھی اور
گاؤں والوں نے سلطان کو پاگل خانے میں داخل کروا دیا تھا۔ یوں اللہ تعالیٰ نے اُس کو نشان عبرت بنا دیا تھا۔

ایمان جو اسپتال میں داخل تھی کچھ دنوں بعد صحت یاب ہو کر واپس گاؤں آ گئی ہے' لیکن اُس نے اُس بنگلے میں رہائش اختیار نہ کی' کیونکہ اُسے اُس جگہ سے خوف آتا ہے۔ اُس بنگلے کی جگہ اب درس گاہ بنی ہوئی ہے اور اُس میں بچوں کو پاک کتاب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ایمان، بخشو اور اُس کی بیوی کے ہاں رہتی ہے اور سلطان کی زمینیں بخشو نے سنبھال رکھی ہیں۔ سلطان کی زمینوں کی آمدنی سے گاؤں والے فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔

☆☆......☆☆

چوتھی عبرت اثر کہانی کراچی سے

چراغ تلے اندھیرا!

ریاض خیر آبادی کا خیال

بڑے نیک صورت بڑے پاک باطن
ریاض آپ کو کچھ ہم ہی جانتے ہیں

نازیہ بتول رضا

''ارے کچھ سنا تم نے؟'' زینو کی اماں نے اپنی آنکھیں چندھی کر کے ہونٹوں پر انگلیاں جماتے ہوئے قریب بیٹھی ہوئی عورتوں سے سوال کر کے سنسنی پھیلائی' ان کی یہ بات سن کر عورتیں کچھ اور قریب کھسک آئیں۔ وہ جانتی تھیں کہ زینو کی اماں کے پاس ہمیشہ گاؤں کی 'نئی تازی' خبریں ہوتی ہیں۔ کس کا چکر کس سے چل رہا ہے' کس کی بہو زیادہ میکے میں رہتی ہے' کس گھر میں لڑائی جھگڑا چل رہا ہے یا کس کی شادی ہونے والی ہے وغیرہ وغیرہ۔''

اسی لیے اس وقت بھی عورتوں کے کان کھڑے ہونا فطری عمل تھا۔

اس وقت گرمی کی ستائی ہوئی زیادہ تر عورتیں گاؤں کے ایک چبوترے پر پیپل کے گھنے درخت کے سائے تلے براجمان تھیں اور 'برائی برائی' کھیل رہی تھیں' ہر ایک دوسری سے سبقت لے جانے پر تلی تھی۔

اور اب زینو کی اماں اک اور 'نئی تازی' خبر سنانے جا رہی تھی۔

''کیا ہوا؟'' چھوٹو کی اماں کو کھلبلی ہوئی۔

''ارے تم لوگوں کو کچھ پتہ ہی نہیں ہے؟'' زینو کی اماں نے اتنے افسوس سے کہا کہ جیسے کوئی بہت اہم خبر ہے' جواب تک کسی کو نہیں معلوم۔

''سچی نہیں پتہ اللہ خیر کرے اب کیا ہوگیا؟'' شنو کی اماں اپنا بھاری بھرکم وجود سنبھالتی مزید آگے کھسک آئی تھی۔

''کون سی دنیا میں رہتے ہو تم لوگ؟ ہیں؟'' زینو کی اماں نے آنکھیں پھاڑ کر حیرانی سے سب عورتوں کی طرف دیکھا۔

''یہاں اتنا کچھ ہوگیا اور تم لوگ بے خبر ہو لو بھلا بتاؤ محلے کی کچھ خبر ہی نہیں ہے تم لوگوں کو؟''

''اب بتا بھی دو ایسے باتیں نہ بناؤ' میرے تو پیٹ میں کھولن ہونے لگی ہے تجسس سے۔'' شنو کی ماں کے پیٹ میں درد ہوا تھا۔

''ارے یہ اپنی سلطانہ نہیں ہے؟'' زینو کی اماں نے بات شروع کی۔

''ہاں! ہاں کیا ہوا سلطانہ کو؟''

''ارے اُسے کچھ نہیں ہوا اُس کی بیٹی رات کو گھر سے بھاگ گئی' اپنے آشنا کے ساتھ۔'' زینو کی ماں نے پیٹ ہلکا کر کے سکون کا سانس لیا۔

''تمہیں کیسے پتہ چلا؟'' چھوٹو کی اماں نے تصدیق چاہی۔

''اے لو ہمارے برابر میں تو گھر ہے سلطانہ کا' بھلا ہمیں ہی خبر نہیں ہو گی' میری تو صبح چھ بجے ہی آنکھ کھل گئی تھی شور شرابے سے' بہت رونا پیٹنا ہو رہا تھا بے چاری کے گھر میں' زینو کی اماں کی کبھی فجر کی اذان سے آنکھ نہیں کھلی ہو گی' لیکن ایسی خبروں کی طرف ہر وقت کان لگے رہتے تھے' ہر کسی کی ٹوہ میں رہنا اس کی عادت تھی۔

''پھر کچھ پتہ چلا کہ کہاں چلی گئی ہے؟'' چوتھی عورت جو بڑی دیر سے چپ تھی بولی۔

''ارے ابھی کہاں باپ بھائی بے چارے صبح سے بھاگ دوڑ میں لگے ہیں۔'' زینو کی اماں نے اطلاع دی۔

''اچھا کچھ پتہ چلے تو ہمیں بھی بتانا۔''

''ہاں! ہاں تمہیں تو پتہ ہے میرے پیٹ میں کوئی بات رُکتی کہاں ہے ضرور بتاؤں گی۔ اچھا اب میں تو چلی' گھر میں زینو اکیلی ہے بچے مدرسے سے آتے ہوں گے۔'' زینو کی اماں کو اب قدرے سکون مل چکا تھا' وہ صبح سے اس خبر کا بوجھ ڈھوئے پھر رہی تھی۔ اور اب گاؤں میں یہ خبر اڑا کر اسے چین مل گیا تھا' اب اسے سکون کی نیند آتی تھی وہ دوپٹہ گلے میں ڈالتی اپنے گھر کو چلی اور یوں محفل برخاست ہوئی۔

☆......☆......☆

''زینو مجھے ایک گلاس پانی تو پلا بیٹی ٹھنڈا سا اُف بہت گرمی ہے۔'' زینو کی اماں دوپٹہ اُتار پلنگ پر لیٹ گئی' زینو جو کسی سے موبائل پر بات کر رہی تھی' جلدی سے کال کاٹ کر اماں کے لیے پانی لے آئی۔ اماں





نے غٹاغٹ پانی پیا اور گلاس اسے تھماتے ہوئے پوچھنے لگی۔
''یہ بچے ابھی تک مدرسے سے نہیں آئے۔''
''ہاں اماں آتے ہوں گے۔'' زینو موبائل پر میسج لکھنے میں مصروف تھی۔
''اچھا کھانا پکالیا تُو نے؟''
''ہاں اماں پکالیا تمہیں لا دوں؟''
''ہاں لا دے بہت بھوک لگی ہے تو تو بچوں کے ساتھ کھائے گی ناں۔''
''آں ہاں! ابھی لائی۔'' زینو مسلسل موبائل پر مصروف تھی۔
زینو نے اماں کے آگے کھانا رکھا۔
''اماں اب تم کھانا کھا کر سو جانا یہ لوگ مدرسے سے آئیں گے تو میں انہیں کھانا کھلا کر سلا دوں گی۔''
''ہاں ہاں! میری بچی' مجھے پتہ ہے تو ہر کام بڑی ذمے داری سے کرتی ہے' جس گھر جائے گی عیش کرے گی' تیری خالہ تو بڑی خوش نصیب ہے کہ تو اُس کی بہو بنے گی۔'' زینو کی اماں نے سرشاری سے بیٹی کو دیکھا' اُن کے خیال میں اُن کی بیٹی بہت سگھڑ تھی' سگھڑ ہونے کی بات جہاں تک ہے تو اُن کا خیال ٹھیک بھی تھا' کیونکہ وہ خود تو صبح ناشتے سے فارغ ہو کر علاقے کی خبر گیری کرنے کے لیے نکل پڑتی تھیں' پورا گھر زینو ہی سنبھالتی تھی۔ اُس وقت بھی انہوں نے کھانا کھا کر ٹرے ایک طرف سرکائی اور پلنگ پر لیٹ گئیں اب نہیں سونا تھا' زینو سب سے بے نیاز موبائل پر مصروف تھی' اماں کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔

☆......☆......☆

اماں کی آنکھ کھلی گھر میں سناٹا تھا انہوں نے چاروں طرف نظر دوڑائی بچے شاید گلی میں کھیل رہے تھے اور زینو پتہ نہیں کہاں تھی' انہوں نے آواز لگائی۔
''زینو......زینو......''
''جی اماں......'' زینو بھاگتی ہوئی آئی۔
''ہاں میری بچی مجھے چائے بنا کر دے دے تاکہ چائے پی کر میں ذرا باہر کی خبر لوں' سلطانہ کی بیٹی گھر آئی یا اِس کی کوئی خبر ملی کہ نہیں۔''

''اچھا اماں ابھی لائی چائے۔'' زینو مڑی تو اماں نے پھر پکار لیا۔
''اے سن زینو! شعیب کا کوئی فون وون آیا تیرے پاس' سب خیریت ہے ناں وہاں؟'' شعیب زینو کا خالہ زاد اور منگیتر تھا اور زینو کو پسند بھی کرتا تھا' یہ رشتہ اُس کی پسند اور خالہ کی رضا مندی سے ہی ہوا تھا' زینو نے بھی خاموشی سے منگنی کر لی تھی' اور زینو کی اماں نہال تھیں کہ ان کی بیٹی کس قدر فرمانبردار ہے' ماں کی مرضی میں ہی اُس کی رضا ہے۔''
''ہاں ہاں اماں روز بات ہوتی ہے میری سب ٹھیک ہیں خالہ کے گھر میں۔'' زینو نے بتایا تو اماں نے سکون کا سانس لیا' تھوڑی ہی دیر میں زینو چائے لے آئی تو اماں نے اُسے پھر سے موبائل پر مصروف دیکھا کچھ دیر دیکھتی رہیں پھر پوچھا۔
''کیا شعیب سے بات کر رہی ہے۔'' زینو نے چونک کر سر اٹھایا۔
''آں......ہاں اماں کیوں؟''
''نہیں نہیں میں تو ایسے ہی پوچھ رہی ہوں تو آرام سے بات کر۔'' اماں مطمئن ہو کر چائے پینے لگیں' پھر خالی کپ رکھ کر اپنی ڈیوٹی سرانجام دینے نکل پڑیں۔ آخر پڑوسیوں کی خبر گیری بھی تو کرنی تھی۔

☆......☆......☆

وہ جب سلطانہ کے گھر میں داخل ہوئیں تو گھر سائیں سائیں کر رہا تھا' ایک طرف پلنگ پر سلطانہ بے سُدھ پڑی تھی' شاید سو رہی تھی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں جیسے روتی رہی ہو سامنے ہی اس کی دونوں چھوٹی بیٹیاں تھیں' زینو کی اماں کو دیکھ کر انہوں نے اسے سلام کیا۔ انہوں نے سر کے اشارے سے جواب دیا اور رانی کے بارے میں معلوم کیا کہ اِس کا کچھ پتہ چلا' تو رانی سے چھوٹی نے جواب دیا۔
''ابا اور بھائی گئے ہوئے تو ہیں' پر اب تک کچھ پتہ نہیں چلا' اماں کی طبیعت بھی بہت خراب ہو گئی تھی' ابا اسپتال لے کر گئے تھے' ڈاکٹر نے نیند کی دوا دی ہے۔''

"اچھا چلو، تم لوگ پریشان نہ ہو، پتہ چل جائے گا رانی کا، لیکن سنو جیسے ہی کوئی اطلاع ملے مجھے ضرور بتانا، میں صبح سے بہت پریشان ہوں اللہ خیر کرے۔" زینو کی اماں نے نہ نظر آنے والے آنسو پونچھے، پھر اٹھتے ہوئے بولیں۔

"اچھا بیٹا میں چلی تم دروازہ بند کرلو ٹھیک ہے پریشان نہ ہونا۔"

زینو کی اماں کا رخ اب چھوٹو کی اماں کے گھر کی طرف تھا، آخر سب کو نئی خبر سنانی تھی۔

دوسرے دن صبح گاؤں میں یہ خبر پھیل چکی تھی کہ رانی نے گھر سے بھاگ کر شادی کرلی ہے۔" اُس کے باپ بھائی منہ چھپاتے پھر رہے تھے۔ محلے کی عورتیں باتیں بنا رہی تھیں جن میں زینو کی اماں پیش پیش تھیں۔

"ہائے ہائے اس لڑکی نے تو باپ بھائی کی عزت خاک میں ملادی، ہماری زینو بھی تو ہے سارا دن گھر کے کاموں میں لگی رہتی ہے مجال ہے جو کبھی دروازے پر نظر آجائے۔"

"ہاں ہاں۔" دوسری نے لقمہ دیا۔

"رانی تو شروع سے ہی بدکردار تھی، محلے کے لڑکوں کو دیکھ دیکھ کر مسکراتی تھی۔"

"ارے ہاں میں نے خود اسے کتنی بار نکڑ والے اشرف سے نین مٹکا کرتے دیکھا ہے۔" تیسری نے ہاتھ کے ساتھ ساتھ آنکھیں مٹکائی تھیں۔

"ارے میں تو کہتی ہوں ایسی لڑکیاں تو پیدا ہوتے ہی مرجائیں، قسم سے میری بیٹی اگر خدانخواستہ میرے منہ میں خاک کوئی ایسا قدم اٹھاتی تو میں اسے زندہ زمین میں دفنا دیتی، توبہ بھئی بڑا جگرا ہے رانی کے باپ بھائیوں کا۔" زینو کی اماں با آواز بلند اپنے خیالات کا اظہار کررہی تھیں اور ایسی ہی بے شمار باتوں کے بعد یہ محفل برخاست ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

اگلے دن زینو صبح صبح گھر سے غائب ہوگئی تھی، اور زینو کی اماں سب سے منہ چھپاتی پھر رہی تھیں۔

☆☆......☆☆

بے معنی...

سبز......شاخِ خیال کی
رگیں سُلگ رہی تھیں
ایاغ روشن، چراغ صورت
ایقان شعلے، گمان تکیے پر
آنے والی ساعتوں کو
اک سراپا دے رہے تھے
بات چل رہی تھی......
عمر ڈھل رہی تھی......
شش و پنج میں......
نرم کچی پوروں سے کھیلتے ہوئے
حوالے آنکھوں کے سامنے
پہاڑ صورت، وجود گاڑھے
اٹل حقیقت کے ماتھے حروف کتبوں پر
برنگِ صورت دھڑک رہے تھے
زمانہ جن کی تصدیق میں
قسم! اپنے ہونے کی کھا رہا تھا
اور بتا رہا تھا......
جیسے پہلے سب ہو رہا تھا
اور ہونے سے پہلے کہہ دیا تھا

پروین سجل

پانچویں عبرت اثر کہانی میاں چنوں سے

عبرت کا نشان

کامل عارفی کا خیال

زندگی	بن	گئی	ہے	عذاب	میری
موت	کیوں	مہرباں	نہیں	ہوتی

مہر پرویز احمد دولو

نوید فطرتاً شیطان ذہن والا انسان تھا' لوگوں کو آپس میں لڑانا' تھانے میں کیس دائر کروانا' کیس کی پیروی کے دوران مال بنانا' صلح نہ ہونے دینا اس کا شیوہ تھا' پورے گاؤں میں کوئی فرد اس کے شر سے محفوظ نہ تھا۔ اس نے ہر شخص کو خون کے آنسو رُلائے تھے۔ سکھ' چین' امن سکون سے اسے سخت نفرت تھی۔ گاؤں میں پولیس یوں باقاعدگی سے آتی جیسے اِدھر ہی تھانہ ہو اور یہاں انہوں نے ڈیوٹی سرانجام دینی ہے۔ نوید کی وجہ سے ایک قتل بھی ہو گیا تھا۔ کئی خواتین کی طلاق کا موجب بنا تھا اور پھر خود ہی طلاق کو فاسق قرار دیتا' گاؤں کا کوئی بھی شریف آدمی اس کے آگے آنکھ اٹھا کر بات نہ کرتا' کیونکہ وہ ایف آئی آر درج کرانے کے بعد ہی صلح کی بات کرتا۔ صبح شام ہر گھر میں کتنے ہی ہاتھ اس کے حق میں بددعا کے لیے اُٹھتے تھے۔

☆......☆......☆

شیراز نوید کا لاڈلہ بیٹا تھا۔ پیسے اور باپ کے رعب و دبدبے کی وجہ سے کافی بگڑ چکا تھا' لڑکیوں کا دلدادہ' سرعام چھیڑنا معمول بنا رکھا تھا' ان حرکات کی وجہ سے کئی بار لڑکیوں کے ہاتھوں پٹ چکا تھا۔ ایسے میں کسی دوست نے اُس کو ایک عجیب مشورہ دیا۔

''اگر لڑکیوں سے دوستی کا شوق ہے تو ڈانس سیکھ لو لڑکیاں تم پر مرمٹیں گی۔'' اس کو یہ مشورہ اتنا پسند آیا کہ آئے روز میلوں' ٹھیلوں پر لگے موت کے کنویں دیکھنے لگا۔ اپنے طور پر ناچنے والوں عورت نما مردوں سے بات کی' ٹکرنا کام رہا۔

☆......☆......☆

خالد اسی گاؤں کے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا وہ اپنے آپ کو پھنے خاں سمجھتا۔ نوید گاؤں میں خالد کی یہ اکڑفوں برداشت نہ کر سکا' اور اُسے ایک جھوٹے کیس میں پھنسا کر تھانے میں بند کروا دیا۔ پھر بہت منت سماجت اور کافی لین دین کے بعد نوید اور خالد کی صلح ہوئی یوں خالد کو تھانے سے رہائی ملی تھی اور اب خالد اکثر نوید سے بدلہ لینے کے منصوبے بناتا رہتا تھا۔

خالد کو جب پتہ چلا کہ نوید کا بیٹا شیراز ڈانس سیکھنے کا خواہشمند ہے تو اس نے فوراً شیراز سے رابطہ کیا اور اپنے ایک جاننے والے ڈانسر کا پتہ اور فون نمبر دے دیا۔

شیراز دوسرے ہی دن شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر ڈانسروں کے ڈیرے پر پہنچ گیا تھا' جہاں عورت نما مردوں اور اُن کے چاہنے والوں کا کاروبار حیات

جاری تھا۔

اِس دوران میں خالد اور شیراز کی دوستی خاصی بڑھ گئی تھی۔ ایک روز شیراز نے فیس بک استعمال کرنے کے لیے خالد سے پچ موبائل مانگا۔ جو اسے فوراً مل گیا تھا، مگر جب ہفتہ دس روز کے بعد خالد نے اپنا موبائل واپس مانگا تھا تو شیراز نے نا صرف موبائل دینے سے انکار کر دیا تھا، ساتھ ہی خالد کو دھمکی دی تھی۔

"تم نے مجھے دھوکہ دے کر ڈانسروں سے میرا سودا کیا ہے، یہ بات میں اپنے ابو کو بتادوں گا۔" خالد تھپڑ لگاتے ہوئے شیراز سے موبائل چھین لیا تھا۔

موبائل واپس لینے کی دیر تھی کہ شیراز اپنے گھر گیا اور روتی صورت بنا کر باپ کو داستان سنائی۔

"خالد نے ڈانسروں کے اڈے پر میرا سودا کر دیا تھا۔ میں بڑی مشکل سے بھاگ کر واپس گھر آیا ہوں۔"

اتنی خوشی اندھے کو آنکھیں ملنے پر نہیں ہوتی جتنا خوش نوید بیٹے کی زبانی یہ کہانی سن کر ہوا تھا۔ اسے تو جیسے قارون کا خزانہ مل گیا تھا۔ فوراً پوری برادری اور گاؤں والوں کا جرگہ بلا کر عرض گزار ہوا تھا کہ خالد نے میرے بیٹے کو ڈانسروں کے اڈے پر بیچا ہے۔ اس نے مجھ پر بہت ظلم کیا ہے میرے بیٹے کے نصیب اچھے تھے جو یہ وہاں سے بھاگ آیا۔"

خالد نے یہ الزام ماننے سے انکار کر دیا اور کہا۔

"یہ اپنی مرضی سے وہاں ڈانس سیکھنے گیا تھا۔ البتہ میری یہ غلطی ضرور ہے کہ میں نے اسے ایک ڈانسر کا موبائل نمبر دیا تھا۔" اور پھر اُسی وقت خالد کے باپ نے نوید کے پاؤں پر اپنی پگ سر سے اُتار کر رکھ دی۔ اور نوید سمیت پوری پنچائیت سے ہاتھ باندھ کر معافی مانگی۔ اور پنچائیت نے معاف بھی کر دیا تھا۔

اتنا بڑا کاری وار خالی گیا تو نوید باؤلا ہی ہو گیا۔ اس نے اُسی رات کو خالد کے باپ کو یہ پیغام بھیجا۔



"اگر اپنے بیٹے کی خیریت چاہتے ہو تو ڈانسر کا نمبر دینے کا جرمانہ پچاس ہزار روپے دو' وگرنہ تمہارے بیٹے کے خلاف اغواء برائے تاوان کا مقدمہ دائر کروں گا۔"

پیغام ملتے ہی خالد کے باپ نے معززین کی پنچایت بلائی' نوید کی دوبارہ منت کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا اور اگلے دن وہ بیٹے کو لے کر تھانے پہنچ گیا۔ اور اغواء کی من گھڑت کہانی سنائی۔ تھانیدار نے خالد کو بلوایا تو وہ گاؤں کے معززین کے ساتھ تھانے گیا۔ وہاں سب لوگوں نے نوید اور اس کے بیٹے کو جھوٹا ثابت کیا' یہاں سے جھوٹا ہونے پر وہ صوبائی لیول کے آفیسروں تک گیا اور مگرمچھ کے آنسو بہا کر اپنے اوپر ہونے والے انجان ظلم کی داستان سنائی' مگر آفیسر کے سامنے بھی وہ باپ بیٹا جھوٹے ثابت ہوئے اور فیصلہ ایک بار پھر مقامی ایس ایچ او صاحب کے حوالے کر دیا گیا۔ اُس نے اِس معاملے میں بڑی مشکل سے نوید کو حلف لینے پر آمادہ کیا۔ نوید نے قرآن مجید اٹھا کر زبان سے کہا۔

"میں نے شیراز کو اغواء نہیں کیا۔"

خالد یہ فیصلہ ماننے کو بھی کسی صورت تیار نہیں ہوا اور جواباً خود بھی جھوٹا حلف اٹھانے کو تیار ہو گیا' پنچائیت کے کافی لوگوں اور تھانیدار نے خالد کو جھوٹا حلف اٹھانے سے روکنے کی بہت کوشش کی' مگر وہ تو اپنی اَنا اور ذلت کا بدلہ لینے کے خیال سے اپنی بات پر اڑا ہوا تھا...... اور پھر ساری پنچایت' تھانیدار اور سارے گاؤں نے دیکھا کہ خالد نے جیسے ہی جھوٹا حلف لینے کے لیے قرآن کو ابھی چھوا ہی تھا کہ وہ اچانک تیورا کر زمین پر جو گرا تو پھر اپنے پیروں پر اٹھ نہ سکا تھا۔

ساری دنیا سے جھوٹے مقدمے جیتنے والا خالد قرآن کا مقدمہ ہار کر فالج زدہ' چارپائی پر پڑا موت کا طالب ہے' مگر موت بھی شاید اُسے قرآن کا جھوٹا حلف اٹھانے پر عبرت کا نشان بنانے کا فیصلہ کر چکی ہے۔

☆☆......☆☆

غزل

ہم سے پہلے بھی فسانوں میں کئی نام آئے
اک فقط ہم ہی نہیں تھے جو تہہ دام آئے

جب بہار آئے دریچے میں کھلیں پھول ہی پھول
وہ ستارہ ہو کہ جگنو ہو' سرِ بام آئے

بڑے سچے بڑے معصوم ہوا کرتے تھے
جن کی شوریدہ سری پہ کئی الزام آئے

وہ جو قادر ہے ہر اک شے پہ' وہی برحق ہے
وہ جو دنیا کے خدا تھے نہ مرے کام آئے

کیا تغافل تھا کہ انجان تھا ہر شخص یہاں
راہزن بھی مری بستی میں سرِ عام آئے

اسمِ اعظم ہے مری ڈھال زمانے بھر سے
تیر دشنام چلے' گردشِ ایام آئے

شائستہ سحر

اُن لوگوں کی کہانیاں، جن کی دنیا بس غم اور دکھ سے آباد ہے



رخصتی

فہمیدہ مقبول کا خیال

> مقدر بھی مجھ کو اٹھا نہ سکا
> بہت غم کا بھاری پلندہ ہوں

ڈاکٹر شمیم انصاری

"دیکھ تو سہی بال کیسے کھردرے ہوگئے ہیں اور خشکی تو یہ کس قدر بڑھ گئی ہے۔ ہزار بار کہا ہے شیشی سے تیل نہ لگایا کر، پر تجھ پر تو جیسے اثر ہی نہیں ہوتا۔" زینوں بڑبڑا رہی تھی اور ملکہ کے سر میں کٹوری سے بھر بھر کے تیل لگائے جا رہی تھی۔ آج اُسے ذرا اطمینان نصیب ہوا تھا۔ صرف ایک قمیض کی ترپائی باقی رہ گئی تھی۔ پچھلے دو ماہ سے وہ مسلسل سلائی میں مصروف تھی۔ سیٹھ عابد کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی اور اُسے کوئی تیس جوڑوں کی سلائی کا کام کرنا تھا۔

تیل لگا کر وہ بیٹی کا ماتھا ٹٹولنے لگی، جیسے جوئیں تلاش کر رہی ہو، اچانک اس کی نظر ملکہ کے سر میں اُس کے چند سفید بالوں پر پڑی۔ زینوں جیسے لرز سی گئی۔ گھبراہٹ میں اس نے ملکہ کے سر سے دو سفید بال نوچ لیے۔

"اوئی ماں!" ملکہ بلبلا کر جیسے جاگ گئی تھی۔

"بیٹی وہ مجھے کوئی جوں محسوس ہوئی تھی۔" زینوں نے بوکھلاہٹ میں بیٹی کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

"سفید بال......" خیر یہ عمر سفید بالوں والی تو نہیں تھی، ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ ملکہ کی عمر اب مزید گھر بٹھانے کی بھی نہیں ہے۔ چار برس کی عمر میں ملکہ کی منگنی کر کے تو وہ اس قدر مطمئن ہو گئی کہ شادی کا خیال ہی نہیں آیا، اور اب اسے محسوس ہوا کہ جیسے ملکہ بہت بڑی ہو گئی ہے۔ اسے ملکہ کا بوجھ اپنی چھاتی پر پہلی بار محسوس ہو رہا تھا۔

"بیٹی یہ نصیبن آپا نہیں آئیں کئی دنوں سے؟ جیسے وہ مدتوں سے ان کی آمد کی منتظر تھی اور نصیبن کے نام سے ہی ملکہ شرما گئی۔ نصیبن کا بیٹا جمیل ایک مقامی اسکول میں ماسٹر تھا اور بچپن ہی سے ملکہ جمیل سے منسوب تھی۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا جمیل سے اس کا پردہ تھا مگر پھر بھی محلہ میں کہیں نہ کہیں اس کا سامنا ہو ہی جاتا تھا۔

زینوں نے کنگھی کر کے ایسی کس کر چوٹی باندھی کہ ملکہ کے بال تک کھنچ گئے، پھر یہی تیل بھرے ہاتھ اس نے ملکہ کے منہ پر پھیر کر منہ چمکا دیا۔ پیار سے بیٹی کی پیشانی کو چوما۔ اسے ملکہ پر بے اختیار پیار آ گیا تھا۔ مگر عین اسی لمحے کھٹ سے کوئی چیز اسے اپنے اندر ٹوٹتی محسوس ہوئی۔ پھر خود کو یہ سوچ کر تسلی دی کہ میں کل ہی نصیبن آپا کے یہاں جاؤں گی۔ پچھلے چھ مہینے میں وہ ایک دفعہ بھی نہیں آئیں۔ مگر پہلے سیٹھ صاحب کے یہاں کپڑے دے دوں۔"

زینوں چٹائی پر بیٹھ کر جلدی جلدی مشین چلا رہی تھی، اب رات کو اسے ٹھیک سے دکھائی بھی نہیں دیتا تھا۔ کوئی

18 برس سے مشین کی ٹک ٹک اور اس کا ساتھ تھا۔ صبح اُس نے کپڑوں کی گٹھڑی بنائی ٹوپی والا برقعہ پہن کر سیٹھ صاحب کے گھر چل دی۔

''سلام بیگم صاحبہ! یہ دیکھیں اس قمیض پر میری ملکہ نے گوٹے کا کام کیا ہے۔ کتنا خوبصورت ہے میری ملکہ کے ہاتھ میں بہت صفائی آ گئی ہے نا' بیگم صاحبہ!'' وہ آپ ہی آپ تعریف کیے جا رہی تھی۔

''ہاں اچھا ہے......'' بیگم صاحبہ نے بس اتنا ہی کہا کہ کہیں زیادہ تعریف سے معاوضہ نہ بڑھانا پڑے۔

''اور ہاں! پیسے پھر لے جانا۔''

یہ امیر لوگوں کے یہاں کیا مسئلہ ہوتا ہے کہ کبھی بھی وقت پر پیسے نہیں دیتے اور غریب کی ضرورت پھر کا انتظار نہیں کرتی' اس کے لب ہلتے ہلتے رہ گئے تھے۔

یہاں وہاں سارے گھر میں جہیز کا سامان پھیلا پڑا تھا۔ فرج T.V صوفہ سیٹ' کمرہ بھرا ہوا تھا اور ابھی خریداری جاری تھی۔

''میں ملکہ کے لیے بھی اچھا جہیز بنا سکتی ہوں۔''

اس نے سوچا ہی تھا کہ جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔ اس کے قدم گھر کے بجائے آپا نصیبن کے گھر کی طرف جا رہے تھے۔

''نصیبن آپا اتنے دن ہو گئے تم نے پلٹ کر اُدھر رخ بھی نہیں کیا ملکہ تو تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔'' اپنے سارے گلے شکوے ایک ہی سانس میں کر ڈالے مگر آپا نصیبن کا رویہ کچھ بدلہ بدلہ سا لگا۔

''نصیبن وہ سیٹھ صاحب کی بچی کا بیاہ ہو رہا ہے۔''

''اُسی منجھلی بیٹی کا' جو ملکہ سے کوئی سال بھر چھوٹی ہے نا۔'' زینوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح خود اپنے منہ سے شادی کی بات کرے جبکہ نصیبن اب بھی بالکل خاموش تھی۔

''آپا وہ جمیل کہاں ہے' نظر نہیں آ رہا ہے۔'' اُس نے بڑی محبت سے ہونے والے داماد کے بارے میں پوچھا تھا۔

نصیبن آپا بولیں۔

''وہ آج کل بہت پریشان ہے زینوں اسے پانچ



ہزار روپوں کی سخت ضرورت ہے۔ اگر اسے یہ رقم نہ ملی تو......!'' وہ پھر خود ہی خاموش ہوگئی۔

''پانچ ہزار! یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔'' زینوں نے دل ہی دل میں سوچا تھا اور پھر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ تقریباً مایوس ہوکر گھر آ گئی۔

زینوں کے تھکے تھکے اداس انداز سے ملکہ کانپ گئی

''اماں!'' ملکہ نے سوالیہ انداز میں پکارا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کچھ پوچھ سکتی۔ ماں کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اُسے نصیبن آپا کی بے رخی سے بہت دکھ پہنچا تھا۔

ملکہ جلدی سے پانی کا گلاس لے آئی۔ ماں کا جی ذرا ٹھنڈا ہوا تو وہ خود ہی بڑبڑانے لگی۔

''جمیل کو پانچ ہزار کی سخت ضرورت ہے اور پھر کھل کر نصیبن آپا کی بے رخی بھی بتا دی اور اس لمحے ملکہ جیسے سفید پڑ گئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بلّو ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اُس کا جی چاہا وہ ماں کو بتا دے کہ نصیبن آپا جمیل کا بیاہ ہیڈ ماسٹر کی بیٹی سے کر رہی ہے' پرسوں ہی تو بلّو نے اسے یہ خبر دی تھی جس پر اس نے قطعی اعتبار نہیں کیا تھا۔ مگر وہ اپنے جی کا بوجھ ہلکا کر کے ماں کو مزید دکھ دینا نہیں چاہتی تھی۔ وہ خود بھی ماں کی بے بسی پر رو دی۔

زینوں کی جیسے راتوں کی نیند حرام ہوکر رہ گئی تھی اور پھر اگلے ہفتے نصیبن آپا آ گئیں' زینوں تو جیسے کھل اٹھی مگر یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ نصیبن آپا نے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ جمیل کا بیاہ ہیڈ ماسٹر کی بیٹی سے کرنا چاہ رہی ہیں۔

''کیا بتاؤں بہن سخت مجبوری ہے۔ وہ بیٹی کو پانچ ہزار نقد دے رہے ہیں۔ میرے بچے کی ضرورت بہت اہم ہے اور اس کے سوا چارہ نہیں۔''

''تم سیٹھ عابد سے کیوں نہیں کہتیں' آخر عمر دین نے اُس کی جان بچائی تھی۔''

''عمر دین۔'' زینوں کو شدت سے ملکہ کا باپ یاد آ گیا۔

''ٹھیک ہے بہن تم تھوڑے دن اور انتظار کرلو۔''

''میں بات کروں گی۔ مجھے تو خیال ہی نہیں آیا۔ سیٹھ عابد انکار نہیں کرینگے۔'' وہ جیسے مطمئن ہوگئی۔

ان کی یہ آہستہ آہستہ ہونے والی گفتگو بھی ملکہ نے صاف سن لی تھی۔ اس نے کرب سے ہونٹ کاٹ لیے' آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''جمیل......'' اس کے لب ہل کر رہ گئے' ہنستی مسکراتی ملکہ ایک دم خاموش ہوگئی تھی ماں خود بھی بہت دکھی تھی۔ زینوں سیٹھ صاحب کے پاس گئی۔

''صاحب وہ میں ملکہ کا بیاہ کرنا چاہتی ہوں۔''

''بہت خوب ماشاءاللہ ضرور کرو کب کرو گی؟''

''بیگم ملکہ کے لیے کوئی بہت اچھا سا جوڑا بنانا۔''

''صرف جوڑا......سیٹھ سے کہہ دے کہ جوڑا نہیں وہ پانچ ہزار۔'' زینوں کے دل نے آواز دی۔

مگر سیٹھ صاحب تو فوراً کھڑے ہوکر چل دیے۔ کوئی ملنے والا آ گیا تھا۔

وہ گھر آئی تو ملکہ کی سوجھی آنکھیں دیکھ کر اس کی ممتا تڑپ کر رہ گئی' آج اسے اپنی جھگی بھی بہت پرانی نظر آ رہی تھی۔ کیا رکھا ہے اس میں' ایک چارپائی' ایک چٹائی' سلائی کی مشین' دو بکسے اور کھانے پینے کے کچھ برتن' اُسے پانچ ہزار تو کیا پانچ پیسوں میں بھی کوئی نہ خریدے۔ اس نے حقارت سے جھگی پر نظر ڈالی تھی۔

زینوں کو یاد آیا۔ اسی جگہ وہ عمر دین کی دلہن بن کر آئی تھی تو اپنے گھر کے تصور سے کیسی خوش تھی۔ تب اُسے یاد آیا سیٹھ صاحب نے سوائے سلائی کی مشین اور عمر دین کے علاج پر خرچ ہونے والی رقم کے کیا دیا' کچھ بھی تو نہیں دیا۔ تو پھر آج وہ عمر دین کی زندگی کی قیمت کا مطالبہ کرے گی۔ وہ اپنا آنچل پھیلا دے گی نہیں وہ سیٹھ صاحب کے پاؤں پکڑے گی۔

''نہیں نہیں...... میں کچھ بھی نہیں کروں گی۔ میں شہید کی بیوہ ہوں۔''

''میں اکڑ کے سیٹھ صاحب کو یاد دلاؤں گی کہ عمر دین نے اُن کی جان بچانے کی خاطر خود اپنے سینے پر گولی کھائی تھی۔ اگر عمر دین آڑے نہ آجاتا تو قتل پر حملہ کرنے والے غنڈوں کا نشانہ خطا نہ جاتا' ایک ماہ زخمی حالت میں رہ کر عمر دین دو برس کی ملکہ کے ساتھ اسے تنہا چھوڑ گیا تھا۔

ہاں سیٹھ صاحب نے عمر دین کے علاج میں کوئی کسر تو نہیں چھوڑی تھی مگر یہ تو ان کا فرض تھا۔ اس کے علاوہ یہ مشین خرید کر دی تھی تو ہمیشہ اپنے کپڑے سستے ہی سلواتے تھے۔"

ملکہ کئی دنوں سے چپ چپ تھی۔ ماں کی پریشانی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور ملکہ کو دیکھ کر تو اسے اور بھی دکھ ہوتا تھا۔

"بیٹی میں صبح سیٹھ صاحب کے پاس جاؤں گی۔" اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی کہہ دیا اور ملکہ جانتی تھی کہ وہ کیوں جائے گی۔

"ٹھیک ہے میں کل ہر حال میں سیٹھ صاحب سے بات کروں گی اور اگر انہوں نے انکار کر دیا تو...... تو...... تو میں زہر کھا لوں گی۔" دل میں پکا ارادہ کیا۔ مگر میری ملکہ کا کیا بنے گا؟" اس نے تڑپ کر سوچا۔

"لیکن میں جیتے جی ملکہ کا جنازہ بھی نہیں دیکھ سکتی۔"

"سیٹھ صاحب! جی وہ ملکہ کے جمیل کو پانچ ہزار روپوں کی اشد ضرورت ہے۔ میں پانچ ہزار جہیز میں دے دوں تو میری بچی کا گھر آباد ہو جائے گا۔ جی وہ اگر آ آ آپ پ......"

"پانچ ہزار......!" سیٹھ صاحب یوں چونکے جیسے زینوں دنیا کے کسی خزانے کا ذکر کر رہی ہو۔

"سیٹھ صاحب جی! عمر دین نے آپ کی جان بچاتے ہوئے شہادت پائی۔"

زندگی میں پہلی بار اُس نے یہ احسان جتا ہی دیا۔ صاحب میرے عمر دین۔

"ٹھیک ہے زینوں' مگر اس کا یہ مطلب نہیں' پہلے ہی کئی ہزار اس کے علاج پر میں خرچ کر چکا ہوں۔"

اس نے بڑھ کر سیٹھ صاحب کے پاؤں پکڑ لیے اُسے صرف ایک ہی حل نظر آ رہا تھا۔ مگر وہ ایک ہزار سے زیادہ دینے پر کسی طرح رضا مند نہیں ہو رہے تھے۔ اب جیسے کے غریب کی غیرت کو جوش آ گیا۔

"سیٹھ میں تھوکتی ہوں تمہارے پیسوں پر...... میرا عمر دین جان سے گیا' صرف تمہاری خاطر' تم نے اپنی بیٹی کو چار لاکھ کا جہیز دے دیا اور اب تمہیں خدا سمجھے سیٹھ۔" وہ تقریباً چیخنے لگی۔ پھر جلدی سے برقعہ لیا اور گھر کی طرف چل دی۔

زینوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"عمر دین......" اس نے تڑپ کر پکارا تھا۔

اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ابھی ابھی وہ بیوہ ہوئی ہو۔

"اس کائنات میں میرا کون ہے۔ میرا کوئی سہارا نہیں' غریب کا صرف خدا ہوتا ہے مگر خدا!"

"اے خدا! مجھے معاف کر دینا میں تیری مادہ پرست دنیا کے سامنے آج...... ہار گئی ہوں۔" وہ مستقبل بڑبڑائے جا رہی تھی' اس نے جیب سے نیلے تھوتھے کی پڑیا نکالی تھی۔

"ہاں! یہ ٹھیک ہے میں مر جاتی ہوں۔ مگر میری بچی! میری ملکہ! میں آج آخری بار اُسے پیار کروں۔"

گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ "ملکہ......" ماں نے روتے ہوئے پکارا۔

"ملکہ میری بچی! غریب کی ملکہ تو صرف نام کی ملکہ ہوتی ہے۔ وہ بولے جا رہی تھی۔ "ملکہ......" وہ زور سے چیخی تھی۔

اُس کی ملکہ گھر کی اکلوتی چارپائی پر گہری نیند سو رہی تھی۔ ابدی نیند! آنکھیں جیسے ابلی ہوئی تھیں رنگ نیلا پڑا ہوا تھا۔

"ملکہ میری بچی! میری جان! یہ تو نے کیا کیا ملکہ یہ تو نے کیا کیا؟" پھر اُس کے آنسو ایک دم تھم سے گئے۔ وہ خاموشی سے اٹھی ٹین کا بکس کھولا اور اپنا پچیس برس پرانا عروسی دوپٹہ نکالا ستے ہوئے چہرے بنجر آنکھوں کے ساتھ ملکہ کے مردہ جسم کے پاس آ ئی اُس کے سر پر وہ گوٹے والا سرخ دوپٹہ ڈالا اور آگے بڑھی' بڑھ کر ملکہ کی پیشانی کو چوما اپنی آنکھیں بند کیں اور آہستہ آہستہ (ہولے ہولے) سسکنے لگی۔

اور پھر جنازے کے سرہانے چٹائی پر بیٹھ کر یوں پھوٹ پھوٹ کر رو دی جیسے ابھی ابھی اکلوتی بچی کو رخصت کر کے بیٹھی ہو۔

☆☆......☆☆

کاہے کو دنیا میں آئی

عکاشہ سحر ایمان کا خیال

داستاں گو کی آنکھ بھر آئی
کوئی کردار مرگیا ہے کیا؟

ڈاکٹر طارق محمود آکاش

تقدیر بنانے والے تُو نے کمی نہ کی
کسی کو کیا ملا مقدر کی بات ہے

ثمینہ نے تیزاب پی لیا ہے۔ اُسے لاہور لے گئے ہیں۔ ہر زبان پر یہی بات تھی۔ جس کو دیکھو وہ یہی بات کر رہا تھا۔

''ارے کتنی لاڈلی تھی۔ ماں باپ کی مگر ماں کے مرنے کے بعد تو جیسے اس کے نصیب بھی مرگئے تھے۔ اگر باپ سوتیلا ہوتا تو بات سمجھ میں آتی تھی مگر یہ کیا...... سگے باپ نے ایسا سلوک کیا...... توبہ توبہ......'' اور پھر سب خود ہی کہنے لگ جاتے۔

''اچھا ہی کیا بے چاری نے...... اس عذاب جیسی زندگی میں دھکے کھانے سے بہتر ہے مرجانا۔''

☆......☆......☆

لیاقت اور کوثر کے ہاں پہلی اولاد ثمینہ پیدا ہوئی اور بعد میں رزاق...... دونوں بہت خوش تھے۔ بچوں کی ہر خوشی ہر خواہش پوری ہوتی تھی۔ بہت پیار کرتے تھے ایک دوسرے سے' ہمیشہ بچوں کی خوشیوں کے لیے دعا مانگنے کو کہتے' کوثر اکثر کہا کرتی۔

''لیاقت اگر میں دنیا سے چلی گئی تو میرے بچوں کا خیال رکھنا۔'' مگر جب لیاقت یہ بات کرتا تو کوثر اسے بہت کوستی کہ ایسی بات زبان پر بھی مت لایا کرو۔ میری عمر بھی آپ کو لگ جائے۔

مگر شاید قدرت کو ایسا ہی منظور تھا تیسرے بچے کی پیدائش کے وقت کوثر اور بچہ دونوں ہی اس دنیا کو چھوڑ گئے۔ ڈاکٹرز کی بہت کوشش کے باوجود بھی وہ زچہ بچہ کو بچا نہ پائے۔

☆......☆......☆

وقت کا کام ہے چلتے رہنا' اور وہ چلتا ہی گیا۔ لوگوں نے بہت بولا کہ بچے چھوٹے ہیں دوسری شادی کرلو' لیاقت نہ مانا۔ مگر جب ثمینہ دس سال اور رزاق سات سال کا تھا تو ایک روز لیاقت کے ساتھ ایک عورت گھر میں داخل ہوئی۔ ثمینہ کے سوال پر اس کے ابا نے جواب دیا۔

''یہ تمہاری اماں ہے۔''

لیاقت نے یہی کام اگر اس نے کچھ سال پہلے کرلیا ہوتا تو بچے یقیناً اب تک سمجھوتہ کرچکے ہوتے' مگر اب وہ سمجھدار ہوچکے تھے۔ اب اُن کو یہ حقیقت اتنی جلدی سمجھانا آسان نہ تھا۔ ثمینہ خاموش تو ہوگئی تھی' مگر اس کے لیے یہ قابل قبول بات نہ تھی جبکہ رزاق ابھی ناسمجھ تھا۔ جب نئی اماں عذرا بی بی کسی بھی کام

کے سلسلے میں اسے باہر دوکان پر بھیجتی تو وہ ضرور جاتا‘ مگر ثمینہ ہمیشہ اکھڑی سی رہتی تھی۔

پہلے پہل تو ابا اپنی پرانی روٹین کے مطابق دونوں بچوں کے لیے چیزیں وغیرہ لے کر آتا۔ اسکول فیس‘ ٹیوشن فیس‘ رکشے کا کرایہ ٹائم پر مل جاتا تھا‘ مگر پھر آہستہ آہستہ کئی کئی دن اس جائز ضرورت کے لیے بھی بچوں کو ابا کی منتیں کرنا پڑتیں‘ اُس روز اسکول میں پارٹی کا اعلان ہوا تھا‘ جس کے لیے ہر اسٹوڈنٹ کو 200 روپے جمع کروانا تھے۔ ثمینہ نے جب رزاق کے ذریعے ابا کو بولا تو عذرا بی بی نے صاف منع کر دیا کہ ایسی فضولیات کے لیے ایک روپیہ بھی نہیں مل سکتا۔ اور اس طرح ثمینہ کو پہلی ضرب لگا دی گئی تھی۔

☆......☆......☆

شادی کو جب کچھ ماہ گزر چکے اور عذرا بہت جلد



ماں بننے والی تھی تو لیاقت تو بس اُس کے آگے پیچھے پاگل ہوا پھرتا۔ کبھی فروٹ، کبھی دودھ، کبھی کچھ کبھی کچھ آرہا ہے۔ اور عذرا بیگم تو بس بیڈ سے ایک قدم بھی نیچے نہیں رکھتی تھیں، ثمینہ کو مجبوراً ہر کام کرنا پڑ رہا تھا۔ اب وہ کھانا وغیرہ تو سوتیلی ماں کے روم میں پہنچا دیتی، مگر آج تک اُس نے کبھی عذرا کو نہ دل سے قبول کیا تھا اور نہ ہی کبھی اس سے زیادہ بات کی تھی، البتہ رزاق عذرا کی ایک آواز پر اُس کے پاس ہوتا تھا۔

اور پھر ایک روز عذرا نے ایک بہت خوبصورت بچی کو جنم دیا۔ لیاقت بہت خوش تھا۔ رزاق بھی چھوٹی بہن کو گود میں اٹھائے پھرتا۔ مگر ثمینہ نے اس کو دیکھا تک نہیں تھا۔ لیاقت کا خیال تھا کہ گھر میں چھوٹا بچہ ہوجائے گا تو ثمینہ خود ہی سمجھ جائے گی اور خوش دلی سے عذرا اور بچے کو قبول کرلے گی مگر ایسا نہ ہوسکا۔

ثمینہ کا خالہ زاد کزن خالد شروع سے ثمینہ کو پسند کرتا تھا، دونوں ایک ہی کلاس میں پڑھ رہے تھے۔ رزاق ثمینہ اور خالد صبح ایک ساتھ اسکول جاتے تھے، دونوں پہلے ثمینہ کو اسکول چھوڑتے کیونکہ ثمینہ کا اسکول تھوڑا آگے تھا۔ اور پھر وہ واپس اپنے اسکول آجاتے۔ خالد نے اب تک کبھی ثمینہ سے اپنے دل کی بات نہ کی تھی، اُس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ ابھی اس بات کے لیے بہت ٹائم پڑا ہے مگر وہ ہر طرح سے ثمینہ کا خیال رکھتا تھا۔

رزاق کی چھوٹی بچی کا نام نیلم رکھا گیا۔ نیلی آنکھوں والی نیلم واقعی میں بے حد حسین تھی، اسکول سے واپس آکر رزاق تو بس اُسے ہی اٹھائے پھرتا جبکہ ثمینہ اسکول سے آکر دوپہر کا کھانا کھا کر تھوڑا ریسٹ کرتی اور پھر سام کے لیے کھانا بناتی، ساتھ ساتھ وہ ہوم ورک بھی کرتی جاتی، اور جو کام رہ جاتا وہ رات کو مکمل کرلیتی، ابا کا رویہ اس کے ساتھ اب پہلے جیسا نہ تھا اُس کے لیے جیسے کل کائنات عذرا اور نیلم ہی تھے۔

وقت کے ساتھ زندگی کا سفر بھی جاری تھا۔

ثمینہ نے اب میٹرک کرلیا تھا، جبکہ رزاق آٹھویں کلاس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ عذرا چار بچوں کی ماں بن چکی تھی، ثمینہ نے کبھی بھی آج تک اُس سے کلام نہ کیا تھا، اور نہ ہی کبھی لیاقت نے کوشش کی تھی کہ دونوں کے مابین سمجھوتہ کروادیا جاتا۔ عذرا کا رویہ انتہائی خشک رہتا، زیادہ تر کام اسے ہوئے ملتے، جو باقی رہ جاتے وہ کرلیتی رزاق ماں باپ کی عدم توجہ کے باعث کافی حد تک آوارہ گرد بن چکا تھا۔ اسے گھر اور کام سے دلچسپی برائے نام ہی تھی جبکہ لیاقت کی نظر میں تو شاید یہ تھا ہی نہیں کہ ثمینہ اور رزاق بھی اُس کی اولاد ہیں۔

☆......☆......☆

خالد بی اے میں پڑھ رہا تھا ساتھ ساتھ اُس نے ایک اکیڈمی جوائن کررکھی تھی۔ جس میں وہ بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا، جس سے اس کے پڑھائی کے اخراجات پورے ہورہے تھے۔ اُس نے جب ماں کو ثمینہ سے شادی والی اپنی خواہش بتائی تھی تو ماں کو اپنی بہن بہت یاد آئی تھی۔ اور پھر ایک روز کافی عرصے بعد زرینہ بی بی اپنی بہن کے گھر گئی تھیں تو عذرا نے انتہائی روکھے پن سے ان کا استقبال کیا تھا۔ ثمینہ اپنی خالہ سے مل کر بہت خوش ہوئی تھی۔ اور اپنے کمرے میں لے جا کر اُن کے لیے چائے وغیرہ تیار کی تھی۔ زرینہ نے ثمینہ سے گلہ بھی کیا تھا کہ تم کبھی اپنی خالہ کے گھر کیوں نہیں آتی ہو اور ساتھ پوچھا تھا کہ عذرا کا رویہ تم لوگوں کے ساتھ کیسا ہے؟

ثمینہ کوئی بھی بات عذرا کے خلاف نہ کی تھی بلکہ خالہ کا دھیان کسی اور طرف کردیا تھا۔ کافی دیر بیٹھنے کے بعد خالہ اپنے گھر لوٹ گئی تھیں اور ساتھ ہی تہیہ کرلیا تھا کہ وہ جلد ثمینہ کو اپنے گھر کی بہو بنا کر لے جائیں گی۔

☆......☆......☆

خالد کو بی اے کے بعد ایک فیکٹری میں جاب مل گئی تھی تو زرینہ دوبارہ سے لیاقت کے ہاں گئی تھی اور اس سے ثمینہ کا رشتہ طلب کیا تھا۔ ایک ہی محلے میں رہنے کے باوجود بھی ایک عرصہ ہوا لیاقت زرینہ کے ہاں نہ گیا تھا۔ ایک لمحے کو لیاقت کو یاد آیا کہ اُس کی بیٹی جوان ہوچکی ہے۔ ورنہ وہ تو شاید اپنی ذمہ داری کو خیر

بھول ہی چکا تھا۔

جب خالد کا رشتہ آیا تو اُس نے ہاں کر دی زرینہ خوشی خوشی اپنے گھر لوٹ گئی۔ مگر جب عذرا کے علم میں یہ بات آئی تو اسے بہت تکلیف پہنچی کہ اب گھر کے کام وغیرہ کون کرے گا۔ اب اُس کی ذمہ داریاں بڑھ جائیں گی۔ مگر جب اُس نے سوچا کہ ثمینہ کا رویہ شروع دن سے اُس کے ساتھ کیسا ہے تو اُس نے بہتر یہی جانا کہ ثمینہ کو اس گھر سے رخصت کر دیا جائے۔

☆......☆......☆

ثمینہ کو انتہائی سادگی کے ساتھ خالد کے ساتھ نکاح کے بندھن میں باندھ دیا گیا۔ خالد کو اپنے بچپن کی ساتھی بچپن کا پیار مل جانے پر بہت خوشی ہوئی۔ سالہا سال کے بعد آج شاید ثمینہ کے چہرے پر ہنسی آئی تھی۔

زرینہ اور خالد نے ثمینہ کو ماں جیسا پیار دیا تھا۔ ثمینہ اپنے سارے غم بھول گئی وہ اپنی نئی زندگی سے بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

خالد اور زرینہ ثمینہ کا بہت خیال رکھتے' زرینہ نے اسے کبھی ماں کی یاد نہ آنے دی۔ دوسری طرف عذرا کو اب بہت مشکل محسوس ہوتی' گھر کے سارے کام اُسے خود کرنا پڑ رہے تھے۔

خصوصاً برتن دھونا اِس کے لیے عذاب تھا' ثمینہ کے ہوتے اس نے برتن دھونے والا کام ہرگز نہ کیا تھا۔ رزاق کو لیاقت نے کسی فیکٹری میں ملازم لگوا دیا تھا۔ جس سے گھر کے اخراجات کے لیے معقول پیسے مل جاتے تھے۔

ثمینہ کی زندگی خوش و خرم ہوگئی تھی۔ بن ماں کی بچی کی شادی کو ڈیڑھ مہینہ ہی گزرا تھا مگر اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس نے ڈیڑھ ماہ میں پوری زندگی جی لی ہو' مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ اُس صبح کام پر جاتے ہوئے خالد ثمینہ کو بول رہا تھا۔

''جب ہم سب اسکول جایا کرتے تھے میں تب سے تم سے پیار کرتا ہوں' اس کے بعد جب تم نے اسکول چھوڑ دیا تو میرا بہت جی چاہتا کہ تم آگے بھی مزید پڑھو مگر میں کچھ نہ کر سکا۔ میرا دل بہت کڑھتا مگر میں خاموش رہا مگر اب میں تمہیں ہر وہ خوشی دینا چاہتا ہوں جس جس پر تمہارا حق تھا' مگر تمہیں نہ مل پائیں۔ میرے خدا نے چاہا تو میں تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا۔''

اور پھر اُسی سہ پہر کے بعد جب ثمینہ اور زرینہ شام کا کھانا بنانے میں مصروف تھیں تو خالد کی لاش گھر آ گئی تھی۔ ہوا کچھ یوں کہ فیکٹری میں خالد کا ہاتھ مشین میں آنے سے کٹ گیا تھا اور خون اتنی شدت سے بہہ نکلا کہ اسپتال جانے سے پہلے ہی اُس نے دم توڑ دیا۔

ثمینہ کی تو دنیا ہی لٹ چکی تھی۔ چند روز کی خوشیوں کے بعد زندگی میں ایک دفعہ پھر اندھیرے پھیل گئے۔ دوسرا ظلم یہ ہوا کہ جوان بیٹے کی لاش سے لپٹی زرینہ بھی بیٹے کے ساتھ ہی دنیا چھوڑ گئی۔ گھر سے دو جنازے اٹھے تو قیامت آ گئی۔ ہر آنکھ اشکبار تھی' گھر کے در و دیوار بھی ڈھائیں مار مار کر رو رہے تھے۔ ثمینہ کو کچھ ہوش نہ تھا کہ وہ کہاں ہے۔

☆......☆......☆

ثمینہ ایک مرتبہ پھر عذرا کے رحم و کرم پر تھی۔ اسے بنا معاوضہ کے نوکرانی مل گئی تھی۔ ثمینہ دن رات کام کرتی رہتی' نیلم ایک حاکم کی طرح اس پر حکم چلاتی' بہن سے کپڑے استری کروانا یہاں تک جوتے تک صاف کروانا نیلم اپنا فرض سمجھتی تھی جبکہ ثمینہ اپنی پرانی روٹین پر قائم تھی۔ وہ ہر کام کرتی مگر عذرا سے ہم کلام بھی نہ ہوئی اپنے بھائی رزاق کی چیزوں کا خاص خیال رکھتی۔ اس کے کمرے کی روزانہ صفائی کرتی۔ اُس کے کپڑے پریس کرتی' مگر وہ بھی پہلے کی طرح اپنے کام میں مصروف رہتا۔ کبھی بہن کے دکھ درد نہ جانے......

☆......☆......☆

خالد کو مرے چھ ماہ ہو گئے تھے۔ ثمینہ اس کی یاد میں پل پل روتی اور اپنی تقدیر سے گلہ کرتی۔

''اگر مجھے رُلانا ہی تھا تو چار دن کی خوشی کیوں دی۔ مجھے غم کے اندھیرے میں دھکیلنا تھا تو روشنی کی کرن کیوں دکھائی' میری آنکھوں سے ساون ہی برسنا تھا تو میرے آنگن میں بہار کیوں آئی۔''

وہ دسمبر کی ٹھٹھری رات تھی۔ باہر شدید بارش جاری تھی۔ ثمینہ کو شدید بخار تھا۔ اُس کا جسم تپ رہا تھا۔ کسی کو کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کس حال میں ہے۔ اُس کا دل گھبرایا تو وہ باہر برآمدے میں آکر بیٹھ گئی' بجلی چمک رہی تھی۔ اس کے کانوں نے سنا کہ لیاقت عذرا سے کہہ رہا تھا۔

''ثمینہ کے لیے ایک رشتہ آیا ہے۔ آدمی فیکٹری میں اس کے ساتھ کام کرتا ہے۔ اُس کے تین بچے ہیں۔ بیوی تھوڑا عرصہ پہلے فوت ہو چکی ہے۔ اب ثمینہ کے لیے کسی کنوارے لڑکے کا رشتہ ملنا ممکن نہیں۔ میرا خیال ہے اس کا نکاح کر دینا چاہیے۔ اور پھر اُس کی کوئی ڈیمانڈ بھی نہیں ہے۔ اپنا گھر ہے تین بچے ہیں ایک بوڑھی ماں ہے گھر میں کھانا پکانے والا کوئی نہیں ہے۔''

☆......☆......☆

اور پھر ثمینہ کا نکاح وحید سے کر دیا گیا۔ اُس نے بنا احتجاج کیے یہ حکم قبول کر لیا تھا۔ وحید ویسے تو اچھا انسان تھا مگر وہ دمے کا مریض تھا' اکثر اس کا سانس اُکھڑ جاتا تھا۔ اس نے گویا پورا میڈیکل اسٹور گھر میں بنا رکھا تھا۔ ہر وقت دوائیوں کے سہارے چل رہا تھا۔ بچے بہت پیارے تھے تینوں اسکول جاتے' بوڑھی ماں کی نظر بالکل تھوڑی سی تھی۔ وہ بستر پر ہی رہتیں' بچے دادی کے ساتھ زیادہ اٹیچ تھے۔ وحید نے ثمینہ سے کہہ رکھا تھا کہ اسے جس چیز کی بھی ضرورت ہو وہ بلا جھجک کہہ سکتی ہے' مگر اُس نے کبھی کوئی ڈیمانڈ نہ کی تھی۔

☆......☆......☆

ہائے ری قسمت' ہونی ہو کر رہتی ہے۔ کسی کو کیا خبر تھی کہ ایسا ہو جائے گا۔ ثمینہ خاموشی سے زندگی کے دن پورے کر رہی تھی کہ ایک رات وحید کو کھانسی کا جان لیوا دورہ آیا اور پلک جھپکتے ہی وہ دنیا چھوڑ گیا۔ ابھی اس کی شادی کو ایک سال بھی پورا نہ ہوا تھا ہر ایسے موقع پر جاہل عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ یہ بات سوچے اور کہے بنا نہیں رہ سکتیں کہ یہ لڑکی ہی منحوس ہے' پہلے ایک جوان شوہر کو کھا گئی اور اب ایک صاحبِ اولاد بچوں کے باپ کو لے گئی۔ ہر کوئی اُسے ہی قصوروار ٹھہرا رہا تھا اور ثمینہ اپنے خدا سے پوچھ رہی تھی۔

''کاہے کو دنیا بنائی۔''

☆......☆......☆

ثمینہ ایک مرتبہ پھر لٹی پٹی باپ کے دروازے پر آ چکی تھی کیونکہ بوڑھی ماں نے اپنے بچے کے مرنے کے بعد منحوس ثمینہ کے سائے کو بھی گھر سے نکل جانے کا بول دیا تا۔ اب تو عذرا نے بھی نیلم کو ثمینہ سے دور رہنے کا مشورہ دے دیا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق بھی ثمینہ منحوس ہے۔ یہ جس کے ساتھ لگتی ہے وہ زندہ نہیں رہتا۔

ثمینہ نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اب کبھی بھی شادی نہیں کرے گی' خود کسی کے گھر میں کام کر لیا کرے گی اور اپنی روزی روٹی کا بندوبست خود کرے گی۔ مگر وہ باپ پر بوجھ نہ بنے گی۔ رزاق اچھا خاصا کمانے لگ گیا تھا۔

مگر اس نے بھی خود کو ثمینہ سے دور کر لیا تھا یعنی کہ ثمینہ کا سگا بھائی بھی یہ سمجھتا تھا کہ ثمینہ منحوس ہے۔ ثمینہ ویسے تو سب کچھ برداشت کر رہی تھی مگر اسے بھائی کا رویہ کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔

ایک روز جب ثمینہ گھر سے نکلی۔ اور دو تین گھروں میں جانے کی کوشش کی کہ شاید کوئی کام پر رکھ لے' مگر کسی نے بھی اسے اندر ہی نہ آنے دیا۔ محلے کا ایک آوارہ گرد تھا جس کا نام تو محبوب تھا مگر اسے سب 'لوبا' بولتے تھے۔

لوبا کا کام ہر وقت آوارہ پھرنا' شراب نوشی کرنا اور رات کو جوئے کے اڈے پر رہنا تھا' اُس نے جب ثمینہ کو گزرتے دیکھا تو دوست سے پوچھا کہ یہ کون ہے۔ تو اس نے بتایا کہ لیاقت کی بیٹی ہے۔ دو دفعہ شادی ہوئی دونوں دفعہ ہی اس کے شوہر مر گئے۔ تو لوبا کو سمجھ آ گئی یہ کون ہے۔ تو اُس نے اپنے ساتھی سے کہا۔

''دو شوہر تو اس سے شادی کے بعد مرے تھے مگر لوبا تو شادی سے پہلے ہی مر گیا ہے اس پر' اور اب اس

کو اپنا نہ بنایا تو میرا نام نہیں۔''
محبوب قسم کے آوارہ اور مسٹنڈے قسم کے لوگوں کو ناٹک کرنا تو خوب آتا ہے۔ اور پھر لُو با تو ماسٹر تھا اس سلسلے میں اُس نے بڑے پازیٹو طریقے سے ثمینہ کو حاصل کرنے کا پلان بنایا۔
اس نے نماز پڑھنا شروع کر دی مولوی صاحب اکثر اسے آتے جاتے نماز کی تلقین کیا کرتے تھے۔ پھر جب میاں جی نے لُو با کو مسجد آتے دیکھا تو وہ بہت خوش ہوئے کہ چلو اُن کی بات کا اثر تو ہوا لُو با پر......
مسلسل ایک ماہ تک وہ باجماعت نماز ادا کرنے مسجد آتا رہا اس دوران اُسے ثمینہ تو نظر نہ آئی مگر اس نے اپنے ساتھی کی ڈیوٹی لگا رکھی تھی کہ پتہ رکھے کہ ثمینہ کا کہیں رشتہ نہ ہو جائے۔ مگر اب ایسی کوئی بھی بات نہ تھی۔
ایک روز جب ظہر کی نماز کے بعد میاں جی لُو با سے کہہ رہے تھے کہ ''وہ بہت خوش ہیں کہ تم نے نماز شروع کر دی ہے اب تم باقاعدگی سے قرآن کی تعلیم بھی لینا شروع کر دو تو پہلے تو لُو با نے میاں جی کو مکمل شیشے میں اتارا اُن کا اعتماد حاصل کیا اور پھر تین دن کے بعد اپنے مطلب کی بات زبان پر لے آیا۔
''گھر سنبھالنے والا کوئی نہیں ہے' میں اب سدھر گیا ہوں' میں چاہتا ہوں کہ میرا گھر آباد ہو جائے' میں کام کروں اور وہ گھر سنبھالے۔'' اور جب میاں جی نے اُس سے پوچھا کہ کوئی ایسی لڑکی ہے تمہاری نظر میں تو اس نے فوراً کہہ دیا۔
''لیاقت کی بیٹی ثمینہ...... جس کو سب منحوس کہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی زندگی میں ایک دفعہ پھر رونق آ جائے اور وہ آباد ہو جائے۔'' تو میاں جی کو یہ بات بہت اچھی لگی اور انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اس کے لیے پوری کوشش کریں گے۔
☆......☆......☆
ثمینہ محبوب سے شادی کے لیے راضی نہ تھی اور لیاقت بھی ایسا کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر چونکہ عذرا' رزاق اور نیلم تینوں ہی ثمینہ کو منحوس قرار دے چکے تھے اس لیے' انہوں نے بولا کہ جتنی جلدی ہو سکے اسے گھر سے نکال دینا چاہیے اور پھر میاں جی جو امام مسجد تھے پورا گاؤں اُن کی عزت کرتا تھا اُن کی بات ٹالی نہ جا سکی اور ایک دن بعد ہی محبوب کے ساتھ ثمینہ کا نکاح کر دیا گیا۔
ثمینہ خون کے آنسو بہاتی' لُو با کے ویران آنگن میں وقت کے ہاتھوں کٹی پتنگ کی طرح آ گئی نہ جانے اب وقت اُس کے ساتھ کیا کھیل کھیلنے والا تھا۔ یہ تو وقت ہی بتاتا جبکہ محبوب پہلی رات ہی نماز کو بھول کر شراب نوشی کر کے ثمینہ کو آنے والے وقت کے خطرات سے آگاہ کر چکا تھا۔
☆......☆......☆
اب تو ہر رات یہ معمول بن چکا تھا کہ محبوب کے دوست اُس کے گھر ہی آ جاتے اور رات گئے تک وہاں جوا چلتا رہتا۔ بے چاری ثمینہ پوری رات اُن آوارہ لڑکوں کے لیے چائے ہی بنا بنا کر تھک جاتی۔ اور پھر ایک رات ثمینہ کے لیے آسمان ہی سر پر آن گرا جب وہ کچن میں چائے بنا رہی تھی تو اُس کے کانوں میں آواز پڑی۔
''دیکھ لُو با میں جوئے میں تیری بیوی کو جیت چکا ہوں اب تو اسے اپنے ہاتھوں سے تیار کر دے کہ آج کی رات میں اُس کا شوہر ہوں ورنہ تجھے تو پتہ ہے کہ ہم جوئے میں جیتی ہوئی رقم ہر حال میں لے ہی لیتے ہیں' چاہے اُس کے لیے ہمیں خون ہی نہ کرنا پڑے۔''
ثمینہ کے تو جیسے کسی نے کانوں میں سیسہ انڈیل دیا ہو۔
اب اُسے انتظار تھا کہ آخر اُس کا شوہر اُسے کیا جواب دیتا ہے اور پھر جب لُو با نے کہا۔
''ارے ہم یاروں کے یار ہیں ہم بھی اپنی بات سے نہیں مکرے ہیں۔ اور جو چیز تو جیت چکا ہے وہ تیری ہی ہے۔''
یہ سن کر تو ثمینہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اُس نے اپنی پوری زندگی تو حالات سے سمجھوتہ کیا تھا مگر وہ اپنی عزت سے سمجھوتہ نہ کر سکی اور اس نے تیزاب پی کے اپنی جان دے دی تھی۔
☆☆......☆☆

تیسری دُکھی کہانی حیدر آباد سے

کس سے فریاد کریں

ڈاکٹر نزہت عباسی کا خیال

ایک حادثے میں اس کی المناک موت پر
ہر دل اُداس اور ہر آنکھ اشکبار تھی

فیضان حسین عثمانی

''ارے ارے دیکھو، وہ بچہ کھیلتے کھیلتے گر گیا ہے' جلدی اٹھاؤ اُس کو۔'' ایک ساتھ کئی دکانداروں نے دور سے دیکھ کر آوازیں لگائیں اور ایک دم کئی لوگ اُس طرف بھاگے' جہاں ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا اوندھے منہ گرا ہوا تھا۔ اُس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ لوگوں نے اُس کو اٹھانا چاہا مگر پیچھے ہٹ گئے وہ بچہ بجلی کے ٹوٹے ہوئے تار میں اُلجھ کر گرا تھا' اُس کو کرنٹ لگا تھا' پتہ نہیں زندہ بھی تھا یا نہیں فوراً بجلی کے محکمے والوں کو بلوایا گیا' جو کہ دو دن سے نہیں آرہے تھے جب سے تار ٹوٹا تھا پتہ نہیں اس وقت فوراً کیسے آ گئے انہوں نے علاقے والوں کے ساتھ بچے کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا۔

بچہ اسپتال پہنچتے پہنچتے تک دارِ فانی سے کوچ کر چکا تھا۔

☆......☆......☆

''ارے رانو دیکھ تو علی اب تک واپس نہیں آیا' اتنی دیر تو نہیں لگاتا' کھیل کود کر جلدی گھر آجاتا ہے۔' علی کی والدہ نے اپنی چھوٹی بیٹی سے کہا تھا۔

''ارے اماں بھیا آجائے گا تُو فکر نہ کر۔'' یہ کہہ کر وہ کھیل میں لگ گئی تھی۔ علی کی ماں کا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ اُس وقت اس کے والد بھی گھر پر موجود نہیں تھے۔ وہ کام پر گئے ہوئے تھے۔ علی روز کی طرح آج بھی کھیلنے باہر نکلا تھا' مگر وہ آج خاصی دیر ہو جانے کے باوجود لوٹا نہیں تھا جس کی وجہ سے اس کی ماں تشویش میں مبتلا تھی' علی اُن کے دل کا چین اور روح کا سکون تھا اور ہوتا بھی کیوں نہیں بڑی منت مرادوں کے بعد علی شادی کے چار سال بعد اُن کی گود میں آیا تھا۔ میاں بیوی اس کے لیے کون کون سے جتن نہیں کیے تھے ڈاکٹر پر ڈاکٹر ہوئے تو روحانی علاج بھی پیچھے نہیں رہے' ولیوں کے دربار میں بھی حاضریاں دیں تو اللہ کے سامنے بھی سجدہ ریز ہو کر گڑگڑا کر دعائیں مانگیں مگر بس اللہ کے یہاں دیر تھی اور پھر چار سال کے بعد علی نے اُن کے آنگن میں آنکھ کھولی تو دونوں میاں بیوی نے سینکڑوں نہیں ہزار نہیں لاکھوں بار اپنے رب کا شکر ادا کیا' اور پھر جب علی تین سال کا ہوا تو اللہ نے اُن کو رانو کی صورت میں ایک رحمت اور عطا کر دی 'اب رحمت اور اللہ کی نعمت دونوں موجود تھے' بیٹا بھی اور بیٹی بھی دونوں میاں بیوی اپنے رب کا جتنا بھی شکر ادا کرتے کم تھا وہ ہر وقت اپنے پاک پروردگار کا شکر ادا کرتے رہتے تھے کہ اللہ نے اُن کے سُونے آنگن

میں خوشی کے پھول کھلائے اُن کو اولاد کی دولت سے نوازا۔

سعید دن رات محنت کر کے اپنے بچوں کو اچھا پڑھانا اور اچھا کھلانا چاہتا تھا اور وہ اس کوشش میں کامیاب تھا ان دنوں اسکولوں کی چھٹیاں تھیں تو علی روزانہ باہر کھیلنے نکل جاتا تھا اب وہ بڑا ہو رہا تھا اس لیے ماں باپ نصیحت کرتے تھے مگر بے جا روک ٹوک یا پابندی نہیں لگاتے تھے۔

''ارے ارنو ناں اب تک علی آیا ہے اور نا ہی تیرے بابا آئے ہیں میرا تو دل ہی ڈوبا جا رہا ہے۔''

''ارے یہ بچہ کس کا ہے' آپ لوگ کون ہیں اس کی ڈیڈ باڈی کون وصول کرے گا۔'' ڈاکٹر نے کاغذی کارروائی مکمل کرتے ہوئے مجھ سے سوال کیا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب اس کے والد کو ایک بندہ لینے گیا ہے' اُس غریب پر تو قیامت گزر گئی ہوگی اسے کیا معلوم ہوگا کہ وہ جو صبح کام پر جا رہا ہے واپسی میں بیٹے کی ڈیڈ باڈی گھر لے کر جاؤں گا۔'' سعید کے پڑوسی انور نے روتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ بجلی والے نا اہل لوگ ہیں' ان کو انسانی جانوں کی پرواہ نہیں ہے تار ٹوٹے پڑے ہیں اُس کی اطلاع کتنی بار محکمے کو دی گئی مگر اُن کے کان پر جوں ہی نہیں رینگتی' اُن کی لاپروائی سے ایک معصوم کی جان چلی گئی۔'' یہ دکاندار احمد کی آواز تھی۔

اُسی وقت ایک پڑوسی دکاندار کے ساتھ سعید کی اسپتال میں آمد ہوئی تھی۔

''کیا ہوا تم مجھے اسپتال کیوں لائے ہو اور یار انور تم سب یہاں کیا کر رہے ہو۔'' سعید نے مجھے وہاں کھڑا دیکھ کر حیرانگی سے سوال کیا تھا۔ میں نے اُس کے لیے راستہ چھوڑا تو اُس کی نظر جب اپنے لختِ جگر علی کی لاش پر پڑی تھی وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا تھا۔

''میرے لال تجھے کیا ہو گیا تو صبح تک تو اچھا بھ



تھا۔‘‘ سعید کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ لوگوں نے علی کے باپ کو سنبھالا تھا اور ہم علی کی لاش کو لے کر اُس کے گھر آ گئے تھے۔

گھر میں اُس کی ماں کو غشی کے دورے پڑ رہے تھے‘ بہن کے آنسو اب نہیں رہے تھے علی کا باپ غم سے ڈھال تھا اسی دوران علی کے غسل کا مرحلہ طے ہوا‘ لوگوں نے بہت شور مچایا علاقے کے معزز لوگوں کے اریعے رپورٹ لکھوانے کے لیے کہ ادارے کی ا پرواہی اور غیر ذمہ داری سے ایک معصوم ہنستی کھیلتی جان چلی گئی تھی۔ ہم اس کے ملازمین کے خلاف رپورٹ لکھائیں گے۔

علی کا باب بس سن رہا تھا علی کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارنے کے بعد وہ غم سے چور قبرستان میں ہی یٹھ گیا تھا۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے اُس کو گھر چلنے پر راضی کیا تھا‘ گھر آ کر علاقے کے کونسلر اور ناظم غیرہ اُسے غم کو بانٹنے کے لیے آئے تھے۔

’’سعید بھائی‘ جیسا آپ بولو گے ویسا ہوگا اگر رپورٹ کرنی ہے تو تھانے چلتے ہیں اپنے بچے کے قتل کا مقدمہ درج کراؤ‘ تاکہ ان لوگوں کو سزا ملے ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔‘‘

’’نہیں نہیں مجھے کسی کے خلاف رپورٹ نہیں لکھوانی کیا ایسا کرنے سے علی میرا لختِ جگر واپس جائے گا‘ مجھے میرا بیٹا مل جائے گا‘ اور کیا قانون اُن کو قرار واقعی سزا دے گا نہیں یہاں جنگل کا قانون ہے‘ صور اُس بجلی کے ادارے کا نہیں ہے تمام سرکاری ادارے افسران سب بے قصور ہیں قصور تو بس ہمارا ہے کہ ہم غریبوں کو اللہ نے اس زمین پر پیدا کر دیا ہے ہم غریب لوگ ان کے بے جا ظلم کا شکار ہوتے چلے ائے ہیں اور ہوتے رہیں گے مجھے نہیں کرانی پورٹ۔‘‘ علی کے باپ نے روتے ہوئے کہا تھا۔

واقعی ہمارے ملک میں قصور غربت اور غریب کا ہے‘ قانون بھی غریب کے لیے ان اداروں کی غفلت ور نااہلی کے خلاف کچھ نہیں کرسکتا۔ کیا آپ میری ں بات سے متفق ہیں۔

☆☆......☆☆

سردیوں کی بارش

سردیوں کی بارش بھی
کیا عجیب بارش ہے
آم ہیں نہ جھولے ہیں
بھیگنے کی خواہش بھی
جاگتی نہیں دل میں
بند بند کمرے میں
گرم گرم بستر میں
چسکیوں کی آوازیں
ہیٹروں کی گرمائش
اور بند کھڑکی سے
جھانکتی ہوئی بوندیں
جیسے کہتی ہوں آؤ
اس طرح نہیں کرتے
سردیوں کی بارش میں
اس طرح نہیں ڈرتے

قاضی اعجاز محور

ایسی کہانیاں جو انسانی عقل اور سوچ سے ماوراء ہیں

روح کا انتقام

امجد اسلام امجد کا شعر

کسی کی آہٹ قریہ قریہ پھیل رہی ہے
دیواروں کے رنگ بدلتے دیکھ رہا ہوں

شیخ معظم الٰہی

یہ پُر اسرار واقعہ آج سے کئی برس پہلے کا ہے۔ روای کا اصرار ہے کہ یہ تمام واقعات بالکل سچے اور حقیقت پر مبنی ہیں۔ آپ بھی اسی کی زبانی سنیے۔

میری تعلیم مکمل ہوگئی تو میں نے ٹیچر بننا چاہا...... والد صاحب کو جب میرے ارادے کا علم ہوا تو وہ بولے۔

''تمہیں کہیں ملازمت کرنے کی ضرورت نہیں، تم نے تعلیم مکمل کرنے کا شوق پورا کرلیا ہے۔ اب کاروبار کی دیکھ بھال میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔''

میں نے والد صاحب سے کہا۔

''نہیں ابا جان! مجھے کاروبار سے ذرا بھی دلچسپی نہیں...... میں ٹیچر بننا چاہتا ہوں، اور بچپن سے ہی خواب دیکھتا آرہا ہوں کہ کسی گاؤں میں جاکر علم کی روشنی پھیلاؤں۔ میں نے محکمہ تعلیم میں درخواست بھی دے رکھی ہے۔ اللہ پاک نے چاہا تو مجھے میری دل پسند ملازمت مل جائے گی۔''

والد صاحب بولے۔ ''ارے پگلے ٹیچر کی نوکری میں کیا رکھا ہے۔ اگر تمہیں نوکری ہی کرنی ہے تو کسی آمدنی والے محکمے میں کرو۔ میرا اتنا اثر رسوخ کس کام آئے گا میں آج ہی منسٹر صاحب سے بات کرتا ہوں کہ وہ کسی اچھے سے محکمے میں تمہارا تقرر کروادیں۔''

مگر میں اپنی ضد پر اڑا رہا چونکہ میں اپنے والد کی اکلوتی اولاد تھا۔ اسی لیے بادلِ نخواستہ والد صاحب نے مجھے ٹیچر بننے کی اجازت دے دی۔ یہ بھی حسنِ اتفاق کہ چار پانچ روز کے بعد مجھے تقرری کا آرڈر ملا۔ مصطفیٰ آباد (للیانی) نامی چھوٹے سے گاؤں میں ایک آسامی خالی تھی۔ وہیں جاکر مجھے بچوں کو پڑھانا تھا۔ للیانی کا نام سن کر والد صاحب چونک گئے تھے۔

''ایک زمانے میں ہمارے بزرگ اُسی گاؤں میں رہتے تھے۔ پھر وہاں سے یہاں لاہور آکر ہوگئے۔ اب والد صاحب مجھے وہاں جانے سے اس لیے روک رہے تھے کہ اب وہاں ہمارا کوئی بھی وارث نہیں تھا اور مجھے وہاں رہائش کے سلسلے میں بھی سے دوچار ہونا تھا، مگر میں نے والد صاحب کو یہ مطمئن کردیا تھا کہ میں اسکول میں ہی رہ لوں گا۔''

روانگی سے پہلے والد صاحب نے کہا۔ ''تم للیانی نہیں گئے۔ تمہارے دادا جان کی قبر بھی وہ ہے۔ اب تم جا ہی رہے ہو تو سب سے پہلے اپنے جان کی قبر پر جاکر فاتحہ پڑھنا پھر گاؤں میں داخل ہو

میں نے اُن کی بات مان لی اور یقین دلایا کہ ایسا ہی کروں گا۔ اور اب میں بس میں بیٹھا یہ سوچ

ہ نہ جانے قبرستان کس طرف واقع ہوگا اور میں اپنے
اجان کی قبر کیسے پہچانوں گا کہ اتنے میں بس رک گئی تھی
ر کنڈیکٹر نے آواز لگائی تھی کہ ’’ للیانی والے اتر
ئیں۔‘‘ اتفاق سے للیانی اترنے والا میں واحد مسافر
۔

میں اپنا بیگ اٹھا کر بس سے نیچے اتر گیا۔ یہاں
ے ایک کچی سڑک گاؤں کی طرف جا رہی تھی۔ وہاں
ے کافی دور برگد کا درخت نظر آ رہا تھا جس پر گدھ
ڑلا رہے تھے۔

میں اسی کچی سڑک پر چل پڑا جس کے دونوں
راف کھیت تھے۔ اسی راستے سے کچھ دور جا کر ایک
ستان نظر آیا تو مجھے والد صاحب کی تاکید یاد آ گئی۔ میں
ستان کی طرف چل پڑا۔ قبرستان کے اندر داخل ہو کر
جان کی قبر تلاش کرنے لگا۔ اچانک میری نظر ایک
قبر پر پڑی۔ میں اس کا کتبہ پڑھنے لگا۔ اس پر میرے
جان کا نام بمعہ ولدیت لکھا ہوا تھا۔ میں نے وہاں
ر پڑھی اور دعا کی میرے دادا جان کی قبر کے پاس ہی
ایک اور قبر بھی تھی۔ میں نے از راہ ثواب اس پر بھی فاتحہ
پڑھی اور پھر گاؤں کی طرف چل پڑا۔

سورج غروب ہونے میں ابھی پونا گھنٹہ باقی تھا کہ
میں گاؤں پہنچ گیا۔ میں نے گاؤں والوں کو بتایا کہ میں نیا
ماسٹر ہوں اور یہاں کے بچوں کو پڑھانے آیا ہوں۔
گاؤں والے بہت عزت سے پیش آئے اور مجھے ایک
اوطاق میں لے گئے۔ (اوطاق گاؤں میں خاص طور پر
ایک کمرہ مہمانوں کے لیے بنائی جاتی ہے)۔

انہوں نے مجھے اوطاق میں بٹھایا اور روٹی پانی کا
پوچھنے لگے۔ میں نے کہہ دیا کہ فی الحال مجھے بھوک
نہیں۔ رات کو کھانا کھاؤں گا۔

آہستہ آہستہ سارے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ
بچوں کو پڑھانے کے لیے ماسٹر صاحب آ گئے ہیں۔
بہت سے لوگ اور بچے مجھے ملنے کے لیے آ رہے تھے اور
خوشی کا اظہار کر رہے تھے اور پھر ان گاؤں والوں کی
زبان سے میں نے ایک عجیب وغریب خبر سنی وہ یہ کہ اس
گاؤں میں جو بھی ماسٹر آتا ہے وہ کچھ دن کے بعد



پُراسرار طور پر ہلاک ہو جاتا ہے۔

میں نے سوچا یقیناً یہاں کوئی ایسا آدمی ہو گا جسے یہ بات پسند نہ ہو کہ یہاں کے بچے تعلیم حاصل کریں اور ان لوگوں سے میں نے یہ بات کہی۔ مگر ایک بزرگ نے کہا۔

''جی نہیں! یہ کسی ہوائی مخلوق کا کام لگتا ہے' کیونکہ ہلاک ہونے والے کے جسم پر کوئی زخم نہیں ہوتا ہے۔''

میں نے اس بزرگ سے پوچھا کہ ''وہ ماسٹر جب آتے تھے تو وہ رہتے کہاں تھے؟''

بزرگ نے بتایا کہ ''وہ اُس مکان میں رہتے تھے جو یہاں سے تھوڑی دور واقع ہے اور کچھ عرصے سے خالی پڑا ہوا ہے۔ کافی عرصہ پہلے وہاں پر اللہ دتا نامی ایک شخص اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ رہتا اور اپنی زمین پر کھیتی باڑی کیا کرتا تھا۔ ایک دن اُس کی بیٹی زہرا قریبی جنگل میں لکڑیاں لینے گئی جب وہ کافی دیر تک واپس نہ آئی تو اللہ دتا زہرا کی تلاش میں گیا تو اسے جنگل کے پاس کھیتوں میں اپنی بیٹی کی لاش ملی جو بہت بری حالت میں تھی۔ اللہ دتا نے جب اپنی بیٹی کی لاش کی یہ حالت دیکھی تو وہ صدمے سے پاگل ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں سارے گاؤں والے بھی وہاں پہنچ گئے اور پھر ہم لوگ زہرا کی لاش کو اٹھا کر اُس کے گھر لے آئے۔ جب زہرا کی ماں نے اپنی بیٹی کی لاش دیکھی تو وہ جہاں تھی وہیں گر گئی اور پھر نہ اٹھ سکی۔ ایک گھر سے دو جنازے نکلے تو اللہ دتا جو پہلے ہی پاگل ہو چکا تھا اُس کی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ اس واقعے کے ایک ہفتے کے بعد اللہ دتا بھی اس دنیا سے چلا گیا اور وہ مکان خالی ہو گیا۔ پھر گاؤں والوں نے فیصلہ کیا کہ یہ گھر ماسٹر کی رہائش کے لیے دے دیتے ہیں یہاں وہ آرام سے رہے گا اور پھر سب سے پہلے جو ماسٹر آیا تھا وہ بہت شریف آدمی تھا۔ اس نے اپنے اخلاق سے ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ گاؤں کے سب لوگ اس کے آرام کا خیال رکھتے تھے لیکن ایک ہفتے کے بعد اس گھر سے اس کی لاش ملی جو پُراسرار طور پر ہلاک ہو گیا تھا۔ اس کے بعد تین ماسٹر اور آئے وہ بھی اسی گھر میں ٹھہرے تھے وہ تینوں بھی پُراسرار طور پر ہلاک ہو گئے۔ پھر چار سال گزر گئے اِدھر کوئی ماسٹر نہیں آیا۔ آج تم آئے ہو تو ہمیں خوشی ہوئی ہے کیونکہ ہمارے بچوں کو پڑھنے کا بہت شوق ہے۔''

گاؤں والوں کی باتیں سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی میں نے سوچا بلکہ پکا ارادہ کر لیا کہ میں اس بات کا سراغ لگا کر ہی رہوں گا کہ ماسٹر کو کون ہلاک کر رہا ہے؟ میں نے گاؤں والوں سے کہا کہ میں بھی اسی مکان میں رہوں گا جہاں دوسرے ماسٹر رہتے تھے۔ گاؤں والوں نے کہا۔

''نہیں ماسٹر صاحب! آپ یہاں اوطاق میں ہی رہیں یہ جگہ آپ کے لیے بالکل محفوظ بھی ہے اور ٹھیک بھی...... وہ جگہ آپ کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں آج کی رات یہاں اوطاق میں رہ لیتا ہوں...... لیکن کل تم لوگ مجھے وہ مکان دکھانا میں وہیں رہوں گا۔''

وہ بولے۔ ''جیسا آپ چاہیں۔'' اس کے بعد میں نے رات کا کھانا کھایا اور سب گاؤں والوں سے کہہ دیا کہ ''کل اپنے بچوں کو تیار کرا کے اسکول بھیج دینا۔ میں کل ہی سے انہیں پڑھانا شروع کروں گا...... انشاء اللہ۔''

دوسرے دن میں اسکول گیا وہ ایک چھوٹا سا اسکول تھا۔ یہاں صرف پانچ کمرے تھے۔ کرسیاں اور میزیں ٹوٹی ہوئی تھیں صبح کے نو بج رہے تھے میں دفتر میں بیٹھا اسکول کی حالت کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ''السلام علیکم......'' کی آواز پر چونک پڑا۔ سر اُٹھا کر دیکھا تو سامنے گاؤں کے بچے کھڑے تھے۔ جو پڑھنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ اُن کے چہروں سے خوشی چھلک رہی تھی۔ میں نے انہیں بیٹھنے اور اپنا تعارف کروانے کو کہا کچھ اور بچے بھی آ گئے۔ سب بچوں نے اپنا تعارف کروایا۔ ان کی خوشی دیکھ کر مجھے یہ اندازہ ہوا کہ انہیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ پہلا دن تو تعارف میں گزر گیا پھر میں بچوں کو چھٹی دے کر اسکول سے باہر آیا اور لوگوں سے کہا کہ ''مجھے اللہ دتا کے گھر لے چلو میں اس گھر کی صفائی وغیرہ کر کے آج سے وہیں پر رہوں گا۔''

گاؤں کے دو آدمیوں نے مجھے اللہ دتا کے گھر پہنچا دیا۔ اس گھر پر پہنچ کر میں نے اُن آدمیوں کو واپس کر دیا۔ پھر میں اس گھر کا معائنہ کرنے لگا اس کے صحن میں برگد کا ایک بہت بڑا درخت تھا۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں بس

سے اترا تھا تو مجھے دور سے یہی درخت نظر آیا تھا۔ اس گھر کے دو کمرے تھے صحن کے ایک کونے میں گارے کا بنا ہوا باورچی خانہ تھا۔ صحن کے دوسرے کونے پر غسل خانہ تھا۔ کمرے بھی کچے تھے جبکہ صحن میں تین چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں۔

لوگوں کا کہنا تھا کہ اس گھر میں عرصے سے کوئی نہیں رہا۔ لیکن اس گھر کی حالت دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ جیسے کوئی یہاں رہتا ہے۔ ہر چیز اپنی صحیح جگہ پر بڑے سلیقے سے رکھی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے تھوڑی دیر پہلے کسی نے آگ جلائی ہو۔ یہ سب دیکھ کر میرے دل میں ایک انجانے خوف کی لہر دوڑ گئی اور میں سوچنے لگا۔

”آخر یہ سب کیا ہے؟“ مجھے گھر کی صفائی کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ گھر پہلے سے ہی صاف ستھرا تھا۔ پھر میں اس گھر سے نکلا اور جا کر اوطاق سے اپنا بیگ لے کر واپس آ گیا۔

رات کو گاؤں کا ایک آدمی میرے لیے کھانا اور بستر لے آیا تھا۔ میں نے کھانا کھا کر برتن اس آدمی کو واپس کر دیے۔ برتن لے کر آدمی واپس چلا گیا تو میں نے ایک چارپائی درخت کے نیچے رکھی اور اس پر بستر بچھا کر سو گیا۔ کیونکہ گرمیوں کا موسم تھا اور اندر گرمی لگ رہی تھی۔ لیٹنے کے تھوڑی ہی دیر کے بعد مجھے نیند آ گئی اور پھر نہ جانے رات کے کون سے پہر اچانک میری آنکھ کھل گئی اور میں اٹھ بیٹھا۔

وجہ یہ تھی کہ اس برگد کے درخت کی ایک چھوٹی سی ٹہنی میرے اوپر آ گری تھی۔ میں سوچنے لگا کہ وہ ٹہنی میرے اوپر کیسے آ گری، حالانکہ ہوا برائے نام تھی میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ چکر کیا ہے؟ سوچتے سوچتے میں پھر سو گیا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ وضو کر کے میں نے فوراً نماز پڑھی میں نے دیکھا کہ برگد کے درخت کے بہت سارے پتے نیچے زمین پر بکھرے ہوئے ہیں جیسے رات کو تیز ہوا چلی ہو، لیکن حقیقت یہ تھی کہ رات کو تیز ہوا نہیں چلی تھی۔

دوسری رات میں کمرے کے اندر سو گیا۔ کمرے کا بلب میں نے جلا دیا تھا۔ رات کے کسی پہر میری آنکھ کھل گئی تو میں نے دیکھا کہ کمرا اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے جبکہ صحن کا بلب جل رہا تھا۔ میں چارپائی سے اٹھنے ہی والا تھا کہ کمرے کا بلب روشن ہو گیا۔ میرے وجود میں سنسنی دوڑ گئی لیکن میں نے خوف کو ختم کرنے کی کوشش کی اور ہمت کر کے کمرے سے باہر آ گیا، باہر صحن میں مجھے کوئی نظر نہیں آیا اس کے بعد میں نے باورچی خانے میں جھانک کر وہاں نظر دوڑائی تو کوئی نظر نہ آیا تو میں واپس آ کر بستر پر لیٹ گیا کروٹیں بدلتے بدلتے صبح ہو گئی تھی۔

سارا دن میں گزشتہ رات کے واقعات کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اس کے بعد دو دن تک پھر کوئی غیر معمولی بات نہ ہوئی۔ دو دن کے بعد جب میں رات کو سو رہا تھا تو اچانک رات کے کسی پہر دروازے پر دستک ہوئی۔ میری آنکھ فوراً کھل گئی میں سوچنے لگا کہ اس وقت کون ہو سکتا ہے؟ میں ہمت کر کے دروازے پر آ گیا اور پھر سوچنے لگا کہ دروازہ کھولوں یا نہ کھولوں۔ اچانک مجھے ایسا لگا کہ کوئی دروازے کے پاس سے گزر کر آگے چلا گیا ہو۔ میں نے فوراً دروازہ کھول کر باہر نکل کر دائیں بائیں دیکھا لیکن مجھے کوئی نظر نہ آیا میں واپس گھر میں آیا۔ اچانک مجھے ایسا لگا کہ جیسے دوسرے کمرے میں کوئی ہو، حالانکہ باہر سے دروازہ بند تھا۔ میں دروازہ کھول کر اندر کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا پھر بھی مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی میرے آس پاس موجود ہے۔

میں نے اللہ کا نام لے کر اپنے اندر ہمت اور حوصلہ پیدا کرتے ہوئے زوردار آواز میں پوچھا تھا۔

”کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟ تم جو کوئی بھی ہو میرے سامنے آؤ اور بتاؤ تم نے یہ کیا ڈرامہ رچایا ہوا ہے؟“ تھوڑی دیر کے بعد میرے سامنے ایک لڑکی نمودار ہوئی تھی جو سفید لباس میں ملبوس تھی، اسے دیکھ کر میرے دل میں خوف کی لہر اٹھی اور دھڑکن مزید تیز ہو گئی۔

”میں زہرا ہوں اللہ دتا کی بیٹی! میں چاہتی ہوں کہ یہاں کوئی ماسٹر نہ آئے جو بھی ماسٹر آئے گا میں اسے ختم کر دوں گی۔“ میں نے اس لڑکی سے پوچھا۔

”ماسٹروں کو تم نے ہلاک کیا ہے؟ لیکن کیوں؟“ اس لڑکی نے کہا۔

”تم جاننا چاہتے ہو تو پھر سنو! میں یہاں اس گھر میں اپنے ماں بابا کے ساتھ رہتی تھی۔ ایک دن ہمارے

گاؤں میں ایک ماسٹر آیا جس کا نام اشفاق احمد تھا جو شکل سے نہایت ہی شریف اور با اخلاق لگتا تھا۔ مگر اندر سے بہت ہی بدنیت تھا۔ جس کا گاؤں والوں کو علم نہیں تھا۔ میں بابا کے ساتھ جنگل سے لکڑیاں لینے جایا کرتی تھی۔ ایک روز بابا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ لہٰذا مجھے اکیلے ہی جانا پڑا میں نے جنگل سے لکڑیاں اکٹھی کر کے گٹھا بنایا اور اسے بڑی مشکل سے اُٹھا کر سر پر رکھا اور گھر کی طرف چل پڑی۔ ابھی میں کچھ ہی دور گئی تھی کہ میرے سر سے لکڑیوں کا گٹھا کھل کر گر گیا میں نے اسے باندھ کر اٹھانا چاہا لیکن اسے دوبارہ اٹھا نہ سکی وہ بہت بھاری تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا کہ کوئی آ رہا ہو تو وہ گٹھا اٹھوا دے۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ ایک آدمی اس طرف آ رہا ہے۔ وہ قریب آیا تو میں نے اُسے پہچان لیا وہ ہمارے گاؤں کا اسکول ماسٹر اشفاق احمد تھا۔ اس نے جنگل میں مجھے اکیلا دیکھا تو اُس کے دل میں چھپی خباثت ظاہر ہو گئی۔ وہ مجھ سے بدتمیزی کرنے لگا تو میں نے اسے زوردار تھپڑ مارا وہ غصے سے تلملا اٹھا۔ اُس نے مجھے پکڑ لیا اور میرا گلا گھونٹ کر مجھے ہلاک کر دیا۔ گاؤں والوں کو پتہ نہ چل سکا کہ میرے ساتھ ظلم کس نے کیا ہے؟ اُس کی وجہ سے میرے ماں باپ بھی چل بسے اور ہمارا گھر ویران ہو گیا۔ پھر ماسٹر اشفاق احمد جب میرے گھر میں رہنے لگا تو میرے انتقام کی آگ مزید تیز ہو گئی اور میں انتقام کی آگ بجھانے وہاں پہنچ گئی اور اسے نہایت بے دردی سے ہلاک کر دیا پھر میں نے اپنے گھر میں ہی بسیرا کر لیا...... اس کے بعد یہاں ایک اور ماسٹر قدیر آ گیا اور وہ بھی اس گھر میں رہنے لگا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ یہ بھی گاؤں کی کسی معصوم لڑکی کو تنگ نہ کرے۔ اس لیے میں نے اسے بھی اپنے انتقام کا نشانہ بنایا اس کے بعد دو اور ماسٹر ماجد اور مظہر آئے ان کو بھی میں نے انتقام کی آگ میں جلا دیا۔ پتہ نہیں کیوں میرے اندر کی آگ بجھ نہیں رہی شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے کسی بھی شہری آدمی پر بھروسہ نہیں ہے۔ میں تو مر چکی ہوں مگر دوسری لڑکی کا مذاق ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔'' یہ کہہ کر زہرا درد بھری سسکیاں لینے لگی۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کہوں بہرحال میں نے اپنا اعتماد بحال کر لیا تھا۔ وہ پھر بولی۔

''ماسٹر میں تمہیں پہلی رات ہی ہلاک کر دیتی لیکن میں نے تمہیں اس لیے نہیں مارا کہ جب تم اس گاؤں میں آ رہے تھے تو راستے میں تم قبرستان گئے اور تم نے اپنے دادا جان کی قبر پر فاتحہ پڑھی اس قبر کے پاس ہی میری قبر ہے تم نے میری قبر پر بھی فاتحہ پڑھی اس فاتحہ سے مجھے کچھ سکون ملا تھا۔''

''دیکھو زہرا! تم یہ سب ٹھیک نہیں کر رہی ہو۔'' میں نے اُسے سمجھانا چاہا۔

''بلاوجہ بے گناہ آدمیوں کے خون میں اپنے ہاتھ رنگ رہی ہو۔ تم نے اپنا انتقام پہلے ماسٹر کو مار کر لے لیا ہے لیکن دوسروں کو تم کیوں اپنے انتقام کا نشانہ بنا رہی ہو؟ جن بے گناہوں کو تم نے مارا ہے کبھی ان کے گھر والوں کے بارے میں سوچا ہے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے گھر کے واحد کفیل ہوں ان کے مرنے کے بعد ان کے گھر میں کیسے حالات ہو گئے ہوں۔ کیا تم نے سوچا ہے جن کو تم نے مارا ہے کیا اُن کے والدین اپنوں کے قاتل کو بددعائیں نہیں دیتے ہوں گے اور دکھی ماں کی بددعا آسمان میں شگاف کر دیتی ہے تم نے اللہ پاک کو کیا جواب دو گی؟ اور اگر گاؤں میں ماسٹر نہیں آئے گا تو اس گاؤں کے بچے کبھی پڑھ نہیں سکیں گے ہمیشہ جاہل رہیں گے۔ جس کی ذمہ داری صرف تم پر ہو گی۔'' میں خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔

''تم صحیح کہہ رہے ہو میں انتقام کی آگ میں اندھی ہو چکی تھی۔ اس لیے مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا میں اللہ پاک سے معافی مانگتی ہوں میں اب کسی کو نہیں ماروں گی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

میں نے اسے کہا۔ ''اچھا ہوا کہ تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا میری دعا ہے کہ اللہ پاک تمہیں معاف کر دے۔'' پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

اس واقعہ کو آج پندرہ سال ہو چکے ہیں اب اسکول میٹرک تک ہو چکا ہے اور یہاں کا میں ہیڈ ماسٹر ہوں اور اسی گھر میں رہ رہا ہوں میری بیوی بچے میرے ساتھ ہیں۔ آج مجھے یہ واقعہ یاد آتا ہے تو ایک ٹھنڈی آہ بھرتا ہوں۔

☆☆......☆☆

دوسری ناقابل یقین کہانی حیدرآباد سے

حاصلِ لاحاصل

محمد فیروز شاہ کا شعر

شام اُس کے نام کی ہمراز حیرت رہ گئی
بھولنے کو بھی کوئی تو نسبت رہ گئی

کائنات بھٹی

میں حجلہ عروسی میں دلہن بنی بیٹھی تھی' زوار کا انتظار کرتے ہوئے بے انتہا خوش تھی کہ جس کی میں نے چاہت کی وہ میرا ہوگیا تھا زوار کے تصور سے ہی میرے لبوں پر شرمیلی مسکراہٹ کھلنے لگی تھی۔ اسی وقت دروازہ کھلا تھا' وہ آہستہ آہستہ بیڈ کی طرف بڑھ رہا تھا' اُس کے قدموں کی آہٹ سے میرا دل عجیب انداز سے دھڑک رہا تھا' وہ بیڈ پر میرے سامنے آ کر بیٹھا تو میرا جھکا سر مزید جھک گیا۔ زوار نے جیسے ہی گھونگھٹ اٹھایا تھا میرے حلق سے ایک چیخ نکلی تھی۔ میں اپنے حواسوں پر قابو نہ رکھ سکی اور بے ہوش ہوگئی۔

☆......☆......☆

زوار حیران و پریشان تھا کہ پارس مجھے دیکھ کر چیختے ہوئے بے ہوش کیوں ہوگئی۔

''پارس پارس! اٹھو کیا ہوا؟'' زوار اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھی منرل واٹر کی بوتل اٹھائی تھوڑا سا پانی گلاس میں ڈال کر وہ پارس پر چھڑکنے لگا' مگر اُس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ ہنوز بے ہوش تھی۔ زوار بوکھلا گیا کہ آخر میں اسے کیسے ہوش میں لاؤں۔ میں امی کو جگا کر لے آتا ہوں۔'' یہ خیال آتے ہی تیزی کے ساتھ کمرے سے نکلا تھا۔ نیچے اُس کی ماں کا کمرا تھا زوار نے کمرے کے بند دروازے پر زور سے دستک دی تھی مگر دروازہ نہیں کھلا اب وہ امی امی کی آواز کے ساتھ دھڑا دھڑ دروازہ بجا رہا تھا' شادی کے ہنگامے میں بہت دنوں تک سب کی نیندیں حرام ہوئی تھیں۔ سو اب فارغ ہو کر سب مُردوں سے شرط لگا کر سوئے ہوئے تھے۔

''کیا مصیبت آ پڑی ہے جو دروازہ توڑ رہے ہو۔'' سیدہ بانو نے سوئی جاگی کیفیت میں دروازہ کھولا تھا۔

''امی! وہ وہ' پارس بے ہوش ہوگئی ہے۔'' اور پھر وہ سیدہ بانو کا ہاتھ تھامے انہیں اوپر لے جا رہا تھا۔ اور جب وہ زوار کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئیں تو بیڈ پر موجود بے ہوش پارس کو دیکھ کر زوار کو کچھ ایسی نظروں سے دیکھا تھا کہ وہ گڑبڑا گیا تھا۔

''امی یہ مجھے دیکھتے ہی بے ہوش ہوگئی ہے' میں نے اِسے کچھ نہیں کیا۔''

''ایسے کیسے بے ہوش ہوگئی تمہیں دیکھ کر' تم نے ضرور اس کے ساتھ کوئی شرارت کی ہوگی تمہیں تو عادت ہے نت نئے ڈرامے کرنے کی۔''

سیدہ بانو کو یقین تھا کہ زوار نے ضرور پارس کے ساتھ کوئی خطرناک شرارت کی ہے' جس کی وجہ سے وہ بے ہوش ہوگئی ہے۔ انہوں نے پارس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے تھے' مگر پھر بھی اُسے ہوش نہ آیا تھا' وہ اب پارس کے سرہانے بیٹھ کر قرآنی آیات پڑھ کر اس پر پھونک رہی تھیں۔

جب مجھے ہوش آیا تھا تو میں نے اپنے سرہانے اپنی پھوپو کو بیٹھے دیکھا تھا۔ میری نظر پھولوں سے سجی چھت پر گئی تھی تو مجھے سب کچھ یاد آ گیا تھا' یاد آنے پر میں نے خوف سے جھرجھری لی تھی۔

''پارس بیٹا بتاؤ کیا ہوا تھا جو تم بے ہوش ہوگئیں؟''

''پھوپو...... وہ زوار......'' میں آگے بول نہیں پا رہی تھی۔

''بتاؤ بیٹا......زوار نے تمہارے ساتھ؟''

''پھوپو میرا گھونگھٹ اٹھانے والے زوار نہیں تھے۔'' یہ کہہ کر میں ہچکیوں سے رونے لگی تھی۔ سیدہ بانو نے حیرت سے بھری سوالیہ نظروں سے زوار کو دیکھا۔

''امی میں ہی تھا اور کس کو ہونا تھا بھلا؟'' زوار کے لہجے میں غصہ اور شرمندگی چھپی ہوئی تھی۔

''پارس تم ذرا میری طرف دیکھو۔'' اب وہ مجھ سے مخاطب تھا۔

پھوپو کی گود میں سر چھپائے مسلسل روئے جا رہی تھی۔ انہوں نے جیسے تیسے میرا چہرہ اوپر کیا' اب جو میں نے زوار کو دیکھا تو وہاں سب کچھ ٹھیک تھا' خوف کے سائے میرے چہرے سے دور ہوگئے۔

''اب بتاؤ کیوں ڈر گئی تھیں؟'' پھوپو نے بہت پیار سے پوچھا تھا اس دوران ہی زوار میرے برابر میں ہی بیٹھ گیا۔

''پھوپو زوار نے جب میرا گھونگھٹ اٹھایا اور میری نظر ان کے چہرے پر پڑی تو وہاں بہت ہی بھیانک جانور کی شکل تھی' اس لیے میں خوف سے بے ہوش ہوگئی۔ ہوسکتا ہے کسی ذہنی ٹینشن کی وجہ سے ایسا ہوا ہو۔'' میں نے دبے دبے لہجے میں کہا تھا۔

''دیکھو بیٹا! زوار بالکل ٹھیک ہے' اب تم آرام کرو' میں بھی سونے جا رہی ہوں۔'' پھوپو نے آئی



جمائی کو روکتے ہوئے کہا تھا۔

"پھوپو! مجھے ان کے ساتھ اکیلے میں ڈر لگے گا آپ میرے ساتھ سو جائیں۔" جیسے ہی وہ کمرے سے جانے لگیں تھیں میں نے انہیں روکتے ہوئے کہا تھا۔

"بیٹا! یہ تم کیسے بچپنے کی باتیں کر رہی ہو' آج تمہاری سہاگ رات ہے' میں اگر تمہارے ساتھ سو جاؤں تو گھر میں جو مہمان ٹھہرے ہیں اُن میں سے اگر کسی کو پتا چل گیا تو کیا سوچیں گے۔" پھوپو مجھے بہت نرمی سے سمجھا رہی تھیں۔

"امی آپ یہاں سو جائیں۔ پارس بہت خوفزدہ ہے' میں ساتھ والے کمرے میں سو جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر زوار کمرے سے نکل گیا تھا۔

☆......☆......☆

یہ کوئی ایک رات کی بات نہ تھی' اب جب بھی زوار رات کو اکیلے میں' میرے پاس ہوتا تو میں اُسے دیکھ کر چیخنے چلانے لگتی۔ اب میں پہلے کی طرح بے ہوش تو نہیں ہوتی تھی مگر چیخیں مار کر کمرے سے نکل جاتی تھی' رفتہ رفتہ سب گھر والے مجھ سے عاجز آ چکے تھے۔

"پارس اگر تمہیں میرے ساتھ رہنا نہیں تھا تو مجھ سے شادی کیوں کی؟ کسی نے زبردستی تو نہیں کی تھی تمہارے ساتھ' تمہاری اپنی مرضی سے یہ شادی ہوئی ہے' پھر کیوں ایسے ڈرامے کرتی ہو' برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے' میں اب اور کتنا برداشت کروں؟" اُس روز زوار کا ضبط جواب دے گیا تو وہ مجھ پر پھٹ پڑا۔

"زوار میرا یقین کرو میں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتی' میں تو آپ سے شروع سے محبت کرتی تھی' میں بہت خوش تھی مگر پتا نہیں کیسے رات کو آپ کی شکل بڑے ہی ڈراؤنے جانور جیسی ہو جاتی ہے۔" زوار میری یہ بات سن کر پیر پٹختا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

اِس صورت حال سے میں خود بہت تنگ آ گئی تھی۔ مجھے بالکل سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اس مسئلے کی وجہ سے دونوں گھرانے بہت زیادہ پریشان تھے۔ میری بھابی صفیہ زوار کی بہن تھی' جس کے دو بچے بھی تھے۔ اُس بے چاری کو ڈر تھا کہ زوار تنگ آ کر مجھے طلاق نہ دے دے' اگر مجھے طلاق ہوئی تو میرا بھائی ہاشم اُسے نہ چھوڑ دے۔

ان تمام حالات سے پریشان میری والدہ مجھے اِدھر اُدھر دم و درود کے لیے بھی لے گئی تھیں۔ مجھے نفسیاتی ڈاکٹر کو بھی دکھایا مگر میرا مسئلہ جوں کا توں تھا۔ اور پھر آخر کار تنگ آ کر میں نے خود زوار کی زندگی سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں شادی کے تین مہینے بعد بھی اَن چھوئی تھی' زوار اگر یہ تمام صورت حال اب تک برداشت کرتا آ رہا تھا تو صرف اپنی بہن صفیہ کے لیے کہ مجھے طلاق دینے کی صورت میں کہیں اُس کا گھر برباد نہ ہو جائے' سو میں نے خود زوار سے علیحدگی کا مطالبہ کر دیا تھا۔ جسے اُس نے فوراً قبول کر لیا تھا اور مجھے طلاق دے دی تھی' یوں طلاق کے بعد بھی ہمارے گھرانوں میں رنجش نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ سب مجھے ہی قصوروار سمجھتے تھے۔

اب پورا خاندان اور محلے والے مجھے برا سمجھتے تھے۔ سب کا مشترکہ خیال یہی تھا کہ شادی سے پہلے ضرور میرا کسی کے ساتھ چکر ہوگا' یہ شادی ماں باپ کے مجبور کرنے پر میں نے کر لی ہوگی اور پھر ایک ناٹک رچا کر طلاق لے لی تھی' جبکہ میں زوار سے الگ ہو کر بالکل ٹوٹ گئی تھی' ہم دونوں کے بیچ کوئی عہد و پیمان تو نہ ہوئے تھے مگر ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ میں نے تو کبھی زوار کے علاوہ اور کسی کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا۔

کسی طلاق یافتہ لڑکی کی دوسری شادی کوئی مشکل بات نہیں' اگر میرے دامن پر بدنامی کا داغ نہ لگا ہوتا تو شاید میری بھی دوسری شادی کے لیے رشتے آتے' کہتے ہیں نہ کہ بد اچھا بدنام برا' میرے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ اور پھر جب طلاق کے تقریباً دو سال بعد میرا ایک رشتہ آیا تو میرے والدین نے بغیر کسی چھان بین کے فوراً ہی قبول کر لیا' جبکہ میں نے بھی ماں باپ کی خوشی کے لیے ہامی بھر لی تھی۔

شادی کے بعد گزرے چھ مہینوں میں ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میری شادی ایک نشہ کرنے والے

بہت ہی غلط آدمی سے ہوئی ہے۔ مگر میں ہر صورت میں اُس کے ساتھ گزارہ کرنے پر مجبور تھی۔ کیونکہ اب میں اُس کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔

☆......☆......☆

''محبوب کو حاصل کرنے کی لگن اگر سچی ہو تو ناکامی ہمیں چھو کر نہیں گزرتی' میری مثال تمہارے سامنے ہے' مجھے زوار سے عشق تھا' میں اُسے حاصل کرنے کے لیے آخری حد تک گئی اور آخرکار کامیاب ہوگئی۔'' ثمن کے لہجے میں اپنی محبت حاصل کرنے کا غرور تھا۔

''ثمن! آخر ایسا تم نے کیا کیا کہ جو زوار تمہاری صورت پر ایک نظر کے بعد دوسری نظر ڈالنا گوارا نہ کرتا تھا' اُس نے تم سے شادی بھی کرلی۔'' یہ سوال کرنے والی شاید' بہت عرصے کے بعد ثمن سے ملنے والی اُس کی کوئی پرانی سہیلی تھی۔

کسی کی باتیں کان لگا کر سننا بہت معیوب بات ہے مگر زوار کے ذکر پر میرا تجسس بڑھ گیا تھا' ثمن کو میں جانتی تھی' وہ زوار کی بڑی بہن عارفہ کی صرف نند ہی نہیں تھی' اب کافی عرصے سے زوار کی بیوی اور اُس کے تین بچوں کی ماں تھی۔ میں اُس وقت اپنے چاچا کے بیٹے کے ولیمے میں شریک تھی۔ جس کا انتظام باہر گلی میں ہی شامیانہ لگا کر کیا گیا تھا۔ میں ثمن کے ذرا پیچھے ہی بیٹھی تھی۔ اور شاید اس بات کا ثمن کو اندازہ نہ تھا۔ اس لیے وہ برسوں بعد ملی سہیلی کو اپنی یہ کہانی سنا رہی تھی۔

''تمہیں تو پتا ہے میں زوار کی محبت میں شروع ہی سے مبتلا تھی' مگر اُس نے مجھے کبھی لفٹ نہ کرائی' اُس کی بڑی بہن جو میری بھابی ہے میں اُس کے بھی بہت آگے پیچھے پھری' مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا کیونکہ میں عمر میں زوار سے پانچ سال بڑی تھی۔ اور پھر جب مجھے زوار اور پارس کی منگنی کا پتا چلا تو میری جو حالت ہوئی وہ بیان نہیں کرسکتی' عارفہ بھابی کو اندازہ تھا کہ میں زوار کو چاہتی ہوں پھر بھی انہوں نے میرے رشتے کے لیے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ اب جو کرنا تھا مجھے خود کرنا تھا اور پھر مجھے اپنی ایک سہیلی کے ذریعے معلوم ہوا تھا کہ حب چوکی میں ایک ہندو عامل ہے جو گارنٹی والا کام کرتا ہے میں سہیلی کے ساتھ اُس عامل کے پاس پہنچی' مجھے پارس کو مروانا نہیں تھا صرف اپنے راستے سے ہٹانا تھا' عامل نے کہا تھا کہ بیس دن کے اندر میرا کام ہوجائے گا۔ مگر اُس نے اِس کام کے لیے جو رقم مانگی وہ زیادہ تھی' مطلوبہ رقم حاصل کرنے میں مجھے دو مہینے لگ گئے تھے یہ رقم میں نے کیسے حاصل کی یہ ایک الگ کہانی ہے' اسی دوران زوار اور پارس کی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی' میں نے رقم جا کر ہندو عامل کو دی اور اس نے جو کہا تھا ویسا ہی ہوا' شادی کی پہلی رات ہی پارس زوار کی بھیانک شکل دیکھ کر ڈر گئی تھی' زوار کو خود پتا نہیں چلتا تھا کہ پارس کے ساتھ تنہائی میں اُس کی شکل نہایت ہی بھیانک جانور جیسی ہوجاتی تھی۔ اس سارے کھیل کا نتیجہ اُن دونوں کے درمیان طلاق کی صورت نکلا' طلاق پارس نے خود لی تھی اس لیے سب کی نظر میں اُس کا کردار مشکوک ہوگیا اور پھر زوار خود بخود میری طرف کھنچا چلا آیا ہندو عامل نے عمل ہی ایسا کیا تھا' میری اور زوار کی شادی ہوگئی ہمارے تین بچے بھی ہوگئے اور آج میں اُس کے ساتھ ایک خوش و خرم زندگی گزار رہی ہوں۔''

ثمن کی زبانی اُس کا کارنامہ سن کر مجھ پر سکتہ طاری ہوگیا اُس نے میرے ساتھ جو کیا تھا وہ ہرگز قابلِ معافی نہ تھا' کتنے فخر سے وہ اپنا کارنامہ بتا رہی تھی' اُسے اپنے کیے پر ذرا بھی ندامت نہ تھی بلکہ اُسے اپنے کارنامے پر فخر تھا۔

میں ہمیشہ سے مکافاتِ عمل پر یقین رکھتی ہوں ثمن کبھی نہ کبھی تو مکافاتِ عمل کی پکڑ میں آئے گی اور اگر اس دنیا میں بچ بھی گئی تو آخرت میں تو اُسے اپنے کیے کا حساب دینا ہی ہوگا' میرا کیا ہے' آج میرے بچے چھوٹے ہیں' شوہر نشئی اور جواری ہے تو میں مصائب میں گھری ہوئی ہوں کل میرے بچے جوان ہوجائیں گے تو میرا سہارا بنیں گے۔ اگر اس دنیا میں مجھے راحت نصیب نہ ہوئی تو کیا ہوا آخرت میں مجھے اجر مل جائے گا۔

☆☆......☆☆

تیسری ناقابل یقین کہانی کراچی سے

وہ میری سہیلی

محسن بھوپالی کا شعر

وہ تھا جو خواب سہانا عجیب لگتا ہے
گزر گیا جو زمانہ عجیب لگتا ہے

فرح انیس

میری خالہ کو کسی عورت نے یہ کہانی سنائی تھی میں یہ کہانی اُسی عورت کی زبانی بیان کرر ہی ہوں۔

''میرا نام صائقہ ہے میرے ماں باپ بچپن میں ہی وفات پا گئے تھے۔''

''میری پرورش تایا تائی نے کی تائی کا میرے ساتھ کوئی زیادہ اچھا سلوک نہ تھا۔ خیر جب میں اٹھارہ برس کی تھی تو تائی نے میری شادی کر دی۔ شادی کے بعد تو میری زندگی ہی بدل گئی۔ میرے شوہر امجد نے مجھے اتنی زیادہ محبت دی کہ تایا کے گھر میں اٹھائی ہوئی تکلیفوں کو میں بھول گئی۔ میری زندگی میں مزید بہار اُس وقت آ گئی جب میں پہلے بیٹے علی کی ماں بنی تھی۔

میری زندگی بہت اچھی گزر رہی تھی' مگر وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا' ہمارا بیٹا علی چار سال ہو گیا تھا اور میرے ہاں دوسرے بچے کی ولادت ہونے والی تھی کہ میرے شوہر امجد کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اس حادثے نے ان کی جان لے لی میری ہنستی بستی زندگی یکا یک اجڑ گئی تھی۔ مجھے تو جیسے کچھ ہوش ہی نہ رہا تھا۔ گھر کا سائیں پیسہ کمانے والا نہ رہا تو تین وقت کی روٹی کھانی بھی مشکل ہو گئی۔ مجھے علی کے ساتھ اب دوسرے بچے کی فکر بھی تھی' جو ابھی دنیا میں آیا بھی نہ تھا میں کچھ مالی مدد حاصل کرنے کے خیال سے تایا تائی کے ہاں بھی گئیں تھی پر اُن کا نہایت ہی برا رویہ دیکھ کر میری کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی اور مایوس ہی واپس آ گئی تھی۔ اس ساری صورت حال نے مجھے رُلا دیا تھا۔ مجھے لگتا میں بالکل تنہا ہو گئی ہوں۔

ایک دن میں علی کو سلا کر بیڈ پر اداس سی بیٹھی تھی کہ میری نگاہ دیوار پر موجود چھپکلی پر جا ٹھہری تھی۔ اب آپ اسے میرا پاگل پن سمجھیں یا کچھ اور...... میں اُس چھپکلی سے مخاطب ہو کر اپنے دل کی بھڑاس نکالنے لگی تھی۔ میرا تو کوئی بھی نہیں ہے' تم ہی بن جاؤ میری سہیلی' میری غمگسار اور مددگار......

اُس دن میں نے چھپکلی سے ڈھیر ساری باتیں کی تھیں اور پھر میرا یہ معمول ہو گیا تھا کہ میں جب بھی کام سے فارغ ہوتی اُس چھپکلی سے ڈھیروں باتیں کر کے اپنا دل ہلکا کر لیتی تھی۔

ایک رات میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی' میری دوسری اولاد کے دنیا میں آنے کا وقت آ گیا تھا۔ محلے والوں نے مجھے ایک سرکاری زچہ خانے میں داخل کرا دیا تھا' جہاں میں نے اپنے دوسرے بیٹے کو جنم دیا تھا۔

میں اُس وقت اسپتال میں تنہا پڑی اپنے اور ہونے والے بچے کے نصیبوں کو رو رہی تھی کہ اچانک ایک اجنبی عورت وارڈ میں داخل ہوئی تھی' اور میرے پاس آکر مجھے چپ کرانے لگی تھی' میں ایک ہمدرد پا کر اور بکھر سی گئی تھی۔ اور اپنے حالات کا رونا رونے لگی تھی۔

اُس عورت نے مجھے بتایا تھا کہ اس دنیا میں وہ بھی بالکل تنہا ہے' دولت کی اُس کے پاس کمی نہیں' لیکن کوئی عزیز رشتے دار دوست نہیں' وہ بھی تنہائی کی ڈسی ہوئی تھی اس نے مجھ سے کہا تھا کہ آج سے میں تمہاری اور تم میری سہیلی ہو' اور اب میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر میں ہی رہوں گی۔ اُس عورت جس نے اپنا نام صفیہ بتایا تھا اُس کی باتوں میں کچھ ایسا اثر تھا کہ میں جواب میں کچھ کہہ ہی نہیں سکی تھی۔ صفیہ اسپتال سے میرے ساتھ ہی گھر آگئی تھی۔ اس کے آنے سے مجھے بہت سہارا ہو گیا تھا۔ اُس نے آتے ہی گھر کا سارا کام سنبھال لیا تھا۔

وہ ہر کام اتنی جلدی کر دیتی کہ میں اس کی پھرتی پر



حیران رہ جاتی صفیہ نے میرا گھر ہر قسم کی اشیاء سے بھر دیا تھا۔ اب مجھے اور میرے بچوں کو کسی بھی چیز کی کمی نہیں تھی۔ دوسرے لفظوں میں میری سہیلی صفیہ نے ہمارے گھر کو ایک بہت ہی خوشحال گھرانے میں تبدیل کر دیا تھا۔ میں اور میرے بیٹے علی اور حمزہ بہت آرام اور آسائش کی زندگی گزار رہے تھے۔ میری اس کہانی کی سب سے اہم بات یا خاص حصہ یہ ہے کہ جب سے میری سہیلی صفیہ میرے گھر آئی تھی۔ میرے گھر کی دیوار پر رہنے والی وہ چھپکلی نجانے کہاں غائب ہوگئی تھی جس سے میں بھی دل کی ہزاروں باتیں کیا کرتی تھی۔

صفیہ کو ہمارے ساتھ رہتے ہوئے تقریباً آٹھ برس ہوگئے تھے۔ ایک صبح میں سوکر اٹھی تو مجھے صفیہ دکھائی نہیں دی، میں نے سوچا کہ کسی کام سے باہر نہ گئی ہو۔ اُس کا انتظار کرتے ہوئے دن سے رات ہوگئی پر وہ نہ آئی بچے صفیہ خالہ کہہ کر اُسے یاد کرتے روتے رہے۔ میرا بھی پریشانی کے مارے برا حال تھا۔ سب جگہ پوچھ لیا پر کچھ پتا نہ چل سکا۔ اُس کے جانے کے بعد ہم بہت اُداس ہوگئے تھے، میں بھی اُسے یاد کر کے دکھی ہو جاتی اور یوں ایک سال بیت گیا۔ اب یہاں میں آپ کو حیرت کی یہ بات بھی سنا دوں کہ جس روز سے صفیہ میرا گھر چھوڑ کر گئی تھی وہ چھپکلی دیوار پر پھر نظر آنے لگی تھی۔

اُس روز میرے بیٹے فاخر کی سالگرہ تھی۔ میں سوکر اٹھی تو بیڈ پر سالگرہ کے تحفے موجود تھے۔ میں خوشی سے باہر بھاگی کہ صفیہ آگئی پر وہاں کوئی موجود نہ تھا گھر کا دروازہ بھی لاک تھا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ یہ تحفے میرے گھر میں کیسے آگئے؟ اب مجھے کچھ خوف بھی محسوس ہو رہا تھا۔ فاخر سو کر اٹھا تو اُن چیزوں کو دیکھ کر خوشی سے چیختے ہوئے بولا کہ صفیہ خالہ آگئی ہیں۔

میں نے اسے یہی بتایا کہ وہ آئی تھیں پر آپ کو سوتا دیکھ کر چلی گئیں۔ وہ اب اپنے بھائی کے ہاں رہتی ہیں، آپ سے ملنے جلد ہی دوبارہ آئیں گی۔ میں نے اُس کے سامنے یہ بات بنا دی تھی۔ پر میری عقل کام نہیں کر رہی تھی کہ یہ سب کیا ہے اور کیسے ہوا؟

میرا تمام دن انہی سوچوں میں گزرا تھا۔ اور رات کو سوتے ہوئے بھی اسی بارے میں سوچ رہی تھی، اور شاید اسی لیے مجھے خواب میں بھی صفیہ ہی نظر آئی تھی۔ وہ مسکراتی آنکھوں کے ساتھ مجھ سے مخاطب تھی۔

''صائقہ! تمہیں یاد ہے بہت سال پہلے تم مجھے بس ایک چھپکلی سمجھ کر مجھ سے اپنی تنہائی اور حالات کا رونا روتی تھیں، تم اِس بات سے ناواقف تھیں کہ میں چھپکلی نہیں، بلکہ اُس کے روپ میں ایک جنی ہوں، تو میں نے سوچا تھا کہ میں روپ بدل کر تمہارے ساتھ رہوں گی، اور تمہاری مدد بھی کروں گی۔ اور پھر میں نے ایسا ہی کیا اور صفیہ کے روپ میں تم سے ملی، تمہارے ساتھ میرا وقت بہت اچھا گزرا، میں صفیہ کے روپ میں تمہارے ساتھ ہمیشہ رہتی لیکن میری کچھ مجبوری ہے جو اِس بات کی اجازت نہیں دیتی سو میں دوبارہ اس روپ چھپکلی میں آگئی مگر اب میں اِس روپ میں بھی تمہارے ساتھ، تمہارے گھر میں نہیں رہوں گی کیونکہ میرا راز کھل گیا ہے اب میں اپنے لوگوں میں واپس جا رہی ہوں۔

یہ کہہ کر وہ غائب ہوگئی تھی اور میری آنکھ کھل گئی تھی۔

آج میرے بیٹے جوان ہوچکے ہیں علی کی تو شادی بھی ہوگئی ہے۔ میرا ایک پیارا سا نواسہ بھی ہے جو چھپکلیوں کا دشمن ہے، جہاں چھپکلی نظر آئی اُس نے ڈنڈا اٹھایا۔ میں اُسے چھپکلی کو مارنے سے اور تنگ کرنے سے سختی کے ساتھ منع کرتی ہوں...... وہ ہنستے ہوئے کہتا ہے۔

''نانو آپ چھپکلی سے ڈرتی ہیں؟''

اب آپ ہی بتائیں میں اپنے نواسے کو کیا جواب دوں؟ اپنی چھپکلی سے جڑی ناقابلِ یقین کہانی تو اُسے نہیں سنا سکتی نا؟ اور اگر سنا بھی دوں تو کیا وہ یقین کرلے گا؟ ارے اُس کی بات تو چھوڑیں بھلا آپ نے کون سا یقین کرلیا ہے؟

☆☆......☆☆

ناول

حمیرا خان



قسط نمبر: 04

اُس نوجوان کی سرگزشت جس کے سینے میں انتقام کا جوالا مکھی بھڑک رہا تھا

اکرم کا خیال غلط نہیں تھا عالیہ بھی پہلی نظر کی محبت کا شکار ہو گئی تھی اس رات وہ بھی چین سے سو نہیں پائی تھی' اس نے نواب کو کتنے سال بعد دیکھا تھا وہ کتنا بدل گیا تھا بدل تو وہ خود بھی بہت گئی تھی لیکن اپنے اندر آئی تبدیلی کا احساس نہیں ہوا کرتا لیکن دوسرے کو دیکھ کر اس چیز کا بہت احساس ہوتا ہے لمبا چوڑا نواب کتنا دلکش لگ رہا تھا یہ کوئی عالیہ کے دل سے پوچھتا۔ وہ تو اس مختصر سی ملاقات میں ہی دل ہار بیٹھی تھی اور بچپن کے ان دنوں کو یاد کر رہی تھی' جب وہ ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ اس کی زندگی میں اب بھی رانی کے علاوہ کوئی ایسی دوست نہیں تھی جس سے دل کی باتیں کر سکتی اس لیے اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ اڑ کر رانی کے پاس پہنچ جائے اور اپنے دل کا حال کہہ سنائے اور اپنی اس سکھی سے اس مسئلے کا حل پوچھے اس سے پوچھے کہ اب کیا کرے؟ دوسری طرف ایک اور خیال اسے تنگ کر رہا تھا کہ کیا نواب بھی اس کے لیے وہ سب سوچ رہا ہو گا محسوس کر رہا ہو گا جو وہ سوچ رہی تھی اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ کبھی اسے لگتا کہ وہ سراب کے پیچھے جانے لگی ہے اور جب نواب کی نظریں یاد آتیں تو دل اچھل اچھل ہونے لگتا اسے یقین ہونے لگتا کہ اس کی محبت یکطرفہ نہیں ہے لیکن پھر اچانک مایوسی اس پر حملہ کر دیتی اور دماغ کہتا کہ وہ اتنی خوبصورت ہے کہ جو بھی دیکھے دیکھتا رہ جائے ایسے میں اگر نواب اسے ٹکٹکی باندھ کے دیکھتا رہا تھا تو اس میں کوئی نئی یا عجیب بات نہیں تھی اس کے دیکھنے سے یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا تھا کہ اسے عالیہ سے محبت ہو گئی تھی' یہ دلیل اسے اُداس کر دیتی تھی پھر وہ اس سے الٹ سوچنے لگتی' سوچتی کہ اس کی طرح نواب بھی پہلی نظر میں اس کی محبت میں مبتلا ہو گیا ہو گا اور ایسا سوچتے ہی اس کی آنکھیں جگمگانے لگتیں ہونٹ مسکرانے لگتے اور پلکیں خوابوں کے بوجھ سے بند ہونے لگتیں اور اسی طرح خوابوں میں کھوئے ہوئے وہ نیند کی وادیوں میں اتر جاتی لیکن کچھ دیر میں پھر چونک کر اٹھ جاتی پھر وہی سوال جواب پھر وہی کشمکش عالیہ کی پوری رات ایسے ہی گزری تھی صبح تک وہ اس کشمکش کی وجہ سے نڈھال ہو رہی تھی۔

☆......☆......☆

صبح ہوتے ہی وہ بستر سے اٹھ بیٹھی وہ جو روز بارہ بجے تک بستر پر ہوتی تھی اور جس پر چوہدرائن اسے روز صبح جلدی اٹھنے کے فائدے بتاتی اور نصیحتیں کرتی تھی لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا آج صبح سویرے نا صرف اٹھ چکی تھی

بلکہ کچن میں آ کر اپنی نگرانی میں نواب کے لیے ناشتہ تیار کروا رہی تھی اسے ملازموں سے پتا چل گیا تھا کہ نواب کے ساتھ اس کا کوئی دوست بھی ہے اس لیے اس نے ناشتہ بھیجتے ہوئے نواب کے علاوہ اس کے دوست کے لیے بھی بھیج دیا تھا۔ ناشتہ بھجوانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آئی اور چادر اٹھا کر رانی کے پاس جانے کو تیار ہوگئی۔ وہ چاہتی تو کسی ملازم کو بھیج کر رانی کو اپنے پاس بلوا سکتی تھی لیکن اس کے دل میں ایسی بے چینی لگی تھی کہ وہ اتنا سا بھی انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ جب وہ رانی کے گھر پہنچی تو وہ ناشتے سے فارغ ہو کر گھر کے کام سمیٹنے میں لگی ہوئی تھی' اتنی صبح عالیہ کو اپنے گھر دیکھ کر رانی حیران تو ہوئی مگر کچھ کہا نہیں کہ یہ نہ ہو عالیہ ناراض ہی ہو جائے وہ بہت نازک مزاج تھی کسی بھی چھوٹی سے چھوٹی بات پر کسی سے بھی ناراض ہو جایا کرتی تھی حتیٰ کہ اس کی مرضی کے خلاف ذرا بھی کچھ ہوتا تو وہ اپنے ماں باپ سے بھی کئی کئی دن بات نہیں کرتی تھی رانی تو پھر رانی تھی صرف ایک دوست اس لیے رانی اس سے ذرا سنبھل کر بات کیا کرتی تھی اس لیے اب بھی اس نے عالیہ کو دیکھ کر خوشی کا اظہار تو کیا لیکن حیرت چھپا گئی۔

''تمہیں پتا ہے گاؤں میں کون آیا ہے؟'' عالیہ اس کے تاثرات سے بے نیاز پوچھ رہی تھی اس کے لہجے میں دبا دبا جوش تھا جسے محسوس کرتے ہوئے عالیہ بھی اس کی بات میں دلچسپی محسوس کرنے لگی۔

''ہاں بس اتنا پتا ہے کہ ساجدہ خالہ والے مکان میں کوئی آیا ہوا ہے۔'' رانی نے جواب دیا۔

''نواب آیا ہے اور ساتھ میں اس کا دوست ہے۔'' عالیہ نے ایسے بتایا جیسے کوئی اہم انکشاف کیا ہو جس سے رانی اب تک بے خبر تھی۔

''نواب......'' رانی کو فوری طور پر یاد نہیں آیا کہ نواب کون ہے لیکن پھر عالیہ کے یاد کرانے پر اسے سب یاد



آ گیا تھا۔ اور عالیہ کی خوشی اور جوش وخروش دیکھ کر وہ اس کے دل کا بھید بھی جان گئی تھی باقی کی باتیں عالیہ نے خود اسے بتا دی تھیں ویسے بھی وہ اس کی راز دار سہیلی تھی عالیہ کی ہر بات جو اس کے گھر والے بھی نہیں جانتے تھے وہ بھی رانی کو معلوم تھی۔ اور پھر عالیہ نے اس سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ نواب کو دیکھنا اور اس سے ملنا چاہتی ہے اس لیے رانی کو اس کے ساتھ نواب کے گھر جانا ہوگا۔ عالیہ کے اس حکم نما فرمائش پر رانی سوچ میں پڑ گئی تھی جانتی تھی کہ جب حویلی یہ خبر پہنچے گی تو عالیہ کو تو کوئی کچھ نہیں کہے گا لیکن اس کی خوب کھنچائی ہوگی اور گھر والوں سے جو سننا پڑے گا وہ الگ لیکن عالیہ کی بات ٹالنا بھی تو اس کے لیے کسی طرح ممکن نہیں تھا۔

☆......☆......☆

رانی ماں کو حویلی جانے کا کہہ کر عالیہ کے ساتھ اپنے گھر سے نکل آئی اُن کا رخ نواب کے گھر کی طرف تھا' راستہ بھر وہ نواب کے بارے میں ہی بات کرتی رہی تھیں' جب وہ نواب کے گھر پر پہنچے تو عالیہ دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے ہچکچانے لگی رانی نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی عالیہ اس کے پیچھے کھڑی ہوگئی وہ یہاں تک آ تو گئی تھی لیکن اب سوچ رہی تھی کہ اس کے اس طرح آنے پر نواب پتا نہیں اس کے بارے میں کیا خیال کرے گا کیا سوچے گا کہ یہ کیسی لڑکی ہے جو اس سے ملنے چلی آئی ہے' اسے زیادہ دیر اس بارے میں سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا کیونکہ دروازہ کھل گیا تھا دروازہ کھولنے والا اکرم تھا جو اپنے گھر کے دروازے پر دو خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔

''میں رانی ہوں اور یہ عالیہ ہے چوہدری کی بیٹی ہم حویلی سے آئے ہیں۔'' اکرم کی سوالیہ نظروں کے جواب میں رانی نے اپنا اور عالیہ کا تعارف کروا دیا تو اکرم نے چونک کر عالیہ کی طرف دیکھا تھا اور پھر مسکراتے ہوئے دروازے پر سے ہٹ کر انہیں راستہ دیتے ہوئے اندر آنے کا کہا تھا اس کی مسکراہٹ بہت معنی خیز تھی۔

''کون ہے اکرم......'' پیچھے سے نواب نے پوچھا تھا۔ اسی لمحے عالیہ اور رانی گھر کے اندر داخل ہوئیں وہ عالیہ کو اس طرح اپنے گھر دیکھ کر حیران رہ گیا تھا اور پھر حیرت سے نکل کر اس نے اُن کا پرتپاک استقبال کیا تھا اور انہیں اندر چلنے کو کہا تو عالیہ کہنے لگی۔

''ہم صرف یہ پوچھنے آئے تھے کہ آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔'' اس کے اس طرح کہنے پر نواب بے اختیار مسکرا دیا اس کا بہانہ بے تکا تھا اگر اسے نواب کی فکر بھی تھی تب بھی وہ رانی یا کسی ملازم کو بھیج کر ان کی ضرورت کے بارے میں پتا کر سکتی تھی لیکن وہ خود چل کر ان کے گھر آئی تھی اسی سے پتا چل رہا تھا کہ اس کا دل بھی نواب کے لیے اتنا ہی بے چین تھا جتنا کہ نواب کا اس کے لیے تھا۔ اس بات کے بعد عالیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا بات کرے اس لیے اپنی بات کو سچا ثابت کرنے کے لیے وہ واپسی کے لیے مڑتے ہوئے بولی تھی۔

''نہیں ہم بیٹھیں گے نہیں ہم بس یہی پوچھنے آئے تھے اب ہم جاتے ہیں۔'' نواب کی اندر تک اترتی محبت بھری نظروں نے عالیہ کو گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا تھا اسے بہت زیادہ شرم بھی آ رہی تھی اس لیے وہ مزید وہاں نہیں رک پا رہی تھی۔

''تم نے آج یہاں آ کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے مجھے اس کشمکش سے نکال دیا ہے کہ صرف میں ہی تمہارے لیے تڑپ رہا ہوں۔'' نواب نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے عالیہ کے کان میں سرگوشی کی اس کا اس طرح اظہار سن کر عالیہ کے گلابی گال شرم سے سرخ پڑ گئے اور اس کے ہونٹ بے ساختہ مسکرانے لگے اس نے ایک نظر نواب کی طرف دیکھا اور بنا کچھ کہے مسکراتے ہوئے دروازہ پار کر گئی پیچھے نواب وہیں کھڑا دروازے کو تکتا رہ گیا تھا اس کا دل خوشی سے اچھل رہا تھا اور ہونٹوں پر بڑی خوبصورت مسکراہٹ تھی۔

''بس اب اندر چل میرے بھائی' بھابی جا چکی ہے۔'' اکرم نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو نواب خیالوں کی دنیا سے باہر آ گیا۔ اکرم کا اس طرح بھابی کہنا بھی نواب کو بہت بھایا تھا۔

''دیکھا میں نے کہا تھا نا دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔'' اکرم نے کہا تو نواب اس کے اتنے درست اندازے کی تعریف کرنے لگا۔ آج وہ اپنے آپ کو ایک نیا انسان محسوس کر رہا تھا اس کے دل کی دنیا کیا بدلی تھی ارد گرد کی دنیا بھی بدلی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔ ان کا ارادہ تو یہی تھا کہ ایک دن گاؤں رک کر واپس چلے جائیں گے لیکن اب نواب کا وہاں سے جانے کا دل نہیں کر رہا تھا اور اکرم بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ اب چوہدری چوہدرائن سے ملے بنا نواب وہاں سے نہیں ہلے گا اس لیے اس نے بھی واپسی کی بات نہیں کی تھی۔

☆......☆......☆

عالیہ جب گھر پہنچی تو صحن میں ہی اس کا سامنا اپنے بڑے بھائی وسیم سے ہو گیا۔

''کہاں سے آ رہی ہو تم......'' اس نے خاصے غصیلے لہجے میں سوال کیا تھا عام طور پر تو وہ ایسے لہجوں کو خاطر میں نہ لاتی تھی لیکن آج چونکہ دل میں چور تھا اس لیے تھوڑا سہم سی گئی تھی۔

''رانی کے گھر گئی تھی۔'' عالیہ نے ساتھ کھڑی رانی کی طرف دیکھتے ہوئے ذرا لاپرواہی سے کہنے کی کوشش کی۔

''بکواس بند کرو مجھے معلوم ہے تم دونوں کہاں سے آ رہی ہو۔'' وہ اس جھوٹ پر عالیہ کو گھورتے ہوئے بولا تو رانی کی تو سمجھو جان ہی نکل گئی یقیناً کسی نے یہ خبر حویلی پہنچا دی تھی کہ وہ دونوں نواب کے گھر گئے تھے اب عالیہ کا تو جو ہوتا سو ہوتا لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کی خیر نہیں ہے اس لیے وہ باقاعدہ کانپنے لگی تھی۔

''اس کو تو اماں پوچھ لیں گی تم مجھے بتاؤ تم اسے وہاں کیوں لے کر گئی تھی۔'' اب وسیم رانی سے مخاطب تھا رانی عجیب مصیبت میں پھنس گئی تھی جس طرح وہ عالیہ کو انکار نہیں کر پائی تھی اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ اسے وہاں جانے کے لیے عالیہ نے مجبور کیا تھا۔ عالیہ تو اس کے اس انداز میں بات کرنے پر ناراض ہو کر اندر چلی گئی اور رانی دیر تک سر جھکائے وسیم کی باتیں سنتی رہی۔

☆......☆......☆

عالیہ وہاں سے سیدھا اپنے کمرے میں گئی تھی ناراضگی کا بہانہ کر کے اس نے وسیم سے جان تو چھڑوا لی تھی لیکن



اس کے اندر آنے سے پہلے وسیم نے اس پر اچھی طرح یہ بات واضح کر دی تھی کہ وہ دوبارہ کبھی نواب یا اس کے گھر کے ارد گرد بھی دکھائی نہ دے ورنہ اس کے لیے اچھا نہ ہوگا اور اماں ابا بھی اسے وسیم سے نہیں بچا سکیں گے اس وقت تو عالیہ نے بدتمیزی سے الٹے جواب دے دیے تھے لیکن دل ہی دل میں وہ ڈر بھی گئی تھی آج تک اس نے جو بھی من مانیاں کی تھیں ان میں کوئی بھی بات کسی لڑکے کے بارے میں نہیں تھی۔ اسی لیے اماں ابا بھی اس کا ہی ساتھ دیتے تھے اور اس طرح وہ اپنی ہر ضد پوری کر لیا کرتی تھی لیکن اب معاملہ مختلف تھا اسے یقین تھا اس معاملے میں ماں باپ بھی وسیم کو ہی ٹھیک سمجھیں گے اور اسے ہی ڈانٹیں گے اسی لیے وہ بہت پریشان ہوگئی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ اس نے کبھی کسی لڑکے کو دیکھا نہیں تھا بات نہیں کی تھی سارے گاؤں کے لڑکے اس پر جان دیتے تھے وہ اپنی خوبصورتی اور اہمیت سے بخوبی واقف تھی اور جو اس کو اچھا لگ جاتا اس کو تھوڑی بہت لفٹ بھی دے دیا کرتی تھی۔ زیادہ تر وہ ان کے تڑپنے کا مزہ ہی لیا کرتی تھی۔ لیکن وہ خود کبھی کسی کے لیے نہیں تڑپی تھی۔ لڑکے طرح طرح سے اس کے آگے پیچھے پھرتے اس کی راہ میں پلکیں بچھاتے اس کی محبت میں مرنے مارنے کی باتیں کرتے لیکن وہ ہنس کر ٹال جاتی نہ تو کسی کو ہاں کرتی اور نا ہی کسی کو انکار کرتی وہ فطرتاً تھوڑی فلرٹ تھی یا خوبصورتی کے احساس اور اتنے لڑکوں کے آگے پیچھے پھرنے کی وجہ سے ایسی ہوگئی تھی مگر یہ ضرور تھا کہ وہ فلرٹ تھی لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی سچ تھی کہ اس کا تعلق صرف زبانی کلامی ہی رہا تھا اس سے زیادہ اس نے کبھی کسی کو اپنے قریب نہیں ہونے دیا تھا۔ لیکن نواب کا معاملہ مختلف تھا نواب پہلی نظر میں ہی اس کے دل میں اتر چکا تھا وہ پہلا انسان تھا جس کے لیے وہ تڑپ رہی تھی یعنی اسے سچ مچ نواب سے محبت ہوگئی تھی۔ رانی وسیم سے ڈانٹ کھا کر اندر آئی تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا وسیم نے اس کی اچھی خاصی کلاس لے لی تھی۔ عالیہ نے اس سے ساری تفصیل پوچھی اس نے ایک ایک لفظ بتا دیا جو کچھ بھی وسیم نے اس سے کہا تھا۔ جیسے جیسے وہ بات کر رہی تھی عالیہ کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

شام کا کھانے کا وقت قریب آیا تو عالیہ کچن میں چلی آئی تاکہ نواب کے گھر کھانا بھیج سکے لیکن جب اس نے ملازم کو کھانا لے جانے کے لیے کہا تو اس نے جانے سے صاف منع کر دیا اور بتایا کہ وسیم نے انتہائی سختی سے اسے کہا ہے کہ نواب کے گھر نہ جائے اور کھانا لے کر تو بالکل بھی نہ جائے۔ عالیہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اب چاہے کچھ بھی ہو جائے ملازم اس کی بات نہیں مانیں گے اس لیے چپ چاپ اپنے کمرے میں آگئی اور اس رات عالیہ نے اپنی ناراضگی کے اظہار کے طور پر کھانا کھانے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ ملازمہ جتنی بار بھی اس سے کھانے کا پوچھنے آئی اس نے ملازمہ کو ڈانٹ کے بھگا دیا تھا اب ماں باپ تو گھر تھے نہیں جو اس کے نخرے اٹھاتے وسیم ویسے ہی شروع سے غصے کا تیز تھا اور عالیہ کے معاملے میں اس کی یہ سوچ بھی تھی کہ گھر والے اسے کچھ زیادہ ہی اہمیت دیتے ہیں جس کی وجہ سے عالیہ بگڑ گئی ہے اپنی اس سوچ کی وجہ سے بھی اس نے اس بات کی بالکل پرواہ نہیں کی عالیہ نے کھانا نہیں کھایا بلکہ جب ملازمہ نے اسے عالیہ کے کھانا نہ کھانے کے بارے میں بتایا تب بھی اسے کوئی فکر نہیں ہوئی اور اس نے ملازمہ سے بھی کہہ دیا کہ دوبارہ اس کے پاس کھانا لے کر جانے کی ضرورت نہیں ہے جب بھوک لگے گی تو خود ہی کھانا مانگ لے گی۔ عالیہ کی وہ رات بہت بری گزری تھی بھوک اور غصے سے اس کا برا حال تھا وہ شدت سے ماں باپ کی واپسی کی منتظر تھی تاکہ بھائی کی شکایت کر کے اسے ڈانٹ پڑوا سکے۔

☆......☆......☆

اس شام اکرم اور نواب انتظار ہی کرتے رہے لیکن حویلی سے کھانا آیا اور نہ ہی کوئی پیغام آخر جب بہت دیر ہوگئی اور ہوٹل بند کرنے کا وقت ہونے لگا تو انہوں نے ہوٹل جا کر کھانا کھایا اس کے بعد وہ یونہی ٹہلتے ہوئے اس گراؤنڈ کی طرف نکل آئے جہاں بچپن میں وہ کھیلا کرتے تھے بچپن میں یہ گراؤنڈ ان کی سب سے پسندیدہ جگہ ہوا کرتی تھی۔ یہاں وہ کھیلتے لڑتے اور پھر سے ایک ہو جاتے وہ دونوں وہاں کھڑے دیر تک باتیں کرتے رہے اور

گزرے وقت کو یاد کرتے رہے۔ وہ واپس گھر آئے تو بھی نواب لاشعوری طور پر عالیہ کے بارے میں ہی سوچ جا رہا تھا جبکہ اکرم گھر آنے کے بعد کچھ دیر نواب سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا تھا اور پھر سو گیا تھا لیکن نواب بہت بے چین تھا بار بار اسے ایک ہی بات ستائے جا رہی تھی کہ کیا عالیہ کو اس کی کوئی بات بری لگی تھی لیکن جب عالیہ کا شرمایا ہوا مسکراتا چہرہ اس کے تصور میں آتا تو یہ سوال خود ہی اپنی موت آپ مر جاتا تھا تو پھر ایسا کیا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے حویلی سے کھانا نہیں آیا تھا نواب کا دل کہہ رہا تھا کہ وہاں ضرور کچھ ہوا ہے وہ تو چاہتا تھا کہ حویلی جا کر پتا کرے لیکن اکرم نے ایسے ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔ اب صبح کا انتظار کرنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆......☆......☆

اگلے دن صبح صبح رانی عالیہ کی طرف چلی آئی تھی اسے آگے کی کہانی جاننے کی جلدی تھی اور جب اسے پتا چلا کہ عالیہ نے رات سے کھانا بھی نہیں کھایا ہوا تو بہت پریشان ہوگئی پھر اس نے بڑی منتیں کر کے اور نواب کا واسطہ دے کر اسے ناشتے کے لیے راضی کیا تھا۔ عالیہ کو بھوک بھی بہت لگی ہوئی تھی اس لیے تھوڑے بہت نخروں کے بعد آخر اس نے ناشتہ کر لیا تھا۔ عالیہ نے رانی کو تیار کیا تھا کہ وہ اس کا پیغام لے کر نواب کے پاس جائے اور اسے شام کو کھیتوں میں ملنے کے لیے کہے۔ رانی نے پہلے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اگر ان کی اس ملاقات کے بارے میں وسیم کو معلوم ہو گیا تو بہت برا ہوگا لیکن وہ عالیہ ہی کیا جو کسی کی بات مان جائے وہ تو ویسے بھی بہت ضدی تھی اور اپنی بات منوانے والی اور اب تو معاملہ بھی دل کا آ گیا تھا آخر رانی کو عالیہ کی بات ماننی ہی پڑی۔

☆......☆......☆

نواب کی رات بے چینی میں گزری تھی وہ سکون سے سو نہیں پایا تھا صبح بھی وہ اکرم سے پہلے بستر سے اٹھ بیٹھا تھا اور لاشعوری طور پر وہ عالیہ کا منتظر تھا لیکن دن چڑھ گیا وہ نہیں آئی۔ وہ گھر بند کر کے باہر جانے کو تیار نہ تھا کہ کہیں پیچھے عالیہ نہ آ جائے اور گھر بند دیکھ کر اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا' اس لیے اکرم ہوٹل سے ناشتہ گھر پر ہی لے آیا تھا اور دونوں نے گھر پر ہی ناشتہ کیا تھا ناشتہ کیا کرنا تھا نواب نے تو بس دو چار نوالے ہی زہر مار کیے تھے وہ بھی اکرم کے کہنے پر۔ اس کے بعد بھی وہ باہر جانے کو تیار نہ ہوا تو اکرم جا کر کمرے میں لیٹ گیا اور نواب بے چینی سے سارے گھر میں گھومتا پھر رہا تھا۔ جب کافی دیر ہوگئی اور انتظار کرنے کی ہمت نہ رہی تو نواب حویلی جانے کا سوچ کر گھر سے باہر کی طرف چلا لیکن ابھی وہ گھر سے نکلا ہی تھا کہ اس نے رانی کو اپنے گھر کی طرف آتے دیکھا وہ وہیں کھڑے ہو کر اسے قریب آتے دیکھتا رہا' جب رانی قریب آئی تو نواب کو احساس ہوا کہ وہ کافی گھبرائی ہوئی تھی نواب اسے فوراً گھر کے اندر لے گیا رانی نے اسے عالیہ کا پیغام دینے سے پہلے وسیم اور عالیہ کے درمیان ہوئی باتوں کے بارے میں بھی بتا دیا۔ ساری بات سن کر نواب گہری سانس بھر کر رہ گیا اس کی محبت کی کہانی کے آغاز میں ہی سماج درمیان میں آ گیا تھا وہ کسی کی پرواہ کرنے والا تھا اس نے آج تک جو چاہا تھا وہ کیا تھا اور پھر عالیہ تو اس کی محبت تھی اسے وہ کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا تھا کسی کے لیے بھی نہیں' رانی تو پیغام پہنچا کر وہاں سے چلی گئی تھی لیکن نواب سوچ میں پڑ گیا تھا کہ آگے کے حالات سے کیسے نپٹنا ہوگا اور پھر اس کی سوچیں عالیہ کی طرف مڑ گئیں تو وہ مستقبل کی فکروں کو بھول کر عالیہ کے حسین خوابوں میں کھو گیا اسے شدت سے شام ہونے کا انتظار تھا۔

☆......☆......☆

رانی نواب کو پیغام دینے کے بعد سیدھی حویلی پہنچی تھی وہاں پھر اس کا وسیم سے سامنا ہو گیا تھا لیکن وسیم نے اسے صرف غصے کی نظروں سے گھورنے پر اکتفا کیا تھا اور کوئی بات نہیں کی تھی۔ رانی بھی جلدی سے اندر کی طرف بڑھ گئی تھی اور تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس نے عالیہ کے کمرے میں پہنچ کر ہی دم لیا تھا عالیہ اس کی ہی منتظر تھی رانی نے بڑی تفصیل سے اسے اپنے اور نواب کے درمیان ہوئی بات چیت بتا دی تھی لیکن پھر بھی عالیہ بار بار اس

سے یہی پوچھے جا رہی تھی اور عالیہ کی دیوانگی پر ہنستے ہوئے رانی بار بار اس کی باتوں کا جواب دیے جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

شام ہوتے ہی نواب مطلوبہ جگہ پر پہنچ گیا تھا لیکن اسے وہاں عالیہ کہیں دکھائی نہیں دی تھی وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا عالیہ اسے آتی دکھائی دے گئی تھی دونوں بہت گرم جوشی سے ملے تھے' پیار محبت کی قسمیں کھائی گئیں اور ساتھ جینے مرنے کے وعدے کیے گئے۔ دونوں جوان تھے اور دونوں ضدی اور دونوں کو پہلی بار محبت ہوئی تھی دونوں کسی بھی حد سے گزرنے کو تیار تھے وہ شام ان دونوں نے ایک ساتھ گزاری تھی اور بہت ساری باتیں کی تھیں۔ پھر دونوں اپنے اپنے راستے پر چلے گئے تھے۔

☆......☆......☆

نواب گھر پہنچ کر بھی عجیب سی سرشاری میں تھا اکرم گھر پر اس کا منتظر تھا اسے آتے دیکھا تو مسکرایا۔

''ہوگئی ملاقات؟'' اکرم نے پوچھا۔

''ہاں یار ہوگئی لیکن اب دوبارہ پتا نہیں کب ملنا ہوگا۔'' نواب نے بے چارگی سے کہا تو اکرم ہنس پڑا۔

''ابھی مل کر آئے ہو اور دوبارہ ملنے کی بات کر رہے ہو' مطلب تم تو پکا پکا عشق کے جال میں پھنس چکے ہو۔'' اکرم کے کہنے پر نواب بھی مسکرا دیا۔

''یہ سب ٹھیک ہے یار لیکن تم بھول گئے ہو ہم پیچھے بھی ایک زندگی چھوڑ کر آئے ہیں آج میری بات ہوئی ابا سے پوچھ رہے تھے' واپس کب آ رہے ہو۔ میں نے کہا نواب سے پوچھ کر بتاؤں گا' اب تم بتاؤ کیا ارادے ہیں؟'' اکرم کے پوچھنے پر نواب سوچ میں پڑ گیا۔

''یار میں چوہدری اور چوہدرائن سے مل کر ہی جانا چاہتا ہوں۔'' نواب نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

''لیکن وہ تو پتا نہیں کب واپس آئیں ہم کب تک ان کے انتظار میں بیٹھے رہیں گے۔'' اکرم نے پوچھا۔

''دو ایک دن میں آ ہی جائیں گے بلکہ عالیہ کہہ رہی تھی شاید کل صبح میں ہی آ جائیں' لیکن تمہاری بات بھی ٹھیک ہے ماما بھی اکیلے تنگ ہو رہا ہوگا تم ایسا کرو تم واپس چلے جاؤ میں دو چار دن بعد آ جاؤں گا۔'' نواب نے بیچ کی راہ نکالی کیونکہ وہ خود تو کسی صورت بھی ابھی واپس جانے کو تیار نہیں تھا لیکن اکرم کے احساس دلانے پر اسے خیال آیا تھا کہ پیچھے بھی وہ ایک دنیا ایک زندگی چھوڑ کے آیا ہے' اکرم نے اس کی بات سے اتفاق کیا تھا اور اگلے دن صبح سویرے وہ وہاں سے نکل گیا تھا وہ پبلک ٹرانسپورٹ سے گیا تھا اور گاڑی نواب کے لیے چھوڑ گیا تھا نواب نے اسے بہت کہا تھا کہ وہ گاڑی لے جائے لیکن وہ نہیں مانا تھا۔ اس طرح اب نواب گاؤں میں اکیلا رہ گیا تھا۔

☆......☆......☆

اسی صبح چوہدری اور چوہدرائن کی گاؤں واپسی ہوئی تھی وہ لوگ دن نکلنے کے کچھ دیر بعد حویلی پہنچے تھے واپسی پر گاؤں کے حالات پوچھنے پر انہیں نواب کی گاؤں میں آمد کے بارے میں بھی خبر ملی تھی جس پر چوہدری نے تو کسی قسم کے ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تھا البتہ چوہدرائن نے دل میں ایسی خوشی محسوس کی تھی جو کسی جاننے والے کے اچانک آ جانے سے ہوجایا کرتی ہے۔ وہ ابھی تک یہ بات نہیں بھولی تھی کہ نواب نے جاتے ہوئے کس خلوص سے اپنے سارے کھلونے ان کی عالیہ کو دے دیے تھے اپنی سب سے قیمتی چیز وہ اسے دے گیا تھا ساجدہ کے حوالے سے بھی وہ نواب سے اپنائیت کا رشتہ محسوس کرتی تھی۔ چوہدری کی واپسی کی خبر سن کر گاؤں سے بھی کئی لوگ ان سے ملنے آ گئے جنہوں نے مختلف معاملات میں چوہدری سے فیصلہ کروانا تھا تو کسی نے کسی اور معاملے میں مشورہ لینا تھا چوہدرائن بھی گاؤں کی عورتوں کے ساتھ مصروف رہی اور عالیہ اسے ساری باتیں بتانے کے لیے بے چین سارا وقت چوہدرائن کے ارد گرد منڈلاتی رہی اور جیسے ہی چوہدرائن کو فرصت ہوئی اس نے الف سے یے تک ساری بات کہہ سنائی جس کا اصل مقصد وسیم کی شکایت کرنا تھا اور ظاہر ہے اس بیچ میں اس نے وہ ساری باتیں چھپالی تھیں

جن پر اسے ڈانٹ پڑ سکتی تھی۔ چوہدرائن کو وسیم کے روپے کے بارے میں جان کر بہت افسوس ہوا اور اس نے اسی وقت ملازم کو نواب کو بلانے کے لیے بھیج دیا۔

☆......☆......☆

اکرم کے جانے کے بعد نواب دوبارہ سو گیا تھا جب دوسری بار اُس کی آنکھ کھلی تو دن چڑھ آیا تھا وہ پھر بھی سستی سے لیٹا رہا لیکن آخر بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے بستر چھوڑ دیا نہا دھو کر جس وقت وہ گھر سے باہر نکلا اس وقت دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا اس لیے اس نے ناشتے کی بجائے کھانا کھانے کا فیصلہ کیا اور قریبی ہوٹل میں چلا آیا وہاں سے کھانا کھانے کے بعد وہ سیدھا گھر کی طرف چلا گیا ایک تو اس کے جانے کی اور کوئی جگہ نہیں تھی اور آوارہ گردی کا اس کا موڈ نہیں بن رہا تھا دوسرے اسے یہ خیال بھی رہتا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں کہیں عالیہ یا رانی وہاں نہ آئیں' اس مسئلے کے حل کے لیے اس نے سوچا تھا کہ جانے سے پہلے موبائل لے لے گا اور عالیہ کو بھی موبائل دے جائے گا تا کہ ان کے درمیان رابطہ رہ سکے۔ یہی باتیں سوچتا وہ اپنی گلی میں داخل ہوا تو اس نے حویلی کے ملازم کو اپنے دروازے پر کھڑا دیکھا ملازم کو دیکھ کر نواب کو حیرت ہوئی تھی جو حالات تھے ان میں حویلی کی طرف سے کسی کا آنا حیرت کی بات ہی تھی' وسیم نے عالیہ سمیت سب کو سختی سے منع کر رکھا تھا کہ نواب کے گھر نہ جایا جائے دروازے پر تالا لگا دیکھ کر ملازم واپسی کے لیے مڑا تو اس کی نظر نواب پر پڑی وہ وہیں ٹھہر کر نواب کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا اور جیسے ہی نواب اس کے قریب پہنچا ملازم نے چوہدرائن کا پیغام اسے پہنچا دیا چوہدرائن کے گاؤں واپس آ جانے کا سن کر نواب خوش ہو گیا تھا کیونکہ حویلی میں ایک چوہدرائن ہی تھی جس کے دل میں اس کے اور اس کے خاندان کے لیے کوئی نرم گوشہ موجود تھا ورنہ چوہدری اور اس کے بیٹے کو تو ان سے اللہ واسطے کا بیر تھا' یوں لگتا تھا جیسے چوہدری کے اندر کی ساری ناپسندیدگی وسیم میں ویسی کی ویسی منتقل ہو گئی ہو۔ ملازم پیغام دے کر واپس چلا گیا تو کچھ سوچتے ہوئے نواب بھی اس کے پیچھے پیچھے حویلی کی طرف چل دیا۔

☆......☆......☆

جب وہ حویلی پہنچا تو چوہدرائن کو اپنا منتظر پایا چوہدرائن اس سے بہت محبت سے ملی اور حال چال پوچھا' پھر اِدھر اُدھر کی تھوڑی باتوں کے بعد چوہدرائن نے ملازم کو اس کے لیے کھانا لگانے کو کہا تو اس نے کھانے سے معذرت کر لی اس دوران عالیہ بھی ماں کے پاس ہی بیٹھی رہی تھی' بظاہر تو نواب سے انجان بنتی عالیہ کی توجہ کا مرکز نواب ہی تھا نواب بھی باتوں کے دوران گاہے بگاہے عالیہ پر نظر ڈال لیتا تھا۔ جب نواب واپسی کے لیے اٹھا تو عالیہ بھی بہانے سے اٹھ کر اس کے پیچھے آئی اور نواب نے آہستہ سے اسے شام کو کھیتوں میں ملنے کا کہہ دیا اور اپنے گھر واپس چلا آیا۔ واپسی پر وہ چوہدرائن کے بارے میں ہی سوچتا رہا تھا اس کا رویہ بہت اچھا تھا لیکن کیا نواب اور عالیہ کے بارے میں معلوم ہونے کے بعد بھی اس کا رویہ ایسا ہی رہتا یا اس کے دل میں نواب کے لیے کوئی گنجائش رہتی' اسی طرح کے سوال تھے جو نواب کے ذہن میں آئے جا رہے تھے پھر اس نے سب سوالوں کو ذہن سے جھٹک دیا اور عالیہ سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں سوچنے لگا۔

☆......☆......☆

نواب اسی دوپہر قریبی شہر جا کر دو موبائل فونز لے آیا تھا ایک اپنے لیے اور دوسرا عالیہ کے لیے...... جب تک وہ شہر سے واپس آیا شام ہونے والی تھی یعنی عالیہ سے ملاقات کے لیے جو وقت طے تھا وہ قریب آ گیا تھا۔ گھر پہنچ کر نواب نے کچھ دیر آرام کیا اور پھر نہا دھو کر عالیہ سے ملنے طے شدہ جگہ پر پہنچ گیا جہاں عالیہ پہلے سے اس کی منتظر تھی عالیہ کو اپنے سے بھی پہلے وہاں موجود دیکھ کر نواب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''کہاں رہ گئے تھے میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔'' وہ شاید کچھ زیادہ ہی پہلے آ گئی تھی اسی لیے انتظار کر کر کے جھنجلائی ہوئی تھی۔ اسے یہ کہنے کی بجائے کہ وہ وقت سے پہلے وہاں آ گئی تھی نواب نے اپنے دیر سے

آنے پر اس سے معافی مانگی اور اسے منایا تو آخر اس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اور جب نواب نے موبائل نکال کر اس کے سامنے رکھا تو وہ اور بھی خوش ہوگئی اس نے نواب کو بتایا کہ اسے موبائل لینے کا کتنا شوق تھا لیکن وسیم کی وجہ سے وہ موبائل نہیں رکھ سکتی تھی اس روز دوسری باتوں کے علاوہ نواب اسے موبائل کا استعمال بھی سکھاتا رہا عالیہ بہت ذہین ثابت ہوئی تھی اس نے کچھ ہی دیر میں ضروری چیزیں سیکھ لی تھیں اور پریکٹس بھی کر لی تھی۔ عالیہ رانی کے گھر جانے کا کہہ کر حویلی سے نکلی تھی وہ زیادہ دیر نواب کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی اسے رانی کے گھر پہنچنا تھا یہ خدشہ بھی تھا کہ حویلی سے کوئی اسے بلانے کے لیے رانی کے گھر نہ پہنچ جائے اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کچھ دیر بعد واپسی کے لیے اٹھ گئی اور تب نواب نے اسے اپنی واپسی کے بارے میں بتایا تو وہ نواب کے جانے کا سن کر اُداس ہوگئی۔

''تم واپس تو آؤ گے؟'' یہ پوچھتے ہوئے عالیہ کے لہجے میں ڈھیروں خدشے بول رہے تھے۔

''اس بات کے لیے پریشان مت ہونا میں بہت جلد واپس آؤں گا۔'' نواب نے اسے اپنی محبت کا یقین دلاتے ہوئے کہا اور پھر ڈھیروں وعدوں اور قسموں کے ساتھ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔

عالیہ کو اللہ حافظ کہنے کے بعد نواب سیدھا قبرستان ساجدہ کی قبر پر چلا آیا کچھ دیر وہاں بیٹھنے اور فاتحہ پڑھنے کے بعد وہ گھر لوٹ آیا۔ نواب سے جدا ہو کر عالیہ سیدھی رانی کے پاس اس کے گھر پہنچی تھی اور پھر اس نے اسے موبائل دکھانے کے ساتھ ساتھ نواب کے جانے کا بھی بتایا تھا اور نواب کے جانے کا بتاتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی جس پر رانی نے بے اختیار اسے گلے لگا کر تسلی دی تھی۔ کچھ دیر اور رانی کے ساتھ گزار کر عالیہ حویلی لوٹ آئی تھی لیکن اس کا دل وہیں کہیں نواب کے پاس رہ گیا تھا۔

☆......☆......☆

واپسی کے سفر میں نواب اکیلا ضرور تھا لیکن اس کے دل میں عالیہ کی یادیں اور محبت بھی تھی۔ سفر میں اس کے ساتھ بات کرنے والا کوئی نہیں تھا اس لیے وہ مسلسل سوچوں میں کھویا رہا تھا بار بار اس کے ذہن میں آتا کہ عالیہ کو اپنی اصلیت نہ بتا کر وہ ایک طرح سے عالیہ کو دھوکا دے رہا ہے اور پھر یہ خیال بھی آتا کہ کیا سب کچھ جاننے کے بعد بھی عالیہ اس سے محبت کرے گی یا نہیں؟ اس کے گھر والوں کے بارے میں تو اسے یقین تھا کہ وہ کسی بھی صورت ایک جرائم پیشہ انسان کا رشتہ اپنی اکلوتی لاڈلی بیٹی کے لیے قبول نہیں کریں گے اس لیے انہیں سب کچھ بتانا مناسب نہیں تھا کیونکہ وہ کسی بھی صورت عالیہ کو کھونا نہیں چاہتا تھا لیکن وہ یہ ضرور چاہتا تھا کہ عالیہ کو اس کے ماضی اور حال کے بارے میں ہر ہر بات معلوم ہونی چاہیے تاکہ وہ اپنی مرضی کا فیصلہ کر سکے اسے ایسا نہ لگے کہ نواب نے اسے دھوکا دیا ہے' لیکن عالیہ کو بھی اپنی اصلیت بتانا نواب کو مشکل لگ رہا تھا اس نے کئی بار سوچا مگر عالیہ سے کچھ بھی نہ کہہ سکا اور واپسی پر اس کے دل پر بوجھ سا رکھا ہوا تھا۔

☆......☆......☆

دوسری طرف عالیہ بھی بے حد اُداس تھی ایک طرف تو اسے نواب پر بہت زیادہ اعتماد تھا اس کی محبت کا یقین تھا اور واپسی کا بھی لیکن دوسری طرف ڈھیروں خدشات تھے کہ کہیں شہر جا کر نواب اسے بھول نہ جائے یا پھر کوئی اور لڑکی اسے اپنی طرف متوجہ نہ کر لے وغیرہ وغیرہ' دوسرا جب وہ نواب سے شادی کے بارے میں سوچتی تو اپنے گھر والوں کا خیال ستانے لگتا اور وہ پریشان ہونے لگتی اس بات میں اسے ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ نواب کے رشتہ مانگنے پر اسے انکار ہی سننے کو ملتا لیکن لاڈلی بیٹی ہونے کے باعث یہ امید بھی تھی کہ وہ ضد کر کے ہمیشہ کی طرح اپنی بات منوا لے گی۔ اس کی بے فکری والی زندگی میں اچانک ہی سوچیں اور پریشانیاں آ گئی تھیں۔

☆......☆......☆

نواب رات ڈھلے گاؤں پہنچا تھا اور وہاں سے عابد کے پاس سے گھوڑا لے کر فوراً ہی جنگل کی طرف روانہ ہوگیا

تھا' جنگل میں اس روز اس کے سبھی ساتھی اڈے پر موجود تھے ان میں جو جاگ رہے تھے وہ اس کے آنے کی خبر سنتے ہی ملنے چلے آئے۔ اسلم سویا ہوا تھا لیکن گھوڑوں کی ٹاپوں سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی وہ بھی فوراً اپنے خیمے سے باہر آ گیا تھا' باقی سب تو مل کر واپس اپنے خیموں میں چلے گئے لیکن اسلم اور اکرم کافی دیر اس سے باتیں کرتے رہے تھے پھر اسلم بھی سونے کے لیے اٹھ گیا تو اکرم اس سے عالیہ کے بارے میں پوچھنے لگا۔ کافی دیر وہ عالیہ کے بارے میں باتیں کرتے رہے اور پھر دونوں سونے کے لیے لیٹ گئے۔ نواب تو اتنی لمبی ڈرائیو کر کے تھکا ہوا تھا فوراً ہی سو گیا جبکہ اکرم بھی کچی نیند سے جاگا ہوا تھا اس لیے اسے بھی جلد نیند آ گئی تھی۔

☆......☆......☆

اگلے دن سے نواب اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا تھا اس کے پیچھے کیا کچھ ہوا تھا وہ سب تفصیل اسے بتا دی گئی تھی اور اس دن اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر آئندہ کی پلاننگ کی تھی اس طرح اس کا وہ دن بہت مصروفیت میں گزرا تھا۔ جمال کو جیسے ہی اس کی واپسی کی خبر ملی تھی اس نے اسے ملنے کے لیے بلوا لیا تھا اس روز وہ چاہنے کے باوجود بھی عالیہ کو کال نہ کر سکا کیونکہ عالیہ نے اسے سختی سے کہا تھا کہ وہ ہمیشہ صرف رات کے وقت ہی اسے کال کرے دن میں کوئی اس کے پاس موجود ہو سکتا تھا اور اگر ایک بار بھی کسی نے اس کے پاس موبائل دیکھ لیا تو پھر انہیں ساری بات کا پتا چل جاتا۔ جیسے ہی رات ہوئی نواب نے گھڑی میں وقت دیکھ کر اندازہ کیا کہ اب عالیہ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آ چکی ہو گی اور اس نے جب فون ملایا تو عالیہ نے بیل ہوتے ہی کال ریسیو کر لی عالیہ کو اس طرح اپنا منتظر دیکھ کر نواب کا دل خوشی سے بھر گیا اور وہ دونوں کافی دیر فون پر بات کرتے رہے اور مستقبل کی پلاننگ کرتے رہے۔

☆......☆......☆

نواب جمال سے بات کرنے پہنچا تو جمال نے اسے جو کام بتایا وہ ایک سیاسی شخصیت کے اغواء کا تھا' جمال لاشعوری طور پر اس فیلڈ کو چھوڑنے کا سوچ رہا تھا اس لیے یہ بات سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''کس سوچ میں پڑ گئے ہو نواب مانا کہ بندہ سیاسی ہے لیکن تمہارے لیے کسی کو بھی اٹھانا کوئی مشکل کام تو نہیں ہے۔'' اسے سوچ میں پڑا دیکھ کر جمال نے کہا تھا۔

''کام مشکل ہونے کی بات نہیں ہے جمال صاحب بس میں سوچ رہا تھا کہ بندہ اچھا خاصا سیاسی بیک گراؤنڈ رکھتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ معاملہ گلے پڑ جائے۔'' نواب نے اپنا خدشہ بیان کیا۔

''ارے تم کب سے ایسی باتوں کو سوچنے لگے پہلی بات تو یہ کہ کوئی مسئلہ نہیں ہو گا لیکن فرض کرو کوئی مسئلہ ہوا بھی تو ہم یہاں کس لیے بیٹھے ہیں' تمہارا مسئلہ ہمارا مسئلہ ہے بے فکر رہو۔'' نواب اور زیادہ کچھ نہیں کہہ سکا تھا اور تصویر اور تفصیل لے کر وہاں سے واپس آ گیا تھا۔ یہ سچ تھا آج سے پہلے نواب نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی بلکہ سوچی بھی نہیں تھی اس نے کبھی کوئی جرم کرتے ہوئے اس کے انجام کے بارے میں نہیں سوچا تھا نہ ہی فائدے نقصان کا حساب کتاب کیا تھا لیکن وہ آج ایسا سوچ رہا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اب وہ اکیلا نہیں ہے اب وہ جو کچھ بھی کرتا اس کا اثر عالیہ کی زندگی پر بھی پڑنے والا تھا اور وہ عالیہ کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں دے سکتا تھا اسی لیے اس اغواء کے لیے سوچ میں پڑ گیا تھا۔ ابھی اسے خود بھی اچھی طرح اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ اندر ہی اندر بہت بدل گیا تھا جرائم کی دنیا جس سے وہ اچھی طرح واقف تھا اور جس کا وہ عادی تھا اب اسے بوجھ محسوس ہونے لگی تھی لیکن اس نے ابھی تک یہ بات کسی کے ساتھ شیئر نہیں کی تھی۔

☆......☆......☆

نواب کا پہلا کاروبار بھی بہت اچھا چل رہا تھا لیکن وہ اپنے بزنس کو فروغ دینا چاہتا تھا اس نے مارکیٹ کا جائزہ لیا اور ایک ساتھ دو تین بزنس شروع کر دیے ساتھ میں ایک فیکٹری بھی اسٹارٹ کر لی اس طرح بزنس کی دنیا میں

اس کا نام اور بھی معتبر ہو گیا۔ نواب بڑے دل والا اور رحم دل باس تھا اس لیے اوپر سے نیچے تک سارا عملہ اسے بہت پسند کرتا تھا۔ پہلے بھی نواب ہر کام لگن سے کرتا تھا لیکن اب جو کچھ وہ کر رہا تھا وہ اپنے لیے نہیں بلکہ عالیہ کے لیے کر رہا تھا وہ چاہتا تھا کہ وہ ایسے مقام پر پہنچ جائے کہ جب وہ عالیہ کا رشتہ مانگے تو اس کے گھر والے انکار نہ کر پائیں اسی لگن میں وہ دن رات ایک کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

نواب اور عالیہ کی ہر روز موبائل پر بات ہوتی تھی نواب کے گروپ کا اصول تھا کہ ان میں کوئی بھی اپنے پاس موبائل نہیں رکھتا تھا سب لوگ سختی سے اس پر عمل کرتے تھے اور جس نے بھی اپنے گھر والوں سے بات کرنا ہوتی تھی وہ باہر جا کر پی سی او کا فون استعمال کرتا تھا لیکن اب نواب نے عالیہ کے لیے یہ اصول توڑ دیا تھا اور اپنے پاس موبائل رکھ لیا تھا کیونکہ وہ عالیہ سے بات کیے بنا کسی صورت نہیں رہ سکتا تھا ہاں یہ ضرور تھا کہ اس نے اپنا نمبر صرف عالیہ کو دیا تھا اور وہ اس موبائل کا استعمال بھی صرف رات کو عالیہ سے بات کرتے وقت ہی کرتا تھا باقی وقت اس کا موبائل بند رہتا تھا لیکن ہر روز بات کرنے کے باوجود وہ عالیہ سے ملنے کو بے چین تھا اور سارے کام کرنے کے باوجود وہ کھویا کھویا سا رہتا۔

کام تو وہ پہلے کی طرح ہی کر رہا تھا لیکن اب اس کا کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا اکرم اس کی کیفیت کا جائزہ لے رہا تھا' آخر ایک دن اس نے نواب سے اس بارے میں بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''کیا بات ہے نواب تو بہت کھویا کھویا اور بے چین رہتا ہے۔'' نواب اپنے جھونپڑے میں بیٹھا عالیہ کی یادوں میں کھویا ہوا تھا جب اکرم اس کے پاس چلا آیا اور آتے ہی پوچھنے لگا اکرم کے پوچھنے کی دیر تھی نواب نے اپنا حال دل اُسے کہہ سنایا اکرم کا اندازہ درست تھا۔ یہ عالیہ کی یاد ہی تھی جس نے اسے خاموش اور اُداس کر رکھا تھا۔

''یار اکرم میں سوچتا ہوں کہ عالیہ کو اپنے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتا دوں۔'' نواب نے اکرم کے سامنے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے بعد کہا۔

''اور اگر سچ جان کر اس نے تجھے چھوڑ دیا پھر کیا کرو گے؟'' اکرم نے دل میں ابھرتے خدشے کے تحت سوال کیا۔

''وہ مجھ سے محبت کرتی ہوگی تو کبھی نہیں چھوڑے گی۔'' نواب نے جواب دیا۔

''محبت اپنی جگہ لیکن کوئی بھی لڑکی کسی ایسے ڈاکو سے شادی کے لیے تیار نہیں ہوگی جس کی جان ہر وقت خطرے میں پڑی رہتی ہو۔'' اکرم نے اسے حقیقت کا چہرہ دکھانے کی کوشش کی۔

''اور اگر میں یہ سب چھوڑ دوں تو؟'' نواب کی بات پر اکرم نے چونک کر اسے دیکھا تھا اسے اندازہ نہیں تھا کہ نواب عالیہ کے لیے اس حد تک سنجیدہ ہو چکا ہے کہ اس کے لیے سب کچھ چھوڑنے کو تیار ہو سکتا ہے۔

''تو سب کچھ چھوڑ دے گا؟'' اکرم نے پتا نہیں کیوں تصدیق چاہی شاید اس کے ارادوں کی پختگی کو جانچنا چاہ رہا تھا۔

''ہاں اگر وہ مان جائے تو میں سب کچھ چھوڑنے کو تیار ہوں اور ویسے بھی شہر میں اپنا کاروبار اتنا اچھا چل پڑا ہے کہ یہ سب کیے بنا بھی میں عالیہ کو بہت اچھی زندگی دے سکتا ہوں' تم کیا کہتے ہو؟'' نواب نے اپنے دل کی بات بتاتے ہوئے اکرم کی رائے مانگی۔

''اگر تم ایک اچھی زندگی کی طرف چلے جاؤ اور اپنا گھر بساؤ تو اس سے اچھا اور کیا ہو سکتا ہے۔'' اکرم نے نواب کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔

''تو کیا تم میرا ساتھ دو گے؟'' نواب نے اکرم کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے میں ہر حال میں ہر حالات میں تیرے ساتھ ہوں۔'' اکرم کے کہنے پر نواب

بے اختیار آگے بڑھا اور اکرم کو گلے سے لگالیا۔ اکرم نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی حوصلہ دیا تھا اور وہ جانتا تھا کہ اکرم زندگی کے آخری سانس تک اس کا ساتھ دے گا اور اگر زندگی میں ایک ایسا دوست موجود ہو تو زندگی اور زیادہ خوبصورت لگنے لگتی ہے' ایک ایسا دوست جس پر آپ اعتبار کر سکیں جس کا آپ کو بھروسہ ہو یقین ہو اور جو آپ کا یقین کبھی نہ توڑے اس لحاظ سے نواب اور اکرم دونوں بہت خوش قسمت تھے کہ وہ ایک دوسرے کے لیے ایسے دوست تھے جس کی دوستی پر فخر کیا جا سکتا ہے۔

☆......☆......☆

کچھ دن بعد ہی نواب نے واپس عالیہ کے گاؤں جانے کا فیصلہ کرلیا تھا اس بار وہ بالکل اکیلا جارہا تھا اکرم کو اسلم کی مدد کے خیال سے وہیں چھوڑ دیا تھا وہ اس بار اس ارادے سے جارہا تھا کہ اس بار عالیہ کو اپنی ساری حقیقت بتادے گا۔ راستہ بھر وہ انہی خیالوں میں کھویا رہا تھا سوچتا رہا تھا کہ میں یہ کہوں گا یوں کہوں گا عالیہ یہ جواب دے گی وہ جواب دے گی اس طرح سوچوں میں اُلجھے ہوئے اسے سفر کا احساس بھی نہیں ہوا وہ راستے میں کھانا کھانے کے لیے بھی نہیں رُکا تھا اُسے اپنی منزل پر پہنچنے کی بہت جلدی تھی شاید جہاں اس کی جان نے اس کی زندگی کا فیصلہ سنانا تھا۔

☆......☆......☆

گاؤں میں داخل ہو کر وہ پچھلی بار کی طرح سب سے پہلے قبرستان گیا تھا اور ساجدہ کی قبر پر کچھ وقت گزارنے کے بعد وہ وہاں سے اٹھا تو ہمیشہ کی طرح اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے ماں کے پاس آتے ہی وہ لمبے چوڑے نوجوان سے دس سال کا چھوٹا بچہ بن جاتا تھا اور اس کا دل ماں کو دیکھنے کو اس سے بات کرنے کو تڑپ اٹھتا تھا' راستے میں اسے گورکن مل گیا گورکن نے اسے دیکھ کر سلام کیا نواب نے سلام کا جواب دیتے ہوئے جیب میں سے کچھ پیسے نکال کر گورکن کو تھما دیے جو اس نے شکر گزاری کے ساتھ قبول کر لیے۔ قبرستان سے نکل کر نواب سیدھا حویلی کی طرف گیا تھا وہ چوہدرائن کو سلام کرنا چاہتا تھا اور عالیہ کو دیکھنے کی امید بھی اسے حویلی کی طرف لے جارہی تھی لیکن حویلی پہنچ کر نہ تو اس کی چوہدرائن سے ہی ملاقات ہو پائی اور نہ ہی عالیہ کی جھلک دکھائی دی' اس کی ملاقات حویلی کے باہر ہی چوہدری اور وسیم سے ہوگئی تھی دونوں اس کے ساتھ بڑے روکھے پھیکے انداز میں پیش آئے یقیناً وسیم نواب کے حوالے سے چوہدری کے کان بھر چکا تھا' نواب کو کافی مایوسی ہوئی لیکن پھر اس نے حویلی جا کر چوہدرائن سے ملنے کا ارادہ ملتوی کر دیا ویسے بھی اسے نہیں لگ رہا تھا کہ چوہدری اسے حویلی لے جا کر میزبانی کرنے کے موڈ میں ہے۔ وہ چوہدری کو اللہ حافظ کہتا ہوا اپنے گھر کی طرف گاڑی بڑھا لے گیا۔

☆......☆......☆

گھر آتے ہوئے وہ ہوٹل سے اپنے لیے کھانا لیتا آیا تھا کھانا کھا کر وہ وہیں چارپائی پر لیٹ کر آسمان کو تکنے لگا وہ رات گہری ہونے کا منتظر تھا تاکہ عالیہ کو فون کر سکے اس نے اپنے آنے کے بارے میں عالیہ کو نہیں بتایا تھا وہ اچانک اس کے سامنے پہنچ کر اسے خوش اور حیران ہوتے دیکھنا چاہتا تھا۔ پھر اسے یاد آیا ایک بار عالیہ نے کہا تھا کہ اب اس پر پابندیاں بڑھ گئی ہیں اس لیے وہ اب شاید اس سے مل بھی نہ سکے اور پھر مذاق کرتے ہوئے عالیہ نے کہا تھا کہ اگر ہمت ہو تو تم میری حویلی میں آجانا اور مجھ سے مل لینا لیٹے لیٹے نواب کو یہ بات یاد آئی تو وہ چارپائی سے اٹھ بیٹھا اس کے ذہن میں ایک پلان آرہا تھا اور پھر اس نے زیادہ نہیں سوچا بلکہ گھر کا تالا لگاتے ہوئے باہر نکل آیا تھا اس کا رخ حویلی کی طرف تھا۔

☆......☆......☆

وہ تیز تیز قدموں سے حویلی کی طرف بڑھتا چلا جارہا تھا اس نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ اسے حویلی کی طرف جاتے ہوئے کوئی نہ دیکھے جب وہ حویلی کے قریب پہنچا تو وہاں وہ کچھ دیر کے لیے رُک گیا بہت بچپن میں

اس نے حویلی کے اندر کا حصہ دیکھا تھا وہ کئی بار عالیہ کے کمرے میں بھی گیا تھا لیکن اب حویلی کا نقشہ اس کے دماغ میں کافی دھندلا گیا تھا اور اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ عالیہ کا اب بھی وہی کمرہ تھا یا اس نے اپنا کمرہ تبدیل کر لیا تھا لیکن اب جو بھی تھا وہ یہاں تک آ گیا تھا یہاں سے ایسے واپس نہیں جا سکتا تھا اس نے کچھ دیر حویلی کے اندر ہونے والی نقل وحرکت کا جائزہ لیا اور پھر دبے قدموں حویلی کی طرف بڑھا حویلی کے بڑے گیٹ پر کوئی پہریدار نہیں تھا کیونکہ گاؤں میں ایسا ماحول ہی نہیں تھا کہ پہریدار کھڑے کرنے کی ضرورت پیش آتی وہ ایک پرامن گاؤں تھا جہاں زمینوں پر ہونے والے جھگڑوں کے علاوہ کوئی جھگڑا کبھی نہیں ہوا تھا اور چوری یا ڈکیتی کا تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا ویسے بھی یہ چوہدری کی حویلی تھی جہاں رات کے ہر پہر ملازموں میں کوئی نہ کوئی جاگتا ہوا ہی ہوتا تھا یا کوئی خدمت گار اپنے کام میں مصروف ہوتا اور ڈیرے پر آئے مہمانوں کی مہمان نوازی میں لگا ہوتا ایسے چہل پہل والے ماحول میں چوری کرنے کے لیے آنے کے لیے بھی کوئی ہزار بار سوچتا لیکن نواب بلا سوچے سمجھے وہاں آ چکا تھا بلکہ حویلی میں داخل ہو چکا تھا۔ وہ چور نہیں تھا ڈاکو تھا اور ڈاکو اس طرح دبے قدموں نہیں آیا کرتے جس طرح وہ آیا تھا۔ ذہن میں حویلی کا نقشہ دہراتے ہوئے وہ آگے بڑھا جا رہا تھا اور پھر آخر اُسے وہ کمرہ دکھائی دے گیا جو کہ عالیہ کا ہوا کرتا تھا اور امید تھی کہ اب بھی وہ کمرہ عالیہ کا ہی ہوگا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا لیکن کھڑکی کھلی ہوئی تھی نواب دھیرے سے کھڑکی کے ذریعے کمرے میں داخل ہو گیا۔

☆......☆......☆

عالیہ اپنے بستر پر لیٹی موبائل ہاتھ میں تھامے نواب کے فون کا انتظار کر رہی تھی اتنے میں اس نے کھڑکی سے کسی کو کمرے میں چھلانگ لگاتے دیکھا ہلکی روشنی میں وہ نواب کو پہچان نہیں پائی تھی اور پھر اس کے تو خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ نواب اس وقت گاؤں میں موجود ہوگا' خوف کے مارے عالیہ کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی وہ اور زور سے چلاتی لیکن نواب نے تیزی سے آگے بڑھ کر عالیہ کے منہ پر مضبوطی سے ہاتھ رکھ دیا۔

''خاموش رہو یہ میں ہوں نواب۔'' نواب نے اس کے کان کے قریب سرگوشی کی تو اس کی جان میں جان آئی نواب نے ہاتھ عالیہ کے منہ سے ہٹا لیا تو وہ نواب کے گلے لگ گئی نواب نے بھی اسے اپنی بازوؤں میں سمیٹ لیا کافی دیر دونوں یونہی خاموش ایک دوسرے میں گم صم کھڑے رہے نواب کو کچھ عجیب سا احساس ہوا تو اس نے عالیہ کو خود سے الگ کیا دیکھا تو عالیہ رو رہی تھی آنسو اس کی آنکھوں سے لگاتار بہہ رہے تھے قتل وغارت سے نہ گھبرانے والا نواب عالیہ کے آنسو دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

''کیا بات ہے تم رو کیوں رہی ہو؟'' نواب نے عالیہ کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے پوچھا تو وہ دوبارہ سے نواب سے لپٹ گئی اور کچھ بھی کہے بنا ہچکیوں سے رونے لگی آخر بڑی مشکل سے نواب اُسے چپ کرانے میں کامیاب ہوا۔

''مجھے لگا تم دوبارہ کبھی نہیں آؤ گے۔'' اس نے اپنے رونے کا سبب بتایا تو نواب کو ہنسی آ گئی۔

''پگلی ایسی بات تو نے سوچی بھی کیسے تو جانتی نہیں تیرے بنا میں نے یہ وقت کیسا گزارا ہے۔ ہر وقت تیری یاد آتی رہتی تھی۔'' نواب نے اس کے گالوں سے آنسو پونچھتے ہوئے اپنے دل کا حال بتایا تو وہ شرما گئی۔

''تم اچانک گاؤں کیسے آ گئے؟'' نواب اسے لے کر بیڈ پر بیٹھ گیا تو عالیہ پوچھنے لگی۔

''بس تمہاری یاد آ رہی تھی اور تم سے کچھ ضروری بات بھی کرنا تھی اس لیے آ گیا تمہیں بتایا اس لیے نہیں اچانک پہنچ کر تمہیں حیران کرنا چاہتا تھا لیکن تم تو ڈر گئیں۔'' نواب کا لہجہ آخر میں چھیڑنے والا ہو گیا۔

''میں ڈری تو نہیں تھی وہ تو مجھے لگا کہ پتا نہیں کون آ گیا ہے۔'' عالیہ کو اب اپنے اس طرح ڈرنے پر شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔

''اچھا بتاؤ تو ایسی کیا بات کرنی تھی جس کے لیے تمہیں یہاں آنا پڑا۔'' شرمندگی سے نکلنے کے لیے عالیہ نے

بات بدلی تو اس کے سوال پر نواب ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ آخر فیصلے کا وقت آ گیا تھا اور پھر اس نے گاؤں چھوڑنے سے لے کر دوبارہ گاؤں آنے تک اپنی زندگی کی ساری کہانی کہہ سنائی اس نے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔

''میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے اگر تم میرا ساتھ دیتی ہو تو میں وعدہ کرتا ہوں سارے جرائم چھوڑ دوں گا اور تمہیں زندگی کی ہر خوشی دوں گا اور اگر تم مجھے چھوڑنا چاہو تب بھی میں تمہارا فیصلہ مانوں گا۔'' نواب نے ساری بات بتاتے کے بعد بے حد جذباتی لہجے میں کہا تھا۔

''جب تک میں زندہ ہوں مجھے تم سے کوئی جدا نہیں کر سکتا اب تم جو بھی ہو جیسے بھی ہو میرے ہو مجھے قبول ہو۔'' عالیہ نے بھی اسی طرح جذباتی لہجے میں جواب دیا تو اس بار نواب نے اسے اپنے سینے میں چھپا لیا ماحول بے حد جذباتی ہو رہا تھا دونوں کی آنکھیں نم تھیں لیکن ان میں ایک عزم جھلک رہا تھا۔

☆......☆......☆

صبح کے قریب نواب حویلی سے رخصت ہوا تھا اس بار واپس جاتے ہوئے اس کے دل میں کوئی خدشہ تھا نہ ہی کوئی خوف وہ بے حد مطمئن تھا عالیہ اس کے ساتھ تھی اور اس کے ساتھ کے ہوتے ہوئے دنیا کی کوئی طاقت نواب کو ڈرا نہیں سکتی تھی' وہ بے حد خوش تھا عالیہ نے اس کی محبت کا مان رکھ لیا تھا اسے امید تھی کہ وہ اسے مایوس نہیں لوٹائے گی لیکن پھر بھی تھوڑا بہت ڈر بھی تھا کہ کہیں وہ یہ جان کر کہ وہ ایک ڈاکو ہے اسے ٹھکرا نہ دے۔ لیکن اب سب کچھ ٹھیک ہو چکا تھا واپسی کے سفر میں وہ مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا وہ مستقبل جس میں عالیہ نے اُس کے ساتھ اس کے ہمسفر کے روپ میں ہونا تھا۔

☆......☆......☆

واپس آ کر اس نے اکرم اور اسلم کو بلا کر عالیہ سے ہوئی ساری بات بتا دی اور انہیں یہ بھی بتا دیا کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر سیدھی سادھی زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ اس کی بات سن کر اکرم نے تو کسی قسم کے ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تھا کیونکہ وہ پہلے سے اس بارے میں جانتا تھا اسے بس خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ عالیہ نے سچ جان کر نواب کو چھوڑا نہیں تھا لیکن اسلم یہ سب سن کر سوچ میں پڑ گیا تھا۔

''کیا بات ہے ماما کیا تم نہیں چاہتے کہ میں اس زندگی سے دور ہو جاؤں تمہاری تو ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ میں اچھی زندگی گزاروں پھر اب اتنے خاموش کیوں ہو۔'' نواب کو اسلم کی خاموشی بے چین کر رہی تھی۔

''بیٹا تمہارا فیصلہ بہت اچھا ہے اور جب تم اس پر عمل کر لو گے تو سب سے زیادہ خوشی مجھے ہی ہو گی لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں بیٹا کہ اس راستے پر آنا آسان ہوا کرتا ہے لیکن واپسی اتنی آسان نہیں ہوا کرتی' کیا تم لوٹ پاؤ گے پوری طرح پچھلی باتوں کو بھول کر چھوڑ کر۔'' اسلم نے اپنا خدشہ بیان کیا۔

''اگر آپ کا اشارہ ڈاکے ڈالنے کی طرف ہے تو میرا جواب ہے ہاں' میں یہ سب کچھ بھول کر پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں اور آپ کا ساتھ اور دعا رہی تھی انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا اور اگر آپ چوہدری شاکر سے انتقام کی بات کر رہے ہیں تو میں اس بارے میں اپنے عہد پر آج بھی قائم ہوں اور جب تک اس سے بدلہ نہ لے لوں گا سکون سے نہیں بیٹھوں گا۔'' نواب نے تفصیلی جواب دیا اکرم خاموشی سے ان کے درمیان ہونے والی بات چیت سن رہا تھا۔

''ایک طرف تم نئی زندگی کی طرف جانے کی بات کرتے ہو دوسری طرف تم انتقام کی باتیں کر رہے ہو مجھے بتاؤ تم آگ اور پانی کو ایک ساتھ کیسے رکھ سکتے ہو کہ دونوں ایک دوسرے پر کوئی اثر بھی نہ کریں۔'' اسلم نے سوال کیا۔

''آپ کی اس بات کے جواب میں میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ میں کوشش کروں گا کہ اس انتقام کا اثر میری زندگی پر نہ پڑے۔'' نواب کو خود بھی اندازہ تھا کہ وہ جو بات کر رہا ہے وہ کتنی عجیب بلکہ بے تکی ہے کیونکہ یہ کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا کہ کوئی انتقام کی آگ میں جل رہا ہو اور وہ آگ اسے نقصان نہ پہنچائے۔ لیکن اس کے پاس اور

کوئی چارہ بھی نہیں تھا اگر فرض کر و وہ شاکر کو بھول بھی جاتا (جو کہ ناممکن تھا) تو شاکر اسے کبھی نہ بھولتا جب تک شاکر زندہ تھا وہ نواب کی زندگی کے لیے خطرہ بنے رہنا تھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے ان چیزوں سے آزاد کریں تاکہ میں اپنی پوری توجہ اپنے کاروبار کو دے سکوں گروپ کے سردار آپ بن جائیں یا پھر اکرم یہ ذمہ داری سنبھال لے جیسے بھی آپ مناسب سمجھیں۔'' نواب سارے فیصلے کیے بیٹھا تھا اور ان پر عمل کرنے میں بھی دیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''بات یہ ہے بیٹا کہ میں بھی اب اس بھاگ دوڑ کی زندگی سے تھک گیا ہوں بڑھاپا بھی آ گیا ہے اب جو کچھ وقت بچا ہے اسے سکون سے گزارنا چاہتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ بہتر ہوگا اکرم بھی اس زندگی کو چھوڑ کر نئی زندگی کا آغاز کر دے۔'' اسلم نے اکرم کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو نواب بھی سوالیہ نظروں سے اکرم کی طرف دیکھنے لگا۔

''آئیڈیا تو بہت اچھا ہے تم اس بارے میں کیا کہتے ہو اکرم؟'' آخر نواب نے اکرم کی رائے مانگ لی۔

''تم دونوں کو یہی ٹھیک لگتا ہے تو یہی ٹھیک ہے ویسے بھی جب تم دونوں یہ زندگی چھوڑ رہے ہو تو میں یہاں رہ کر کیا کروں گا میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلوں گا۔'' اکرم نے بھی اپنا فیصلہ سنا دیا تو اسلم اور نواب دونوں مسکرانے لگے۔

''تو اب یہ طے ہو گیا ہے کہ ہم تینوں ایک نئی زندگی شروع کرنے جا رہے ہیں۔'' نواب نے کہا۔

''انشاءاللہ..... '' اسلم اور اکرم نے بے ساختہ انشاءاللہ کہا تھا۔

☆......☆......☆

اگلے ہی دن نواب نے سب ساتھیوں کو جمع کر کے گروپ چھوڑنے کے بارے میں بتا دیا تھا جس سے گروپ میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی تھی کئی ساتھیوں نے نواب پر اپنا فیصلہ بدلنے کے لیے زور بھی دیا لیکن وہ اپنے ارادوں کا پکا تھا ویسے بھی اس نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا تھا ایسے پیچھے ہٹنے والا نہیں تھا سب ساتھیوں کے مشورے سے اور اتفاق سے گروپ کے ایک سینئر بندے کو گروپ کا نیا سردار بنا دیا گیا اور اس طرح نواب باقاعدہ طور پر گروپ سے الگ ہو گیا۔

☆......☆......☆

کہتے ہیں عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتا عالیہ اور نواب کے معاملے میں بھی یہی ہوا تھا ان کی کھیتوں میں ہونے والی ملاقاتیں لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکی تھیں اور جو باتیں پہلے سرگوشیوں میں کی جاتی رہی تھیں اب ہر جگہ سرعام اس کا ذکر ہو رہا تھا' اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ گاؤں میں عالیہ کے کئی عاشق موجود تھے ان کی اپنی برادری میں بھی اس کے کئی امیدوار تھے جس لڑکی پر اتنی نظریں ٹکی ہوں اس کی کوئی بھی ایسی حرکت کیسے چھپی رہ سکتی تھی' جب یہ خبریں چوہدرائن تک پہنچیں تو اس نے عالیہ کو اپنے پاس بلوا کر سیدھا اس سے پوچھ لیا کہ ان باتوں میں کتنی سچائی ہے۔

عالیہ چاہتے ہوئے بھی ماں کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکی تھی اور اس نے نواب سے اپنی محبت کا اقرار کر لیا تھا ویسے بھی وہ خود یہ بات اپنے ماں باپ تک پہنچانا چاہتی تھی انہیں نواب کے بارے میں بتانا چاہتی تھی تاکہ معاملات آگے بڑھائے جاسکیں اس لیے جب اسے ماں نے بلا کر اس بارے میں خود سوال کر دیا تو اس نے جھوٹ بولنے کی بجائے ساری بات سچ سچ بتا دی۔ جس پر چوہدرائن کو زندگی میں شاید پہلی بار اپنی لاڈلی بیٹی پر اتنا شدید غصہ آیا تھا کہ اس کا ہاتھ عالیہ پر اٹھ گیا تھا ہمیشہ ماں کی محبت پانے والی عالیہ کو بھی اتنے شدید ردعمل کی امید نہیں تھی اس لیے تھپڑ کھا کر وہ بھی ہکا بکا کھڑی ماں کی شکل دیکھتی رہ گئی تھی پھر جب ذرا ہوش آیا تو بھاگی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

☆......☆......☆

نواب نے بہت تیزی سے سارے معاملات نبٹائے تھے اور وہ اکرم اور اسلم کو لے کر شہر شفٹ ہو گیا تھا' فی الحال ان کا قیام کرائے کی ایک کوٹھی پر تھا لیکن نواب نے اپنے سپنوں کا گھر بنانے کے لیے زمین دیکھنا شروع کر دی تھی۔ بہت جلد اس نے ایک پراپرٹی ڈیلر کے توسط سے ایک پلاٹ پسند کر لیا اس کا رقبہ کافی زیادہ تھا لیکن نواب کا خواب تھا کہ وہ عالیہ کے لیے بہت شاندار گھر تعمیر کرے اور وہ اسی سلسلے میں یہ سب کر رہا تھا بہت جلد اس نے گھر کا نقشہ بھی بنوا لیا اور اکرم کی نگرانی میں اس گھر کی تعمیر کا کام تیزی سے ہونے لگا۔

☆......☆......☆

گھر کی تعمیر میں کئی مہینے لگ گئے تھے اس دوران فون پر نواب کا عالیہ سے مسلسل رابطہ تھا۔ گھر تعمیر ہوتے ہی نواب نے اسلم کو عالیہ کے گھر جانے کا کہا اس کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا سو عالیہ کے گاؤں رشتہ لے کر جانے کی تیاریاں شروع کر دی گئیں' اسلم کا بس نہ چل رہا تھا کہ شگن کے طور پر ساری دنیا کی چیزیں عالیہ کے لیے لے کر چلا جائے اکرم اس کام میں اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔

وہ لوگ کئی دن تک جانے کی تیاریاں کرتے رہے تھے اگرچہ اس وقت وہ حیثیت میں عالیہ کی فیملی سے بہت زیادہ آگے جا چکے تھے لیکن مالی حیثیت کے علاوہ بھی ایسا بہت کچھ ہوتا ہے جو رشتہ جوڑتے ہوئے دیکھا جاتا ہے اور انہی باتوں کی وجہ سے اسلم دل ہی دل میں فکر مند بھی تھا لیکن وہ اپنی فکر مندی ظاہر کر کے اکرم کے جوش و خروش اور نواب کی خوشی کو کم نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے اس نے اپنی ساری سوچیں اپنے تک محدود رکھی ہوئی تھیں۔ لیکن جیسے جیسے گاؤں جانے کا وقت قریب آ رہا تھا اس کی فکر مندی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ وہ اپنے خاندان کے لیے خوشیاں لینے جا رہا تھا لیکن پتا نہیں آنے والا وقت ان کے لیے کیا لانے والا تھا۔

☆......☆......☆

تین شاندار گاڑیوں کا یہ چھوٹا سا قافلہ جس وقت گاؤں میں داخل ہوا ہر دیکھنے والا متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکا۔ آگے والی گاڑی میں اسلم اور اکرم تھے گاڑی کو وردی پوش ڈرائیور چلا رہا تھا پیچھے کی دونوں گاڑیوں میں سامان تھا جب یہ لوگ چوہدری کی حویلی پر پہنچے تو اس وقت چوہدری گھر پر موجود تھا اور اس کا بیٹا وسیم بھی گھر پر ہی تھا' ملازم نے انہیں مہمانوں کی آمد کا بتایا تو وہ مہمانوں کے استقبال کے لیے گیٹ پر چلا آیا اتنے سالوں میں اسلم کی شکل و صورت میں کافی تبدیلی آ چکی تھی کچھ دولت کی فراوانی اور سکھری زندگی نے بھی اس پر بہت اچھے اثرات مرتب کیے تھے اس وقت سوٹ پہنے وہ کوئی خوشحال سیٹھ لگ رہا تھا۔ چوہدری نے اسے بالکل بھی نہیں پہچانا تھا ویسے بھی اس کے لیے اسلم کو پہچاننا ممکن نہیں تھا کیونکہ اس نے بہت سالوں پہلے اسے دیکھا تھا اور وہ بھی کوئی ایسی ملاقات نہیں تھی جس میں خاص طور پر اسلم کی طرف توجہ ہو سکتی۔ چوہدری کی معیت میں وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے چلتے حویلی کے اندر داخل ہوئے اور چوہدری انہیں لے کر بیٹھک کی طرف بڑھا۔ اسلم کے اشارے پر ڈرائیورز سامان گاڑی سے نکال کر ان کے پیچھے پیچھے ہو لیے اور کمرے میں سامان رکھ کر مودبانہ کھڑے ہو کر اگلے حکم کا انتظار کرنے لگے پھر اسلم کے اشارے پر وہ سب وہاں سے چلے گئے۔

☆......☆......☆

''میں اسلم ہوں اور یہ میرا بیٹا اکرم......'' اسلم نے تعارف کی رسم نبھائی چوہدری مروت سے مسکرایا لیکن اس نے انہیں پہچانا نہیں تھا البتہ ان کی آن بان سے متاثر دکھائی دے رہا تھا۔

''شاید آپ نے ابھی تک مجھے پہچانا نہیں چوہدری صاحب۔'' اسلم کو چوہدری کے رویے سے اندازہ ہو گیا تھا ہی مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

''واقعی میں ابھی تک آپ لوگوں کو نہیں پہچان سکا۔'' چوہدری نے معذرت خواہانہ لہجے میں اقرار کیا تو جواب میں اسلم اپنا تعارف تفصیل سے کروانے لگا اب نہ پہچاننے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا چوہدری کے رویے میں

واضح فرق محسوس ہو رہا تھا یعنی جن مہمانوں کو وہ زیادہ اہمیت دے رہا تھا وہ اب کتنے بھی دولت مند کیوں نہیں ہو گئے تھے لیکن تھے تو اس کی رعایا میں سے ہی دوسرے اس خاندان کے لیے چوہدری کے دل میں کبھی بھی کوئی اچھے جذبات نہیں رہے تھے اور اب نواب اور عالیہ کی بات مشہور ہونے کے بعد تو وہ خاندان اس کے لیے قابلِ نفرت ہو چکا تھا۔ چوہدری کے رویے سے ساری گرمجوشی ختم ہو چکی تھی اور اس کی جگہ سرد مہری نے لے لی تھی۔ چوہدری کے بدلتے ہوئے رویے نے اسلم کے خدشات کی تصدیق کر دی تھی۔ وہ خاصی بے چینی محسوس کر رہا تھا اکرم نے بھی ماحول میں تناؤ کو محسوس کر لیا تھا اور اس کے چہرے سے بھی مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔

''چوہدری صاحب میں ایک خاص مقصد سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں اس امید کے ساتھ کہ آپ مجھے مایوس نہیں لوٹائیں گے۔'' اسلم نے طریقے سے بات کا آغاز کیا چوہدری کے تاثرات مزید سنجیدہ ہو گئے وہ کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں تھا کہ ان کی آمد کا مقصد نہ جان سکتا' ویسے بھی عالیہ نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ صرف اور صرف نواب سے شادی کرے گی ایسے میں ان لوگوں کی آمد کا مقصد واضح تھا۔

''اگر تم لوگ ہماری بیٹی کے سلسلے میں آئے ہو تو آگے بات کرنے کی ضرورت نہیں میری طرف سے صاف انکار ہے۔'' چوہدری نے بات سننے سے پہلے ہی انکار کر دیا۔

''چوہدری صاحب آپ تسلی سے میری بات سن لیں اور پھر سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔'' اسلم کو اس سے اتنے ہی صاف انکار کی امید تھی اس لیے اسے کوئی خاص جھٹکا نہیں لگا تھا کیونکہ وہ ذہنی طور پر اس سب کے لیے تیار ہو کر آیا تھا اور یہ بھی سوچ کر آیا تھا کہ وہ اپنی بات منوائے بنا وہاں سے نہیں اٹھے گا لیکن چوہدری کا بے لچک رویہ اس کے ارادوں کو کمزور کر رہا تھا۔

''مجھے کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں میں جواب دے چکا ہوں۔'' چوہدری نے پھر کہا۔

''دیکھیے چوہدری صاحب آپ بیٹی کے باپ ہیں فیصلہ آپ کو کرنا ہے اور آپ اپنی بیٹی کے لیے جو بہتر سمجھیں فیصلہ کر سکتے ہیں لیکن میری گزارش ہے کہ فیصلہ کرنے سے پہلے تھوڑا سوچ سمجھ لیں' نواب میرا بھانجا ہے لیکن مجھے اپنے سگے بیٹے سے بڑھ کر عزیز ہے وہ ایک اچھا لڑکا ہے ہر طرح سے اس قابل ہے کہ آپ کی بیٹی کو خوش رکھ سکے۔'' اسلم ابھی بول ہی رہا تھا کہ چوہدری نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔

''ابھی ہمارے خاندان پر اتنا برا وقت نہیں آیا کہ ہم چور اچکوں کے ساتھ اپنی بیٹیاں بیاہنے لگ جائیں۔'' چوہدری کا لہجہ اور الفاظ اتنے زیادہ سخت اور ہتک آمیز تھے کہ اسلم اور اکرم دونوں کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا' اکرم نے کچھ کہنا چاہا لیکن اسلم نے اسے کچھ بھی کہنے سے روک دیا اتنا کچھ ہونے کے باوجود نہیں چاہتا تھا کہ معاملہ بالکل ہی ہاتھوں سے نکل جائے۔

''چوہدری صاحب نواب ایک باعزت بزنس مین ہے شہر میں دس لوگ اٹھ کر اسے سلام کرتے ہیں اور......'' اسلم نے کچھ کہنا چاہا لیکن چوہدری نے ایک بار پھر اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔

''اب وہ کوئی بھی بہروپ بھر لے رہے گا تو وہی کا وہی قاتل باپ کا جرائم پیشہ بیٹا......'' چوہدری کے لہجے میں حقارت تھی وہ یقیناً بہت کچھ معلومات حاصل کر چکا تھا۔

''وہ سب پرانی باتیں ہیں چوہدری صاحب آپ آج کو دیکھیے۔'' یہ جاننے کے بعد کہ چوہدری ان کے بارے میں سب کچھ نہ سہی بہت کچھ جان چکا تھا اسلم نے بھی خواہ مخواہ پردے ڈالنے اور کچھ چھپانے کے لیے جھوٹ کا سہارا لینے کی بجائے سیدھی بات کی۔

''آپ لوگ تشریف لے جا سکتے ہیں۔'' چوہدری غصے سے کہہ رہا تھا اسلم اور اکرم کے لیے وہاں سے جانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا تو وہ خاموشی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''جاتے ہوئے اپنا سامان ساتھ لے جانا نہ بھول جانا۔'' چوہدری نے تاکید کی۔

''ایسا نہ کریں چوہدری صاحب وہ ہم عالیہ بیٹی کے لیے تحفے لائے ہیں انہیں واپس نہ کریں۔'' دروازے کی طرف جاتے ہوئے اسلم نے چوہدری کی بات پر مڑتے ہوئے لجاجت سے کہا۔

''تحفے تحائف اپنے برابر کے لوگوں میں لیے دیے جاتے ہیں میاں جا کر کوئی اپنے برابر کے لوگ تلاش کرو جو دولت کی چکا چوند سے اندھے ہو کر تمہاری بات مان لیں' یہاں اس مال و دولت سے زیادہ اہمیت خاندانی شرافت کی ہے۔'' چوہدری نے ایک بار پھر پہلے والے لہجے میں کہا' اب کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی وہاں رکنے کی اور رشتے کی بات کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اسلم اور اکرم بھاری دلوں کے ساتھ مایوس لوٹ گئے۔ جتنے خوش خوش وہ آئے تھے جاتے ہوئے اتنے ہی اُداس اور ناخوش تھے باپ کی اتنی توہین پر چپ رہنا اکرم کے لیے مشکل ہو رہا تھا لیکن اسلم اسے مسلسل تحمل کا مظاہرہ کرنے کا کہہ رہا تھا۔

''چوہدری نے اچھا نہیں کیا ابا۔'' گاڑی روانہ ہوئی تو اتنی دیر سے خاموش رہنے والا اکرم بولے بنا نہ رہ سکا۔

''میں تو یہ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں کہ نواب کو کیا جواب دوں گا۔'' اسلم نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے اپنی فکر بیان کی۔

''جو جواب ملا ہے وہی جواب دے دینا اس میں سوچنے والی کیا بات ہے۔'' اکرم کو اپنے باپ کی بات سن کر تعجب ہوا تھا جس کا اظہار کیے بنا وہ نہیں رہ سکا تھا اسلم کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اکرم کچھ دیر اسلم کے بولنے کا منتظر رہا پھر اس کی خاموشی سے تھک کر اس نے اپنی نظریں کھڑکی سے باہر بھاگتے دوڑتے مناظر پر جما دیں اس کی پیشانی پر پڑی ہوئی سلوٹیں بتا رہی تھیں کہ اس کا موڈ بہت زیادہ خراب تھا اسلم اور نواب کے خیال سے وہ چوہدری کے سامنے خاموش رہا تھا لیکن اس کے اندر غصہ جمع ہوتا رہا تھا جواب باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

نواب کو بہت اچھی امیدیں تھیں اسے نہ جانے کیوں یہ یقین ہو چلا تھا کہ جس طرح اس نے اپنے ماضی کو چھوڑ دیا ہے اس طرح لوگ بھی اس کے ماضی کو بھلا کر اس کے حال میں اسے دیکھیں گے اور اسی حیثیت سے اسے اپنائیں گے۔ دوسری طرف عالیہ تھی جسے اپنے گھر والوں سے ایک فیصد بھی یہ امید نہیں تھی کہ وہاں سے اسلم لوگوں کو کوئی مثبت جواب دیا جائے گا لیکن اسے یہ امید بھی نہیں تھی کہ اس کی حویلی میں روایات کو بھول کر مہمانوں کی بے عزتی کی جائے گی مہمانوں کے جانے کے بعد گھر کے ملازم نے ایک ایک بات چوہدرائن کے سامنے بیان کر دی تھی اور عالیہ نے بھی وہ سب باتیں سنی تھیں۔

ایک طرف تو اسے اس بات کا غصہ تھا کہ اس کی بات کو نظر انداز کیا جا رہا ہے جو اس کے لیے بالکل ناقابلِ برداشت بات تھی دوسری طرف وہ نواب سے شرمندہ ہو رہی تھی وہ کیا سوچے گا اس کے بارے میں اور جب وہ اس بارے میں عالیہ سے سوال کرے گا تو بھلا وہ کیا جواب دے گی' اسی طرح کی سوچوں نے اُسے بے چین کر رکھا تھا یہی وجہ تھی کہ اس نے تمام احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دن میں ہی نواب کو فون کرنے کا فیصلہ کیا تھا غصے اور جھنجلاہٹ میں اس نے ہر بات کو نظر انداز کر دیا تھا حتیٰ کہ اپنے کمرے کا دروازہ بھی اندر سے بند نہیں کیا تھا اس کے ذہن میں بس ایک ہی بات گھوم رہی تھی کہ کسی طرح نواب سے اس کی بات ہو جائے۔

☆......☆......☆

نواب بھی مسلسل فون کی طرف متوجہ تھا وہ بے چینی سے اسلم کی طرف سے کسی اچھی خبر کا منتظر تھا گاؤں پہنچنے تک کی اطلاع اسے مل گئی تھی اور اب اس بات کو دو گھنٹوں سے زیادہ ہو گئے تھے اب تک ان کی طرف سے کوئی فون وغیرہ آ جانا چاہیے تھا نواب بے چینی سے ٹہلتے ہوئے سوچ رہا تھا پھر کچھ سوچ کر اس نے اکرم کا نمبر ملا دیا نہ جانے کیوں اسے اسلم سے براہ راست پوچھتے ہوئے جھجک محسوس ہو رہی تھی لیکن اکرم نے دو بیل کے بعد ہی اس کا فون کاٹ دیا نواب نے حیرت سے موبائل کو دیکھا اکرم اس کی کال کبھی نہیں کاٹا کرتا تھا چاہے وہ کسی انتہائی ضروری

میٹنگ میں ہی کیوں نہ ہوتا۔
''اس نے فون کیوں کاٹ دیا؟''نواب کا ذہن مسلسل اس سوال میں اٹکا ہوا تھا۔

☆......☆......☆

''نواب کا فون ہے؟''اپنی سوچوں میں گم اسلم اکرم کے فون پر ہونے والی گھنٹی کی وجہ سے چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا تھا پھر اس نے اکرم کو فون کاٹتے دیکھا اکرم کے چہرے کے تاثرات سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ فون کرنے والا کوئی اور نہیں بلکہ نواب ہے۔
''جی نواب کا فون ہے۔''اکرم نے جواب دیا۔
''فون کیوں کاٹا......؟''اسلم کے پوچھنے پر اکرم نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ اور کیا کرتا کیا جواب دیتا نواب کے سوالوں کا۔
''بات کراؤ میری۔''اسلم کے کہنے پر اکرم نواب کا نمبر ملانے لگا۔

☆......☆......☆

ابھی اسے فون بند کیے ہوئے چند منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ اس کے فون پر کال آنے لگی اکرم کا نام دیکھ کر نواب نے جلدی سے یس کا بٹن پش کرتے ہوئے کال ریسیو کر لی دوسری طرف اکرم نے ہیلو ہائے کے بعد فون اسلم کو پکڑا دیا تھا' وہ جو اکرم سے بہت کچھ جاننے کے لیے بے چین ہو رہا تھا اس کے اس طرح اسلم کو فون دینے پر جھنجلا سا گیا' مگر وہ کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔
''ہم حویلی سے ہو آئے ہیں اب واپسی ہے گھر آ کر بات کرتے ہیں۔''اسلم نے مختصر ترین الفاظ میں اپنی بات کہہ کر فون رکھ دیا تو نواب اُلجھ سا گیا اگرچہ اسلم نے کچھ نہیں کہا تھا لیکن پھر بھی نواب کا دل پریشان ہو گیا تھا اسے لگ رہا تھا کہ وہاں کچھ غلط ہوا ہے ابھی وہ انہی سوچوں میں تھا کہ اس کے فون کی گھنٹی ایک بار پھر بجنے لگی اس بار فون کرنے والے کا نام دیکھ کر وہ چونک گیا اور جلدی سے کال ریسیو کر لی دوسری طرف عالیہ تھی جو اپنے گھر والوں کے رویے پر پریشان بھی تھی اور شرمندہ بھی۔
''سنو مجھے ٹھیک سے بتاؤ کیا ہوا ہے تمہارے گھر والوں نے کیا جواب دیا۔''عالیہ کے معذرت بھرے الفاظ سن کر وہ بولا تھا۔
''تمہیں نہیں معلوم کیا ہوا ہے؟''عالیہ نے اُلٹا اس سے سوال کر دیا۔
''اگر مجھے پتا ہوتا تو تم سے کیوں پوچھتا بتاؤ مجھے کیا ہوا ہے کیا کہا تمہارے گھر والوں نے میرے ماما سے۔'' عالیہ کے سوال نے نواب کی بے چینی میں اضافہ کر دیا تھا اسے لگ رہا تھا کہ اس کی چھٹی حس اسے جو بتا رہی تھی وہی سچ تھا وہاں جو بھی ہوا وہ کچھ اچھا نہیں تھا اس سے پہلے کہ عالیہ اسے کچھ بتا پاتی اسے عالیہ کی طرف سے شور سا سنائی دیا یقیناً کسی نے اسے فون کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا لائن کٹ چکی تھی۔
نواب نے بے اختیار عالیہ کا نمبر ملایا بیل جا رہی تھی لیکن کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا پھر کال کاٹ دی گئی' نواب نے دیوانگی سے دوبارہ نمبر ملایا لیکن اس بار فون آف تھا نواب سب کچھ بھول گیا اسے اس وقت صرف عالیہ کی فکر ہو رہی تھی وہ تصور کر سکتا تھا اس وقت عالیہ کے گھر میں کیا ہو رہا ہوگا۔
اس کا دل چاہا ایک بار پھر اکرم کا نمبر ملائے لیکن پھر کچھ سوچ کر خاموش رہا اسے صبر کرنا تھا اور انتظار کرنا تھا جب تک کے اسلم اور اکرم گھر نہ پہنچ جاتے۔

☆......☆......☆

گھر پہنچ کر اسلم نے نہایت مناسب الفاظ میں چوہدری کا انکار نواب تک پہنچایا تھا لیکن پھر بھی وہ شدید غم میں آ گیا تھا اسے یہ ملال بھی ہو رہا تھا کہ اس کی وجہ سے اس کے ماما کی بے عزتی ہوئی ہے حالانکہ اسلم نے اسے کافی

سمجھایا تھا کہ اس طرح کے معاملات میں انکار ہو جائے تو اسے بے عزتی نہیں سمجھا کرتے لیکن نواب کا غصہ کسی طرح کم ہو کے نہ دے رہا تھا دوسری طرف اسے عالیہ کی بھی فکر ستا رہی تھی جو نہ جانے کس حال میں تھی عالیہ سے رابطے کا واحد ذریعہ وہ موبائل تھا جو اس وقت عالیہ کے گھر والوں کے قبضے میں تھا جب اور کوئی راستہ دکھائی نہ دیا تو نواب نے گاؤں جانے کا فیصلہ کر لیا۔

☆......☆......☆

فیصلہ کرنے کے بعد نواب اسلم کے کہنے پر بھی نہیں رُکا تھا اور سیدھا گاؤں چلا آیا تھا' وہ جانتا تھا ایک بار وہ گاؤں پہنچ گیا تو کسی نہ کسی طرح عالیہ سے ملاقات ہو ہی جائے گی ورنہ کم از کم وہ رانی کے ذریعے اپنا پیغام تو اس تک ضرور ہی پہنچا دے گا اور ہوا بھی یہی اسے گاؤں پہنچے ہوئے ایک گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ رانی عالیہ کا پیغام لے کر اس کے پاس آ گئی عالیہ نے شام کو اسے اپنی مخصوص جگہ پر ملنے کے لیے بلوایا تھا۔ پیغام دینے کے بعد رانی رُکی نہیں تھی بلکہ فوراً ہی وہاں سے چلی گئی تھی وہ عالیہ کے لیے وہاں تک آ تو گئی تھی لیکن اب اسے یہ فکر بھی ستا رہی تھی کہ کوئی اسے وہاں سے آتے جاتے نہ دیکھ لے۔

☆......☆......☆

رانی کے جانے کے بعد کا سارا وقت نواب نے بہت بے چینی سے گزارا تھا' اس روز وہ دن میں ایک بار بھی گھر سے باہر نہیں نکلا تھا کھانا کھانے کے لیے بھی نہیں کہ اس کی بھوک پیاس سب کچھ موجودہ حالات نے اڑا دی تھی۔ اس نے ساری رات گاڑی ڈرائیو کی تھی اب وہ تھکا ہوا تھا بستر پر لیٹے لیٹے عالیہ کے بارے میں سوچتا ہوا وہ کئی بار غنودگی میں چلا گیا تو خواب میں بھی کبھی عالیہ کا موبائل کوئی چھین لیتا تو کبھی عالیہ ان سے ملنے کے لیے نہ آ پاتی اس طرح سوتے جاگتے اس نے دوپہر تک کا وقت گزارا تھا اور اس کے بعد وہ بستر سے اٹھ بیٹھا اس روز وہ خود کو دنیا کا سب سے بے کار اور فالتو آدمی لگ رہا تھا جس کے پاس کوئی مصروفیت نہیں تھی سوائے انتظار کرنے کے' شام قریب آئی تو وہ نہانے کے لیے باتھ روم میں گھس گیا نہا دھو کر وہ خود کو کافی فریش محسوس کرنے لگا اور پھر ٹائم ہونے پر وہ گھر سے نکل کر جانے پہچانے راستوں پر چلنے لگا۔

☆......☆......☆

اس روز عالیہ کے لیے گھر سے نکلنا آسان کام نہیں تھا اس کے لیے گھر سے باہر جانے پر پابندی لگی ہوئی تھی چوہدرائن بھی اس سے ناراض تھی اس لیے اسے کسی قسم کی رعایت کی امید نہیں تھی' آج کل اس کا زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں بند ہو کر ہی گزرا کرتا تھا' گھر میں کوئی اس سے بات کرنے کا روادار نہ تھا تو وہ بھی کسی سے بات کرنے کے موڈ میں کہاں تھی' وہ سب سے روٹھی ہوئی تھی لیکن زندگی میں پہلی بار کسی کو اس کے روٹھنے کی کوئی پرواہ نہیں تھی' جب سے اس کے اس سے موبائل ملا تھا چوہدری خود کو تھکا ہوا اور ہارا ہوا محسوس کر رہا تھا تو چوہدرائن اپنی تربیت پر شرمندہ بیٹھی تھیں لیکن ماں باپ ہونے کے ناطے عالیہ کو کچھ کہنے سے بھی گریز کر رہے تھے کہ وہ ان کے جگر کا ٹکڑا تھی جسے کبھی انہوں نے پھولوں کی چھڑی سے بھی نہیں چھوا تھا لیکن وسیم کے معاملے میں ایسا نہیں تھا وہ غصے میں تھا اور اپنے غصے کا بھرپور اظہار بھی کر رہا تھا' اس کے غصے کی وجہ سے عالیہ بھی اس کے سامنے آنے سے گریزاں تھی اور جب کبھی بھولے بھٹکے اچانک ان کا سامنا ہو جاتا تو وسیم کی آنکھوں سے نکلتے غصے کے شعلے عالیہ کو ہراساں کر دیتے اس کے باوجود جب اس نے سنا کہ نواب گاؤں آ گیا ہے تو اس نے فوراً رانی کے ہاتھ اسے ملنے کا پیغام بھجوا دیا تھا یہ اور بات کہ اس وقت سے وہ باہر نکلنے کے بہانے تلاش کر رہی تھی اور مسلسل ناکام ہو رہی تھی اسے کوئی راستہ سجھائی نہ دیا تو اس نے ایک بار پھر رانی سے مدد مانگی' رانی کو اپنے بستر پر لٹا کر وہ چپکے سے حویلی سے نکل آئی اور تیز تیز قدموں سے اس طرف بڑھنے لگی جہاں اس نے نواب کو ملنے کے لیے بلایا ہوا تھا۔

اس سنسنی خیز ناول کے باقی واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمایئے

ایسی کہانیاں جن کا انجام اور طرح کا ہے



سعید آثم کا خیال

اے شاخِ شجر ہم سے نہ کر ترکِ تعلق
اک رُت میں ترے جسم کی پوشاک تھے ہم بھی

میجر (ر) امتیاز حسین ملک

مارچ کے آخری ہفتے کی بات ہے میں ایک کام کے سلسلے میں سیکریٹریٹ گیا ہوا تھا۔ آفس واپس آیا تو پتہ چلا کہ منہاس صاحب دو چکر لگا چکے ہیں۔ کوئی اور صاحب بھی ساتھ تھے۔ کوئی ضروری کام تھا اس لیے پھر آنے کا کہہ گئے ہیں۔ بڑی حیرانی ہوئی آخر ایسا کیا کام پڑ گیا ان کو کہ اس طرح چکر لگا رہے ہیں۔

منہاس صاحب ایک مقامی ماہنامے کے ایڈیٹر ہیں۔ ان سے اچھے خاصے تعلقات ہیں۔ اکثر ملنے آتے رہتے ہیں لیکن ان کا اس طرح بار بار چکر لگانا باعثِ تشویش تھا۔ پتہ نہیں بے چاروں کو کیا پریشانی تھی۔ انہیں فون کر کے معلوم کرنے کا سوچا۔ ابھی فون ڈائل ہی کر رہا تھا کہ منہاس صاحب آفس میں داخل ہوئے ان کے ساتھ مرسلین بھی تھے۔ مرسلین کے ساتھ منہاس صاحب کے آفس میں ہی ایک دو دفعہ ملاقات ہوئی تھی لیکن کوئی ایسے تعلقات نہ تھے۔ ہم دونوں منہاس صاحب کے ماہنامے کے لیے لکھتے تھے۔ علیک سلیک ہوئی اور دونوں سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ منہاس صاحب سے خیر خیریت پوچھنے کے بعد میں نے اپنی غیر حاضری کے لیے معذرت کی اور پھر ان سے اس طرح بار بار چکر لگانے کی وجہ دریافت کی۔ وہ بولے۔

"مرسلین صاحب کو کوئی پریشانی لاحق ہے اس سلسلے میں آپ سے مشورہ اور مدد درکار ہے۔" مرسلین مجھے خاصے مضطرب نظر آئے۔ میں نے انہیں تسلی دی۔

"فکر نہ کریں اگر میں کچھ کر سکا تو ضرور کروں گا۔" ان کو سنبھالنے کے لیے میں نے انہیں چائے پیش کی جو انہوں نے شکریے کے ساتھ قبول کی۔ سبز چائے تو میرے آفس میں ہر وقت موجود رہتی ہے۔ دودھ والی چائے پینی ہو تو منگوانی پڑتی ہے۔ لیکن انہوں نے سبز چائے ہی پسند کی اس لیے آسانی رہی۔ چائے وغیرہ پی کر یہ لوگ آرام سے بیٹھے تو میں نے مرسلین سے پوچھا۔

"اب بتائیں کیا مسئلہ ہے؟"

"کیا بتاؤں بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ آپ کے پاس مشورے اور مدد کے لیے آئے ہیں۔" وہ بولا۔ میں نے اُسے تسلی دی۔

"اللہ رحم کرے گا۔ لیکن آپ بتائیں تو سہی آخر مسئلہ کیا ہے۔" اس نے کچھ کاغذات میرے سامنے رکھ دیے ان کے ساتھ کچھ تصویریں بھی تھیں اور بولا۔

"میں نے ان میں سب کچھ لکھ دیا ہے اگر آپ کے پاس وقت ہو تو پڑھ لیجیے گا۔" لکھنے والے کے لیے بولنے سے زیادہ لکھنا آسان ہوتا ہے اس لیے اس نے یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ یا شاید میرے سامنے بیان کرنے میں جھجک محسوس کر رہا ہو۔ چونکہ نماز جمعہ کا وقت قریب تھا اس لیے میں نے تجویز پیش کی کہ پہلے نماز پڑھ لیتے ہیں پھر تسلی سے انہیں پڑھ بھی لیں گے اور ان پر گفتگو بھی کر لیں گے۔ وقت کافی ہوگا' اس وقت تو ہمیں نماز کی وجہ سے ذرا جلدی کرنی ہوگی۔ ان کو تجویز پسند آئی اور ہم سب نماز کے لیے چلے گئے۔ میں تو اپنے معمول کے مطابق آفس سے نزدیک ہی زہری مسجد میں گیا اور دونوں پتہ نہیں کہاں گئے۔ نماز کے فوراً بعد ملاقات ٹھہری تھی۔

نماز میں ایک گھنٹہ لگ گیا۔ آفس واپس آیا تو ابھی منہاس صاحب اور مرسلین نہیں آئے تھے۔ سوچا ان کے آنے تک ان کے کاغذات ہی پڑھ لوں۔ ابھی شروع ہی کیا تھا کہ وہ دونوں بھی آ گئے۔ مجھے کاغذات پڑھتا دیکھ کر مرسلین نے کہا۔

"آپ تسلی سے پڑھ لیں ہم لوگ بیٹھے ہیں۔"

میں نے دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ لوگ سامنے ہی بیٹھ گئے۔ میں نے تسلی سے سارا کیس پڑھا۔ مرسلین کے کسی لڑکی سے تعلقات کا قصہ تھا جو منگنی تک پہنچا لیکن پھر تعطل کا شکار ہو گیا۔ سارا معاملہ بڑی تفصیل سے لیکن بڑے جذباتی انداز سے لکھا گیا تھا۔ قصے میں جذبات زیادہ تھے اور حقائق کم۔ اس لیے کیس ٹھیک طریقے سے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اسی طرح جیسے بیان کرتے ہوئے آواز جذبات سے رُندھ جائے تو بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کئی چیزیں تشریح طلب تھیں تو کچھ تفصیل طلب۔ کاغذات پڑھنے کے بعد میں نے کچھ پوچھنے کے لیے مرسلین کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی اس نے پوچھا۔

"پڑھ لیا آپ نے؟" میں نے کہا۔

"پڑھ تو لیا ہے لیکن اس میں کافی کچھ تشریح



طلب ہے اس میں دراصل جذبات زیادہ ہیں اور حقائق کم۔ میرے خیال میں بہتر ہوگا اگر یہ سب کچھ آپ خود سنائیں۔''

وہ خود بھی شاید یہی چاہتا تھا بھڑاس نکالنا چاہتا ہوگا۔

''یہ غفار خان ہے۔'' اس نے ایک تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔ سندھ میں ہمارے کچھ عزیز رہتے ہیں ان کے ساتھ اس کی رشتہ داری ہے اس حوالے سے اس کا ہمارے ساتھ کچھ تعلق بنتا ہے۔ اس کی یہاں کوئٹہ میں پوسٹنگ ہوئی تو یہ اسی حوالے سے مجھے ملنے آیا۔ اس کی یہاں ایک سرکاری محکمے میں پوسٹنگ ہوئی تھی۔ رشتہ داری کا معاملہ تھا اس لیے ہم نے اس کی خوب خاطر تواضع کی۔ ہم پر خدا کا فضل ہے خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ غفار خان اس سے خاصا متاثر اور مرعوب ہوا۔ ہمارے پاس وہ ایک دن رہ کر واپس چلا گیا۔ تکلفاً ہم نے اسے دوبارہ آنے اور بچوں کو بھی ساتھ لانے کا کہا۔ اس نے یہ دعوت بخوشی قبول کر لی۔ کوئی ایک مہینے بعد وہ دوبارہ ہمارے گھر آیا۔ اس بار اس کے ساتھ اس کی بیٹی پروین' اس کی بیوی اور بیٹے بھی تھے۔ اس نے غفار کی فیملی کی تصویر بھی دکھائی۔ مرسلین کے پاس ان لوگوں کی کافی تصویریں تھیں۔ دوسرے دن غفار خان یہ کہہ کر واپس چلا گیا کہ اسے تو ڈیوٹی پر جانا ہے البتہ بچوں کا چونکہ یہاں کافی دل لگ گیا ہے اس لیے وہ دو ایک دن مزید رہیں گے۔

بچوں کا دل ہمارے گھر میں کچھ ایسا لگا کہ وہ ایک دو دن کی بجائے پورا ایک ہفتہ رہے۔ ہم نے ان کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس دوران ان لوگوں کی ہم سے کافی بے تکلفی ہوگئی۔ گھر میں والدہ کے علاوہ ہم دو بھائی ہی موجود تھے میں اور چھوٹا بھائی نعیم۔ نعیم کی بیوی میکے گئی ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے ہے تو چھوٹا لیکن اس کی شادی مجھ سے پہلے ہوگئی تھی۔ پتہ نہیں اسے جلدی تھی یا میں ہی لیٹ ہوگیا تھا۔ اس کے تو ماشاء اللہ دو بچے بھی تھے۔ میری عمر اب 35 سال ہوگئی ہے۔ لیکن پسند و ناپسند کے چکر میں ابھی تک شادی نہیں کی۔ کوئی رشتہ گھر والوں کو پسند ہوتا ہے تو مجھے ناپسند' کوئی مجھے پسند ہوتا ہے تو گھر والوں کو ناپسند۔ میری والدہ کو اس معاملے میں مجھ سے شکایت رہتی تھی وہ میرے متعلق فکر مند بھی بہت تھیں۔ ان کے خیال میں تو میری شادی کی عمر ہی نکلی جا رہی تھی۔ اب انہیں کون سمجھاتا کہ شادی کے معاملے میں مرد عمر سے زیادہ دل کے محتاج ہوتے ہیں۔ جب کوئی پسند آ جائے یا کسی پر دل آ جائے تو پھر عمر وغیرہ نہیں دیکھتے۔ تھوڑا بہت فرق ہو بھی تو نظر نہیں آتا یا دل خود ہی پورا کر لیتا ہے۔ پروین کی میرے ساتھ خاصی بے تکلفی ہوگئی۔ اس سے پتہ چلا کہ غفار خان اس کا حقیقی باپ نہیں تھا سوتیلا تھا لیکن ماں حقیقی تھی۔ پروین کی والدہ کا تعلق سوات سے تھا۔ اس کی پہلی شادی اپنے خاندان میں ہی ہوئی تھی۔ شادی کے بعد وہ شوہر کے ساتھ قطر چلی گئی۔ وہیں پروین اور اس کے دو چھوٹے بھائی پیدا ہوئے۔ قطر میں کافی عرصہ انہوں نے مالی آسودگی اور سکون و آرام سے گزارا۔ لیکن پھر کسی بیماری کی وجہ سے ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ والد کے انتقال کے بعد مجبوراً اُن کی والدہ ان کو لے کر پاکستان واپس آ گئی۔ ان کا تعلق چونکہ غریب خاندان سے تھا اس لیے پاکستان آ کر انہیں اَن گنت مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ غربت اور بیوگی ہی کچھ کم مصائب نہ تھے کہ اوپر سے تین چھوٹے چھوٹے بچوں کی پرورش کے بوجھ نے تو پروین کی والدہ کی کمر توڑ دی۔ بچے چھوٹے تھے خود اس کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ اس لیے سب کی نظر اس پر تھی۔ ہمدردی میں نہیں اس کی جوانی پر' ایک تنہا جوان عورت کا زندہ رہنا ہمارے معاشرے میں بہت مشکل ہے۔ تنگ آ کر اس نے کسی مرد کے سہارے کی تلاش شروع کر دی۔ آخر غفار خان کی صورت میں اسے سہارا مل گیا۔ جس نے اس کے ساتھ شادی کر لی اور بچوں کی پرورش کی ذمہ داری بھی قبول کر لی۔

شروع شروع میں غفار خان کا رویہ ہمارے ساتھ ٹھیک ٹھاک تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ بدلتا گیا۔ جیسے جیسے والدہ بڑھاپے کی طرف اور میں جوانی کی

طرف بڑھتے گئے ہم لوگ اس کے لیے بوجھ بنتے گئے۔ اب تو وہ روایتی سوتیلا باپ بن گیا۔ بات بات پر ڈانٹ ڈپٹ، کچھ بولو تو مار پیٹ، امی کے ساتھ ہر وقت کی چیخ چیخ اور لڑائی اس کا معمول ہو گیا ہے۔ دیگر ضروریات پوری کرنا تو دور کی بات ہے وہ تو روزمرہ کی ضروریات کھانا پینا، کپڑے اور تعلیم کے اخراجات تک پورے نہیں کرتا۔ کچھ مانگو تو اُلٹی سیدھی سناتا ہے۔ والدہ کچھ کر بھی نہیں سکتیں۔ سب کچھ برداشت کرتی ہیں اس لیے بے سہارا ہیں۔ غفار خان کی صورت میں کم از کم مرد کا سہارا اور حفاظت تو میسر ہے۔ امی خاص طور پر میری وجہ سے پریشان رہتی ہیں اس لیے کہ جوان لڑکی کسی مرد کی حفاظت کے بغیر کیسے زندہ رہ سکتی ہے۔

پروین کی داستان سے میں بہت متاثر ہوا۔ میں نے ان لوگوں کی مدد کا فیصلہ کیا۔ پروین خوش شکل اور جوان بھی جبکہ مجھے مناسب رشتے کی تلاش تھی۔ مجھے وہ پسند آ گئی اور میں نے اُسے دلہن بنا کر گھر لانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اس سلسلے میں جلدی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا تاکہ ان کے متعلق تسلی کر لوں۔ ان کے واپس جانے کے کوئی دو ہفتے بعد میں ان کے گھر گیا۔ بہت اچھی طرح ملے۔ خوب خاطر تواضع کی۔ پھر ان کے گھر آنا جانا میرا معمول بن گیا۔ پروین کے ساتھ میرا تعلق اور دوستی آہستہ آہستہ محبت کی صورت اختیار کر گئے۔ اس کے گھر والوں کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ اس کی والدہ تو بہت خوش تھیں۔ وہ میرے ساتھ اکیلی سیر تفریح اور شاپنگ وغیرہ کے لیے جاتی۔ خوب فوٹو گرافی وغیرہ بھی ہوتی۔ اس نے بہت سی تصویریں بھی دکھائیں۔ ہماری خط و کتابت بھی رہی۔ خطوط کا بھی اس کے پاس پورا پلندہ تھا۔ تعلقات اس حد تک بڑھ گئے کہ آخر میں نے والدہ سے ان کے ہاں جا کر رشتے کی بات کرنے کا کہہ دیا۔ والدہ تو شاید اسی دن کی منتظر تھیں فوراً رضا مند ہو گئیں۔ میری والدہ اور ہمشیرہ ان کے ہاں رشتے کے لے گئیں۔ وہ لوگ تو شاید منتظر ہی تھے فوراً راضی ہو گئے۔ کوئی ایک ہفتے کے بعد منگنی کی رسم ادا کرنے کی ٹھہری۔ ان ہی کی درخواست پر ان کے گھر ہی میں بڑی خاموشی اور سادہ سی منگنی کی رسم ہوئی۔ لیکن ہم لوگوں کی تسلی نہ ہوئی اس لیے ہم نے اپنی طرف سے بڑی دھوم دھام کی تقریب منعقد کی۔ شہر کے بہت سے معززین کو تقریب میں مدعو کیا۔ منگنی کے بعد ہم لوگ خوشی خوشی شادی کی تیاریوں میں لگ گئے۔ شادی بڑی دھوم دھام سے کرنے کا پروگرام تھا۔ میری والدہ شادی جلدی کرنا چاہتی تھیں لیکن پروین کے والدین جلدی شادی پر رضا مند نہیں ہو رہے تھے۔ جب بھی ہم لوگ تاریخ لینے کے لیے جاتے یہ کہہ کر ٹال دیتے کہ ابھی ہم لوگ تیار نہیں۔ منگنی کے کچھ ماہ بعد غفار خان ہمارے گھر آیا اور اس نے مجھ سے ایک لاکھ روپیہ مانگا۔ اسے کسی کاروبار کے سلسلے میں رقم کی ضرورت تھی لیکن میں شادی سے پہلے اتنی رقم نہیں دینا چاہتا تھا اس لیے میں نے معذرت کر لی۔ بس اسی دن سے ان لوگوں کا رویہ بدلنا شروع ہو گیا۔ ہم تاریخ کا تقاضا کرتے تو وہ لوگ کہہ دیتے کہ ابھی ہمارے پاس اتنی رقم نہیں کہ شادی کا بندوبست کر سکیں جونہی رقم کا بندوبست ہو گیا شادی کی تاریخ دے دیں گے۔ لیکن ان کے رویے میں روکھا پن اور سرد مہری آتی گئی۔ پروین البتہ اسی طرح رہی۔ اس کی خط و کتابت بھی جاری رہی اور ملتی بھی رہی۔ یہ چیز میرے لیے ان کے بدلتے رویے کے باوجود تقویت کا باعث تھی۔ آخر ہمارے اصرار سے مجبور ہو کر انہوں نے شادی کی تاریخ مقرر کر دی۔ ہم لوگ بہت خوش ہوئے اور شادی کی تیاریوں میں لگ گئے۔

تمام تیاریاں مکمل کرنے کے بعد شادی کی تاریخ سے دو ایک دن پہلے کچھ معاملات طے کرنے کے لیے میری والدہ اور ہمشیرہ غفار خان کے گھر گئیں۔ وہاں تو جیسے ایک طوفان ان کا منتظر تھا۔ غفار خان اور اس کی بیوی نے نہ صرف میری والدہ اور ہمشیرہ کے ساتھ بدتمیزی کی بلکہ منگنی کے وقت دیا گیا سامان بھی واپس کر کے شادی سے انکار کر دیا۔ مجھے خبر ملی تو میرے تو ہوش اڑ گئے۔ ساری تیاریاں مکمل تھیں لوگوں کو دعوت وغیرہ بھی دے دی گئی تھی۔ منگنی ٹوٹنا کوئی معمولی بات

تو نہیں تھی۔ ہمارا تو قبائلی سسٹم ہے یہاں تو منگنیاں ٹوٹنے پر جانیں چلی جاتی ہیں۔ پھر کوئی چوری چھپے کی بات تو تھی نہیں سارے شہر کو پتہ تھا اس لیے عزت خاک میں مل جاتی تھی۔ ان سے فون پر بات کرنے کی کوشش کی لیکن وہ لوگ اتنے بپھرے ہوئے تھے کہ بات تک کرنے کے روادار نہ تھے۔ پروین کو خط لکھا تو جواب ملا کہ تمہاری والدہ نے میرے والدین کی اتنی بے عزتی کی ہے کہ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ میری والدہ اور ہمشیرہ کہتی ہیں کہ ان لوگوں نے ہماری بہت بے عزتی کی جبکہ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ آپ کی والدہ نے ہماری بہت بے عزتی کی۔ اب میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ اپنا قصہ ختم کرنے سے پہلے مرسلین نے مجھے ایک خط دکھایا اور بتایا کہ یہ خط میں نے پروین کو لکھا ہے۔ میں نے اسے لکھا ہے کہ یہ میرا آخری خط بھی ہوسکتا ہے۔ تمہارا سوتیلا باپ تو رشتہ توڑ رہا ہے لیکن تم بتاؤ تم کیا چاہتی ہو۔ اگر تم مجھے چاہتی ہو اور میرے ساتھ شادی کرنا چاہتی تو چپ چاپ گھر سے نکل کر میرے پاس آ جاؤ میں سب کچھ سنبھال لوں گا یا پھر خط یا فون کے ذریعے اپنی خواہش بتادو میں خود آ کر تمہیں نکال لے جاؤں گا۔ قصہ ختم کر کے اس نے میری طرف بے بسی سے دیکھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''آپ کے خیال میں غفار خان ایسا کیوں کر رہا ہے۔ اور یہ وہ اکیلا ہی کر رہا ہے یا پروین اور اس کی والدہ بھی اس میں اس کے ساتھ شامل ہیں؟'' وہ بولا۔

''یا تو وہ سوتیلا ہونے کی وجہ سے سوتیلی بیٹی کی قیمت وصول کرنا چاہتا ہے کیا پتہ یہ دھندہ ہی کرنا چاہتا ہو یا پھر سوتیلی بیٹی کو خوش اور بستے نہیں دیکھنا چاہتا اور اس طرح اس کی خوشیوں اور آرزوؤں کا خون کرنا چاہتا ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''اب کیا کرنا چاہتے ہو؟'' وہ بولا۔

''کرنا کیا ہے جی...... اس نے ہماری اتنی بے عزتی کی ہے کہ میں تو اسے عدالت میں لے جاؤں گا۔ اگر ممکن ہوا تو شاید ملٹری کورٹ میں بھی لے جاؤں۔ یہی مشورہ کرنے تو آپ کے پاس آیا ہوں۔'' میں نے اس سے پوچھا۔

''کیا عدالت میں جانے سے آپ لوگوں کی بے عزتی نہیں ہوگی' آپ کے خاندان کا نام نہیں اُچھلے گا؟'' وہ بولا۔

''یہ تو ہوگا...... بے عزتی بھی ہوگی...... خاندان کا نام بھی اُچھلے گا لیکن پھر کریں کیا؟ یہی تو مسئلہ ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیوں نہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کریں کہ عدالت تک جانے کی ضرورت ہی نہ پڑے اس سے پہلے ہی کام ہوجائے۔ میرے خیال میں ایسا کرتے ہیں ایک درخواست غفار خان کے انچارج افسر کے نام لکھتے ہیں۔ جس میں سارا قصہ تفصیل سے لکھ دیتے ہیں۔ پھر یہ درخواست لے کر آپ خود اس افسر کے پاس جائیں۔ امید ہے یہ قصہ یہیں ختم ہوجائے گا ورنہ کوئی اور طریقہ دیکھیں گے۔'' دونوں کو میری تجویز پسند آئی۔ فیصلہ ہوا کہ اگلے دن مرسلین درخواست لکھ کر لائیں گے اور مجھے دکھانے کے بعد غفار خان کے افسر انچارج کے پاس جائیں گے۔

دوسرے دن مرسلین صبح صبح ہی میرے پاس پہنچ گئے۔ میں نے درخواست پڑھی ٹھیک ٹھاک لکھی ہوئی تھی۔ میرے آفس سے ہی مرسلین غفار خان کے افسر کو ملنے چلا گیا۔ ٹھیک اندازہ نہیں لگ سکتا تھا کہ اسے وہاں کتنا وقت لگے گا اس لیے اگلا دن ملاقات کا طے ہوا۔ اگلے دن وہ آیا تو پہلے سے بھی پریشان تھا۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ درخواست لے کر میں وہاں گیا تو پہلے مجھے ان کے اسٹاف افسر کے پاس لے جایا گیا۔ انہوں نے درخواست لے لی۔ درخواست اور سارا قصہ پڑھا اور پھر میری خوب بے عزتی کی یہ کہہ کر کہ تم ہمارے ایک ملازم کو بدنام کرتے پھر رہے ہو اور اس کی بیٹی کی تصویریں لوگوں کو دکھاتے پھر رہے ہو۔ اگر تم دوبارہ نظر آئے تو ہم تمہیں پولیس کے حوالے کردیں گے۔ اس پر میں چپ چاپ وہاں سے واپس چلا آیا۔ میں نے مرسلین کو سمجھایا کہ یہ تمہیں ڈرانے اور دباؤ ڈالنے کا طریقہ ہے تاکہ ڈر کر ان کا پیچھا چھوڑ دو۔ تم ایسا کرو کہ دو ایک دن انتظار کرو۔

اس کے بعد دوبارہ ان کے آفس جاؤ۔ لیکن اس دفعہ کسی اسٹاف افسر سے مت ملنا بلکہ آفیسر انچارج سے ملنے پر اصرار کرنا۔ یہ بھی بتا دینا کہ دو تین دن پہلے میں نے درخواست دی تھی اسی کے متعلق چیک کرنے آیا ہوں۔ دو دن بعد یہ ان کے آفس گئے تو وہاں حالات ہی بدلے ہوئے پائے۔ انہیں دیکھ کر وہ لوگ کافی پریشان ہوئے۔ ان کے ارادے معلوم ہوتے ہی وہ اسٹاف افسر صاحب تو وہاں سے کھسک گئے۔ لگتا ہے ان دو دنوں میں بہت کچھ ہو چکا تھا۔ پھر ایک صاحب آئے انہوں نے بتایا کہ آفیسر انچارج آج موجود نہیں ہیں اگر آپ کل آ جائیں تو ملاقات ہو سکتی ہے۔ یہ کل دوبارہ آنے کا کہہ کر وہاں سے واپس آ گئے۔ لیکن آفس سے نکل کر تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ غفار خان اور اس کی بیوی نے ان کو جالیا۔ وہ شاید کہیں ان کے منتظر تھے۔ ملتے ہی ان سے کہنے لگے۔

''ہمارے ساتھ گھر چلیں آپ سے کچھ بات چیت کرنی ہے۔'' لیکن مرسلین نے ان کے گھر جانے سے انکار کر دیا اس لیے کہ پہلے وہ بات چیت سے انکار کر چکے تھے۔ اس پر انہوں نے وہیں بات چیت شروع کر دی۔

''پہلی شکایت انہوں نے یہ کی کہ آفس میں درخواست دے کر تم نے ہمیں بہت بدنام کر دیا ہے۔'' اس پر مرسلین نے جواب دیا۔

''منگنی توڑ کر آپ لوگوں نے ہماری بدنامی میں کیا کسر چھوڑی ہے۔'' پھر کہنے لگے تمہاری والدہ اور ہمشیرہ نے ہماری بہت بے عزتی کی ہے اگر تم ان کو چھوڑ دو تو ہم پروین کی شادی تم سے کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن مرسلین نے والدہ اور ہمشیرہ کو چھوڑنے سے انکار کر دیا اور وہاں سے چلا آیا۔ رات کو اسے پروین کا فون آیا۔ اس نے بھی یہی کہا کہ اگر والدہ کو چھوڑ دو تو ہماری شادی ہو سکتی ہے کیونکہ میرے والدین تمہاری والدہ کے سخت خلاف ہیں۔ لیکن مرسلین نے پھر انکار کر دیا۔ اس پر پروین نے کہا کہ اب تم اگر آسمان سے تارے بھی توڑ لاؤ تو میں تم سے شادی نہیں کروں گی۔ لیکن تارے دوسرے ہی دن ٹوٹنے شروع ہو گئے۔ جب غفار خان نے مرسلین کو بات چیت کے لیے اپنے گھر بلایا۔

مرسلین اور منہاس دونوں ان کے گھر گئے۔ خوب خاطر مدارات ہوئیں۔ کافی لمبے چوڑے مذاکرات ہوئے۔ پہلی شرط تو یہی رکھی گئی کہ مرسلین والدہ کو چھوڑ دے لیکن یہ انہوں نے نہیں مانی۔ پھر اس بات کی گارنٹی مانگی گئی کہ اس جھگڑے کا انتقام پروین سے نہیں لیا جائے گا اور اسے تنگ نہیں کیا جائے گا۔ بات معقول تھی اس لیے منہاس صاحب نے ان کی تسلی کرا دی۔ آخر معاملات طے ہو گئے اور وہ لوگ شادی پر رضا مند ہو گئے۔ باقاعدہ تاریخ مقرر کرنے کی رسم بعد پر چھوڑ دی گئی۔

اب جبکہ معاملات طے ہو گئے تھے اور مرسلین اور پروین کی شادی ہو رہی تھی میرا خیال تھا کہ مرسلین خوش ہو گا لیکن اگلی ملاقات پر پھر اسے اُداس اور مرجھایا ہوا پایا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

بھئی اب تو تمہیں خوش ہونا چاہیے لیکن چہرے سے نہیں لگ رہا کیا بات ہے؟'' وہ بولا۔

''خوشی کیسی جی ... یہ ٹھیک ہے کہ ہم لوگ بے عزتی اور بدنامی سے بچ گئے ہیں لیکن ان سے اب وہ پہلے والے تعلقات کہاں ہو سکتے ہیں۔ وہی پروین جس سے کبھی مجھے محبت تھی اور جس سے کبھی ملنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا اب مجھے بالکل اچھی نہیں لگتی۔ اب تو یہ شادی اور تعلقات ہماری مجبوری ہے اس لیے گزارہ کرنا ہو گا۔ ورنہ خوشی اور محبت تو اب اس سلسلے میں ذرا بھی نہیں رہ گئیں۔'' مرسلین کی باتیں سنیں اور اس کی حالت دیکھی تو فراز کا شعر یاد آ گیا۔

یہی دل تھا کہ ترستا تھا مراسم کے لیے
اب یہی ترکِ تعلق کے بہانے مانگے

میرے خیال میں وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ان کی شادی اب جسموں کا ملاپ ہو تو ہو دلوں کا ملاپ نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ محبت کا کچا گھڑا تو غفار خان کا چناب لے گیا تھا۔

☆☆......☆☆



سرپرائز

مخدوم محی الدین کا خیال

کسی خیال کی خوشبو ' کسی بدن کی مہک
درِ قفس پر کھڑی ہے صبا پیام لیے

روشن آراء اسماء

اُس کی آنکھ سوتے میں اچانک کھل گئی تھی' حلق جیسے پیاس سے سوکھ رہا تھا' ٹیبل پر پانی کا جگ نہیں تھا اور نہ ہی کوئی پانی کی بوتل' کچھ دیر کسلمندی سے لیٹ کر وہ اٹھ گئی۔ کچن میں جا کر پانی پینے کے لیے لاؤنج سے گزرنا پڑتا تھا' وہ لاؤنج تک پہنچی تھی کہ امی ابو کے کمرے کی لائٹ جلتے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ وال کلاک پر نظر ڈالی رات کے ڈھائی بجے تھے۔ (اتنی رات تک امی ابو کے کمرے کی لائٹ کیوں جل رہی ہے خدانخواستہ کہیں کسی کی طبیعت تو خراب نہیں) سوچتے ہی وہ اپنی پیاس بھول کر اٹھ کر کمرے کی طرف بڑھی' لیکن باہر آتی آوازوں نے اسے رُکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ دبے قدموں چلتی دروازے کے پاس کان لگا کر کھڑی ہوگئی' اپنے نام کی بازگشت نے اُسے چونکا دیا۔

''امی یہ ثناء کہنے کو میری بہن ہے' لیکن یہ میرا گھر برباد کرنے پر تلی ہے۔'' یہ ہما باجی کی آواز تھی۔

''مجھے تو سجاد پر سخت غصہ آتا ہے ہر وقت ثنا ثنا کرتے رہتے ہیں' یہاں تک کہ ابھی پرسوں کہہ رہے تھے کہ جب رشتے کے لیے آئے تھے تو ثناء کو اگر دیکھ لیتے تو میرے لیے کبھی ہاں نہیں کرتے۔'' وہ رونے لگیں تھیں۔

''یہ رو میری بچی میں سجاد سے بات کروں گی۔'' امی انہیں تسلی دے رہی تھیں۔

''نہیں امی مجھے اب کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔''

''دیکھو بیٹا ہم ابھی زندہ ہیں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

ابو کی آواز آئی تھی۔

''امی یہ سب یکطرفہ نہیں ہے' اُس ثنا کی بچی کو دیکھیں نا سجاد کی ہر بات پر کیسے اُن کی پذیرائی کرتی ہے ضد کر کر کے اپنی بات منواتی ہے' اُس دن وہ آئے تھے تو جلدی سے جا کر تیار ہوئی اور پھر اُن کے سامنے آئی۔'' ہما کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔

''اچھے مرے اُس کے ماں باپ روڈ ایکسیڈنٹ میں اور یہ بلا ہمارے سر آ گئی۔'' امی نے جلے کٹے لہجے میں کہا تھا۔

''ایسے نہیں کہو صالحہ بیگم' وہ میرے مرحوم بھائی بھابی کی اولاد ہے' اُن کے بعد اُس کی ذمہ داری ہماری ہی ہے صرف تین دن کی تھی وہ' جب یہ حادثہ ہوا اور وہ ہمارے گھر آئی اور یہ تم ہی تھیں نا جس نے اُسے گود میں لیتے ہی کہا تھا کہ یہ ہماری چوتھی بیٹی

ہے۔''ابو نے جیسے انہیں یاد دلایا۔

''ہاں...... ہاں مجھے سب یاد ہے اور میں نے کب اُسے پرایا سمجھا' اپنی اولاد کی طرح ہی پالا' کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی' لیکن یہ...... یہ لڑکی اپنی ہی بہن کے گھر پر ڈاکہ ڈال رہی ہے تو میں ایسا ہونے نہیں دوں گی۔'' بڑا حتمی انداز تھا اُن کا۔

''دھیرج رکھیں صالحہ بیگم' ثناء ہماری سگی اولاد نہیں تو کیا ہوا' تربیت تو ہماری ہی ہے نا اُس کی' ہم اُس سے بات کریں گے' ابھی آپ اتنا غصہ نہیں کریں اور ہما بیٹا تم بھی حوصلہ رکھو اللہ سب بہتر کرے گا' رات بہت ہو چکی ہے میرا خیال ہے اب بیٹا تم بھی کمرے میں جاؤ اور سب کچھ اللہ پر چھوڑ کر سو جاؤ وہ بہتر کرے گا۔'' ابو کی آواز آتے ہی وہ جلدی سے کچن کی سمت بڑھ گئی مبادا کہیں کوئی اسے دیکھ نہ لے۔

دبے پاؤں جب وہ کمرے میں آئی تو ہما آکے بیڈ پر لیٹ چکی تھی' وہ بھی برابر میں کروٹ لے کے لیٹ گئی اور زبردستی آنکھیں موند لیں۔

ہما' ریما' صبا تین بیٹیاں تھیں عبداللہ صاحب اور صالحہ بیگم کی' ثنا ان کی چچازاد تھی جو محض تین دن کی تھی جب ایک ایکسیڈنٹ میں والدین کے گزر جانے کے بعد تایا تائی کے در پر آ گئی تھی۔ لیکن انہوں نے اُس کی پرورش اپنی بیٹیوں کی طرح ہی کی تھی' کبھی اُسے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ اس کے والدین نہیں۔

ہما کی شادی چھ سال قبل ابو کے دوست کے بیٹے سجاد سے ہوئی تھی۔ سجاد دیکھنے میں بہت خوبرو تھا' ایک مقامی بینک میں منیجر تھا۔ یہ محض اتفاق ہی تھا کہ جب سجاد رشتے کے لیے اپنے والدین کے ہمراہ اُن کے گھر آیا تو اس دن ثنا اپنی کسی دوست کے گھر گئی ہوئی تھی۔ سانولی سی تیکھے نین نقش والی ہما سجاد کے ساتھ اس کے والدین کو بھی بہت پسند آئی اور یوں یہ رشتہ طے ہو گیا' لیکن اس کے بعد شادی کی تمام رسومات میں جب سجاد نے ثنا کو دیکھا تو جیسے اپنے ہوش کھو بیٹھا۔ سرخ و



سفید گڑیا جیسی ثنا ہر رسم میں اس کی مرکز نگاہ تھی' یہ جان کر تو اُسے بہت ہی دکھ ہوا تھا کہ وہ ہما کی چھوٹی بہن ہے۔

جس دن میں پہلی بار تمہارے گھر آیا تھا' اُس دن ثنا کہاں تھی۔ شادی کے صرف ایک ہفتے بعد اُس نے ہما سے پوچھا تو وہ حیران رہ گئی۔

''کیوں اس سے کیا فرق پڑتا ہے' آپ تو مجھے دیکھنے آئے تھے نا؟''

''ہاں! لیکن اگر...... چلو خیر کچھ نہیں۔'' سجاد چپ ہو گیا۔ مگر ہما کے دل میں جیسے کوئی بات کھٹک گئی تھی' اور اس کے بعد کتنی ہی مرتبہ اس نے سجاد کا ثنا کے لیے والہانہ پن دیکھا اور ثنا پتہ نہیں کس نظریے سے اسے دیکھتی تھی' جو اِس کے آتے ہی پھول کی طرح کھل جاتی۔

''سجاد بھائی! یہ سجاد بھائی وہ......'' اس کی فرمائشیں ختم نہیں ہوتی تھیں اور وہ پوری کرتے نہیں تھکتا تھا۔ ہما اندر ہی اندر کڑھتی رہتی۔ اُسے یاد آیا کہ ابھی کچھ دن پہلے اُس کا آئس کریم کھانے کا دل چاہا اور سجاد سے جب کہا تو اس نے تھکاوٹ کا بہانہ کر کے ٹال دیا تھا' اور وہ دل مسوس کر رہ گئی تھی اور ثناء کے تو بس منہ سے بات نکلتی اور وہ بوتل کے جن کی طرح پوری کر دیتا تھا۔

اُس دن وہ امی کے گھر آئی تو اُس نے ثناء کو کچن میں کام کرتے دیکھا' وہ رات کے کھانے کی تیاری میں ریما اور صبا کی مدد کر رہی تھی' پیچھے پیچھے سجاد بھی وہیں آ گیا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' وہ پوچھ تو سب سے ہی رہا تھا لیکن نظریں ثنا پر تھیں جو سرخ سوٹ میں اُس کے دل میں اتر رہی تھی۔

''ویسے تو چکن کڑاہی اور بریانی بن رہی ہے' لیکن میرا دل تو بروسٹ کھانے کو چاہ رہا ہے۔'' ثنا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''میں ابھی آیا۔'' سجاد الٹے قدموں پلٹ گیا تھا اور نصف گھنٹے بعد جب واپس آیا تو شاپر میں بروسٹ تھا' اس کے علاوہ آئس کریم بھی تھی۔

''اِن سب کی کیا ضرورت تھی؟'' ہما جیسے جل ہی گئی تھی۔

''وہ ثنا کا دل تھا نا کھانے کو تو اسی لیے۔'' یہ کہتے ہوئے سجاد نے بڑی سرشار نظروں سے ثنا کو دیکھا تھا۔ جو خوش دلی سے ہنس دی تھی۔

''آپ بہت اچھے ہیں سجاد بھائی۔'' شاپر اس نے سجاد کے ہاتھوں سے لے لیے تھے' اور شاپر لیتے ہوئے سجاد کے ہاتھ اُس کے ہاتھوں کو مس کر رہے تھے۔ ثناء کے انداز میں لاپرواہی تھی' اور ہما کا دل آنے والے خطرات کی بو سونگھ رہا تھا۔ اور پھر ایسا بہت بار ہوا سجاد ثنا کے بارے میں بہت حساس تھا۔ ہر وقت ثنا ثنا کی گردان سے ہما تھک گئی تھی۔

''آپ کی شادی مجھ سے ہوئی ہے ثنا سے نہیں'' اُس رات ہما نے سجاد سے کہا تو لہجہ بہت شکایتی تھا۔

''ہاں! یہی تو غم ہے تم لوگوں نے اس دن جان بوجھ کر ثنا کو چھپا دیا تھا۔ ورنہ میرا انتخاب تم نہیں وہ ہوتی۔'' ہما سمجھی کہ شاید سجاد مذاق کر رہا ہے لیکن جب اس کے چہرے پر نظر پڑی تو آنکھوں میں چھپی سچائی دیکھ کر وہ لرز گئی پھر خود پر قابو پا کر ہنس دی۔

''آپ مذاق بہت اچھا کرتے ہیں۔'' اُس نے بات کو ٹالنا چاہا۔

''مذاق...... ہاہاہا......'' وہ ہنسنے لگا تھا۔

''مذاق تو تم لوگوں نے میرے ساتھ کیا ہے۔''

''کیا بکواس ہے سجاد مجھے بھی آپ نے پسند کیا تھا' اس کے بعد ہی ہاں کی تھی۔'' ہما کو غصہ آنے لگا تھا۔

''ہاں! تو میں نے کب اِس بات سے انکار کیا ہے' لیکن اب مجھے لگتا ہے میرا فیصلہ شاید جلد بازی کا نتیجہ تھا' مجھے کچھ دن انتظار کرنا چاہیے تھا۔'' سجاد کے لہجے میں چھپے پچھتاوے کو اُس نے محسوس کر لیا تھا' وہ کروٹ لے کر سو رہا تھا یا پتہ نہیں جاگ رہا تھا' لیکن ہما کی نیند اڑ چکی تھی۔ اور پھر دوسرے دن بہت سوچ کر اس نے امی ابو کو سب کچھ بتا دیا تھا۔

اگلے دن شام کو بینک سے واپسی پر سجاد اُسے لینے آیا تو خلاف توقع کسی نے بھی خوش دلی سے اس کا

استقبال نہیں کیا تھا۔
''کیا ہوا ہے' خیریت تو ہے؟'' اس نے ٹٹولنے والی نظروں سے ہما کو دیکھا۔ پھر اس کی نظریں جا کر امی کے چہرے پر ٹھہر گئیں۔
''کیا ہوا آنٹی؟''
''کچھ نہیں بیٹا بس ذرا سر میں درد ہے۔'' انہوں نے بات بنائی اور ہما کو بھی خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔
''باقی سب کہاں ہیں؟'' سجاد نے متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھا تھا۔ اُسے اپنے گوہرِ مقصود کی تلاش تھی۔
''صبا کی دوست کی برتھ ڈے پارٹی ہے' یہ سب وہیں گئی ہیں۔'' ہما کے جواب پر وہ خاموش ہو گیا۔
''گھر چلنے کا ارادہ ہے یا نہیں' ویسے میں کل دو ہفتوں کے لیے بینک کے کام سے ملائیشیا جا رہا ہوں' بہتر ہے کہ تم یہیں رہو۔''
''کیوں میں اپنے گھر میں نہیں رہ سکتی' باقی سب تو ہیں ناوہاں۔'' ہما نے تلخی سے کہا۔
''میں تو تمہارے ہی لیے کہہ رہا ہوں' آگے تمہاری مرضی۔'' سجاد کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔
''ٹھیک ہے میں یہیں ٹھیک ہوں۔'' اس کے خراب موڈ کو دیکھ کر ہما نے جلدی سے کہا۔
''کیا ثنا بھی گئی ہے؟'' امی کے جانے کے بعد سجاد نے پوچھا۔
''اُفوہ! کیا آپ ہر وقت ثنا ثنا کرتے رہتے ہیں' میں امی کو بلاتی ہوں' اب آپ ان سے ہی پوچھیے گا۔'' ہما امی کو آواز دینے والی تھی کہ سجاد نے بڑی لجاجت سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
''انہیں کیوں پریشان کر رہی ہو' اچھا رہنے دو میں چلتا ہوں' اسلام آباد سے آؤں گا تو ثنا کو جی بھر کے دیکھوں گا اور......!''
''اور کیا؟'' ہما ڈر گئی تھی۔ سجاد ہنسنے لگا۔
''اور کیا یہ تو سرپرائز ہے' تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔'' وہ خاموشی سے اُسے دیکھنے لگی تھی۔ اُس کے جانے کے بعد بھی وہ اسی طرح سے بیٹھی رہی' اور پھر رونے لگی تھی' امی آئیں تو اُسے روتے دیکھ کر پریشان ہو گئیں' ان کے استفسار پر ہما نے سب کچھ بتا دیا تھا۔
''کہیں ایسا تو نہیں کہ ثنا نے ہی اُسے اپنے چکر میں لے رکھا ہو ورنہ اُس کی اتنی جرأت تو نہیں ہو سکتی۔'' امی کا غصے کے مارے برا حال تھا۔
''آنے دو ثنا کو میں پوچھتی ہوں اُس سے۔'' اور پھر یہی ہوا کہ ثنا کے آتے ہی امی نے اُسے اپنے کمرے میں طلب کر لیا تھا' ابو اور ہما بھی موجود تھے۔ ثنا امی کے تیور دیکھ کر گھبرا گئی تھی' اُس رات ہونے والی گفتگو کے بعد امی کا موڈ اُس سے خراب ہی رہتا تھا اور چاہنے کے باوجود وہ اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہہ سکی تھی' اور اس وقت سب کا خراب موڈ دیکھ کر وہ سمجھ گئی تھی کہ معاملہ کیا ہے۔
''ثنا سچ بتاؤ کہ تم ہم سب کو کیا سمجھتی ہو؟'' بات ہما نے شروع کی تھی۔ امی ابو منتظر نظروں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔
''یہ کیا سوال ہے ہما آپی' ظاہر ہے یہ میرے امی ابو ہیں اور آپ میری آپی۔''
''پھر یہ سب کیا ہے ثنا؟ سجاد کے ساتھ تم کون سا کھیل کھیل رہی ہو' تم اپنی ہی بہن کا گھر برباد کر رہی ہو۔''
امی کی قوتِ برداشت ختم ہو رہی تھی جس کا ثبوت ان کا بدلا ہوا لہجہ تھا۔
ثنا کانپ گئی تھی' پھر رونے لگی۔
''امی ابو اور ہما آپی میرا یقین کریں سجاد بھائی میرے لیے بھائی کی طرح ہیں' میں نے تو کبھی اُن کے لیے ایسے نہیں سوچا جس طرح آپ لوگ سمجھ رہے ہیں' اور مجھے موردِ الزام قرار دے رہے ہیں۔'' وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
ابو سمجھتے تھے کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے' لیکن امی اور ہما کے آگے مجبور تھے' اس لیے تاسف بھری نظروں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔
''پھر سجاد کا رویہ تمہارے ساتھ ایسا کیوں ہے؟ آخر صبا اور ریما بھی تو ہیں۔'' ہما نے پوچھا۔
''مجھے نہیں معلوم کہ سجاد بھائی کا رویہ کیسا ہے' میں تو صرف یہ جانتی ہوں کہ وہ میرے بھائی کی طرح

ہیں۔'' رندھے گلے سے وہ کہہ رہی تھی۔
''اچھا تو پھر ٹھیک ہے' ہمیں تمہارا یقین ہے لیکن سجاد کے دل میں کیا ہے اسے ختم کرنے کے لیے تمہیں ہماری ایک بات ماننا ہوگی۔'' امی پُرسوچ انداز میں کہہ رہی تھیں۔
''آپ کہنا کیا چاہتی ہیں صالحہ بیگم۔'' ابو نے غور سے انہیں دیکھا۔
''ہماری چار بیٹیاں ہیں' ایک کی شادی ہم کر چکے ہیں۔ تین کی ہمیں کرنی ہے' ثنا سب سے چھوٹی ہے لیکن ضروری نہیں کہ پہلے ریما اور صبا کی شادی ہو' اس کے بعد ثنا کی۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟'' امی نے جس طرح کہا تھا اُس نے ثنا سمیت سب کو چونکا دیا تھا۔
''مطلب کیا ہے آپ کا؟''
''میرا مطلب واضح ہے' میں ثنا کی شادی کر رہی ہوں اپنی دوست کے بیٹے جواد کے ساتھ وہ پہلے بھی ثنا کے لیے کہہ چکی ہیں' پہلے میں نے منع کر دیا تھا' لیکن اب میں سوچ رہی ہوں کہ دیر نہیں کرنی چاہیے اور اللہ کا شکر ہے کہ جواد کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی ہے' ثنا تمہیں اعتراض تو نہیں' دیکھو بیٹا ہمیں تمہاری شادی تو کرنی ہی ہے' ابھی کریں یا کچھ عرصے بعد اس سے کیا فرق پڑتا ہے' میں کل ہی رضیہ کو فون کر کے انہیں شام کو ہی گھر بلا رہی ہوں شکر ہے کہ سجاد اسلام آباد گیا ہے اس کے آنے سے پہلے ثنا اپنے گھر کی ہو جائے گی' اور ہماری ہما کا گھر بھی آباد رہے گا۔''
امی کا انداز حتمی تھا' لیکن ان کی بات نے ہما کے چہرے پر اطمینان بکھیر دیا تھا' ابو البتہ خاموش ہو گئے تھے' وہ اتنی جلدی اس بات کے حق میں نہیں تھے لیکن ہما کی شادی کو بچانا بھی ضروری تھا' اور وہ جس کے متعلق اُس سے پوچھے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کر دیا گیا تھا' وہ کچھ کرنے یا کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھی' سو اُن کے فیصلے کو ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔
اگلے دن شام کو امی کی دوست رضیہ آنٹی اپنے بیٹے جواد اور دوسرے فیملی ممبرز کے ساتھ ان کے گھر آئیں۔ ثنا انہیں پہلے ہی پسند تھی' جواد کو بھی اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا سو یہ رشتہ قبولیت کے مراحل طے کر گیا۔ اس کے بعد فوراً ہی انہوں نے شادی کی تاریخ بھی طے کر دی' وہ چاہتی تھیں کہ سجاد کے اسلام آباد سے آنے سے پہلے ثنا کا قصہ ختم ہو جائے اور انہوں نے ایسا ہی کیا' ثنا کی رخصتی کے بعد ہما اور امی نے خاص طور پر سکون کی سانس لی تھی۔
''امی سجاد کو جب پتہ چلے گا تو کیا ہوگا۔'' ہما بڑے پُرجوش انداز میں وہ ماں سے پوچھ رہی تھی۔
''ہوگا کیا منہ دیکھتا رہ جائے گا۔'' وہ ہنسنے لگی تھیں اور ہما نے بھی اُن کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔
اگلی شام سجاد آ گیا' گھر کا ماحول دیکھ کر ٹھٹک گیا' مہندی اور پھولوں کی خوشبو اور کہیں کہیں مسلے ہوئے پھولوں کی پتیاں دیکھ کر وہ اُلجھ گیا۔
''کیا ہوا کوئی تقریب تھی کیا گھر میں؟'' چاروں طرف دیکھتے ہوئے اس نے سوالیہ نظروں سے سب کی طرف دیکھا۔ ہما کے چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ پھیل گئی۔
''ہاں بیٹا! بہت جلدی میں تقریب ہوئی تھی' افسوس کہ تمہارا انتظار بھی نہیں کر سکے' دراصل ان لوگوں کو جلدی بہت تھی اور اتنا اچھا رشتہ میں ہاتھ سے نکال نہیں سکتی تھی۔''
امی کی مبہم گفتگو نے سجاد کو اُلجھا دیا' پھر اس نے نظر دوڑائی ریما اور صبا موجود تھیں' اور ثنا! اُس کا دل بڑے زور سے دھڑکا تھا۔
''کک......کیا مطلب آنٹی!''
''مطلب یہ بیٹا کہ تین روز پہلے ثنا کی شادی تھی۔ کل رات ولیمہ بھی ہو گیا۔ بہت اچھا رشتہ تھا' ثنا کو انہوں نے بہت پسند کیا اور شادی کے لیے جلدی کی تو ہمیں بھی کیا اعتراض تھا کر دی۔''
''لیکن! لیکن آپ لوگوں نے مجھے بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا۔'' بہت ٹوٹا ہوا لہجہ تھا سجاد کا۔
''بھئی ہم نے سوچا آپ کو سرپرائز دیں گے۔ کیسا رہا ہمارا سرپرائز؟'' ہما نے ہنستے ہوئے کہا تھا اور بے چارے سجاد کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔
☆☆......☆☆

ڈسٹ بن

سعید شیخ کا خیال

اک درد میرے دل میں اڑتا رہا غُبار
ملبوس خواب ہوتا رہا مجھ میں تار تار

رانا زاہد حسین

ماں جی ...... ماں جی کیا ہوا ہے آپ کو وہ دروازے سے ہی چیخا۔

صابر اسکول سے واپس آیا تو اس کی نظر اپنی ماں پر پڑھی۔ جو برآمدے میں پڑی چارپائی پر لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ اُس کی سانسیں اُکھڑ رہی تھیں۔ صابر نے بستہ کندھے سے نیچے پھینکا' دوڑ کر اپنی ماں کو گود میں لے لیا۔ صابر سات سال کا بچہ تھا اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا وہ کیا کرے۔ وہ دوڑ کر جگ میں سے پانی گلاس میں ڈالنے لگا تو اُس کی ماں زور زور سے کھانسنے لگی۔ صابر نے پانی کا گلاس ماں کے لبوں سے لگا دیا۔ صابر کی جنت اُس کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ اپنی جنت کے لبوں سے پانی کا گلاس لگائے بیٹھا تھا لیکن پانی اندر جانے کی بجائے باہر آرہا تھا۔ اُس کی جنت اُس کے ہاتھوں سے نکل رہی تھی۔ صابر کے آنسو گلاس میں گر رہے تھے۔ لیکن وہ بے بس تھا مجبور تھا۔ اُس کی ماں کا وقت آگیا تھا۔

جب اُس کی ماں نے اُس کے ہاتھوں میں دم دیا تو صابر نے ایک دلدوز چیخ ماری جو اُس کے گھر کے در و دیوار کو ہلا گئی۔ صابر کی ماں کا ساکت جسم اُس کے ہاتھوں میں تھا۔ پانی کا گلاس اُس کے ہاتھوں سے گر کر فرش پر کرچی کرچی ہو گیا اور پانی فرش پر پھیل گیا۔

صابر ابھی سات سال کا ہی تھا۔ جب اُس کا باپ فوت ہوا تھا تو اُس کی عمر صرف ایک سال تھی صابر کی ماں نے باپ کے بغیر صابر کی پرورش بڑی مشکل سے کی تھی۔ وہ دل کی مریضہ تھی۔ آج دل نے اُس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور دھڑکنا بند کر دیا تھا۔ صابر کی دنیا اجڑ چکی تھی' کروڑوں کی آبادی میں اُس کا اِس دنیا میں کوئی نہیں رہ گیا تھا۔ ایک ماموں تھا جو شہر میں رہتا تھا۔ صابر کا ماموں اکرام کافی خوشحال تھا۔ اکرام کی شادی ایک امیر کبیر گھرانے کی لڑکی رخشندہ سے ہوئی تھی۔ رخشندہ نے اُس سے صرف اِس شرط پر شادی کی تھی کہ وہ گھر داماد بن کر رہے گا۔ اِس

لیے اُسے گاؤں چھوڑ کر شہر رہنا پڑا تھا۔ اکرام رخشندہ سے دب کر ہی رہتا تھا۔ صابر کی ماں کو منوں مٹی میں دفن کر کے صابر کا ماموں اُسے شہر لے گیا۔ صابر کی ممانی رخشندہ نے صابر کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی لیکن رخشندہ کی بیٹی تابندہ صابر کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔

اس مصیبت کو تم یہاں کیوں لے آئے ۔ رخشندہ نے غصے سے پھنکارتے ہوئے پوچھا۔

رخشندہ اِسے کس کے سہارے چھوڑ کر آتا اب ماں کے بعد میں ہی اس کا سہارا ہوں۔ اکرم ماموں نے منمنا کر جواب دیا۔

ٹھیک ہے رکھو اپنے ساتھ مگر میری بیٹی کے آس پاس بھی یہ غریب اور جاہل لڑکا نظر نہ آئے وہ نخوت سے منہ بسورتی کمرے سے باہر چلی گئی۔

یہ صابر کی اس گھر میں پہلی رات تھی۔

''آؤ صابر میں تم کو اپنے کھلونے دکھاؤں۔'' تابندہ نے صابر کو بازو سے پکڑ کر اپنے کمرے میں لے جانا چاہا۔

''کوئی ضرورت نہیں کھلونے دکھانے کی۔'' رخشندہ نے بڑی حقارت سے صابر کا ہاتھ تابندہ



کے ہاتھ سے چھڑایا۔

اکرام رخشندہ کی یہ حرکت دیکھ کر تڑپ کر رہ گیا۔ صابر کو یوں لگا جیسے وہ شودر ہو اور تابندہ برہمن خاندان کی بیٹی' رخشندہ کا یہ روپ صابر کے لیے کوئی نیا نہیں تھا کیونکہ وہ جب بھی اپنے ماموں کے گھر آتا تھا اُس کی ممانی کا رویہ اسی طرح کا ہی ہوتا تھا۔ اِسی لیے صابر بہت کم اپنے ماموں کے گھر آتا تھا۔ لیکن اب تو اُسے یہیں رہنا تھا گاؤں میں اُس کا کوئی بھی نہیں تھا۔ شہر میں صرف ماموں تھا جو بے بسی کی تصویر بنا اُس کے سامنے کھڑا تھا۔

''اِسے یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی؟'' رخشندہ اکرام کو گھورنے لگی۔

''اِس کی ماں مرگئی ہے' یہ یتیم بچہ ہے۔'' اکرام نے بڑی مشکل سے رخشندہ کو جواب دیا۔

''یتیم بچوں کے لیے یتیم خانہ ہے' یہ میرا گھر ہے کوئی یتیم خانہ نہیں۔'' رخشندہ غرائی۔

''کیا کہہ رہی ہو رخشندہ اتنے بڑے گھر میں یہ رہ لے گا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''آپ جس مقصد کے لیے اِس کو یہاں لائے ہیں وہ میں خوب جانتی ہوں۔''

''کس مقصد کے لیے لایا ہوں؟''

''جب سے تابندہ پیدا ہوئی ہے آپ کا مقصد تو صرف ایک ہی ہے۔''

''توبہ ہے رخشندہ تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔ جب اللہ وہ وقت لائے گا دیکھا جائے گا۔''

''دیکھا نہیں جائے گا میں ابھی آپ پر واضح کردینا چاہتی ہوں آپ کسی خوش فہمی میں نہ رہنا۔'' رخشندہ کی باتیں صابر کے کانوں پر ہتھوڑے برسا رہی تھیں۔ اپنی ممانی کی باتیں سُننا اُس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر بھاگ کر جاتا کہاں وہ تو چڑیا کے بچے کی مانند تھا جس کے ابھی پر بھی نہیں نکلے تھے۔ وہ اڑ نہیں سکتا تھا۔ اُس میں طاقت پرواز نہیں تھی۔ اس لیے اب اُسے اِسی گھر میں رہنا تھا اپنی ممانی کی کڑوی کسیلی باتیں سننی تھیں۔ لوری دینے والی ماں تو اب اس دنیا میں رہی نہیں تھی۔ میٹھی لوری کی بجائے اب ممانی کی کڑوی باتیں اُس کا مقدر تھیں۔

اُس کی تقدیر میں شاید یہی لکھا تھا کہ باقی کی زندگی اُس نے ممانی کے رحم وکرم پر گزارنی ہے۔ کہتے ہیں تقدیریں بدلتی ہیں دعاؤں کے اثر سے' لیکن صابر کے پیچھے دعائیں کرنے والی ماں نہیں تھی۔ اب کون تھا جو اُس کے لیے دعائیں کرے گا۔ رخشندہ اِس لیے صابر سے سختی سے پیش آتی تھی کہ کہیں اُس کی نرمی کو دیکھ کر اکرام تابندہ اور صابر کی شادی کا نہ سوچنے لگے۔

رخشندہ تابندہ کی شادی کسی امیر گھرانے میں کرنا چاہتی تھی جن کا لیونگ اسٹینڈرڈ اس کے برابر کا ہو۔ رخشندہ نے صابر کو اپنے گھر رہنے کی اجازت تو دے دی لیکن صابر کی اِس گھر میں حیثیت اکرام کے بھانجے کی نہیں صرف ایک نوکر کی تھی۔

رخشندہ تابندہ کو لے کر بازار گئی صابر کو بھی وہ ساتھ لے گئی تابندہ کو اُس نے دو تین بہت مہنگے ریڈی میڈ کپڑے خرید کر دیے جب وہ ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان سے باہر نکلی دوکان کے باہر ایک ریڑھی والا بچوں کے کپڑے سجائے آوازیں لگا رہا تھا۔

''بچوں کا سوٹ سو سو روپے.....'' فرخندہ نے پرس سے دو سو روپے نکالے اور دو سوٹ صابر کو خرید کر دے دیے حالانکہ تابندہ کا ایک ایک

سوٹ اُس نے تین تین ہزار میں خریدا تھا۔ ریڑھی والا جس دکان کے سامنے کھڑا تھا وہ کھلونوں کی دکان تھی۔ کھلونوں کی دکان دیکھ کر تابندہ کھلونوں کے لیے ضد کرنے لگی تو رخشندہ تابندہ اور صابر کو لے کر کھلوں کی دکان میں چلی گئی وہاں سے تابندہ نے دو تین کھلونے خریدے شوکیس میں سجی ایک خوبصورت گڑیا کو صابر بڑی محویت سے دیکھ رہا تھا۔

''صابر تم کو یہ گڑیا پسند ہے؟'' تابندہ نے پوچھا۔

''بڑی خوبصورت گڑیا ہے مجھے بہت اچھی لگی ہے۔''

''امی صابر کو یہ گڑیا لے دیں۔''

''کتنے کی ہے یہ گڑیا؟'' رخشندہ نے دکاندار سے پوچھا۔

''صرف بارہ سو کی۔''

''لڑکے گڑیوں سے نہیں کھیلا کرتے چلو اب نکلو دکان سے۔'' فرخندہ گڑیا کی قیمت سن کر فوراً دکان سے نکل جانا چاہتی تھی۔

''امی صابر کو یہ گڑیا لے دیں اس کو بہت پسند ہے۔''

''میں کہتی ہوں نکلو یہاں سے بہت دیر ہو گئی ہے۔''

پھر رخشندہ تابندہ کو زبردستی بازو سے پکڑ کر دکان سے باہر آ گئی۔ صابر کو اُس نے کپڑوں والے شاپر پکڑائے ہوئے تھے وہ ان کے پیچھے پیچھے دکان سے باہر آ گیا۔ گاڑی رخشندہ خود ڈرائیو کر کے لائی تھی، سب گاڑی میں بیٹھے اور گھر آ گئے۔ گھر آ کر جب سارا سامان چیک کیا گیا تو پتہ چلا کہ تابندہ نے جو کھلونے لیے تھے وہ تو دکان پر ہی رہ گئے یہ غلطی رخشندہ کی جلد بازی کی وجہ سے ہوئی جو جلدی جلدی کھلونوں کی دکان سے نکل جانا چاہتی تھی۔ کیونکہ تابندہ بار بار صابر کی پسند کی ہوئی گڑیا کے لیے اصرار کر رہی تھی۔ اب شام ہو چکی تھی اگلے دن رخشندہ نے پھر صابر کو ساتھ لیا بازار سے کچھ اور شاپنگ کی سارے شاپر صابر پر لادے اور کھلونوں کی دکان پر پہنچ گئی۔

''کل میں نے اپنی بچی کے لیے کھلونے خریدے تھے وہ آپ کی دکان میں ہی رہ گئے۔'' رخشندہ دکان میں داخل ہوتے ہی دکاندار سے مخاطب ہوئی۔

''یہ رہے جی آپ کے کھلونے... میں نے تو آپ کو آوازیں بھی دیں مگر آپ گاڑی بھگا کر لے گئیں۔'' دکاندار نے اپنے کاؤنٹر کے نیچے سے کھلونے نکال کر رخشندہ کو دے دیے۔

صابر کل والی گڑیا کو آج بھی بڑی محویت سے دیکھ رہا تھا پتہ نہیں کیا کشش تھی اِس گڑیا میں، گڑیا کی شکل کچھ کچھ تابندہ سے ملتی تھی۔ گڑیا کی ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی۔

''اِس کی ٹانگ کو کیا ہوا؟'' صابر نے دکاندار سے پوچھا۔

''میں صبح دکان کی صفائی کر رہا تھا یہ نیچے گر گئی میرے پاؤں کے نیچے آ گئی۔ اب یہ گڑیا میں تم کو صرف سو روپے میں دے سکتا ہوں۔'' دکاندار نے اب اِس بے کار گڑیا کی قیمت سو روپے ہی وصول کرنا ہی غنیمت جانا کیونکہ وہ تو اِسے اب ڈسٹ بن میں پھینکنے والا تھا۔ صابر کی جیب میں تو سو روپے تو کیا سو پیسے بھی نہیں تھے۔ جیب خالی ہو تو سپنے دیکھنے فضول ہوتے ہیں۔ دولت جیب میں ہو تو بندہ بڑے بڑے خواب بھی دیکھتا ہے اور اُن خوابوں کی تعبیر بھی پا لیتا ہے۔ صابر نے اس گڑیا کے حصول کے لیے خواب اِس لیے دیکھنا شروع

کر دیے تھے کہ اب گڑیا کی قیمت بارہ سو کی بجائے صرف ایک سو تھی۔ لیکن ایک ٹانگ والی گڑیا اب بھی اُس کی پہنچ سے باہر تھی۔ یتیم بچوں کے خواب ادھورے ہی ہوتے' خواب تو صرف اپنے والدین ہی پورے کرتے ہیں۔

''یہ گڑیا! اس کو دے دو۔'' رخشندہ نے سو روپے کا نوٹ نکال کر دکاندار کو دیا۔

صابر گڑیا لے کر بہت خوش ہوا۔ بارہ سو کا احسان اُس نے صابر پر ایک سو میں کر دیا تھا۔ رخشندہ کے لیے یہ کون سا مہنگا سودا تھا۔ صابر معصوم تھا رخشندہ کی چالاکی سمجھ نہ سکا۔

☆......☆......☆

وقت کا پہیہ چلتا رہا تابندہ اور صابر جوان ہو گئے۔ اکرام اور رخشندہ نے بڑھاپے میں قدم رکھ دیے۔ اولاد جب جوانی میں قدم رکھتی ہے تو والدین کے قدم بڑھاپے کی سیڑھی کے پہلے زینے پر پہنچ چکے ہوتے ہیں۔ اب تو اکرام اور رخشندہ کے درمیان روز تابندہ کے رشتے کے بارے میں تکرار ہونے لگی تھی۔ اکرام تابندہ کی شادی صابر سے کرنا چاہتا تھا جبکہ رخشندہ تابندہ کی شادی کسی ہائی کلاس گھرانے میں کرنا چاہتی تھی۔ جہاں گیراجوں میں لمبی لمبی گاڑیاں اور نوکروں کی لمبی لمبی قطاریں لگی ہوں لیکن تابندہ کو یہ سب کچھ پسند نہیں تھا وہ بھی صابر کو پسند کرتی تھی۔ صابر بھی اب پڑھ لکھ کر بینک میں اچھی جاب پر تھا لیکن رخشندہ تو ایسا لڑکا چاہتی تھی جو بینک میں کام نہ کرتا ہو بلکہ بینک کا مالک ہو۔ رخشندہ کے خیالات بہت اونچے تھے جبکہ صابر بہت چھوٹا تھا۔ رخشندہ کے خیالات تک پہنچنا اُس کے بس میں نہیں تھا۔

گھر میں ویٹو پاور بھی رخشندہ کے پاس تھا۔ اُس ویٹو پاور کو استعمال کرتے ہوئے رخشندہ نے تابندہ کا رشتہ شہر کے انتہائی امیر گھرانے میں طے کر دیا۔ اِس گھرانے کے ہر فرد کے پاس اپنی اپنی گاڑیاں تھیں۔ سلیم اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ اُن کی دولت کا کوئی شمار نہیں تھا۔ سلیم نے پہلی نظر میں ہی تابندہ کو پسند کر لیا تھا۔ پسند بھی کیوں نہ کرتا تابندہ لاکھوں میں ایک تھی۔

اُس کا لمبا قد صراحی دار گردن' موٹی موٹی آنکھیں' دودھ کی طرح سفید رنگت اُس کے حسن کو چار چاند لگاتے تھے۔ سلیم کے گھر میں صرف تین افراد تھے سلیم اُس کی ماں اور اُس کے باپ تینوں کے پاس اپنی اپنی گاڑیاں تھیں۔

رخشندہ نے یہ ساری صورت حال دیکھ کر تابندہ کو بھی ڈرائیونگ سیکھنے پر مجبور کیا۔ چند دنوں کی ٹریننگ کے بعد تابندہ تھوڑی تھوڑی گاڑی چلانا سیکھ گئی تھی۔

تابندہ کی جب جھجک ختم ہوئی تو وہ ایک دن گاڑی لے کر اکیلی ہی مین سڑک پر چلی گئی۔ مین سڑک پر جا کر اُس سے گاڑی سنبھالی نہ گئی اور اُس نے گاڑی ایک وین سے ٹکرا دی۔ جس سے وین میں بیٹھی سواریاں معمولی زخمی ہوئیں لیکن تابندہ کو شدید چوٹیں آئیں۔

تابندہ کی گاڑی قلابازیاں کھاتے ہوئے سڑک کے نشیب میں جا گری۔ جبکہ تابندہ گاڑی سے نکل کر سڑک پر جا گری اور بے ہوش ہو گئی۔ ایک ٹرک آیا اُس کا ایک ٹائر تابندہ کی بائیں ٹانگ کے اوپر سے گزر گیا جس سے تابندہ کی بائیں ٹانگ بری طرح کچل گئی۔ لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ ہجوم میں سے کسی نے 1122 کو فون کر دیا تھوڑی دیر بعد ہی 1122 ایمبولینس اپنا مخصوص سائرن بجاتی ہوئی جائے حادثہ پر پہنچ گئی۔

1122 کے اہلکاروں نے بے ہوش تابندہ کو ایمبولینس میں ڈالا اور شہر کے سب سے بڑے اسپتال پہنچادیا۔ تابندہ کی ٹانگ بری طرح کچل گئی تھی ۔ ڈاکٹروں نے بڑی کوشش کی ٹانگ بچانے کی' تابندہ نے پیسہ بھی پانی کی طرح بہایا' لیکن سب تدبیریں بے کار ہوگئیں۔ ہوتا وہی ہے جو خدا کو منظور ہوتا ہے۔ ڈاکٹروں کی لاکھ کوششوں کے باوجود آخر کار تابندہ کی ٹانگ کاٹنی پڑی۔ ایک مہینہ اسپتال میں رہنے کے بعد تابندہ ایک ٹانگ کے ساتھ گھر واپس آ گئی۔ تابندہ کو گھر آئے ایک ہفتہ ہوگیا تھا۔ لیکن سلیم کی طرف سے تابندہ کی مزاج پرسی کے لیے کوئی نہ تو اسپتال آیا تھا نہ ہی ابھی تک گھر آیا۔ رخشندہ روز سلیم کی راہ دیکھتی تھی لیکن سلیم نے نہ آنا تھا اور نہ ہی وہ آیا کیونکہ دنیا تو مکمل لوگوں میں نقص نکالنے سے باز نہیں آتی۔ تابندہ تو اب نامکمل ہوگئی تھی۔ اب وہ کسی کے سہارے کی محتاج تھی۔ غیر بھی کبھی کسی کا سہارا بنے ہیں۔ آخر چند دن بعد سلیم کا فون آ گیا کہ وہ تابندہ سے شادی نہیں کرسکتا یہ فون کال رخشندہ نے سنی تھی۔ رخشندہ کے لیے سلیم کی کال' کال نہیں تھی بلکہ گالی تھی۔ خوابوں کے محل کبھی کبھی ایسے بھی یکدم گرتے ہیں یہ تو رخشندہ نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ تابندہ اب ایک ملبے کا ڈھیر تھی' جو ہر وقت بیڈ پر پڑی رہتی تھی۔ اس ملبے کو اٹھانے والا اب کوئی نہیں تھا۔ رخشندہ اپنے تکبر کی سزا پا چکی تھی۔ اُس کا غرور خاک میں مل گیا تھا۔ صابر کو دھول سمجھنے والی رخشندہ اب خود دھول بن چکی تھی۔

ہوا کا ہلکا سا جھونکا بھی دھول کو اڑانے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اس سے پہلے یہ دھول اڑ جاتی صابر ہلکی سی بونداباندی بن کر اس دھول پر برس گیا۔ دھول اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ آندھی سے پہلے بونداباندی ہو جائے تو دھول کو اڑانے کا ڈر نہیں ہوتا۔ صابر نے برس کر دھول کو محفوظ کرلیا تھا۔

☆......☆......☆

حجلہ عروسی میں تابندہ دلہن بنی بیٹھی تھی۔ اُس کی بیساکھیاں بھی اُس کے پاس ہی پڑی تھیں۔ صابر نے تابندہ کا گھونگھٹ اٹھایا تو تابندہ نے شرم سے آنکھیں بند کرلیں۔ اب یہ پتہ نہیں تھا کہ تابندہ نے آنکھیں شرم سے بند کی ہیں یا ندامت سے' آخر تابندہ نے آنکھیں کھولیں تو اُس نے دیکھا صابر کے ہاتھ میں وہی ایک ٹانگ والی گڑیا تھی جو اُس کی ممانی نے اُس کو بچپن میں لے کر دی تھی۔

"صابر یہ گڑیا تم نے ابھی تک سنبھال کر رکھی ہوئی ہے؟" تابندہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔

"یہ گڑیا میں نے اس لیے سنبھال کر رکھی ہے تاکہ یہ مجھے میری اوقات یاد دلاتی رہے کہ میری اوقات کیا ہے؟"

"صابر مجھے یاد ہے جب ہم بازار شاپنگ کرنے گئے تھے میری ماں نے میرے لیے مہنگے کپڑے خریدے تھے اور تمہارے لیے دکان کے باہر لگی ریڑھی سے دوستے سے سوٹ خرید کر تم کو دے دیے تھے۔ جس گڑیا کی قیمت بارہ سو تھی جب وہ بے کار ہوگئی تو میری ماں نے وہ گڑیا تم کو سو روپے میں لے کر تم پر احسان چڑھا دیا۔ اب جب میں کسی کام کی نہیں رہی تو میری ماں نے مجھے بھی تم کو سونپ دیا۔ صابر اپنی ماں کی طرف سے میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔ صابر مجھے معاف کردو جو چیز بے کار ہو جاتی ہے وہ ڈسٹ بن میں پھینک دی جاتی ہے۔ صابر میں شرمندہ ہوں میری ماں نے تم کو ڈسٹ بن سمجھ رکھا ہے۔

☆☆......☆☆

ناول

کاوش صدیقی

خانقاہ

آخری قسط

خانقاہوں، آستانوں، درباروں، مزاروں سے جڑی ایک مردِ درویش کی داستانِ عجب
تصوف اور محبت کی پراسرار دنیا کی کہانی

''میرے بچو! اللہ تمہیں ہر جگہ کامیاب فرمائے۔!''
اتنی دیر میں عبداللہ شاہ گیلانی کے اشارے پر مٹھائی آ گئی۔ قادری سرکار نے ایک گلاب جامن اٹھا کر



عبداللہ شاہ گیلانی کو کھلایا، پھر خادم حسین کو، پھر ہم کو ایک ایک گلاب جامن اپنے ہاتھوں سے کھلایا۔
''اچھا عبداللہ بیٹے اب ہمیں اجازت دو۔۔!'' انہوں نے کہا۔
''سرکار رات کا کھانا کھا کے جائیں۔!'' عبداللہ شاہ نے درخواست کی۔
''رات کا کھانا تو ہم خادم حسین کے گھر کھائیں گے۔ان سے ہم نے وعدہ کیا ہے۔آپ بھی چلیں بیٹے۔!'' قادری سرکار نے بڑے ملائم لہجے میں کہا۔
''بسروچشم۔۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا۔
ہم لوگ باہر آ گئے۔عبداللہ شاہ گیلانی نے اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا۔سب سے پہلے قادری سرکار بیٹھے پھر ہم تینوں پیچھے بیٹھ گئے۔عبداللہ شاہ ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھا۔قادری سرکار کے ڈرائیور نے گاڑی ہمارے پیچھے لگالی۔ہمارا رخ خادم حسین کے گھر کی طرف تھا۔
راستے میں کئی لوگوں نے قادری سرکار کو پہچان لیا۔قادری سرکار کے نعرے لگنے لگے۔پھر کئی لوگوں نے گاڑی میں جھانکا تو انہیں خادم حسین اور میں نظر آیا۔
دیکھتے ہی دیکھتے ایک جم غفیر گاڑی کے آس پاس جمع ہو گیا۔اور نعرے لگنے لگے۔اچانک خادم حسین کے ساتھ ساتھ ایک اور نعرہ فضا میں گونجا۔
''عبداللہ شاہ گیلانی زندہ باد۔عبداللہ شاہ گیلانی زندہ باد۔'' ہمیں لوگوں کے چھوٹے بڑے ہجوموں سے گزر کر خادم حسین کے گھر تک پہنچنے میں اچھی خاصی دیر لگ گئی۔وہاں پہنچے تو سینکڑوں لوگ جمع تھے۔برق رفتار میڈیا نے خبر کو لمحوں میں دنیا بھر میں پہنچا دیا تھا۔
ہم لوگ گاڑی سے باہر نکلے تو لوگوں نے فلک شگاف نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔قادری سرکار کو، خادم حسین کو، مجھ کو اور عبداللہ شاہ گیلانی کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔بالآخر غلام حسین، خادم حسین اور حافظ سلیمان صاحب کی بار بار کی التجاؤں سے ہجوم پرسکون ہوا۔
اور لوگ آہستہ آہستہ منتشر ہونے لگے مگر ہر شخص جانے سے پہلے قادری سرکار کے، پھر میرے اور پھر عبداللہ شاہ گیلانی کے ہاتھ ضرور چومتا تھا۔
ہم اندر داخل ہو گئے۔کشور اور تاج ورجلدی سے آئیں اور انہوں نے سب سے پہلے قادری سرکار کے پاؤں دھلائے۔انہیں چادر لگی گاؤ تکئے والی بڑی چارپائی پر بٹھایا۔جب ہم سب بیٹھ گئے۔تو قادری سرکار مسکراتے ہوئے میری طرف متوجہ ہوئے۔
''تنزیل میاں۔۔۔!''
''جی سرکار۔۔۔!'' میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔
''کچھ دیکھا، کچھ محسوس کیا آپ نے۔؟''۔انہوں نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔
''سرکار بہتر جانتے ہیں۔!'' میں نے جواب دیا۔
''یہ ترک کا صلہ ہے۔'' انہوں نے فرمایا۔''جب ترک کو پالیتے ہیں تو دلوں تک رسائی مل جاتی ہے۔اور دلوں میں اللہ رہتا ہے۔!''
سبحان اللہ۔۔سبحان اللہ۔۔۔! بے ساختہ کئی آوازیں گونجیں۔
مجھے لگا کہ جیسے کوئی چیز چٹاخ کر کے میرے اندر ٹوٹی ہو۔میں نے اپنے اندر جھانکا۔رغبتِ دنیا کا، کاسۂ سر ایک چھناکے سے ٹوٹ کے کرچی کرچی پڑا تھا۔
اچانک میرے دل سے ایک سیلاب پھوٹا، اور میرے بدن کو ڈبوتا ہوا آنکھوں کے راستے بہنے لگا۔

کسی نے پوچھا۔ ''کیا ہوا خلیفہ جی کو۔؟''
''خلیفہ جی، خلیفہ جی کے منصب پر فائز ہو رہے ہیں۔!'' مجھے بہت دور سے آتی ہوئی غلام حسین کی آواز سنائی دی۔ اور اس کے ساتھ ہی میں ہوش وخرد سے بیگانہ ہو گیا۔

☆☆☆

''میں واپس جا رہا ہوں۔۔۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے نازاں سے کہا۔
نازاں کچھ نہ بولی۔ چپ چاپ عبداللہ شاہ گیلانی کو دیکھتی رہی، پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔
''کیوں رو رہی ہو؟'' عبداللہ شاہ نے اس کے ہاتھوں کو چھوا، جو برف کی طرح سرد ہو رہے تھے۔
''آپ بہت بدل گئے ہیں۔!'' وہ دھیمے سے بولی۔ ''جو بھی ہوا مجھے صرف یہ بتایئے کہ اس میں میرا قصور کیا تھا۔؟''
''کیا ہوا۔؟'' عبداللہ شاہ گیلانی نے حیرت سے پوچھا۔
''میں انجان نہیں ہوں۔ دکھی ہوں۔ آپ نے یہ بھی نہ سوچا کہ اختلافات یا ناراضگی جو بھی ہے، آپ کی پاپا سے ہے۔ میرا کیا قصور ہے۔؟ میں پہلے بھی انتظار کرتی رہی۔ اب بھی انتظار کرتی رہونگی۔!'' وہ مرتعش لہجے میں بولی۔ شدت جذبات سے اس کا بدن لرزنے لگا۔
''مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔ تم میری آرزو، میری زندگی ہو۔ امریکا میں، ہر تنہائی میں صرف تمہارا خیال ہی تھا کہ جس نے مجھے تمہارے لئے وقف رکھا۔ وہ سچ مچ تھی بھی بہت پیاری۔ اس کی پیازی رنگت جو رونے اور شدت جذبات کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھی۔ گلابی پیازی رنگت۔ وہ بہت عزیز تھی، عبداللہ شاہ گیلانی کو۔
''پھر بھی مجھے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔؟'' نازاں نے دھیمے سے پوچھا۔
''ہاں میں ڈر گیا ہوں۔ میرا رشتوں سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔'' عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا۔ ''مجھے کاش پاپا کا بلیک بیری موبائل نہ ملتا۔ کاش میں وہ آخری ریکارڈنگ نہ سنتا جو نجانے کس طرح محفوظ ہو گئی۔!''
''کیا تھا اس میں۔؟'' نازاں نے پوچھا۔
مگر عبداللہ شاہ گیلانی اپنی ہی دُھن میں بولتا رہا۔ ''ہمارے سوئٹزرلینڈ میں چھپن کروڑ ڈالر جمع ہیں۔ اور وہ بھی کسی اور کے بنک میں نہیں، ہمارے اپنے بنک میں ہیں۔
وہ بنک جو چچا جان نے قائم کیا ہے۔ اور ان ہی پیسوں کے لئے میرے باپ کی جان گئی۔ سچ ہے کہ دولت اور اقتدار کے سامنے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ وہ شخص جس نے مجھے پیار دیا۔ اعتبار دیا۔ جس کی ذات میرے لئے مثال تھی۔
جن کی سیاست نے مجھے ہمیشہ ہی متاثر کیا۔ میرے آئیڈیل میرے باپ نہیں، میرے چچا تھے۔ مگر مجھے اس کا کیا صلا ملا۔؟ میں باپ سے محروم تو ہوا ہی تھا۔ چچا سے بھی محروم ہو گیا۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی کے لہجے میں بے پناہ دکھ تھا۔ ''میں یہاں کیسے رہوں۔؟ میرا دم گھٹتا ہے۔!''
نازاں چپ رہی۔ چند دن قبل اس نے سنا تھا کہ عبداللہ شاہ گیلانی اور شاہ ہارون گیلانی کے درمیان کسی مسئلے پر گفتگو ہو رہی تھی۔ مگر وہ یہی سمجھی تھی کہ الیکشن کے حوالے سے کوئی بات ہو رہی ہے۔ مگر یہ تو معاملہ ہی کچھ اور نکلا۔
''تمہیں ایک بتاؤں نازاں۔؟'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا۔ اور نازاں کی طرف دیکھا۔ وہ اسی کی جانب متوجہ تھی۔ وہ کہنے لگا۔ ''چچا جان میرا آئیڈیل ہیں۔ وہ بت جس کو میں ہر

حوالے سے پوجتا رہا۔ میرا مان، میرا آدرش، میں اپنے اس آئیڈیل کے ساتھ نہیں رہ سکتا جو اب ٹوٹ گیا ہے۔ بکھر گیا ہے۔!'' عبداللہ گیلانی کی آواز بھاری ہوگئی۔ حلق تو نازاں کا بھی نمکین تھا۔

''مجھے جانے دو۔۔!''

''اور میں۔۔۔؟'' نازاں نے پوچھا۔

''تم پر کوئی جبر نہیں۔ میں خود کو ترک کر رہا ہوں۔ تمہیں تو نہیں کہہ رہا۔ لیکن فیصلے کا اختیار تمہیں سونپ رہا ہوں۔''

''میرا فیصلہ، میرا حاصل تو آپ ہیں۔!'' وہ دھیمے سے، سر جھکا کے بولی۔ ''روپیہ پیسہ نہیں آپ کا ساتھ چاہیے۔!''

عبداللہ شاہ گیلانی مسکرا دیا۔ بہت دنوں کے بعد اسے لگا کہ جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے کے بعد سورج کی پہلی کرن نکلی ہو۔ محبت اور بھروسے کی۔

بعض لوگ محبت سے سب کچھ کما لیتے ہیں۔ اور بعض لوگ بڑی محنت سے اپنا سب کچھ گنوا دیتے ہیں۔ انسان کے نفع و نقصان کا کیا کہنا۔ وقت کی ہی گواہی ہے کہ انسان نقصان میں ہے۔ مگر وہ لوگ جو اپنے وقت کو قابل قدر جانتے ہیں۔

اس مہلت کو غنیمت جانتے ہوئے اعمال صالحہ بجا لاتے ہیں۔ وہی فلاح پانے والے ہیں۔ مصیبتوں، دکھوں، پریشانیوں، نا امیدیوں اور ناخوشی میں اپنے رب سے امید قائم رکھتے ہیں۔ خالق کے کنبے کی خیر و فلاح کے لئے مصروف عمل رہتے ہیں اور صرف اپنے رب سے مدد مانگتے ہیں۔ اسی کی تسبیح و تہلیل میں لگے رہتے ہیں۔ اس کے بجز جو ہیں۔ وہ خسارے میں ہیں۔ ایسا خسارہ جس میں رتی برابر بہتری کی گنجائش نہیں ہوتی۔

''چلئے میں آپ کو چائے پلاؤں۔!'' نازاں اٹھی۔ اس کے انداز میں بلا کا اعتماد، اور ٹھہراؤ تھا۔ جب انسان کسی فیصلے پر پہنچ جاتا ہے تو پھر جیسے سارے معاملات آسان ہو جاتے ہیں۔

وہ دونوں پائیں باغ سے اندر آ گئے۔ مرکزی ڈرائنگ روم میں تنہا شاہ ہارون گیلانی بیٹھے ہوئے تھے۔ کیوبن سگار ان کی انگلیوں میں دبا ہوا تھا۔ جس سے دھوئیں کی ایک باریک لکیر بل کھاتی ہوئی فضا میں بلند ہو رہی تھی۔ ان کے چہرے پر سوچ کے گہرے دائرے پھیلے ہوئے تھے۔

پتا نہیں کیوں عبداللہ شاہ کو ان پر بہت ترس آیا۔ وہ ان کے پاس آ بیٹھا۔ مگر وہ نجانے بے خودی کے کس عالم میں تھے کہ انہیں اس کی آمد کا پتا ہی نہیں چلا۔

ریاضے کمدار آیا اور خاموشی سے ان کے قریب کھڑا ہوا۔ عبداللہ شاہ گیلانی نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے۔؟''

''جی وہ خادم حسین آیا ہے سلام کرنے۔۔!'' ریاضے کمدار نے بتایا۔

آواز سن کر شاہ ہارون گیلانی نے نظر اٹھا کر اسکو دیکھا۔ پھر عبداللہ شاہ گیلانی کی طرف دیکھا۔ ان کی نگاہیں خالی خالی سی تھیں۔

''جاؤ بلا لو۔۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے اجازت دے دی۔ ریاضے کمدار نے سر کو خم دیا اور چلا گیا۔

چند ہی منٹوں کے بعد خادم حسین اندر آ گیا۔ اس نے بڑے ادب سے اپنے جوتے قالین سے پرے اتارے اور آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے شاہ ہارون گیلانی کے پاس آیا اور ان کے گھٹنے چھو کر انہیں سلام کیا۔ پھر بڑے ادب سے پیچھے ہٹا۔ اور عبداللہ شاہ کے گھٹنے چھونے لگا۔

''ارے یہ۔۔۔یہ کیا کر رہے ہو۔؟'' عبداللہ شاہ گیلانی نے اپنے پاؤں سمیٹ لئے۔''چلو اطمینان سے بیٹھو۔!''

خادم حسین وہیں قالین پر بیٹھ گیا۔

''خادم حسین اوپر بیٹھو۔۔!'' عبداللہ شاہ نے صوفے کی جانب اشارہ کیا۔

''سرکار ہم اپنی جگہ پہچانتے ہیں۔ دنیاوی رتبے سے آدمی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا ہے۔ بڑائی تو ادب سے حاصل ہوتی ہے۔'' خادم حسین نے کہا اور نظریں جھکا کے خاموش ہو گیا۔

''خادم حسین میں واپس جا رہا ہوں۔!'' عبداللہ شاہ نے بتایا۔''امریکا۔۔۔!''

''اور یہاں۔۔؟'' خادم حسین نے پوچھا۔''یہاں کیا ہوگا۔؟ امریکا میں تو سب منظم ہے۔ ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر ہے۔ وہاں جا کر کیا کریں گے آپ۔؟''

خادم کا لہجہ بہت سادہ تھا۔ مگر سوال نہایت ذہانت آمیز۔

''کیا کہا تم نے۔ ذرا پھر سے کہنا۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا۔''اتنی گہری بات۔؟''

''میں کیا جی میری اوقات کیا۔؟ کام کرنے کی ضرورت تو یہاں ہے۔ ہم لوگوں کو سیاست کا، ملکی اُمور کا کیا پتا۔ وہ تو جی آپ لوگ جانتے ہیں۔ ہم تو جی ندیاں، نالے ہیں۔ دریا، سمندر تو آپ ہو، اگر سوتا ہی خشک ہو جائے تو پھر ندی نالے کیا کریں گے جی۔ مٹی پر آنسو کی لکیر بن کر رہ جائیں گے۔!''

شاہ ہارون گیلانی اٹھے اور اس صوفے پر آ کر بیٹھ گئے۔ جس کے پاس خادم حسین بیٹھا ہوا تھا۔ خادم حسین نے اپنا سر شاہ ہارون گیلانی کے گھٹنوں سے لگا دیا۔

''آپ ہی تو ہمارا پیار ہو۔!'' خادم حسین کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔''ہم آپ سے باغی نہیں۔ آپ کو احساس دلاتے ہیں جی کہ آپ جھک کر ہمیں تھام لو، قادری سرکار ہمارے مرشد کی تو ساری تعلیم ہی پیار و محبت ہے جی۔ محبت اگر خوف سے کی جائے تو وہ ریاکاری ہوتی ہے۔ اطاعت اگر اُمید سے کی جائے تو عبادت ہوتی ہے۔ اور اگر محبت اور اطاعت بغیر خوف، بغیر لالچ، بغیر طمع کے ہو تو جی وہ طاقت بن جاتی ہے۔ شاہ جی ہم تو آپ کی طاقت بننا چاہتے ہیں اور بس۔!''

''سچ کہتے ہیں سرکار کہ یہ ہماری تربیت ہیں۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے ایک گہری سانس لیکر کہا۔''ہم دنیا کے جس ملک میں بھی جائیں، جس قدر بھی پیسہ لے جائیں۔ رہتے تو ہم وہاں دوسرے درجے کے شہری ہیں۔ اور پھر جن لفظوں میں ان ممالک میں شہریت کے لئے حلف لیا جاتا ہے وہ کسی بھی آزاد وطن کے باسی کے لئے جو غیرت مند ہو، اس کے لئے مر جانے کا مقام ہوتا ہے۔''

''جی جو اپنی مٹی کی قدر نہیں کرتے دوسرے کی مٹی انہیں کیا عزیز رکھے گی۔؟'' خادم حسین نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

''دیکھ لیں جی ہماری دنیا میں صرف مسلمان ہی دہشت گرد، قدامت پسند ہیں۔ حالانکہ ساری دنیا، پورا یورپ، امریکا بچیوں کو ضبط تولید کی تعلیم دے رہا ہے اور ہم کتنے بے فکرے ہوتے ہیں۔ ہمارے قدامت پسند معاشرے میں پورے سال میں خواتین کی بے حرمتی کے اتنے واقعات نہیں ہوتے ہیں جتنے ایک ماہ میں صرف امریکا میں ہوتے ہیں۔ پہلے یہ مسلمان اور جہاد کا نعرہ لگاتے ہیں، پھر جنت کا لالچ، ملوکیت کی برائی، موروثی بادشاہت کے خاتمے کے لئے دوسروں کو کافر بنا کر پیش کرتے ہیں۔ کمیونزم کا اثر توڑنے کے لئے مسلمان کے جذبے کو لادینیت سے حفاظت کے لئے استعمال کیا۔ اس کے بعد ان ہی لوگوں کو دہشت پسند بنا کر ڈرون حملوں میں مارنا شروع کیا۔ ہمارے ناعاقبت اندیش بچے اس کا شکار ہوتے چلے گئے۔''

خادم حسین کے پردے میں قادری سرکار کے لفظ بول رہے تھے۔ ''اگر آپ ہمیں، ہمارے نوجوانوں کو پیار دیتے، اعتبار دیتے، اپنے ساتھ ملا لیتے تو بھوک کے باعث غیروں کے ہاتھوں وہ اس طرح استعمال نہ ہوتے۔!'' خادم حسین کے لہجے میں دکھ تھا۔

شاہ ہارون گیلانی نے اپنا ہاتھ اس کے سر پہ رکھا اور بولے۔ ''مگر اب تم اکیلے نہیں ہو۔ ہمارے ہو۔ ہمارے گناہ تو شائد اتنے زیادہ ہیں کہ سرکار ہم سے ملنا بھی پسند نہ کریں۔ اور شائد عبداللہ بھی ہمیں معاف نہ کریں۔'' شاہ ہارون گیلانی کی آواز بھاری ہوگئی۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں سرکار۔۔۔؟'' خادم حسین نے مچل کے ان کے پاؤں پکڑ لئے۔ ''مرشد سرکار جی پیار کا سمندر ہیں۔ وہاں تو نری ہی نرمی گداز ہی گداز ہے۔ آپ ایسا ہرگز نہ سوچیں۔ روشنی بھلا کہیں بھی اندھیرا رہنے دیتی ہے۔ محبت تو جی روشنی ہے۔ ہر شئے کو، ہر دل کو اجال دیتی ہے۔ اور آپ تو ہمارے بڑے ہیں۔ گستاخی اگر ہم سے ہوئی ہے تو سو مرتبہ معافی کی طلبی ہے۔!''

شاہ ہارون گیلانی مسکرائے، ایک نم آلود مسکراہٹ، عبداللہ شاہ گیلانی اٹھ کر ان کے پاس آ گیا۔ اور ان کے ہاتھ تھام کے بولا۔ ''چچا جان جو ہو جائے اس کو بدلا نہیں جا سکتا۔ بیتا ہوا وقت واپس نہیں آ سکتا۔ مگر ہم آنے والا وقت تو بدل سکتے ہیں۔ اپنی ہمت، اپنے حوصلے اور اپنی طاقت سے۔!''

وہ مسکرائے۔ ''اور تم جو یہاں سے جا رہے ہو۔؟'' انہوں نے پوچھا۔

خادم حسین نے کہا۔ ''کہ امریکا میں کیا ہے۔ وہاں تو ہر شئے منظم ہے۔ اپنی اپنی جگہ، سسٹم میں لوگ آتے ہیں اور ڈیوٹیاں نبھاتے ہیں۔ جبکہ یہاں تو سب کچھ ہونا ہے۔ سسٹم بنانا ہے۔ سسٹم چلانا ہے۔ کام تو سچ مچ سارے یہاں ہیں۔!''

''یہ اپنا خادم حسین بڑا سمجھ دار ہو گیا ہے۔!'' شاہ ہارون گیلانی مسکرائے۔ ''بڑی اچھی باتیں کرتا ہے۔!''

''جی یہ تو قادری سرکار کا کرم ہے ان کی تربیت ہے۔ وہ جی بہت پیار کرتے ہیں سب سے، پتا نہیں ان کے پاس اتنا پیار کہاں سے آتا ہے۔ کڑوے سے کڑوا بندہ شہد کر دیتے ہیں۔!'' خادم حسین کے لہجے میں مر جانیوالی عقیدت تھی۔

اسی وقت احمد اورنگ زیب اندر آیا۔ شاہ ہارون گیلانی نے اس کو دیکھ کر پوچھا۔ ''خیریت تو ہے کیا بات ہے۔؟''

''سردار حیات اللہ نے پارٹی چھوڑ دی ہے۔ ملک ریاض کی پارٹی میں شمولیت کا اعلان کر دیا ہے۔ اُن کا فون آیا ہے کہ وہ آپ سے فوراً ملنا چاہتے ہیں۔''

''اچھا۔۔۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے حیرت سے کہا۔ ''سردار حیات اللہ نے ملک ریاض کی پارٹی جوائن کر لی۔؟''

اسی وقت شاہ ہارون گیلانی کا موبائل فون بج اٹھا۔ ''ہیلو۔۔۔!'' انہوں نے کہا۔

''فوراً دارلحکومت آؤ بہت ضروری میٹنگ ہے۔ سردار حیات اللہ نے پارٹی چھوڑ دی ہے۔ کچھ دوسرے لوگ بھی پارٹی چھوڑ رہے ہیں اس وقت تمہاری ضرورت ہے۔''

''لیکن میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔۔۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے کہا ''اور۔۔۔!''

عین اسی وقت عبداللہ شاہ گیلانی کے فون پر بیل ہوئی۔ عبداللہ شاہ کے فون اسکرین پر جانا پہچانا نام جگمگا رہا تھا۔

''اسلام علیکم!۔۔'' دوسری طرف سے قادری سرکار کی پرسکون نرم آواز سنائی دی۔
''جی سرکار۔۔۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا۔شاہ ہارون گیلانی اپنی بات مکمل کرتے کرتے رُک گئے۔
قادری سرکار کہہ رہے تھے۔'' توبہ اور سچی توبہ مقامات کو بلند کرتی ہے۔ جو بندہ سچے دل سے توبہ کر لیتا ہے۔خدا اس کی توبہ کو قبول فرماتا ہے۔ ان سے کہو کہ پارٹی نہ چھوڑیں۔ اللہ بزرگ و برتر کے لئے دلی آرزوؤں کو پورا کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔''
مارے حیرت کے فون شاہ ہارون گیلانی کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

☆☆☆☆

جو پوری ہو جائے وہ طلب کہاں؟

ہم لوگ خانقاہ میں حاضر تھے۔قادری سرکار کا درس جاری تھا۔لوگ ہمہ تن گوش تھے۔سراپا سماعت تھے۔
''محبت، تعلق، ایثار، قربانی یہ تمام رُخ، تمام جہتیں کسی ایک فرد کی ذات سے شروع ہوتی ہیں۔فرد تنہا ہوتے ہوئے بھی تائید ایزدی سے تحریک کا روپ دھار لیتا ہے۔ پھر قربانیاں دیتے دوستوں، ساتھیوں، اہل محبت کو جنہوں نے تحریک کے لئے اپنا تن، من، دھن قربان کر دیا، ان کو سراہنے کا عمل شروع ہوتا ہے۔کسی کو خطاب ملتا ہے۔کسی کو اعتبار ملتا ہے۔ کسی کو اپنے ذاتی خاندان میں شامل کر لیا جاتا ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قربانیاں دینے والے صاحب تحریک کو کس حد تک پیارے ہیں۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت مبارکہ ہے۔آپ نے اپنے دوستو کو جنہیں ہم صحابہ اجمعینؓ کہتے ہیں۔ان کو دیکھئے۔۔۔! آپ نے اپنے عزیز ترین صحابہ کرام کی دلجوئی، ان کی محبت، ان کے پیار کے احترام کے لئے ان سے رشتے داریاں قائم فرمائیں۔دلی تعلق کا ایک مظہر رشتے دینا، رشتے لینا بھی ہوتا ہے۔لیکن صاحبو۔۔!'' قادری سرکار نے اپنے مخاطبین کو دیکھا۔سب ان ہی کی جانب متوجہ تھے۔اپنے مرشد کریم کی طرف، جو انہیں ہمیشہ پیار کا درس دیتے تھے۔
''لیکن صاحبو۔۔! ہم کیا کرتے ہیں۔؟ ہم اپنے دوستوں سے رشتہ کرنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ہم ناراض ہوتے ہیں کہ ہمارے دوست نے جو ہمارے گھر آتا جاتا ہے۔اس نے رشتے کی درخواست کرنے کی خواہش کیسے کی۔؟ حالانکہ ہم ہر چیز کی خریداری میں مضبوطی، پائیداری، تعلق کی شدت، اور نوعیت کو سامنے رکھتے ہیں۔مگر دیکھے بھالے شخص کو محض اس لئے طلب گاروں کی فہرست سے نکال دیتے ہیں کہ وہ ہمارا دوست، ہمارا محلے دار تھا۔جانتے ہیں اس سے کیا ہوتا ہے۔؟'' انہوں نے حاضرین کی جانب دیکھا جو بہت دھیان سے ان کا درس سن رہے تھے۔انہوں نے کہا۔
''صاحبو۔۔! اس سے ہوتا یہ ہے کہ ہم اچھے، دیکھے بھالے رشتے سے تو محروم ہوتے ہی ہیں۔نادانستگی میں دل آزاری کا سبب بھی بنتے ہیں۔ پھر ہماری بہن، ہماری بیٹی اچھے رشتے کے انتظار میں بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہوتی رہتی ہیں۔اور ہم مناسب رشتوں کی تگ ودو میں دوڑتے بھاگتے رہتے ہیں۔دوسرا ایک اہم معاملہ یہ ہے کہ ہم لوگ ہمیشہ سوچتے رہتے ہیں کہ پہلے اپنی بہن کی شادی کریں گے۔ پھر اپنی شادی کریں گے۔اگر ہم اس چلن پر قائم رہتے ہیں اور صرف اسی شہر کے نوجوان یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ ہم جب تک شادی نہیں کریں گے کہ جب تک ہماری بہن کی شادی نہیں ہوگی تو جانتے ہیں کیا ہوگا۔؟ تمام لڑکیاں بیٹھی رہ جائیں گی۔ذرا یہ بھی تو سوچئے کہ ہر بیوی کسی کی بہن ہے۔اسلام نے اس کا بہت سادہ سا، فطری حل رکھا ہے۔جو لڑکا یا لڑکی بالغ ہو جائے۔مناسب ذریعہ روزگار میسر ہو تو اس کی شادی کر دی جائے۔اس سے نا صرف معاشرتی مسائل کم ہو جائیں گے۔ بلکہ جذباتی ہیجان کی وجہ سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، وہ بھی ختم ہو جائیں گی۔یاد رکھئے

۔۔!اسلامی احکامات ہمارے فطری تقاضوں کے عین مطابق ہیں۔اے اللہ ہمیں ان احکامات، معاملات کی سمجھ عطا فرما۔سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سچی پیروی نصیب فرما۔!''

''آمین۔۔۔آمین۔۔۔سبحان اللہ۔۔۔'' کا ایک شور، مریدین، مداحین، عقیدت مندوں کی زبانوں سے بے ساختہ بلند ہوا۔قادری سرکار خاموش ہو گئے تھے۔لوگ دھیرے دھیرے ان کے اردگرد جمع ہو رہے تھے۔کچھ ان سے اپنے مسائل پر مشورہ چاہتے تھے۔کچھ دینی مسائل پر ان کی رائے معلوم کرنا چاہتے تھے۔وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔علم کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھے۔ہر شخص ان سے اپنی صوابدید کے مطابق، اپنے ظرف کے مطابق پیاس بجھا سکتا تھا۔

''چلو سرکار کو کارڈ دیں۔۔!'' قدیر نے مجھ سے کہا۔

''تم دیدو۔۔!'' میں نے کہا۔''مجھے شرم آتی ہے۔۔۔میں نے کون سی کوئی تصوف پر کتاب لکھی ہے۔!''

''محبت ہی تو اصل راستہ ہے تصوف تک جانے کا۔عشقِ مجازی ہی تو سیڑھی ہے عشقِ حقیقی تک پہنچنے کا۔!'' قدیر نے مجھے سمجھایا۔میری کتاب ''سندیسے جو کھو گئے'' کی تقریب رونمائی قدیر نے آرٹس کونسل میں رکھی تھی۔جس میں اچھے خاصے ادیب آرہے تھے۔کئی کالم نگار مدعو تھے۔لیکن قدیر کا فیصلہ تھا کہ اس تقریب کی صدارت قادری سرکار کریں گے۔اس نے بغیر ان سے پوچھے ان کا نام کارڈ پر چھاپ دیا تھا۔اب پہلا کارڈ ان کو دینے آیا تھا۔

میں نے پوچھا۔''تم نے سرکار سے بغیر پوچھے ان کا نام چھاپ دیا ہے کارڈ پر، کہیں وہ ناراض نہ ہو جائیں۔!''

''نہیں وہ ناراض نہیں ہوں گے۔۔۔!'' قدیر نے بڑے بھروسے، بڑی عقیدت سے کہا۔''وہ تو ہم سے پیار کرتے ہیں۔تم سے پیار کرتے ہیں۔مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور تشریف لائیں گے۔!''

''اچھا۔۔چلو۔!'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔کافی لوگ آ جا رہے تھے۔قادری سرکار کے درس میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین بھی آتی تھیں اور ان سے راہ نمائی لیتی تھیں۔درس کے بعد لوگ واپس جا رہے تھے۔اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ہم لوگ اس بھیڑ میں راستہ بناتے آگے بڑھ رہے تھے۔اچانک ایک خاتون قدیر سے ٹکرا گئیں۔خاتون کے ہاتھ سے لنگر شریف والا لفافہ نیچے گر گیا۔قدیر اور خاتون دونوں ہی بے اختیار لنگر شریف کا لفافہ اٹھانے کے لئے تیزی سے جھکے تو انکے سر آپس میں ٹکرا گئے۔

''اُف۔۔!'' خاتون کے منہ سے ایک کراہ نکل گئی۔ان کا نقاب سرک گیا۔

''آپ۔۔۔؟'' قدیر نے انہیں لنگر شریف کا لفافہ اٹھا کر دیتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔''آپ یہاں کیسے۔۔۔؟''

''میں۔۔۔میں وہ درس سننے کے لئے آئی تھی۔'' ان خاتون نے گھبراہٹ سے کہا۔وہ بیحد خوبصورت تھیں۔مجھے ان کے نقوش کچھ جانے پہچانے سے لگے۔ان کی آواز بھی ان کے چہرہ کی طرح خوبصورت و نغمگی سے بھرپور تھی۔

''اچھا۔۔۔!'' قدیر نے جواب دیا۔وہ خاتون لفافہ لے کر تیزی سے آگے بڑھ گئیں۔

''یہ خاتون کون تھیں۔؟ مجھے ان کا چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگا۔؟'' میں نے قدیر کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

''ارے تم نے ان کو نہیں پہچانا۔یہ یہ ماضی کی نامور گلوکارہ زبیدہ انصاری تھیں۔سرکار کا درس سننے آئی

ہونگی۔'' قدیر نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا۔

میں چپ ہی رہا۔ یہاں نجانے کتنے مرد و خواتین اپنی تشنہ روح کی پیاس بجھانے آتے تھے۔ ہم دونوں جا کر خانقاہ کے اسی کمرے میں بیٹھ گئے۔ جہاں اس سے قبل بھی آ چکے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد آہٹ ہوئی اور قادری سرکار دروازے کا پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئے۔ ہم دونوں احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے۔

ہمیں دیکھ کر وہ مسکرائے۔ ''کیا بات ہے۔ آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔۔۔؟'' وہ نہایت ذکی الفہم تھے۔

''ایک چھوٹی سے درخواست لئے حاضر ہوا ہوں۔!'' قدیر نے کہا۔

''کہیے۔۔۔!'' انہوں نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئے تو ہم بھی بیٹھے۔

''تنزیل خلیفہ جی کی کتاب ''سندیسے جو کھو گئے'' کی تقریب رونمائی کر رہا ہوں۔ اس میں آپ کی شرکت ہمارے لئے باعث سعادت ہوگی۔!''

''اچھا۔۔۔!'' وہ مسکرائے۔ ''مگر آپ نے ہمیں کتاب تو نہیں دی پھر آپ کی کتاب پر کیا گفتگو کریں گے۔؟''

واقعی یہ تو ہم نے سوچا ہی نہیں تھا۔

''میں اس کے لئے معذرت چاہتا ہوں۔!'' میں نے معذرت کی۔

''کوئی بات نہیں۔۔۔!'' وہ متانت سے بولے۔ ''آپ کا موضوع تو محبت ہی ہے نا۔ پھر محبت تو دل سے پھوٹتی ہے۔ اس لئے اس پر بولنا ہی محبت کو پھیلانے کا موجب ہے۔!''

''سرکار یہ پہلا کارڈ آپ کی نذر، آپ سے ہی تقسیم شروع ہو رہی ہے۔!'' قدیر نے انہیں کارڈ پیش کیا۔

انہوں نے کارڈ لے لیا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''تنزیل میاں! آپ کو ہمارا آج کا درس کیسا لگا۔۔؟''

''سرکار آپ کا ہر درس یوں لگتا ہے کہ ان گمشدہ حقیقتوں کا اعتراف، ادراک ہوتا ہے۔ جو ہمارے اردگرد ہوتی ہیں، لیکن ہم اپنی کوتاہ عقلی سے انہیں نہ دیکھ پاتے ہیں نہ سمجھ پاتے ہیں۔'' میں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ ''اسلام کے اصول اگر سادگی سے، پیار سے سمجھائیں تو پھر دین سے دوری بھی ختم ہو جائے گی اور معاشرہ سچ مچ ایک اثر پذیر عامل کی طرح دیگر معاشروں کے لئے ایک مثال بن جائے گا۔!''

''تنزیل میاں ہر درس اثر پذیر ہوتا ہے۔ لیکن کامل اثر پذیری کے لئے ضروری ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ زبانی سراہنے کے بجائے عملی طور پر اس کو حقیقت بنایا جائے۔!'' انہوں نے مجھے بہت غور سے دیکھا۔ اور مسکرائے۔ ان کی مسکراہٹ میں بہت پیار، نہایت نرمی تھی۔ سردیوں کی صبح کی دھوپ جیسی، زندگی آمیز حرارت لئے۔

اتنی دیر میں خادم چائے لے آئے۔ وہی مخصوص خوشبو، جو اس خانقاہ کا خاصا تھی۔ ہم نے چائے پی۔ پھر قادری سرکار سے اجازت لیکر باہر نکل آئے۔

''دیکھا تم نے۔۔۔!'' قدیر نے کمرے سے باہر نکلتے ہی کہا۔ ''قادری سرکار نے ہماری دعوت قبول فرمالی۔ مجھے ان پر یقین تھا۔!''

میں نے قدیر کو غور سے دیکھا۔ اس کا گندمی چہرہ یقین کی آگ سے دمک رہا تھا۔ سادہ اور سچے لوگ اپنے معاملات میں کس قدر پُر یقین ہوتے ہیں۔ ان کا یقین ہی ان کی کامیابی کی ضمانت ہوتا ہے۔

''کیا سوچ رہے ہو۔؟'' قدیر نے چابی اگنیشن ہول میں گھمائی۔ گاڑی کا انجن ایک جھرجھراہٹ لیکر بیدار ہو گیا۔

''کچھ نہیں۔۔!'' میں نے کہا۔ ''سوچنے کو رکھا کیا ہے۔؟''
''ہاں اب کیا سوچنا۔۔!'' قدیر ہنسا۔ ''خلیفہ کے منصب پر فائز ہو گئے۔ قادری سرکار کی نگاہوں میں آ گئے۔ کتاب کے مصنف بن گئے۔ گویا راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔۔!''
''یار مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے خالی ہوں۔۔!'' میں نے جواب دیا۔
''خالی پن کو بھرنے کے لئے ہی تو دنیا کا سارا جھمیلا ہے۔۔!'' قدیر ہنسا۔
باتوں باتوں میں راستہ کٹ گیا۔ گھر آ گیا۔ میں گاڑی سے باہر نکل آیا۔ ''تم اندر نہیں آؤ گے کیا۔؟'' میں نے اسے گاڑی میں بیٹھے دیکھ کر پوچھا۔
''یار یہ کارڈ اماں کو دیدینا۔!'' اس نے ایک کارڈ میری طرف بڑھایا۔ ''مجھے ذرا اور بھی کارڈ بانٹنے ہیں۔!''
''خود دو اماں کو کارڈ میاں پبلشر۔۔!'' میں نے کارڈ پکڑنے سے صاف انکار کر دیا۔
''اچھا۔۔!'' وہ کارڈ لیکر باہر نکل آیا۔ اس نے گاڑی لاک کی۔ اتنی دیر میں، میں اطلاعی گھنٹی بجا چکا تھا۔ دروازہ کھولنے والی مومی تھی۔
''اچھا ہوا آپ آ گئے۔ اتنی زور کی بھوک لگ رہی تھی کہ بس۔۔!'' وہ بلا تکان بولنا شروع ہوئی تھی کہ اس کی نظر میرے عقب میں کھڑے ہوئے قدیر پر پڑی وہ ایک دم خاموش ہوگئی۔ اور دروازہ کھول کر ایک طرف کھڑی ہوگئی۔ میں اور قدیر گھر میں داخل ہوئے۔ اماں حسب معمول دالان میں تھیں۔ اور اپنے وظیفے میں مشغول تھیں۔
''اسلام علیکم'' میں نے اور قدیر نے انہیں سلام کیا۔
''وعلیکم اسلام۔'' انہوں نے تسبیح ہاتھ سے رکھتے ہوئے کہا۔ ''چلو جلدی سے ہاتھ دھولو، مومی کو بہت بھوک لگ رہی ہے۔ اب تک تمہارے انتظار میں دروازے کے پچاسیوں چکر لگا چکی ہے اور تم حسب معمول اپنا موبائل گھر پر چھوڑ گئے تھے۔'' اماں کے انداز میں پیار بھری ڈانٹ تھی۔
ہم لوگ ہاتھ دھو کر آئے تو کھانا چنا ہوا تھا۔ ہم لوگ کھانے کے لئے بیٹھ گئے۔ ہمیں خادم حسین کے گاؤں سے واپسی کو ابھی تیسرا دن تھا۔ مومی بے شمار باتیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن آتے ہی کتاب کی تقریب رونمائی کے کاموں میں لگ گئے۔ یوں گھر پر زیادہ وقت دینے کا موقع ہی نہ ملا۔
کھانے کے دوران ہلکی پھلکی گفتگو چلتی رہی۔ پھر قدیر اماں کو کارڈ دے کر رخصت ہونے لگا۔
میں نے اس کو خدا حافظ کہتے ہوئے کہا۔ ''یار کارڈ خادم حسین، تاج ور اور کشور کو بھی بھیج دینا۔!''
''فکر نہ کرو عبداللہ شاہ گیلانی سمیت تمام لوگ ہی میری فہرست میں شامل ہیں۔۔!'' قدیر نے مجھے تسلی دی۔ اور خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گیا۔
میں قدیر کو چھوڑ کر اپنے کمرے میں جا رہا تھا کہ باورچی خانے سے آتی ہوئی نرگس کی آواز نے مجھے رکنے پر مجبور کر دیا۔
''دیکھا آج بھی انہوں نے ایک لمحے کے لئے بھی تمہیں مخاطب نہیں کیا۔!'' میرا تجسس بڑھ گیا۔ کسی کی بات چھپ کر سننا معیوب ہونے کے باوجود میں وہیں کھڑا رہا۔
''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ کونسا ہم نے کبھی باتیں کی ہیں۔!'' مومی کی آواز سنائی دی۔ ''اماں اور بھائی ہی مناسب فیصلہ کر سکتے ہیں۔ میں تو کبھی بھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اور مجھے معلوم ہے کہ وہ بھی کبھی نہیں کہیں گے۔ وہ اماں اور بھائی کے احترام میں کچھ نہیں بولیں گے۔ کچھ محبتیں مومی شمعوں کی طرح ہوتی ہیں، جو شب بھر جل کر

ختم ہو جاتی ہیں۔''
دونوں چپ ہو گئیں۔ صرف برتنوں کے دھونے اور رکھنے کی آوازیں آتی رہیں۔ میں آہستہ قدموں سے اپنے کمرے میں آ گیا۔ ''موی کتنی بڑی ہو گئی۔ سمجھدار ہو گئی ہے۔ اتنی بڑی کہ جذبے اس کے اندر انگڑائیاں لینے لگے، اور سمجھدار اتنی کہ اپنے جذبوں پر ضبط کی قدرت رکھے ہوئے ہے۔ میں اپنے بیڈ پر دراز ہو گیا۔ تب ہی جیسے اچانک میرے ذہن میں قادری سرکار کے درس کے جملے گونجنے لگے۔
''آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے عزیز ترین صحابہؓ اجمعینؓ کی دلجوئی، ان کی محبت، ان کے پیار، احترام کے لئے ان سے رشتے داریاں قائم فرمائیں۔ دلی تعلق کا ایک مظہر رشتے لینا، رشتے دینا بھی ہوتا ہے۔ لیکن ہم کیا کرتے ہیں۔ ہم اپنے دوستوں سے رشتہ کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں۔ دیکھے بھالے شخص کو اس لئے طلبگاروں کی فہرست سے نکال دیتے ہیں کہ وہ ہمارا دوست، ہمارا محلے دار تھا۔ اس سے ہوتا یہ ہے کہ ہم اچھے، دیکھے بھالے رشتے سے محروم تو ہوتے ہی ہیں۔ نادانستگی میں دل آزاری کا سبب بھی بنتے ہیں۔''
میں ایک دم پسینے پسینے ہو گیا اور بیڈ سے اٹھ بیٹھا۔ قادری سرکار نے آج جو درس دیا تھا۔ شائد میرے لئے ہی تھا۔ تب ہی تو انہوں نے کہا تھا۔ ''کامل اثر پزیری کے لئے ضروری ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ زبانی طور پر سراہنے کے بجائے عملی طور پر اس کو حقیقت بنایا جائے۔!''
میرے سامنے کی باتیں مجھے اتنی دیر سے کیوں سمجھ میں آتی ہیں۔ مجھے معلوم ہو جانا چاہیے کہ قادری سرکار براہ راست کچھ نہیں کہتے۔ دلجوئی کے لئے ہمیشہ تمثیل کی صورت میں گفتگو کرتے ہیں۔ میں کتنا نااہل ہوں۔ احساسِ بے بسی سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور آواز آئی۔ ''تنزیل بیٹے۔۔!''
''جی اماں۔۔!'' میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ اماں تسبیح پکڑے باہر کھڑی تھیں۔ میں ان کا ہاتھ تھام کے انہیں اندر لے آیا۔ وہ میرے بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ ''کیا نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں نے تمہارے کمرے کی بتی جلتی دیکھی تو ادھر آ گئی۔!''
''جی اماں نیند نہیں آ رہی تھی۔!'' میں نے جواب دیا۔
''کیا تم رو رہے تھے۔؟'' اماں نے مجھے غور سے دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے۔؟''
اماں کا انداز کچھ ایسا تھا کہ میرا دل بھر آیا۔ میں ان کے گھٹنے سے سر ٹیک کے خوب رویا۔ وہ کچھ نہ بولیں۔ بس مجھے تسلی دیتی رہیں۔ سر پر ہاتھ پھیرتی رہیں۔ کافی دیر کے بعد میری طبیعت بحال ہوئی۔ میں نے انہیں آج کے درس کے بارے میں بتایا پھر میں نے کہا۔ ''اماں موی کے لئے آپ نے کیا سوچا۔؟''
''دو ایک لوگوں نے کہا تو ہے رشتے کے لئے۔'' اماں نے کہا۔ ''وہ آئندہ اتوار کو آئیں گے۔ وہ تو پچھلی اتوار کو آنا چاہ رہے تھے۔ مگر تمہاری عدم موجودگی میں، میں نے انہیں نہیں بلایا۔''
''اماں۔۔!'' میں نے کہا۔ ''اتنے رشتے آ رہے ہیں۔ کیا قدیر کے گھر والوں نے آپ سے کبھی کچھ کہا۔؟''
''نہیں۔۔!'' اماں نے نفی میں جواب دیا۔
''اگر قدیر کا رشتہ آ جائے تو کیا بہتر نہیں رہے گا۔؟'' میں نے کہا۔ ''نئے رشتے میں اگر کوئی پسند بھی آ گیا تو اس کی دیکھ بھال، پوچھ پرتیت میں کتنا وقت لگے، پھر کسی کے کردار کا کیا بھروسہ، جو ظاہر ہوتا ہے بعض اوقات ویسا نہیں ہوتا۔!''

''کہتے تو تم ٹھیک ہو بیٹا۔ لیکن جب تک کوئی خود سے نہ کہے ہم کیا کر سکتے ہیں۔!'' اماں نے جواب دیا۔
یعنی اگر قدیر کے گھر والے آئیں تو آپ انہیں منع نہیں کریں گی۔؟'' میں نے پوچھا۔
''قدیر دیکھا بھالا لڑکا ہے۔ اچھا کھاتا کماتا ہے۔ گھر والے سلجھے ہوئے لوگ ہیں۔ اس لئے اگر وہ رشتہ مانگیں گے تو انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے۔!'' اماں نے جواب دیا۔ ''لیکن آج تم یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو۔؟''

''ایسے ہی۔۔۔!'' پتا نہیں کیوں میں ہلکا پھلکا ہو گیا۔ اماں مسکرائیں اور مجھے ایک پیار بھری چپت رسید کر اٹھ گئیں۔ میں بے حد سرشار تھا۔ آج میں نے موی کو وہ خوشی دیدی کہ جس کا اس کے گمان میں شائبہ بھی نہ ہوگا۔ میری اکلوتی نازوں پلی بہن، جس نے ہمیشہ ہمیں پیار دیا۔ مان دیا۔ آج میں نے اس کی محبت کو، اس کے اعتبار کو بچالیا تھا۔

☆☆☆

صبح میری آنکھ فون کی بیل ہی سے کھلی۔ ''اسلام علیکم!'' میں نے نیند بھری آواز میں کہا۔
''کیا بات ہے ابھی تک سوئے جا رہے ہو معلوم نہیں کتنا کام ہے نواب صاحب۔!'' دوسری طرف سے قدیر کی آواز سنائی دی۔ ''سارے شہر کو کارڈ بانٹنے ہیں۔!''
''ٹھیک ہے۔ میں تیار ہو رہا ہوں۔ آ جاؤ مجھے لینے۔!'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ ساڑھے دس بج رہے تھے۔ میں بڑی تیزی سے نہا کر تیار ہو کر چائے پی رہا تھا کہ قدیر کی کار کا ہارن سنائی دیا۔
''بھائی وہ قدیر آئے ہیں۔!'' موی نے مجھے مطلع کیا۔
''اِدھر آؤ۔۔!'' میں نے اسے بلایا۔
''جی بھائی۔۔۔؟''
''بس ایک بات یاد رکھنا کہ تمہارا بھائی تمہارے لئے ہر خوشی لائے گا۔ اپنی جان کی قیمت پر بھی۔!''
''جی ای ی۔۔!'' موی کی حیرت دیدنی تھی۔ ''آپ کیا کہہ رہے ہیں۔؟''
''جلدی سمجھ جاؤ گی۔۔!'' میں نے اس کے سر پر پیار سے چپت لگائی۔ اور گھر سے باہر نکل آیا۔
قدیر مسلسل ہارن بجائے جا رہا تھا۔ ''بس بھی کرو۔!'' میں نے کہا۔ ''کیا بیٹری ڈاؤن کرو گے۔؟''
''یار دیر ہو رہی ہے۔ جمالی، غزالی آشفتہ سب ہی کو کارڈ دینے ہیں۔'' قدیر نے کہا۔ اور گاڑی آگے بڑھا دی۔
''ایک کارڈ اور چھاپ لو۔!'' میں نے کہا۔
''کون سا کارڈ۔!'' اس نے سی ڈی پلیئر آن کرتے ہوئے پوچھا۔
''اپنی شادی کا۔۔!'' میں نے جواب دیا۔
''کیا بک بک کر رہا ہے۔۔۔ پٹھے۔!'' قدیر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔
''حدِ ادب۔۔ بدتمیز۔۔۔ بدتہذیب۔۔ دنیا میں کسی ہونے والے بہنوئی نے اپنے مجوزہ سالے کے ساتھ ایسی ہرزہ سرائی نہیں فرمائی ہوگی۔!''
''کیا۔۔۔؟'' قدیر نے اس زور سے بریک لگائے کہ پوری گاڑی گھوم کے رہ گئی۔ خود میرا سر ڈیش بورڈ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔
''کیا کہہ رہے ہو تم۔۔؟''
''جو تم نے سنا۔۔۔!'' میں نے کہا۔ ''قادری سرکار کیا فرماتے ہیں۔ تعلق کو جب تک کوئی نام نہیں دیا

جاتا وہ معلق ہی رہتا ہے۔!''

''تم۔۔تم۔۔!'' قدیر نے اچانک کھینچ کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔''بڑا کمینہ ہے۔تو بڑا دھوکے باز ہے۔سب کچھ جان کر بھی انجان بنا رہا۔تیرا دل بہت بڑا ہے۔سچ مچ قادری سرکار کا خلیفہ ہے تو۔خلیفہ جی۔۔!''اس کے گرم گرم آنسو میرا سینہ، میرا دل بھگونے لگے۔

''چل بھئی چل پورے شہر کو کارڈ بانٹنے ہیں۔۔!'' میں نے کہا۔

قدیر نے ہنستے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔ہم لوگ سارا دن کارڈ بانٹتے رہے۔شام کو قدیر نے جب مجھے گھر چھوڑا تو بولا۔''اماں سے کہہ دینا کہ کل شام کو امی آئیں گی۔!''اور میرے کچھ کہنے سے قبل ہی گاڑی آگے بھگا لے گیا۔مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔میں گھر میں داخل ہو گیا۔

☆☆☆

حکمران جماعت کا یہ ایک غیر معمولی اجلاس تھا۔جس میں صرف خاص خاص لوگ ہی شامل تھے۔یہ وہ بااثر افراد تھے۔جنہوں نے پارٹی کو نا صرف سپورٹ کیا تھا، بلکہ ان کے زیر اثر کئی ایم این اے اور ایم پی اے تھے۔پھر یہ سب دیگر پارٹیوں پر، رشتوں اور بزنس کی صورت میں خاصا اثر رکھتے تھے۔اجلاس کا ایجنڈا بہت مختصر تھا۔پارٹی کی گرتی ہوئی ساکھ اور اس کے طرزِ حکمرانی سے جو بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔عوام اور خواص دونوں ہی اس سے نالاں تھے۔اس خصوصی اجلاس میں سردار حیات اللہ کو بھی بلایا گیا تھا۔وہ پارٹی کا سب سے اہم فنانسر تھا۔

اجلاس شروع ہوا۔چند رسمی تقریروں کے بعد پارٹی سربراہ نے کہا۔''اختلافاتِ رائے کو ہمیشہ پارٹی میں اہمیت دی جاتی ہے۔لیکن ناراضگی کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ پارٹی چھوڑ دی جائے۔کسی معاملے اور مسئلے میں خرابی اگر اس کی بدانتظامی یا کم فہمی کی وجہ سے ہو تو اس کو ٹھنڈے دل سے سنبھالنا چاہیے۔اگر آپ لوگوں نے پارٹی کو پیسا دیا ہے۔تعلقات استعمال کر کے اس کو لوگ دیئے ہیں۔تو یہ نا بھولئے کہ پارٹی نے ہزاروں کی جگہ لاکھوں اور لاکھوں والوں کو کروڑوں کما کے بھی دیئے ہیں۔اس لئے پرسکون رہنا بہت ضروری ہے۔''پارٹی سربراہ نے کہا اور ان کی طرف دیکھا۔

ایک سینئر وزیر نے کہا۔''آپ کی تمام باتیں بجا، لیکن ہمیں افسوس وزیر اعظم صاحب کی کج فہمی کا ہے۔یہ معاملے کو بگاڑنے کے بعد سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر اس کو سنبھالتے سنبھالتے بالکل ہی ختم کر دیتے ہیں۔''

''تو پھر کیا کریں۔۔؟'' پارٹی سربراہ نے ان سے پوچھا۔''یہ وقت پارٹی بچانے کا ہے۔عوام میں اپنی ساکھ بحال کرنے کا ہے۔ہمیں مضبوط اور سخت فیصلے کرنے پڑیں گے۔چاہے اس میں کوئی خوش ہو یا ناراض۔''پارٹی سربراہ نے کسی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔''آپ میری طرف سے آزاد ہیں کھل کے اپنی رائے دیجئے۔!''

''میرا خیال ہے۔۔!'' وزیر خزانہ نے کہا۔''ہمیں عوام کے سامنے اپنا پروگرام رکھنا چاہیے، اور ایک ایسی شخصیت کو سامنے لانا چاہیے جس کے اوپر لوگوں کو اعتماد ہو، جس کے متعلق لوگوں کو یقین ہو کہ وہ کچھ ہمارے لئے کر سکتا ہے۔''

''آپ لوگ تجویز کریں۔!'' پارٹی سربراہ نے کہا۔''یہ فیصلہ مشترکہ رائے کے بعد ہی کیا جائے گا۔!''

''میں یہ سمجھتا ہوں کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم صحیح فیصلے کریں اور ان لوگوں کو آگے لائیں جو بغیر کسی لالچ کے پارٹی کے ساتھ ہیں اور جن کے متعلق یہ کہا جا سکے وہ قائد ایوان بننے کے بعد بھی کسی ممبر کی دھونس دھمکی میں

آنے کے بجائے اجتماعی مفاد کو سامنے رکھ کر فیصلے کریں گے۔!'' پارٹی کے سینئر نائب صدر نے کہا، اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد دوبارہ بولنا شروع کیا۔ ''میری نظر میں ایسی با اعتماد اور موزوں شخصیت شاہ ہارون گیلانی کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی۔''

سینئر نائب صدر کے نام تجویز کرتے ہی سب بیک وقت بولنا شروع ہو گئے۔ یوں لگا کہ جیسے سب ہی کچھ نہ کچھ کہنا چاہ رہے ہوں۔ چند منٹوں تک یہی صورت حال رہی۔ پھر پارٹی سربراہ نے ہاتھ اٹھا کر سب کو خاموش کیا۔ ''اطمینان سے باری، باری اپنی رائے کا اظہار کیجئے۔ اس طرح تو کسی کا بھی نکتہ نظر واضح نہیں ہو گا۔''

''بالکل ٹھیک۔۔۔!'' سینئر نائب صدر نے کہا۔ ''جو لوگ شاہ ہارون گیلانی کے نام پر متفق ہیں وہ ہاتھ اٹھائیں تاکہ چند ہی منٹوں میں فیصلہ ہو جائے۔!''

اتنا سنتے ہی سب نے ہاتھ اٹھا دیئے۔ پھر اچانک ہی سب بولنے لگے۔ ''ہارون۔۔۔ ہارون۔۔۔ ہارون۔۔۔ ہارون۔۔۔!''

شاہ ہارون گیلانی چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پارٹی سربراہ نے بڑے غور سے ان کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی، مگر ان کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ شاہ ہارون گیلانی اس پر کوئی رائے دیں۔!'' پارٹی سربراہ نے کہا۔

اچانک جیسے خاموشی چھا گئی۔ تمام نگاہیں شاہ ہارون گیلانی پر مرتکز ہو گئیں۔ شاہ ہارون گیلانی نے اپنے اردگرد دیکھا۔ سب ان کو سننے کو بے قرار تھے۔ انہوں نے نہایت نپی تلی زبان میں کہنا شروع کیا۔ ''آپ سب جانتے ہیں کہ میں نے گزشتہ پچیس برسوں میں کبھی کسی عہدے کا لالچ نہیں کیا۔ نہ کوئی وزارت طلب کی۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں مالی معاملات سے آسودہ رکھا ہے۔ جو کچھ ہو سکا ہم نے پارٹی کے لئے، وطن کے لئے کیا اور آئندہ بھی یہی ہو گا۔ مگر آپ لوگ میری شخصیت کے پہلو جانتے ہیں۔ میں ضدی ہوں۔ کام کے معاملے میں بالکل کھرا ہوں۔ میرٹ کے علاوہ میں کوئی سفارش نہیں مانتا۔ نہ خود بدعنوانی کرتا ہوں، نہ کروں گا اور نہ ہی کسی کو کرنے دوں گا۔ اپنی پالیسی بناؤں گا اور اس پر عمل درآمد کرواؤں گا۔ اس معاملے میں کوئی کچھ کہے گا تو میں نہیں سنوں گا۔ اب دیجئے اپنی رائے۔۔۔!'' انہوں نے بڑے سکون سے کہا اور اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔

ان کی باتیں سن کر لمحہ بھر کے لئے یوں لگا کہ جیسے ان سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ وہ بے پناہ خاموش تھے۔ پھر اچانک سینئر نائب صدر نے تالی بجائی۔ دو تین۔ چار۔۔۔ اور پھر سب نے کھڑے ہو کر تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ گویا وہ سب ہارون گیلانی سے متفق تھے۔ ان تالیوں کی گونج میں فیصلہ ہوا کہ شاہ ہارون گیلانی پارٹی کے آئندہ وزیراعظم کے طور پر عوام کے سامنے لائے جائیں گے۔ جس کی پارٹی سے وفاداری، ملک سے پیار کو کسی صورت بھی کسی اور سے تقابل نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی پارٹی میں وہ ہی ایسی شخصیت تھے جنہوں نے اپنے بھائی کو قربان کر دیا تھا۔ اور عوام ان کے والہ و شیدا تھے۔ پھر ضمنی انتخاب میں انہوں نے ایک پڑھے لکھے عام شخص کی حمایت کر کے اس کو عوامی نمائندہ بنوایا۔ اس سے وہ عوامی سطح پر بے حد محترم ہو گئے تھے۔ پارٹی جس مسٹر کلین کو سامنے لانا چاہ رہی تھی، وہ اس کو مل گیا تھا۔ شاہ ہارون گیلانی کی صورت میں۔

سب ہارون گیلانی کو مبارکباد دینے لگے۔ ان سے ہاتھ ملانے لگے، گلے ملنے لگے۔ سینئر نائب صدر نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور پھر ان سے بڑی گرمجوشی سے گلے ملتے ہوئے ان کے کان میں بولا۔ ''ہارون صاحب اپنے اس خیر خواہ کو یاد رکھئے گا۔!''

شاہ ہارون گیلانی نے بے پناہ حیرت سے اسے دیکھا۔ یہ تھا۔ وہ پراسرار مددگار۔ جس نے ہر اہم موقع پر

ان کی راہنمائی کی تھی۔ وہ مسکرادیئے اور بولے ''شاہ ہارون گیلانی کے خون میں احسان فراموشی نہیں ہے۔!''
سینئر نائب صدر مسکرایا اوران کے پاس سے ہٹ گیا۔ وہ پہلا آدمی تھا۔ جس نے مستقبل کے وزیراعظم کو متاثر کرلیا تھا۔ سیاست میں غیر متوقع چال کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ بازی ہارنے کے بجائے جیت کرایسی جگہ بٹھادیتی ہے کہ جہاں سے کامیابی کا سفر شروع ہوتا ہے۔ اور جو اس چال کا ادراک نہیں کرپاتے وہ پھر ہمیشہ موقع کی تلاش میں رہتے ہیں، اور کامیابی ان سے یوں بھاگتی ہے جیسے چھوت کے مریض سے صحت مند لوگ۔۔!

دارالحکومت سے واپسی پر نجانے کیوں شاہ ہارون گیلانی کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ جیت کے لالچ میں بہت کچھ گنوا بھی چکے ہیں۔ دل کے اندر کے احساسات بہت بے رحم ہوتے ہیں۔ ان کے اعداد سے کوئی بھاگ نہیں سکتا۔ کبھی ضرب سے تقسیم ہوجاتے ہیں اور کبھی منفی میں سے مثبت ہوجاتے ہیں۔ دل کے اندر کے حساب میں صفر نہیں ہوتا۔ وہ، وجود کو صفر کردیتے ہیں۔

وہ حویلی پہنچے تو ان سے پہلے ان کی خبریں وہاں پہنچ چکی تھیں۔ سب ان کا بے چینی سے انتظار کررہے تھے۔ کوئی مٹھائی لئے کھڑا تھا، کوئی ہار پھول لئے منتظر تھا۔ ان کے استقبال کو سب ہی آئے۔ چھوٹے بڑے اپنے اور غیر۔ مگر عبداللہ شاہ گیلانی نہیں آیا۔

انہوں نے سگار سلگاتے ہوئے، بڑے قیمتی لائٹر کے شعلے کو دیکھتے ہوئے بہت سرسری انداز میں پوچھا۔
''عبداللہ کہاں ہے۔؟''

نازاں نے انہیں دیکھا۔ وہ اس کے بجائے لائٹر سے نکلتے ہوئے نیلے شعلے کو دیکھ رہے تھے۔

''وہ انیکسی میں ہیں۔!'' نازاں نے جواب دیا۔

''اگر وہ فارغ ہو تو مجھ سے مل لے۔!'' پہلی بار انہوں نے کسی کی طلبی میں جواز کو اہمیت دی، ورنہ وہ تو صرف غیر مشروط حکم دینا ہی جانتے تھے۔

''وہ کہہ رہے ہیں کہ آپ اگر ملنا چاہتے ہیں تو صرف ایک ہی شرط ہے کہ آپ ان کی بات مان لیں گے۔!''

''کیا بات منوانا چاہتا ہے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے پوچھا۔ ''کچھ کہے گا تو ہی پتا چلے گا نا۔!''

''میں آپ دونوں کے درمیان نہیں آنا چاہتی۔ بہتر ہے کہ آپ لوگ خود ہی مل بیٹھیں۔ مجھے تو کسی حقیقت کا، کسی معاملے کا علم ہی نہیں۔!'' نازاں نے اطمینان سے جواب دیا۔

اسی وقت عبداللہ شاہ گیلانی اندر داخل ہوا۔ ''ہمیشہ بڑوں کا احترام ہی سیکھا، اس لئے خود آگیا ہوں۔ میری شرط یہ ہے کہ آپ وہ چھپن کروڑ ڈالر واپس لائیں جو آپ کے غیر ملکی اثاثے ہیں۔ اس ملک کو پیسے کی ضرورت ہے۔ وہ پیسہ جس کو جمع کرنے کے لئے کوئی حساب کوئی کتاب نہیں رکھا گیا۔''

انہوں نے غور سے دیکھا۔ عبداللہ شاہ گیلانی انہیں اپنی بے حد چمک دار آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ ان آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ انہیں ایسا لگا کہ جیسے ان کے سامنے عبداللہ شاہ گیلانی نہیں، سکندر شاہ گیلانی کھڑے ہوں اور انہیں دیکھ رہے ہوں۔ ان سے حساب کرنے آگئے ہوں۔ ان کی نگاہیں جھک گئیں۔

انہوں نے کہا۔ ''اگر میں تمہاری بات مان لوں تو تم جاؤ گے تو نہیں۔؟''

''نہیں۔۔۔!'' عبداللہ شاہ نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ساتھ ہی اس نے فون شاہ ہارون گیلانی کی طرف بڑھایا۔

''یہ کیا ہے۔؟'' انہوں نے عبداللہ شاہ گیلانی کے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ اور فون تھام لیا۔

''کسی سے، کسی کی آخری گفتگو۔!'' اس نے سرسری انداز میں کہا اور تیزی سے واپس چلا گیا۔
شاہ ہارون گیلانی صوفے پر یوں دھم سے بیٹھے کہ جیسے کسی نے ان کے گھٹنوں سے اچانک توانائی کھینچ لی ہو۔

قدرت بھی کیا کیا کرشمے دکھاتی ہے۔ کامیابی اور تنہائی ساتھ ساتھ چلاتی ہے۔ آج انہیں پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ انہیں شکست ہوئی ہے۔ وہ بھی ہر محاذ پر۔ گھر میں بھی، سیاست میں بھی۔ بظاہر وہ ہر جگہ کامیاب تھے۔ مگر صرف ملمع کاری سے، انہیں تو ایک بوریہ نشین نے شکست دی تھی۔ دو طرفہ مات، اپنی دعا اور تربیت دونوں سے۔ انہوں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔۔ ان کی بیگم اندر آئیں تو وہ اسی حال میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دبے پاؤں واپس چلی گئیں۔ وہ ان کے خیالات کے درمیان مخل نہیں ہونا چاہتی تھیں۔ شاہ ہارون گیلانی کو احساس تک نہ ہوا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے ہیں۔

☆☆☆

میں نے اماں کو بتایا کہ قدیر کے گھر والے آج شام کو آ رہے ہیں۔
''کیا تم نے بات کی تھی۔؟'' اماں نے پوچھا۔ ''اس نے اچانک ہی یہ فیصلہ کیسے کر لیا۔؟''
''اماں۔۔۔!'' میں نے اماں کے پاس بیٹھ کر کے ان کے پاؤں دبانا شروع کیے۔ میں اس وقت رات کے کھانے کے بعد اماں کے کمرے میں تھا۔ موی چائے دے گئی تھی۔ جب سے نرگس آئی تھی۔ وہ چائے دیکر تھوڑی ہی دیر میں چلی جاتی تھیں۔ ''ہوسکتا ہے کہ اس کے دل میں خیال ہو، اگر دوستی اچھی ہو تو اس کو مضبوطی کے رشتے میں باندھنے کا خیال آ ہی جاتا ہے۔ بقول آپ کے کہ اونگھتے کو ٹھیلے کا بہانہ۔ جو پہلے ہی خواہش رکھتا ہو، اس سے اظہار مدعا میں کیا مانع۔؟''
میں نے موی کی دلی آرزو، اماں کو نجانے کیوں بتانے سے گریز کیا۔ کچھ ننھے منے راز چھپانا اچھا لگتا ہے۔
''یہ خوشی کی بات ہے۔'' اماں نے کہا۔ ''اللہ کے فضل سے یہ معاملہ خیر و عافیت سے طے ہو جائے تو پھر دوسرا معاملہ بھی طے کرتے ہیں۔!''
ان کا اشارہ واضح طور پر میری جانب تھا۔ میں ان سنی کر گیا۔
تھوڑی دیر میں اماں نے کہا۔ ''جاؤ بیٹا آرام کر لو۔ مسلسل کئی دنوں سے مصروف ہو۔ آج بھی سارا دن ہی کارڈ بانٹتے رہے۔ اللہ پاک میرے بچے کو بہت ساری کامیابیاں عطا کرے، نظر بد سے بچائے۔!'' انہوں نے دعا دی۔ اور مسکرا کے مجھے شب بخیر کہا۔ میں نے انہیں سلام کیا اور رات کی مدھم روشنی کا نیلگوں بلب روشن کر کے کمرے سے باہر نکل آیا۔
صبح ناشتے کے بعد اماں نے نرگس اور موی سے کہا کہ ذرا گھر کی جھاڑ پونچھ کر لیں۔ اور شام کے کھانے کے لئے بھی کچھ اہتمام کر لیں۔ فرج میں مرغی، مچھلی، گوشت سب کچھ موجود ہے۔ پلاؤ اور کباب شامی بنا لینا۔ میٹھے میں شاہی ٹکڑے اور فیرنی بنا لینا۔ باقی جو تمہارا دل چاہے۔!''
''اب بھی کچھ بچا ہے۔؟'' موی ہنسی۔ ''کوئی خاص مہمان آ رہے ہیں کیا۔؟''
''مہمان تو مہمان ہی ہوتے ہیں۔ اللہ کی رحمت کیا خاص کیا عام۔!'' اماں نے جواب دیا۔
''یعنی کہ آپ کا بتانے کا دل نہیں۔!'' موی فوراً ہی بات کی تہہ تک پہنچ گئی۔ اماں ہنس دیں۔ نرگس مسکرائی۔
''اماں اگر کوئی پھل وغیرہ منگوانے ہو تو بتا دیجئے۔ میں لیتا آؤں گا۔ بلکہ میں شام کو جلد ہی آ جاؤں

گا۔!'' میں نے کہا۔

''ہاں یہ تو بہت اچھا ہوگا۔تمہاری تقریب جمعے کو ہے نا۔!'' اماں نے میری بات سن کر پسندیدگی کا اظہار کیا۔یوں ہلکی پھلکی گفتگو اور صبح ناشتے کی بعد کی محفل برخواست ہوگئی۔

☆☆☆

شائد کچھ وقت، کچھ لمحات ہمیں بہت زیادہ خوشیاں دیتے ہیں، حالانکہ ساعتیں وہی ہوتی ہیں۔مگر ہمارے احساسات کا رخ بدل جاتا ہے۔شام تو برسوں سے اس گھر میں آرہی تھی۔مگر آج اس شام کا حسن ہی کچھ اور تھا۔اماں بہت ہشاش بشاش تھیں۔مجھے بھی بہت اچھا لگ رہا تھا۔میں پھل وغیرہ لیتا ہوا ساڑھے تین بجے ہی گھر آگیا تھا۔منہ ہاتھ دھوکر میں نے موی سے ایک گرما گرم چائے کی فرمائش کی، تو تھوڑی دیر میں وہ چائے کے ساتھ ساتھ گرم گرم نمک پارے اور سموسے لے آئی۔مجھے واقعی بھوک سی لگ رہی تھی۔میں اماں کے کمرے میں ہی تھا۔موی چائے رکھ کر واپس چلی گئی۔میں چائے پینے لگا۔ساتھ ساتھ سموسے اور نمک پاروں سے شغل بھی جاری تھا۔اچانک ایک بڑے سے پیکٹ پر میری نظر پڑی۔یہ پیکٹ شائد میرے آنے سے پہلے آیا تھا۔ورنہ میں نے صبح نہیں دیکھا تھا۔''اماں کیا کچھ منگوایا ہے آپ نے۔؟'' میں نے پوچھا۔

''قادری سرکار نے بھیجا ہے۔!'' اماں نے بتایا۔

''اس میں کیا ہے۔؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''معلوم نہیں، میں نے سوچا تمہارے سامنے ہی کھولوں گی۔!'' اماں نے کہا۔

''اچھا۔!'' میں نے جلدی جلدی چائے کے گھونٹ لیکر پیالی خالی کی، ٹشو سے چکنے ہاتھ صاف کئے اور پیکٹ کھولنے لگا۔پیکٹ کے اندر مزید پیکٹ اور دو سفید لفافے تھے۔میں نے لفافے اٹھائے ان پر لکھا تھا۔''موی بیٹی کے لئے بہت پیار سے'' دوسرے پر لکھا تھا۔''قدیر بیٹے کے لئے بہت پیار سے۔'' تیسرے چھوٹے پیکٹ میں ایک بہت خوبصورت سونے کی انگوٹھی تھی۔پانچ سوٹ تھے۔دو مردانہ، دو زنانہ۔پانچویں پہ لکھا تھا بھاگ بھری کے لئے۔مجھے یاد آیا کہ بھاگ بھری قدیر کے ہاں کئی برسوں سے ملازمت کر رہی تھی۔اسی طرح پانچ سوٹ دوسرے لفافے میں تھے۔جن میں سے دو مردانہ اور تین زنانہ تھے۔ایک لفافے پر لکھا تھا برائے دعوت۔اس میں پانچ ہزار روپے تھے۔دوسرے پہ لکھا تھا برائے نرگس اور موی اس میں دس ہزار روپے تھے۔دوسرے دونوں سفید لفافوں میں گیارہ، گیارہ ہزار روپے تھے۔قادری سرکار کے ان تحفوں میں سب کے لئے، دونوں گھروں کے ہر فرد کا خیال رکھا گیا تھا۔

''یہ تو منگنی کا سامان ہے۔!'' اماں نے کہا۔

''لیکن کیسے ہوا یہ۔۔۔!'' میں بے حد حیران تھا۔''قادری سرکار کی اتنی عنایات، اتنی محبتیں۔۔۔!''

''کیا وہ لوگ منگنی کریں گے۔؟'' میں نے پوچھا۔

''معلوم نہیں۔۔۔!'' اماں نے کہا۔''مگر ان سب چیزوں سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قادری سرکار کے علم میں ہے کہ شائد وہ منگنی کی رسم ادا کرنا چاہیں گے۔!''

''یہ انگوٹھی تو یہی ظاہر کرتی ہے۔!'' میں نے کہا۔''اگر سرکار نہ بھیجتے، اور وہ اپنی انگوٹھی نکال لیتے تو پھر کیا ہوتا۔؟''

''اگر ایسا ہوتا تو کوئی مضائقہ نہ ہوتا۔میرے پاس انگوٹھی رکھی ہے۔وہ پہنا دیتی۔!'' اماں نے کہا۔مجھے اماں پر بے حد پیار آیا۔مائیں کتنے چپکے چپکے اپنے بچوں کے لئے نجانے کیا کیا تیاریاں کرتی رہتی ہیں۔کتنے خواب الماری میں، اٹیچی میں، پاندان کی تھالی کے نیچے، بستر کے تکیے تلے، اور بچتوں کے ڈبے میں سینت

سینت کے رکھے ہوتے ہیں۔
مگر اس وقت قادری سرکار نے جس طرح تحائف کی صورت میں ہمیں یاد رکھا، اس نے ہمیں خرید لیا تھا۔ وہ بہت اچھے بیوپاری ہیں۔ محبت کے سکوں، توجہ کے موتیوں اور پیار کے داموں پر ہر دل کو خریدنے پر قادر۔
اماں کی آنکھوں کے گوشوں میں نمی تھی۔ نہ میں نے کچھ کہا۔ نہ اماں نے۔ بس ہم دونوں چپ رہے۔
مغرب کی اذان کے تقریباً نصف گھنٹے کے بعد اطلاعی گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ قدیر اس کی امی، بہن اور ابو کھڑے تھے۔ پیچھے ان کی ملازمہ بھاگ بھری ہاتھوں میں ایک بڑا سا ٹوکرا لئے کھڑی ہوئی تھی۔ واضح طور پر وہ مٹھائی تھی۔
میں انہیں سلام کر کے اندر لایا۔ وہ سب اندر آ گئے۔ اماں نے اپنے تخت سے اٹھ کر استقبال کیا۔ وہ سب بڑی گرم جوشی سے مزاج پرسی کرتے ہوئے بڑے کمرے میں آ گئے۔
رسمی گفتگو کے بعد قدیر کی والدہ نے کہا۔ ''بہن ہم آج آپ سے ایک درخواست کرنے حاضر ہوئے ہیں۔ امید ہے کہ آپ قبول فرمائیں گی۔!'' انہوں نے ذرا رک کے کہا اور میاں کی طرف دیکھا۔
قدیر کے ابا ان کا مدعا سمجھ گئے۔ وہ بولے۔ ''بہن بات سیدھی اور مختصر سی یہ ہے کہ ہم لوگ برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ دونوں گھروں کا رہن سہن، ملنا جلنا معلوم ہے۔ پھر قدیر اور تنزیل بچپن کے دوست ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس دوستی کے رشتے کو مضبوطی دیں۔ اس لئے قدیر کے لئے آپ کی بیٹی کا ہاتھ مانگنے آئے ہیں۔ بے وجہ رسمی تکلفات کا کیا فائدہ۔ ہماری طرف سے تو بسم اللہ ہے۔ آپ کی ہاں کے منتظر ہیں۔!'' قدیر کے ابا نے بڑی سادگی سے اپنا مدعا بیان کر دیا۔
اماں خاموش تھیں۔
قدیر کی بہن نے کہا۔ ''خالہ جان انکار نہ کیجئے گا۔ مومی تو میرے بچپن کی سہیلی ہے اور اتنی پیاری سہیلی مجھے بھابھی کے روپ میں مل جائے تو بہت اچھا ہو گا۔ میری اچھی خالہ جان۔!'' نصرت نے بڑے لاڈ سے کہا اور اماں کے پاس آ بیٹھی۔
''یہ سارے معاملے تو طے ہوتے رہیں گے پہلے آپ لوگ کھانا وغیرہ تو کھا لیں۔!'' اماں نے دھیمے سے کہا۔
''کھانا تو کھا لیں گے، مگر پہلے کوئی خوش خبری تو سن لیں۔۔!'' قدیر کی والدہ نے خوش دلی سے کہا۔
''آپ کا ہی بچہ ہے دیکھا بھالا۔!''
''ہاں وہ تو ہے۔!'' اماں مسکرائیں۔ ''بچوں کی شادی کرنا تو سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ بھلا میں اس سنت سے انکار کر کے گناہگار کیسے ہو سکتی ہوں۔؟'' اماں نے بہت خوبصورتی سے اپنی رضا مندی کا اظہار کیا۔
''تو پھر منہ میٹھا کیجئے۔!'' قدیر کی امی نے برجستہ کہا۔ اور اپنے ہمراہ لائی ہوئی مٹھائی کا ٹوکرا کھول کے اس میں سے ایک لڈو نکالا اور اماں کے منہ کی طرف بڑھایا۔
اماں نے لڈو تھام لیا اور پہلے ان کو کھلایا، پھر خود کھایا، پھر اچانک ہی جیسے نصرت بولی۔ ''ارے یہ ہم خود ہی لڈو کھا رہے ہیں ذرا بھلا میں اپنی ہونے والی بھابھی کو تو لے آؤں۔'' نصرت اٹھی اور باہر نکل گئی۔
قدیر کے والد نے جیب میں سے ایک چھوٹی سی ڈبی نکالی، میز پر رکھی اور بولے۔ ''بہن بلا وجہ کی رسموں پر پیسہ ضائع کرنے کا کیا فائدہ؟ میں آپ کی اجازت سے بیٹی کی انگلی میں انگوٹھی پہنانا چاہتا ہوں۔ شادی کی تاریخ دے دیجئے۔ جہیز کی مجھے ضرورت نہیں۔ سلیقہ، ادب اور گھرداری کے قرینے سے بڑا جہیز کوئی

نہیں ہوتا۔ جب آپ حکم کریں گی بارات لے کر حاضر ہو جائیں گے۔''
اماں نے میری طرف دیکھا میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ تھوڑی دیر بعد نصرت اور نرگس موی کو لئے اندر داخل ہوگئیں۔ شرم سے موی دوہری ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر شرم، حیا اور مسرت کا بے حد خوبصورت امتزاج تھا۔ اسے لا کر بڑے صوفے پر بٹھا دیا۔ قدیر کے والدین نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ان کی بیگم نے ایک زری کا دوپٹہ موی کے سر پر ڈالا۔ انگلی میں انگوٹھی پہنائی۔
میں نے قدیر کو بازو سے تھاما اور لا کر موی کے ساتھ بٹھا دیا۔
امی نے قدیر کو انگوٹھی پہنائی، اور ایک لفافہ قدیر کی گود میں رکھا۔ اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کو دعائیں دیں۔
میں نے دیکھا کہ قدیر کے روئیں روئیں سے مسرت کی روشنی نکل رہی ہے۔ ایسی ہی روشنی موی کے بدن سے نکل رہی تھی۔ میں نے سر جھٹک کے دیکھا۔ مگر روشنی بدستور نکل رہی تھی۔ ''کیا خوشیاں رنگ کی صورت ہوتی ہیں۔۔؟ کیا خوشیاں سب کو دکھائی دیتی ہیں۔۔؟''
''نہیں تنزیل میاں۔۔!'' مجھے ایک جانی پہچانی نرم آواز سنائی دی۔ ''خوشیاں محسوس تو سب کو ہوسکتی ہیں۔ مگر ان کا ادراک اور ان کی روشنی صرف آنکھوں والوں کو ہی دکھائی دیتی ہے۔ جب اندر کی آنکھ کھل جاتی ہے تب۔!'' قادری سرکار کی وضاحت کے ساتھ ہی جیسے اچانک سب کچھ بدل گیا۔ اور روشنیاں غائب ہوگئیں۔
''تنزیل بیٹے مبارک ہو آپ کی دوستی رشتے داری میں بدل گئی۔!'' قدیر کے والد میرے پاس کھڑے کہہ رہے تھے۔ میں اٹھا اور ان سے گلے ملا۔ پھر قدیر سے گلے ملا۔ اور اسے مبارکباد دی۔ اس نے گلے لگتے ہوئے آہستہ آواز سے میرے کانوں میں سرگوشی کی۔ ''شکریہ یار۔!''
میں ہنس دیا۔
موی چند منٹ بیٹھی رہی۔ پھر اماں کے اشارے پر نرگس اور نصرت اسے اندر لے گئیں۔ اماں بھی اٹھ کر کھانے کا انتظام دیکھنے چلی گئیں۔ قدیر کی والدہ بھی تھوڑی دیر بیٹھی رہیں پھر وہ بھی اندر چلی گئیں۔ گھر میں سب بول رہے تھے۔ ہلکا ہلکا شور ہو رہا تھا۔ جو مجھے بے حد اچھا لگ رہا تھا۔
قدیر نے کہا۔ ''کل تقریب ہے، کافی لوگ آرہے ہیں۔ تمہیں بھی کچھ کہنا پڑے گا۔!''
قدیر کے ابا نے کہا۔ ''یہ پہلی کتاب ہے جو اس نے ایسی چھاپی ہے کہ بک رہی ہے۔ ورنہ ہمیشہ اس کو نقصان ہی ہوا۔ اس لئے میں سخت خلاف ہوں ایسی کتابوں کے۔!''
''ابا اللہ کا شکر ہے کہ پریس کی کوئی مشین کی کسی وقت بھی بند نہیں ہوتی۔ پھر یہ شوق تو علم و ادب کے لئے صدقۂ جاریہ ہے۔ بڑے بڑے معروف لوگ اتنی سکت نہیں رکھتے کہ کتاب چھپوا سکیں، نام بڑا اور درشن چھوٹے۔ اگر ان کی کتاب چھپ جائے تو کیا مضائقہ۔'' قدیر نے کہا ''علم و حرف پھیلانے والوں میں ہمارا نام تو لکھا گیا۔!''
قدیر کے ابا ہنس دیئے۔ ''جیسے تمہاری مرضی۔!''
اسی وقت قدیر کے موبائل پر بیل ہوئی۔ قدیر نے فون کی طرف دیکھا اور بولا ''ارے سرکار کا فون ہے۔!''
''اسلام علیکم۔!'' دوسری طرف سے قادری سرکار کی نرم آواز آئی۔ ''کہاں ہیں آپ۔؟''
''جی سرکار یہاں تنزیل کے گھر ہوں۔!''

''اچھا بھئی بہت بہت مبارک ہو آپ کو، اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو خوش و آباد رکھے۔!'' انہوں نے دعا دی۔

''سرکار یہ سب آپ کی دعاؤں کے طفیل ہے۔!'' قدیر نے عاجزی سے کہا۔

''اچھا یہ بتایئے کہ آپ کی تقریب کا مہمانِ خصوصی کون ہے۔؟'' انہوں نے پوچھا۔

جواباً قدیر نے دو تین نام لئے مگر ساتھ یہ بھی کہا کہ ان میں سے کسی نے ابھی تک باقاعدہ حامی نہیں بھری ہے۔

قادری سرکار نے فرمایا۔ ''عبداللہ شاہ گیلانی کا فون آیا تھا۔ آپ کے کارڈز ان تک پہنچ گئے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ اگر کوئی مہمان خصوصی نامزد نہیں کیا ہے تو وہ شاہ ہارون گیلانی کو لانا چاہتا ہے۔ اگر آپ لوگ چاہیں تو۔!''

''بالکل ٹھیک جیسا سرکار کا حکم۔!'' قدیر نے فوراً جواب دیا۔

''یہ حکم نہیں بلکہ آپ لوگوں کی صوابدید پر منحصر ہے!'' انہوں نے نرمی سے کہا۔

''سرکار کی زبان سے اظہار ہونا بھی ہمارے لئے حکم ہے۔!'' قدیر نے کہا۔

''تاج ور، کشور، غلام حسین، خادم حسین، حافظ سلمان، حنیف صحرائی وغیرہ بہت سے لوگ بھی آرہے ہیں۔ ان کے خلیفہ جی کی کتاب کی تقریب رونمائی جو ہے۔ ''سندیسے جو کھو گئے'' مگر لوگوں کو مل گئے۔!'' انہوں نے نہایت معنی خیز بات کی اور سلام کے بعد فون بند کر دیا۔

''تنزیل یار تو تو گیا شوں۔!'' قدیر نے گرمجوشی سے ہاتھوں کا تیر بنا کے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔'' جس تقریب میں قادری سرکار، شاہ ہارون گیلانی جیسے لوگ آرہے ہوں، جن کی پیشگوئی سے ایک عالم واقف ہے تو اس تقریب کی کوریج کے لئے میڈیا ٹوٹ پڑے گا۔ ہر چینل چاہے گا کہ مستقبل کے وزیراعظم کی زیادہ سے زیادہ کوریج کرے اور ابھی سے بہتر تعلقات بنائے۔!''

''اللہ مالک ہے!'' میں نے جواب دیا۔ مجھے خوشی ہوئی۔ لیکن نجانے کیوں ایسا لگا کہ جیسے خوشی مجھے بے قابو کرنے کے بجائے میرے اندر جذب ہوگئی ہو۔

اسی وقت نرگس نے آکر کہا۔ ''کھانا تیار ہے تمام لوگ آجائیں۔!''

کھانے کی ٹیبل پر سب اکٹھا ہوگئے۔ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ موی نہیں تھی۔ اس کو شرم آرہی تھی۔ بے حد خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا۔ نرگس ہر معاملے میں پیش پیش رہی۔ کھانے کے بعد اماں نے سب کو تحائف دیئے۔ سب سے زیادہ خوشی بھاگ بھری کو ہوئی۔ اس نے بے شمار دعائیں دیں۔ تھوڑی دیر میں سب رخصت ہوگئے۔ جاتے جاتے قدیر کے والد کہہ گئے کہ ان کا ارادہ ہے کہ وہ نصرت کے ساتھ ساتھ ہی قدیر کی شادی بھی رکھ لیں تا کہ ایک بیٹی جائے تو دوسری آئے۔ اماں نے کہا کہ نصرت کی تاریخ جب پکی کرلیں تو انہیں بتادیں۔ اللہ نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔

ان کے جانے کے بعد جب اماں کمرے میں آئیں تو موی وہیں موجود تھی۔ اماں نے اسے گلے سے لگا لیا۔ موی اماں کے گلے لگتے ہی رونے لگی۔ اماں خود بھی روتی رہیں۔ وہ بھی روتی رہی۔ نرگس تھوڑی دیر وہاں کھڑی رہی پھر چلی گئی۔

میں وہیں بیٹھ گیا۔ میں اس وقت ان کے درمیان کوئی مداخلت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آنسوؤں کا اپنا ایک علیحدہ رشتہ، علیحدہ زبان ہوتی ہے۔ ان کے اپنے جذبات ہوتے ہیں۔ گرم نمکین پانی کے یہ قطرے بڑے دیالو ہوتے ہیں۔ کبھی اندر کی کثافت باہر نکالتے ہیں۔ کبھی خوشی کی بجلیوں کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں، کبھی کوئی

مٹھاس دے جاتے ہیں۔ کبھی شکوے کا عنوان بن جاتے ہیں۔ کبھی تسلی، کبھی مرہم، کبھی پھاہا بن جاتے ہیں۔ گرم نمکین پانی کے قطرے بڑے دیالو ہوتے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد دونوں ہی سنبھل گئیں۔ اور خود ہی ہنسنے لگیں۔ اتنی دیر میں نرگس چائے لے آئی۔

''اس وقت واقعی بڑی طلب ہو رہی تھی۔'' میں نے کپ تھامتے ہوئے کہا۔

''جو پوری ہو جائے وہ طلب کہاں۔؟'' نرگس نے آہستہ سے کہا۔ کپ میرے ہاتھ میں لرز گیا۔

☆☆☆

تقریب رونمائی میں بہت سارے لوگ آئے ہوئے تھے۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ قدیر کے کس قدر ملنے والے ہیں۔ اخبار نویس، کالم نویس، مصنف، ڈرامہ رائٹر، شاعر، نقاد، سول سوسائٹی کے نمایاں افراد، میں ان سے پہلی بار مل رہا تھا۔ ان سب میں تجسس تھا ملنے کا، ''سندیسے جو کھو گئے'' کے مصنف سے۔ پھر اچانک شور ہوا، معلوم ہوا شاہ ہارون گیلانی آ گئے ہیں۔ تقریباً تمام مہمان آ چکے تھے۔ انتظار تھا تو صرف قادری سرکار، وہ اس تقریب کے صدر تھے۔ پھر اچانک لوگ کھڑے ہونے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سرگوشیوں میں پھیل گیا۔ قادری سرکار آ گئے۔ کسی نے نہیں کہا، مگر جو لوگ انہیں جانتے تھے وہ کھڑے ہونا شروع ہو گئے۔ چند لمحوں میں پورا ہال کھڑا ہو کے انہیں تعظیم دے رہا تھا۔ سچ ہے جو اللہ کے حضور جھک جائے۔ زمانہ اس کے آگے سرنگوں ہو جاتا ہے۔

قادری سرکار کے کرسی صدارت سنبھالتے ہی قرآن مجید کی تلاوت سے تقریب کا آغاز ہو گیا۔ شروع میں چند مقررین نے کتاب کے حوالے سے گفتگو کی۔ پھر ہارون شاہ گیلانی نے اپنے مختصر خطاب میں کہا۔ ''ہمارے نوجوانوں میں بہت توانائی ہے۔ اگر اس توانائی کو ملک کی ترقی اور تعمیر کے لئے استعمال کیا جائے تو اس سے زندگی ہی نہیں ملک کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ ہمیں ایسے سوچنے والے، پیار کرنے والے، ایثار کرنے والے نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ جو قلم کے ذریعے ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیں جہاں امن محبت اور پیار ہو۔ مجھے یقین ہے کہ قادری سرکار کے شاگرد، ان کے خلیفہ، ان کی خانقاہ سے منسلک نوجوان ایک ایسا فکری انقلاب لائیں گے، جو اس معاشرے کو بدل دے گا۔ میں تنزیل میاں کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے محبت کے موضوع پر لکھا اور سچ تو یہ ہے کہ اس کا حق ادا کر دیا۔!'' تالیوں کی گونج میں ان کا خطاب ختم ہوا۔

اس کے بعد میزبان نے مجھے ڈائس پر آنے کی دعوت دی۔ میں نے اجازت طلب نگاہوں سے قادری سرکار کی طرف دیکھا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے مجھے اجازت دے دی۔

میں نے ڈائس پر آ کر سامنے دیکھا۔ پورا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ ''میں آپ سب کا شکر گزار ہوں کہ اس تعفن زدہ معاشرے میں، جہاں قتل، اغوا، ڈکیتی، اور دیگر جرائم روز کا معمول بنتے جا رہے ہوں، وہاں محبت کی پذیرائی اس بات کی دلیل ہے کہ ہم اندر سے امن، محبت پیار اور ایثار کے لئے نا صرف تیار ہیں، بلکہ اس کو سراہنے میں کسی قسم کے بخل سے بھی کام نہیں لیتے۔ یہ کتاب کی یا میری کامیابی نہیں یہ آپ کی محبت سے تعلق کی کامیابی ہے۔ قادری سرکار نے فرمایا۔ ''سندیسے جو کھو گئے، مگر لوگوں کو مل گئے'' میں آپ کے خلوص کا جواب نہیں دے سکتا۔ یہ صرف قرض کی صورت مجھ پر واجب رہے گا۔ اور یہی قرض مجھے محبت کے لئے اکساتا رہے گا۔ اللہ محبت ہے، وہ محبت دلوں میں ڈالتا ہے۔ میں آپ سے، آپ مجھ سے ہم سب ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ بس اسی احساس کو محسوس کرنے اور اس کی تفہیم کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ مجھے اجازت دیجئے۔'' میں نے سر جھکا کے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

جب میں اپنی نشست پر آ کے بیٹھا تو قادری سرکار نے میرے کندھے کو تھپتھپایا۔ اور مسکرا دیئے۔ اس کے

بعد قادری سرکار نے اپنے صدارتی خطبے میں فرمایا۔
''آپ سب اہل علم، حرف کی دنیا کے شناور ہیں۔ میں تو بس ایک طالب علم ہوں، ایک فقیر ہوں۔ جس نے دنیا کو صرف محبت کی نگاہ سے دیکھا۔ یہ دنیا بُری سہی، لیکن بنائی تو آپ کے اور میرے خالق نے ہے۔ اور بنی تو میرے اور آپ کے سرکارؐ کے لئے ہے۔ پھر ہم اس کی برائی سے، اس کے خبث سے، نفرت کے بجائے محبت سے کیوں نا بہتر کرنے کی کوشش کریں۔ محبت تو ترک ہے۔ ایثار ہے۔ اعتبار ہے۔ جو محبت کو جان گیا، محبت کو سمجھ گیا اس نے اس دنیا کو، کائنات کو فتح کر لیا۔ ہم سب محبت چاہتے ہیں، ہمیں اپنا آپ سراہا جانا اچھا لگتا ہے، مگر ہمیں دوسروں کو بھی محبت دینی چاہیے، دوسروں کو بھی سراہنا چاہیے۔
محبت کا جواب فقط محبت کے سوا کچھ نہیں۔ میں عزیزی تنزیل کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے محبت کو سمجھا، اور محبت کے دوسرے رخ ایثار کو اپنا لیا۔ ترک کو سمجھ لیا، اس سمجھنے میں ہی برکتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے معاشرے میں محبت اور ایثار کی اس فضا کو قائم رکھے اور قدیر میاں جیسے علم دوستو کو عزم وحوصلہ عطا فرمائے۔ جو ایسی کتابوں کو لوگوں کے سامنے لاتے ہیں کہ جس سے محبتوں کا سفر آگے بڑھ سکے۔ اور معاشرہ بھرپور صحت مند سرگرمیوں میں پنپ سکے۔''
انہوں نے تقریب کے منتظمین کو کامیاب تقریب کے انعقاد پر مبارکباد دیکر اپنا خطاب ختم کر دیا۔
تقریب کے اختتام پر اسٹیج سیکریٹری نے اعلان کیا کہ جو لوگ کتاب خرید کر مصنف کے دستخط لینا چاہتے ہوں، وہ کتاب خرید کر کے مصنف کے دستخط لے سکتے ہیں۔ ان کے اس اعلان کے بعد کئی لوگوں کا رخ ایک طرف بنے خوبصورت سے اسٹال کی جانب ہو گیا۔ جہاں کتاب کا ایک بڑا سا ٹائٹل بنا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میز پر کافی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔
قادری سرکار اور ہارون گیلانی فوراً ہی چلے گئے۔ میں لوگوں میں اتنا گھرا ہوا تھا کہ ان کو باقاعدہ خدا حافظ بھی نہ کہہ سکا۔ تاج ور اور کشور دونوں نے کتاب خریدی۔ مجھ سے اس پر دستخط لئے۔ تاج ور نے بہت خلوص سے مبارکباد دی۔ بولی ''ہم اپنے خلیفہ جی کا یہ روپ تو جانتے ہی نہیں تھے۔''
قدیر نے برجستہ کہا۔ ''سرکار کے ہیرے ہزار پہلو تراشے ہوتے ہیں ہر رخ خیرہ کرنے والا ہوتا ہے۔!''
''ٹھیک کہتے ہیں آپ۔!'' تاج ور مسکرائی۔ ''آپ کو منگنی مبارک ہو۔!''
''شکریہ۔'' قدیر نے کہا۔ ''چلیں اب چائے پی لیں۔!'' اس نے دوسری طرف اشارہ کیا۔ جہاں چائے کا اہتمام تھا۔
لوگ ملتے رہے، تبصرے کرتے رہے۔ سب بہت خواب آور تھا۔ بہت دل کش، مگر نجانے مجھے کیوں لگ رہا تھا کہ جیسے یہ سب میرے لئے ہونے کے باوجود میرا نہیں۔ کیا خوشیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو اپنی شدتوں کے بغیر ہوں۔ خوشی میں شدت بیقراری نہ ہو تو وہ چنگاری کی طرح اپنے ہی خول میں بجھ جاتی ہے۔
تقریب ختم ہو گئی۔ قدیر بہت خوش تھا۔ یہ اس کی پہلی تقریب تھی جو اس کو بحیثیت پبلشر متعارف کروا گئی۔ کئی نامور ادیبوں نے اس سے اپنی کتاب چھپوانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس کے تعلقات کی انتہاؤں کو سب نے دیکھا تھا۔ سیاست اور مذہب دونوں ہی جگہ اس کے تعلقات مثالی تھے۔ کامیابی کے لئے بس ایک دھکے کی ہی ضرورت ہوتی ہے اور اس کو وہ دھکا مل گیا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔
☆☆☆
حسب معمول خانقاہ میں ہجوم عشاق جمع تھا، اور قادری سرکار اپنے مخصوص تخت پر دھیمے لہجے میں اپنا درس دے رہے تھے۔

''نعمتیں سب کے لئے یکساں تقسیم ہوتی ہیں۔ زمین اپنا سینہ فراغ کرتی ہے تو اناج ملتا ہے۔ ثمر ملتے ہیں۔ سمندر، دریا اپنا دامن کھولتے ہیں تو وہاں بھی انسان کی پذیرائی کے لئے انواع واقسام غذائیں ہیں۔ موتی ہیں مونگے ہیں۔ آسمان کی طرف دیکھو تو ستارے ہیں۔ چاندنی ہے۔ طیور ہیں۔ ابر باراں ہے۔ سورج کی دل کش حرارت ہے۔ غرض ہر جا تیری قدرت کا نظارہ ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اللہ پاک ان نعمتوں کی تقسیم میں رنگ، نسل، مذہب، خطے کی تخصیص نہیں رکھتا۔ سب کو ان کی ضروریات کے مطابق نعمتیں ملتی ہیں۔ مگر برا ہو حرص کا، ہوس کا، ہم ان نعمتوں کو ذخیرہ کرتے ہیں۔ پابندیاں لگاتے ہیں۔ کہیں یہ عالم کہ مارے افراط کے ضائع کرنا پڑے، اور کہیں یہ معاملہ کہ ایک مٹھی اناج کے لئے عصمتیں بیچی جائیں، بچے فروخت کئے جائیں۔ کیا یہ اس ذات پاک کا مقصود و منشاء تھا؟''

انہوں نے ذرا ٹھہر کے اپنے مخاطبین کی جانب دیکھا۔

''نہیں ہرگز نہیں۔۔!'' ایک معمولی وقفے کے بعد دوبارہ گویا ہوئے۔

''قادرِ مطلق ہر نعمت کو شمار رکھتا ہے۔ اور جو اس کا شمار بگاڑتے ہیں۔ ان معاشروں پر، ان خطوں پر، ان ممالک پر عذاب الٰہی مسلط ہونے لگتا ہے۔ کبھی زلزلے، کبھی بارشیں، کبھی قحط کبھی بیماریاں۔ غرض وقفے وقفے سے آفتیں اس خطے کا رخ کر لیتی ہیں۔ معاشرہ عذاب الٰہی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہم صرف اپنی جیب بھرنے لگتے ہیں۔ خیر وفلاح کے معاملات زیادہ سے زیادہ امداد اکٹھی کرنے سے مشروط ہو جاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ سب ایک ایسی دوڑ میں شامل ہو رہے ہیں جہاں بندگان خدا کی مجبوریوں کو، بے بسی کو، پامالی کو، مال تجارت کی طرح بیچا جا رہا ہے۔ ایسا معاشرہ فلاح و خیر سے خالی ہو جاتا ہے۔ یا اللہ۔۔۔ ہمارے دلوں کی درستگی فرما۔۔۔ ہماری اصلاح فرما۔۔۔!''

حسب معمول پتا نہیں کیسے ان کا درس آخر میں دُعا کے قالب میں ڈھل جاتا تھا۔

''اے اللہ ہمیں معاف فرما۔۔ ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں کو معاف فرما۔۔۔ ہماری بداعمالی کو معاف فرما۔۔۔ یا اللہ کرم فرما دے۔ ہم گناہگار ہیں تو غفار ہے۔ ہم عیب سے بھرے ہیں تو ستار ہے۔ ہم فانی ہیں تو حی القیوم ہے۔ ہم جھوٹے ہیں تو سچا ہے۔ ہم ظلمت ہیں تو نور ہے۔ ہم تیرے بندے ہیں تو ہمارا پالن ہار ہے۔ اللہ معاف کر دے۔ یا اللہ معاف کر دے۔۔!''

آنسوؤں کی جھڑی، معافی کی تکرار، ہر آدمی، ہر نفس سے ایک ہی صدا بلند ہو رہی تھی۔ یا اللہ معافی۔۔۔ اللہ معافی۔۔۔ سماعت دم بخود۔۔۔ یا اللہ معافی۔۔۔ نطق بے جان۔۔۔ اللہ معافی۔۔۔ یوں جیسے خانقاہ کو نور کے دائرے اوپر سے نیچے اپنی گرفت میں لینے کو عرش سے اُتر رہے ہوں۔۔۔ اللہ معافی۔۔۔ نور۔۔۔ روشنی۔۔۔ زندگی۔۔۔ بندگی۔۔۔ عاشق معشوق کے انتظار میں۔۔۔ مجبور ملاقات کے خیال میں۔۔۔ اللہ معافی۔۔۔ اللہ معافی۔۔۔ ہر بن و مو سے صدا بلند ہو رہی تھی۔ ہر طرف نور ہی نور تھا۔ اور پھر روشنی کی شدت۔۔۔ معلوم سے نامعلوم کا سفر۔۔۔ ہست سے نیست کی جانب۔۔۔ نیست سے ہست کا شعور اور پھر شعور اعلیٰ کے رنگ کے آگے سب بے رنگ۔۔۔ بے کیف۔۔۔ اصل کیف۔۔۔ اصل رنگ تو ہی ہے۔۔۔ تو ہی ہے۔۔۔ تو ہی۔۔۔ تو ہی تو۔۔۔ اے اللہ۔۔۔ تو ہی تو۔۔۔!''

حواس رخصت ہو گئے۔ ایک میں ہی کیا۔۔ وہاں موجود سب ہی بے حواس تھے۔ سب ہوش وخرد سے بے گانہ ہو رہے تھے۔ سب ہی اُس رنگ ساز کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔ جو کھرچ کھرچ کر زنگ اتار کر اپنا رنگ چڑھا رہا تھا۔ ارض وسما۔۔۔ تو ہی تو۔۔۔ یا اللہ۔۔۔ یا اللہ۔۔۔ یا اللہ

☆☆......☆☆

آپ کی ڈائری

یہ ہے آپ کی پسند' آپ کا انتخاب

مرتب: اشعر جواد

• خیر خواہی

سیدنا ابو ہریرہؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا۔ جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ جب کوئی امر پیش آئے تو اچھی بات کہے نہیں تو چپ رہے اور عورتوں سے خیر خواہی کر اس لئے کہ وہ پسلی سے بنی ہیں اور پسلی میں اوپر کی پسلی سب سے زیادہ ٹیڑھی ہے پھر اگر تو اسے سیدھا کرنے لگا تو توڑ دے گا اور اگر یوں ہی چھوڑ دیا تو وہ ہمیشہ ٹیڑھی رہے گی عورتوں کی خیر خواہی کرو۔

انتخاب: سرور ندیم۔ حیدر آباد

عورت کی طاقت

ابھی تم عورتوں کی قوتوں سے واقف نہیں ہو۔ عورت کمزور اور ناتواں ہونے کے باوجود دنیا میں سب سے زیادہ طاقت ور ہے۔ وہ لشکر نہیں رکھتی مگر حکومت کرتی ہے۔ خنجر نہیں رکھتی مگر زخمی کرتی ہے۔ زندان نہیں رکھتی مگر قید کرتی ہے۔ سانپ کا کاٹا بچ سکتا ہے لیکن عورت کا ڈسا نہیں بچ سکتا۔ زرہ کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو اس میں کہیں نہ کہیں جوڑ ہوتا ہی ہے اور تلوار اس جوڑ کو تلاش کر لیتی ہے۔ اسی طرح آدمی کتنا ہی طاقت ور اور دور اندیش کیوں نہ ہو۔ اس میں ایک نہ ایک کمزوری ہوتی ہے اور عورت اسی کمزور حصہ پر ضرب لگاتی ہے۔ عورت وہ پتوار ہے جو انسانیت کی کشتی کو جس طرف چاہتی ہے موڑ دیتی ہے اور ہزاروں روپ میں ظاہر ہوتی ہے اور ہزاروں دروازوں پر دستک دیتی ہے جن میں سے ایک نہ ایک کھل ہی جاتا ہے وہ جذباتی ہے لیکن مردوں کی طرح جذبات کی رو میں بہہ نہیں جاتی بلکہ ایک شہ سوار کی طرح جذبات کی لگامیں اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے۔ موقع کی مناسبت سے لگام کھینچ لیتی ہے اور موقع کی مناسبت سے چھوڑ دیتی ہے۔ وہ ایک ماہر جنرل کی سی نظر رکھتی ہے اور قابل مبارک باد ہے وہ دل جس کے قلعہ میں عورت کی نظر کوئی رخنہ نہیں پا سکتی اگر تمہارے دل میں جوانی کا جوش ہے تو وہ تمہارے بوسے لیتے نہ تھکے گی اگر تم جاہ و حشمت کے طالب ہو تو وہ تمہارے دل کا قفل توڑے گی اور تمہیں کامیابی و کامرانی کے تراہے پر لا کھڑا کرے گی اگر تم تھکے ہوئے ہو تو اسی عورت کی گود میں تمہیں اطمینان و سکون ملے گا اگر تم پستیوں میں گرے ہوئے ہو تو یہی عورت تمہیں بام عروج تک پہنچا دے گی اور تمہاری شکست کو فتح میں تبدیل کر دے گی۔ ہر...... عورت وہ سب کچھ کر سکتی ہے جو مرد نہیں کر سکتا۔ کیونکہ قدرت اس کا ساتھ دے رہی ہے اور عورت کی خاطر جنگیں ہوتی ہیں' اسی لئے بھائی بھائی کا' باپ بیٹے کا اور بیٹا باپ کا گلا کاٹنے سے دریغ نہیں کرتا' عورت کے اشارے پر قسمتیں بنتی اور بگڑتی ہیں اس کی خاطر مرد نیکی اور بدی کرتا ہے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے وہ عظیم اور جلیل القدر بنتا ہے اسی کی خاطر وہ آگ کے دریا میں کود پڑتا ہے اور اسی کے لئے وہ آسمان کے تارے توڑنے کی کوشش کرتا ہے لیکن عورت اس ابوالہول کی طرح خاموش بیٹھی مسکراتی رہتی ہے اور کوئی اس کی مسکراہٹ کے راز کو آج تک نہیں پا سکا۔

فرعون کی آپ بیتی رائیڈر ہیگرڈ
انتخاب: سید ضمیر شاہ۔ کراچی

طرز زندگی

ایک پاکستانی خاندان کو فرانس میں شہرت ملی۔ فرانس کا سوشل سیکورٹی کارڈ بنوانے کے لئے اس خاندان کی ایک لڑکی سوشل کا سیکورٹی کے دفتر گئی۔ کارڈ بنانے والے معلومات کمپیوٹر کو فیڈ کرنا شروع کیں۔ پوچھا نام لڑکی نے نام بتا دیا تو سوال ہوا تاریخ پیدائش یہ بتادی تو سوال ہوا شادی شدہ یا غیر شادی شدہ لڑکی نے جواب دیا غیر شادی شدہ۔ اب اگلا سوال تھا کتنے بچے ہیں لڑکی نے کہا میں غیر شادی شدہ ہوں۔ اہلکار بولا تو کیا فرق پڑتا ہے۔ بچے تو ہو سکتے ہیں لڑکی نے کہا کیا بات کر رہے ہیں۔ آپ اس پر اہلکار نے کی بورڈ سے انگلیاں اٹھا ئیں اور لڑکی سے کہا۔ آپ فرانس کی طرز زندگی سے نا آشنا ہیں۔ ہمارا طرز زندگی سیکھ کر آیئے تو کارڈ بنے گا لڑکی مایوس ہو کر گھر واپس چلی گئی اس کی عمارت میں ایک ہندوستانی خاندان رہتا تھا لڑکی نے ان سے تذکرہ کیا۔ انہوں نے فرانس کے طرز زندگی کے بارے میں معلومات فراہم کیں چنانچہ وہ لڑکی انٹرویو کے لئے دوبارہ گئی پھر سوال ہوا شادی شدہ یا غیر شادی شدہ لڑکی نے جواب دیا غیر شادی شدہ سوال ہوا کتنے بچے ہیں جواب دیا بچے نہیں ہیں پھر سوال ہوا کیوں لڑکی نے جواب دیا مجھے کوئی بوائے فرینڈ ہی نہیں ملتا۔ اہلکار بولا کیوں آپ تو اچھی خاصی اسمارٹ ہیں لڑکی نے کہا آپ بن جائیں میرے بوائے فرینڈ اہلکار سٹ پٹا گیا اور بولا میری تو پہلے چار فرینڈز ہیں لڑکی نے کہا یہ ہے میری قسمت اہلکار نے خاموشی سے کمپیوٹر پر کام کیا اور بولا دس منٹ بیٹھ جائیں آپ کو ابھی کارڈ مل جائے گا۔

عظیم سرور کی تصنیف 'قصہ مختصر'
انتخاب: شعیب محی الدین۔ لاہور

گونگا اور بہرہ

آپ نے ریل میں چھوٹے بچوں کو مطبوعہ کارڈ تقسیم کرتے دیکھا ہوگا جو وہ ہر مسافر کی جھولی میں ڈالتے جاتے ہیں اور اس کے بعد کارڈ کے ساتھ بھیک مانگتے ہیں۔ مضمون کچھ اس قسم کا ہوتا ہے۔ ''یہ لڑکا گونگا ہے' اس کی ماں گونگی ہے۔ اس کا باپ ریلوے میں تھا جو مر گیا ہے لہٰذا ریلوے نے اس کا کرایہ معاف کر رکھا ہے۔ مسلمان بھائی اس کی مدد کریں اور یہ کارڈ ملاحظہ کر کے واپس کر دیں۔'' اس دنیا میں ہر طرح کے اتفاقات ہوتے رہتے ہیں لیکن یہ عجیب اتفاق ہے ان سب لڑکوں کے باپ ریلوے میں ملازم تھے کوئی ڈاک خانہ یا چنگی میں نہ تھا۔ غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ کسی مخیر نے اس مضمون کے کارڈ چھپوا رکھے ہیں جس کا جی چاہے پانچ روپے سینکڑہ کے حساب سے مانگ لے اور اپنا نام بھر کے استعمال کرے۔ ایک بار ہم نے بھی رحم کھا کر ایسے لڑکے کے چونی دی اور دلاسہ دے کر پوچھا۔ ''بیٹے گونگے ہی ہو یا کوئی اور خرابی بھی ہے؟'' وہ جھٹ بولا۔ ''جی بہرہ بھی ہوں۔''

ابن انشاء کی تحریر سے اقتباس
انتخاب: رابعہ مظفر۔ کراچی

غلط انتخاب

اس زعفرانی جنگل میں میرے سامنے دو راستے تھے۔ میں دوراہے پر کھڑا ہو گیا۔ میں دیر تک سوچتا رہا ان راستوں میں میرا راستہ کون سا ہے۔ مسافر ایک تھا اور راستے دو' مجھے ایک راستہ پسند آ گیا۔ میں نے قدم بڑھائے اور چل پڑا۔ یہ ایک خوب صورت اور صاف ستھرا راستہ تھا۔ اس پر گھاس تھی اور اس سے پہلے اس راستے پر کسی نے قدم نہیں رکھا تھا۔ مجھ سے سیدھی آسمان کی طرف اٹھی ہوئی گھاس آہستہ آہستہ سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ اے مسافر! تم اس راستے کے پہلے راہی ہو۔ میں خوش تھا۔ پہلے مسافر کی طرح خوش تھا مگر افسوس جب میں درمیان میں پہنچا تو مجھے احساس ہوا میں غلط راستے پر نکل آیا ہوں۔ میں نے سوچا کیا میں پلٹ کر واپس جا سکتا ہوں؟ کیا میں اپنے اصل راستے کی طرف واپس لوٹ سکتا ہوں؟ میں نے سوچا نہیں میں اب راستہ نہیں بدل سکتا۔ مدتوں بعد اب سن رہا ہوں۔ جنگل میں دو راستے تھے اور میں اس

راستے پر چل پڑا جو خوب صورت تھا مگر میرا نہیں تھا اور یہ وہ غلط انتخاب تھا جو میری زندگی گھما گیا۔

جاوید چوہدری کی تصنیف 'زیرو پوائنٹ'
انتخاب: سعد گھلو۔ حیدر آباد

انسان اور بندر

بڑھاپے میں ایک بندر کی نظر کمزور ہوگئی۔ اس نے انسانوں کی زبان سے سنا تھا کہ یہ کوئی اتنی بھی بدقسمتی کی بات نہیں۔ بس اتنا ہے کہ عینک لگا لینا چاہئے۔ چنانچہ اس نے کہیں سے درجن بھر عینکیں حاصل کیں۔ کبھی سر پر رکھا' کبھی دم پر باندھنے کی کوشش کی' کبھی سونگھا' کبھی کو چاٹا' پھر بھی کسی عینک نے اس کی بینائی میں اضافہ نہ کیا۔

''واہیات!'' اس نے کہا۔ ''احمق ہیں وہ جو آدمیوں کی بکواس سنتے رہتے ہیں۔ اب یہی عینک کے بارے میں انہوں نے بالکل زٹل ہانک دی ہے۔ ان کا تو ذرا بھی فائدہ نہیں۔''

عجیب بات تو یہ ہے کہ آدمی بھی کبھی کبھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ کوئی چیز کتنی ہی مفید کیوں نہ ہو ناواقف آدمی جو اس کی قدر نہیں جانتا ہمیشہ اس کی برائی کرتا ہے اور اگر تھوڑا بہت اختیار رکھتا ہو تو اس کو ختم کرنے کے درپے ہو جاتا ہے۔

یونس محمد بٹ کی کتاب ''خندہ پیشانیوں''
انتخاب: فیضان حسین عثمانی۔ حیدر آباد

مسجد قرطبہ

سلطان سعود ہسپانیہ کا سرکاری دورہ کر رہے تھے۔ وہ اپنی جماعت کے ساتھ مسجد قرطبہ میں داخل ہوئے تو نماز کا وقت آ گیا۔ سلطان نے نماز ادا کرنے کے لئے پروٹوکول کے افسران سے اجازت چاہی۔ انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کی کہ مسجد کلیسا میں تبدیل ہو چکی ہے۔ سلطان کا چہرہ تمتما اٹھا۔ انہوں نے کہا۔ ''میں اس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت سے ہوں جس نے نصرانیوں کے وفد کو مسجد نبویؐ میں عبادت کرنے کی اجازت دی اور تم مجھے اپنی مسجد میں نماز ادا کرنے سے روکتے ہو؟'' سلطان نے ایک صاحب کو اذان کے لیے کہا یوں سات صدیوں بھی مسجد کی خاموش فضاؤں سے اذان کی صدا گونجی۔

منظور الٰہی کی تصنیف ''درد دلکشا''
انتخاب: اشعر جواد۔ کراچی

سنہری باتیں

☆ بہت سارے سوالات سے نکل کر انسان جب ایک سوال میں داخل ہوتا ہے تو اس کا سفر واضح ہو جاتا ہے۔
☆ اچھے عمل کی یاد کو ایک بڑا لفظ ہمیشہ کے لئے تباہ کر سکتا ہے۔
☆ رشتے ناتے بھی کچے دھاگے کی طرح ہوتے ہیں' ٹوٹ جائیں تو انہیں جوڑا جا سکتا ہے لیکن گرہ ضرور لگ جاتی ہے۔
☆ مخلص کی تعریف یہ ہے کہ وہ آپ کے ساتھ اپنے آپ سے زیادہ مہربان ہو۔
☆ خود شناس نہ ہو تو خدا شناسی کا عمل ممکن نہیں ہوتا۔
☆ مصنفین اپنی کتابوں کی شکل میں اپنے مرنے کے بعد بھی اپنے چاہنے والوں کی لائبریری میں محفوظ رہتے ہیں۔
☆ جب تک کوشش کی ناکامیاں سمجھ میں نہ آئیں نصیب کو سمجھا نہیں جا سکتا۔
☆ اگر دل میں محبت آ جائے تو زبان میں شائستگی آنا شروع ہو جاتی ہے۔
☆ زندگی کے جواز تلاش نہیں کئے جاتے' صرف زندہ رہ جاتا ہے۔ زندگی گزارتے چلے جاؤ' جواز مل جائے گا۔
☆ موت سانس ختم ہونے کا نام نہیں بلکہ موت تو یہ ہے کہ ہمیں یاد کرنے والا کوئی نہ ہو۔

ڈاکٹر ذکریا کی تصنیف 'گوہر آبدار
انتخاب: رضوانہ کوثر۔ لاہور

خوشی اور غم

خوشی اور غم انسان کی زندگی میں اہم کردار ادا

کرتے ہیں اگر انسان کی زندگی میں غم نہ ہوں تو جینے کا مزہ نہیں آتا۔ خوشی تو عارضی چیز ہے پل میں آتی ہے اور پل بھر میں چھن جاتی ہے مگر غم ہمیشہ رہتا ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ خوشی میں انسان خوش رہ سکتا ہے مگر میرا کہنا ہے کہ خوشی میں انسان غم زدہ ہو جاتا ہے کہ یہ پل بھر کی خوشی ہم سے چھن نہ جائے۔ غم تو ہمیشہ کا ساتھی ہے کچھ انسان اپنی خوشی کی خاطر کتنے لوگوں کے اصولوں پر پانی پھیر رہے ہیں۔ آخر ایسا کیوں کرتے ہیں جو اپنی خوشی کی خاطر دوسروں کی خوشی لوٹتے ہیں جو لوگ دوسروں کو خوش رکھنے کی خاطر غم کو اپناتے ہیں اصل میں وہ لوگ ہی انسانیت کا حسن ہیں۔

خیال آرائی: ظفر اقبال خان۔ کراچی

اگر تم نہ ہوتے

یہ یادیں کتنی ظالم ہوتی ہیں صرف ایک پل میں انسان کا رہا سہا سکون بھی برباد کر دیتی ہیں۔ کیا تھا اگر یہ اذیت ناک لمحے میرا مقدر نہ بنتے۔ پچھلے سال چار جون کے دن کی طرح یہ دن بھی گزر جاتا خبر نہیں خوشی کے لمحات اتنی جلدی کیوں بیت جاتے ہیں۔ اجنبی ابھی تو میں نے جی بھر کے تمہیں دیکھا ہی نہیں۔ اخباروں سے تراشی ہوئی ان تصویروں کو میں کب تک دیکھوں؟ تم مجسم حقیقت بن کر میرے سامنے کیوں نہیں آتے؟ تمہیں یہ خوف کیوں ہے کہ محبت میں صرف خسارہ ہی ملتا ہے تم محبت کی راہوں میں آنے سے ڈرتے کیوں ہو۔ اتنی حقیقت پسندی بھی اچھی نہیں ہوتی۔ کیا خبر تمہاری یہ حقیقت پسندی مجھے زندگی سے محروم کر دے۔ تمہیں خبر ہے نا کہ تمہاری یہ خاموشی مجھے اندر سے دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔ مگر اجنبی میں تم سے کیسے کوئی گلہ کروں اس میں تمہارا تو کوئی دوش نہیں۔ بس میرا پاگل پن ہی مجھ سے یہ حرکتیں کرواتا ہے تم تو میری اندھیری زندگی میں روشنی کی کرن ہو۔ اگر تم نہ ہوتے...... تو شاید رسموں رواجوں کی اس دوزخ میں میرا وجود کب کا جل کر خاکستر ہو چکا ہوتا تمہیں کیا خبر...... اجنبی......

خیال آرائی: ع۔س۔ا۔ قادر پورراں

سانچے

زندگی ہمیں بنے بنائے سانچوں میں ملی ہے۔ مہذب صرف اس کو کہا جاتا ہے جو ان سانچوں کے مطابق ڈھل کر زندگی گزار دے، جو ان کو توڑے یا باہر نکلنے کی کوشش کرے اسے دہشت گرد کہا جاتا ہے یا پھر ہیرو۔

خیال آرائی: خضر فرحان۔ کراچی

زندگی

زندگی ایسا پودا ہے جس پر کانٹے اگتے ہیں۔ انسان ان کانٹوں کو نکالتے ہوئے اپنی عمر گزار دیتا ہے لیکن ان کانٹوں سے آزاد نہیں ہو پاتا اگرچہ زندگی میں پھول بھی اگتے ہیں مگر یہ جلد مرجھا جاتے ہیں۔ انسان خوب صورت پھول چن کر ابھی ان سے پوری طرح لطف اندوز بھی نہیں ہو پاتا کہ غم کے کانٹے دوبارہ اگ آتے ہیں اور پھر انسان اس کانٹوں پر چل کر ایک حسین یادوں میں کھو جاتا ہے کیونکہ اس کی قسمت میں یہی لکھ دیا جاتا ہے۔

خیال آرائی: ایم ملک۔ کراچی

دل

سینے میں دل ہے دل میں درد ہے درد میں نشہ ہے نشہ میں مٹھاس ہے۔ مٹھاس میں تشنگی ہے تشنگی میں آرزو ہے آرزو میں حسرت ہے۔ حسرت میں امید ہے، امید میں یقین ہے یقین میں خیال ہے، خیال میں تصور ہے، تصور میں تو ہے تجھ میں ادا ہے ادا میں حیا ہے، حیا میں نزاکت ہے، نزاکت میں شوخی ہے، شوخی میں شرارت ہے، شرارت میں غصہ ہے، غصے میں بناوٹ ہے، بناوٹ میں اپنائیت ہے، اپنائیت میں چاہت ہے، چاہت میں خلوص ہے، خلوص میں پیار ہے، پیار میں عبادت ہے، عبادت میں خدا ہے، خدا سے دعا ہے، دعا میں قبولیت ہے، قبولیت میں تو ہی تو ہے۔

خیال آرائی: ثقلین حیدر۔ کراچی

دور کے ڈھول سہانے

یہ ایک حقیقت ہے کہ جو چیز ہمارے پاس ہوتی

ہے۔ ہم اس کی قدر نہیں کرتے اور جو چیز ہماری پہنچ سے دور ہوتی ہے۔ ہم اس کے پیچھے لپکتے ہیں۔ تعریف اور پسندیدگی کی عمر بہت مختصر ہوتی ہے۔ جس کے ہم مداح ہوتے ہیں۔ اس سے واقفیت بڑھنے اور اسے قریب سے دیکھنے کے بعد یہ جذبات بہت جلد ختم ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اپنے قریب کی چیز میں کشش محسوس نہیں ہوتی بلکہ دور کی چیز ہمیں حسین دکھائی دیتی ہے۔ قریب جا کر پتہ چلتا ہے کہ یہ فریب نظر تھا۔ سراب تھا' ستارے زمین پر کھڑے ہو کر دلکش لگتے ہیں مگر پاس جا کر پتہ چلتا ہے کہ بنجر تو ہیں سو ہیں مگر ان کی روشنی بھی چرائی ہوئی ہے۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔

خیال آرائی: شاہد سلیم۔ کچہ موڑ

یقین

آدمی اپنے ساتھ کئی خواہشات لئے پھرتا ہے۔ حد سے زیادہ توقعات باندھنا بھی اس کی فطرت میں شامل ہے۔ جب وہ کسی آدمی سے بہت بڑی توقعات باندھتا ہے تو اسے خود بھی پتا نہیں چلتا کہ وہ بہت بڑے دھوکے میں ہے اس کا اسے تب پتہ چلتا ہے جب کسی سے بندھی ہوئی خواہش چھناکے سے ٹوٹ کر دل کو ریزہ ریزہ کرتی ہوئی اسے بلندیوں سے پستی کی طرف اچھال دیتی ہے۔ تب اسے احساس ہوتا ہے کہ میں بڑی خود فریبی میں ہوں۔ آنسوؤں پر اختیار کس کا ہے۔ خود فریبی سے نکلنے کے بعد یہ آنسو بھی اس کی آنکھوں سے بڑی بے دردی سے بہتے ہوئے اس دردناک کہانی کو بھی اپنے ساتھ ہی بہا دینا چاہتے ہیں جو ایک انسان کی دوسرے انسان کے ساتھ اعتبار کی داستان تھی جب یہ کہانی ختم ہوئی تو دوسری شروع ہوئی۔ آدمی پھر سے اپنے اندر ایک نئی خواہش پالتا ہے جو اس کی ہر خواہش کا ملتا جلتا عکس ہوتی ہے۔ اب وہ اپنی ہر خواہش کو اپنے رب کے سپرد کرتا ہے اس امید کے ساتھ کے بندوں کے ساتھ کی توقعات سے دھوکا ملتا ہے لیکن وہ پاک ذات ہے جو مجھے کبھی بھی مایوس نہیں کرے گی پھر آدمی ایک نئی امید کے ساتھ چلتا ہے کہ اب وہ رد نہیں ہوگی اس کی ہر خواہش پوری ہوگی لیکن کیا اس دفعہ بھی خواہش راستے میں ہی گم ہوگئی۔ پتا بھی نہ چلا یہ کیا ہو گیا اس کی ذات تو رحمت ہے جس کے ہاتھ میں پوری کائنات ہے وہ تو اپنے بندوں سے ماں سے بھی زیادہ پیار کرتا ہے۔ ماں اپنے بچوں کو تکلیف نہیں دینا چاہتی تو پھر اس نے مجھے کیوں تکلیف دی۔ اب میں کسی سے کوئی امید نہیں رکھوں گا وہ انہی سوچوں کے سمندر میں غلطاں مایوسی کے اندھیروں میں ہوتا ہے تو پھر اچانک اسے احساس ہوتا ہے کہ جو ہوا صحیح ہوا جو وہ جانتا ہے وہ ہم نہیں جانتے۔ میرا رب واقعی میرا دوست ہے میرا محسن ہے جس کو میرے ماضی' حال اور مستقبل کا علم ہے۔ ہو سکتا ہے میری خواہش میرے لئے نقصان دہ ہو اس نے مجھے بڑی تکلیف سے بچانے کے لئے تھوڑی تکلیف دی ہو بچے اگر آگ سے کھیلنا چاہیں تو ماں انہیں روک لیتی ہے۔ بچے کو پتا نہیں ہوتا لیکن ماں جانتی ہے۔ آگ سے کھیلنا خطرناک ہے وہ اس کا رونا برداشت کر لیتی ہے لیکن اسے آگ سے کھیلنے نہیں دیتی۔ ہمارا رب بھی جانتا ہے کیا صحیح ہے کیا غلط وہ رونا بھی ہمارا برداشت کر لیتا ہے لیکن ہمیں آگ سے کھیلنے نہیں دیتا۔ وہ بھی ہماری ہر جائز خواہش کو پورا کرتا ہے اب میری ہر امید کا مرکز وہ ہے اس سے امیدیں باندھنا بھی آدمی کے ایمان کی دلیل ہے۔

خیال آرائی: راشد خواجہ۔ راولپنڈی

کاش ہم بھی پڑھے لکھے ہوتے

پچھلے کئی ہفتوں سے یہ گانا میری زبان سے خود بخود ادا ہو رہا ہے اور رہ رہ کر ہمیں اپنی اس کمزوری کا احساس ہو رہا ہے۔ اگر ہم پڑھے لکھے ہوتے پڑھے لکھے پنجاب کی طرح تو ہم بھی الیکشن میں اپنے رہنماؤں کے نام کا اشتہار گاڑی پر لکھ لیتے اور شہر بھر میں گشت کرتے۔ اگر ہمارا تعلق بھی پاکستان کے چند پڑھے لکھے گھرانے سے ہوتا تو ہم بھی اپنے پسندیدہ امیدوار کے نام پر ٹھپے پہ ٹھپے لگاتے ہم تو اپنی جاہلیت میں مارے گئے۔ صرف ایک مہر لگا کر پلٹ گئے۔ یہ تو بعد میں علم ہوا کہ پڑھے لکھے لوگ کئی

کئی نام لکھ کر ٹھپے لگا گئے۔ پڑھے لکھے ہونے کے بہت سے فوائد ہیں اگر ہمیں لکھنا آتا تو ہم بھی ایک ہی اخبار اور میگزین میں کئی کئی نام سے لکھتے۔ کئی کئی شناختی کارڈ بناتے ہم نے سنا تو ہے کہ انسان کی کئی شخصیات ہوتی ہیں۔ اندر سے کچھ باہر سے کچھ اور کئی روپ ہوتے ہیں مگر ہم ان پڑھ بھلا کیا جانیں' بڑے لوگ اپنی دیگر حیثیت کی بھی الگ شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنواتے ہیں۔ موبائل کی سم لگواتے ہیں۔ خیر جناب اب اس عمر میں اپنی اس کمزوری کا شدت سے احساس ہو رہا ہے۔

اگر ہمیں پڑھنا آتا تو ہم بھی بس میں آگے لکھے حصے میں چڑھتے جہاں بڑا بڑا لیڈیز لکھا ہوتا ہے مگر میں ان پڑھ کیا جانوں سارے مرد آگے کے دروازے پر لٹکے ہوتے ہیں۔ پڑھے لکھے ہونے کے بہت سے فائدے ہوتے ہیں۔ ہم الیکشن لڑ سکتے ہیں اور پڑھے لکھے دوستوں کی مدد سے جیت کر آئین اپنی مرضی سے لکھ سکتے ہیں ہمیں لکھنا آتا تو ہم بھی تاحیات رہائش' گاڑی اور دیگر سہولیات مفت لکھ لیتے۔ لکھنا آتا ہوتا تو ہم بھی روشن مستقبل کے لئے مستقبل کے معماروں کے اسکولوں کی چھٹیاں لکھ دیتے۔ لکھنا آتا ہوتا تو مخالفوں کے لئے دیواروں پر گالیاں لکھ دیتے۔

پڑھنا آتا ہوتا تو یہ گاڑی روکتے لال بتی کی روشنی پہ چلاتے Slow پر تیز کرتے ہارن پر ہاتھ رکھے گاڑی چلاتے مگر ہم پڑھ نہیں سکتے تو بس رک رک کر آہستہ آہستہ گاڑی چلاتے ہیں کیونکہ Sigh board پڑھنا جو نہیں آتا۔ اب اس سے زیادہ اپنی داستان الم کیا بیان کریں۔ اب افسوس کے علاوہ کیا رہ گیا کیا آپ بھی میری طرح ان پڑھ ہیں؟

خیال آرائی: ڈاکٹر کرن نورین۔ کراچی

تعارف قرآن

☆قرآن کے 30 سیپارے ہیں۔
☆کل 114 سورتیں ہیں۔
☆کل آیات 6666 ہیں۔
☆14 سجدے ہیں۔
☆558 رکوع ہیں۔
☆عرصہ نزول 23 سال ہے۔
☆اس میں بسم اللہ 113 مرتبہ آیا ہے۔

مرسلہ: نورین درآب خان۔ میر پور خاص

مہکتے گلاب

☆ محبت کا ایک لمحہ سو برس کی نفرت سے بہتر ہے۔
☆ جن لوگوں کے ذہن میں اچھے خیالات ہوں وہ کبھی تنہا نہیں ہوتے۔
☆ ہمیشہ مسکراتے رہو کیونکہ تمہاری مسکراہٹ کسی کے درد کا مداوا بن سکتی ہے۔
☆ زندگی ایک کشکول ہے جس میں مقدر کی خیرات ملتی ہے۔
☆ مور کے پاؤں بھی اس کے پروں کی طرح خوب صورت ہوتے تو وہ کبھی بھی زمین پر چلنا پسند نہ کرتا۔
☆ زبان تلوار نہیں لیکن قتل کر دیتی ہے زبان کا زخم تلوار کے زخم سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔

مرسلہ: اُم فروا۔ کراچی

انمول موتی

- اچھی کتاب سے اچھا کوئی دوست نہیں۔
- دوست کے دشمن کو اپنا دوست مت بناؤ ورنہ دوست بھی دشمن بن جائے گا۔
- خاموشی اختیار کرنا سب سے بڑی عبادت ہے۔
- تین چیزیں واپس نہیں آتی' والدین' حسن' جوانی۔
- صبر قسمت کے طوفان کے مقابلے کے لئے بہترین لشکر ہے۔
- ہر ہنسنے والا چہرہ دل سے خوش نہیں ہوتا۔
- ہر موڑ پر زندگی کی خوشی نہیں ملتی۔
- کسی کو پانے کی تمنا مت کرو بلکہ اپنے آپ کو اس قابل بناؤ کہ دنیا والے تمہیں پانے کی تمنا کریں۔

مرسلہ: عائشہ اشعر۔ کراچی

سنہری حروف

▫ زندگی ایک ایسی قیمتی چیز ہے جو قیمتی ہونے کے باوجود نہ تو خود خریدی جا سکتی ہے اور نہ ہی کسی کو بیچی جا سکتی ہے۔

▫ جو شخص آپ کو ہمیشہ دکھ پہنچائے اور پریشانی میں اضافے کا سبب بنا رہے اس سے تعلق توڑ دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔

▫ آنسو مسکراہٹ سے زیادہ اسپیشل ہوتے ہیں کیونکہ مسکراہٹ تو ہر ایک کے لئے ہوتی ہے مگر آنسو صرف ان کے لئے ہوتے ہیں جنہیں ہم کھونا نہیں چاہتے۔

▫ کبھی کبھی ہم دانستہ یا نادانستہ غلط راہوں پر نکل جاتے ہیں۔ کبھی تو خود کو آزمانے کے لئے اور کبھی دوسروں کو۔

▫ کچھ لوگوں کی خوشیاں پیڑ پر بیٹھے پرندوں کی مانند ہوتی ہیں۔ نہیں معلوم پرندہ کب اڑ جائے اور پیڑ کو داغ جدائی دے جائے۔

▫ محبت نہ ملے تو انسان جی لیتا ہے لیکن جسے وہ محبت سمجھتا ہے اگر وہ ہی شخص آپ کا مان نہ رکھے، تو انسان ایسے ٹوٹتا ہے کہ پھر ریزے بھی نہیں ملتے۔

▫ محبت بے سبب نہیں ہوتی، کبھی اس کا سبب انسان کی کوئی خواہش ہوتی ہے، کبھی کسی پر ترس کھا کر محبت کی جاتی ہے اور کبھی انسان محبت کی طلب میں محبت کرتا ہے۔

▫ انسان جب حد سے زیادہ خوش ہوتا ہے تو فطرت اس سے انتقام لیتی ہے اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔

▫ بعض ناموں کے ساتھ بہت سی یادیں وابستہ ہوتی ہیں مگر وہ وقت کی مجبوریوں کے ساتھ اس لئے زبان پر نہیں لائے جاتے کہ کہیں ان کے ساتھ کسی قسم کی گراوٹ نہ منسوب کر دی جائے۔

▫ خدا کی تلاش میں بھٹکنے کی کوئی ضرورت نہیں، دیکھنے کی نظر میں دیکھو خدا شہ رگ سے زیادہ قریب ملے گا۔

مرسلہ: رعنا تنویر۔ کراچی

کامیاب زندگی

☆ کسی پر تنقید کرنا یا اسے برا بھلا کہنا بے وقوفی ہے۔

☆ دوسرں کا محاسبہ نہ کرو ورنہ وہ تمہارا محاسبہ کریں گے۔

☆ میں کسی کی برائی نہیں کرتا بلکہ اس کی جو خوبیاں مجھے معلوم ہوتی ہیں بیان کرتا ہوں۔

☆ کسی شخص سے کام لینا چاہتے ہیں تو اس کی ضرورت کا ذکر کریں اور اسے یہ ضرورت پوری کرنے کا طریقہ بتائیں۔

☆ کامیابی کا راز بس یہی ہے کہ دوسروں کے نکتہ نظر کو سمجھا جائے۔

☆ جو شخص بے لوث خدمت کرتا ہے ہمیشہ فائدے میں رہتا ہے۔

☆ دنیا میں سب سے مشکلات اس شخص کو پیش آتی ہیں جو دوسرے لوگوں میں دلچسپی نہیں لیتا۔

☆ ہم میں سے ہر شخص اس کو پسند کرتا ہے جو اس کی تعریف کرے۔

☆ اگر آپ دوست بنانا چاہتے ہیں تو دوسروں کی خدمت کے لئے ہمیشہ تیار رہیں۔

☆ گھریلو زندگی میں مسکرانے کی عادت جادو کا سا اثر رکھتی ہے۔

☆ ہنس مکھ آدمی کو ہر کوئی خوش آمدید کہتا ہے۔

☆ لوگوں کا نام ان کے لئے سب سے میٹھی آواز ہے۔

مرسلہ: شرجیل اقدس۔ جیکب آباد

مسکراہٹ

کتنی عجیب بات ہے کہ دنیا میں سب سے سستی اور اچھی چیز مسکراہٹ ہے یہ مسکراہٹ کسی بھی وقت کسی کو دے سکتے ہیں لیکن نہیں دیتے مگر جب غرض یا کوئی مفاد ہو تو مسکراتے ہیں۔ ورنہ منہ پھیر کر گزر جاتے ہیں۔ اب تو انسان کی مسکراہٹ ڈالر سے بھی مہنگی ہے۔ اگر نہ ہوئی تو مونا لیزا کی مسکراہٹ تو ایک عجائب گھر سے چرا کر دوسرے عجائب گھر تک نہ پہنچایا

جاتا۔

مرسلہ: ساحل ابڑو۔ڈیرہ اللہ یار

لو بھئی اپنی پلیٹ لے جاؤ

کسی انگریز کا پاکستان کے کسی گاؤں سے گزر ہوا۔گاؤں والوں نے حسب روایت اس کی خوب آؤ بھگت کی اور ایک موٹی سی مکئی کی روٹی پر ساگ رکھ کر پیش کیا۔انگریز نے ساگ کھا کر روٹی واپس کرتے ہوئے کہا۔

''لو بھئی اپنی پلیٹ لے جاؤ۔''

مرسلہ: محمد اقبال۔کراچی

سمجھوتہ

ایک نوآموز شاعر نے ایڈیٹر سے شکوہ کیا۔

''آپ لوگوں نے شاعروں اور ادیبوں پر یہ پابندی کیوں لگا رکھی ہے کہ وہ کاغذ کے ایک ہی طرف لکھیں؟''

''یہ تو ہم نے حالات سے سمجھوتا کیا ہے۔'' ایڈیٹر نے گہری سانس لے کر کہا۔

''حالات سے سمجھوتا؟ کیا مطلب؟'' شاعر نے حیرت سے کہا۔

بعض لوگوں کے بارے میں تو یہ پابندی لگانے کو جی چاہتا ہے کہ وہ کاغذ کے کسی طرف بھی نہ لکھیں۔'' ایڈیٹر نے جواب دیا۔

شائستہ جبین جونیجو۔بورڑی خیر پور ناتھن شاہ

الو!

صحافی نے سیاست دان سے پوچھا۔''پچھلے سالوں میں آپ نے کیا تعمیری کام کیا؟''

''آپ میرے سالوں کو درمیان میں مت لائیں اور جہاں تک تعلق ہے تعمیری کاموں کا تو میں اپنی کوٹھی تعمیر کروا رہا ہوں۔''

''لیکن ہمارا خیال ہے کہ آپ کوٹھیاں نہیں الو بنا رہے ہیں۔'' صحافی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''ویسے الو بنانا اتنا آسان کام بھی نہیں ڈرائنگ ماسٹر مجھے ہمیشہ کہتے ''الو بناؤ'' مگر مجھ سے نہ بنتا تو غصے سے کہتے ''کبھی الو دیکھا ہے۔'' اور میں شرم سے ادھر ادھر دیکھنے لگتا تو کہتے ''ادھر ادھر کیا دیکھ رہے ہو۔میری طرف دیکھو۔''

مرسلہ: وقار چیمہ۔فیصل آباد

پریشانی

ایک دوست دوسرے دوست سے: ''یار آج کل میں تین بیویوں سے پریشان ہوں۔''

''تین بیویاں! مگر تمہاری تو شادی ہی نہیں ہوئی۔''

''مگر ہوئی ہے ایک میرے نانا کی' دوسری میرے دادا کی تیسری میرے پاپا کی' ابھی تینوں زندہ ہیں......''

مرسلہ: نور خان۔کوئٹہ

بزم آرائی

☆

بڑا کٹھن ہے راستہ جو آسکو تو ساتھ دو
یہ زندگی کا فاصلہ مٹا سکو تو ساتھ دو
بڑے فریب کھاؤ گے بڑے ستم اٹھاؤ گے
یہ عمر بھر کا ساتھ ہے نبھا سکو تو ساتھ دو
جو تم کہو یہ دل تو کیا میں جاں بھی کروں فدا
جو میں کہوں تو اک نظر ملا سکو تو ساتھ دو
رلا سکو تو ساتھ دو
ہنسا سکو تو ساتھ دو

مرسلہ: (قابل اجمیری) رجب علی۔حیدر آباد

☆

میں نے کہا شہر کے حق میں دعا کرو
اس نے کہا کہ بات غلط مت کیا کرو
میں نے کہا رات سے بجلی بھی بند ہے
اس نے کہا ہاتھ سے پنکھا جھلا کرو
میں نے کہا شہر میں پانی کا قحط ہے
اس نے کہا کہ پیپسی کولا پیا کرو
میں نے کہا کار ڈکیتوں نے چھین لی

اس نے کہا کہ اچھا ہے پیدل چلا کرو
میں نے کہا کہ کام ہے نہ کوئی کاروبار
اس نے کہا کہ شاعری پر اکتفا کرو
میں نے کہا کہ سوکی بھی گنتی نہیں ہے یاد
اس نے کہا کہ رات کو تارے گنا کرو
میں نے کہا غزل پڑھی جاتی نہیں صحیح
اسنے کہا کہ پہلے ریہرسل کیا کرو
میں نے کہا کہ کیسے کہی جاتی ہے غزل
اس نے کہا میری غزل گا دیا کرو
ہر بات پر جو میں کہتا رہا بجا بجا!
اس نے کہا یوں ہی مسلسل بجا کرو
(دلاور فگار)

مرسلہ: عبید سمیع۔کراچی

☆

ہجوم میں تھا وہ کھل کر نہ رو سکا ہوگا
مگر یقیں ہے کہ شب بھر نہ سو سکا ہوگا
وہ شخص جس کو سمجھنے میں مجھ کو عمر لگی
بچھڑ کے مجھ سے کسی کا نہ ہو سکا ہوگا
لرزتے ہاتھ' شکستہ سی ڈور سانسوں کی
وہ خشک پھول کہاں تک پرو سکا ہوگا
بہت اجاڑ تھے پاتال اس کی آنکھوں کے
وہ آنسوؤں سے نہ دامن بھگو سکا ہوگا
مرے لئے وہ قبیلے کو چھوڑ کر آتا
مجھے یقیں ہے یہ اس سے نہ ہو سکا ہوگا
(محسن نقوی)

مرسلہ: عائشہ اشعر۔کراچی

☆

اس کے نزدیک غم ترک وفا کچھ بھی نہیں
مطمئن ایسا ہے وہ جیسے ہوا کچھ بھی نہیں
اب تو ہاتھوں سے لکیریں بھی مٹی جاتی ہیں
اس کو کھو کر تو مرے پاس رہا کچھ بھی نہیں
کل بچھڑنا ہے تو پھر عہد وفا سوچ کے باندھ
ابھی آغاز محبت ہے گیا کچھ بھی نہیں
میں تو اس واسطے چپ ہوں کہ تماشا نہ بنے
تو سمجھتا ہے مجھے تجھ سے گلہ کچھ بھی نہیں
اے شمار آنکھیں اسی طرح بچھائے رکھنا
جانے کس وقت وہ آجائے پتہ کچھ بھی نہیں
(اختر شمار)

مرسلہ: سلیم احمد۔کراچی

☆

مولوی صاحب کی نیک بیوی کہتی ہے
سال کے بارہ مہینے رمضان ہونا چاہئے
بیگم کہتی ہے شاعری سے پیٹ بھرتا نہیں
گھر میں کچھ کھانے کا سامان ہونا چاہئے
اس کی یہ خواہش مجھے لے ڈوبے گی
سمندر کے بیچ میں مکان ہونا چاہئے

مرسلہ: دادا مشتاق جمالی۔حیدرآباد

☆

ہے اس کے گرد یہ محفل جو اک سوال میں چپ
لگی ہے اس کی بھی ایسے کسی خیال میں چپ
ہے ایک طرفہ تماشہ طبیعت عشاق
کبھی فراق میں باتیں کبھی وصال میں چپ
خبر ہے اس کو بہت وقت کے گزرنے کی
ہے حسن اپنے ہی اثر وہ لازوال میں چپ
نگر میں حسن بیاں جن کے بولنے سے تھا
ہوئے وہ اہل ہنر رنجش زوال میں چپ
بہت کلام گزشتہ میں کر چکے ہیں منیر
دکھائی دیتے ہیں جو ہم بیان حال میں چپ
(منیر نیازی)

مرسلہ: رضوانہ کوثر۔لاہور

☆

نظم

معاف کر دینا میری جاں کہا سنا میرا
یہ رات آخری تھی جو آخر شب تک
گزار دی تیرے پہلو میں جاگ کر میں نے

چنے ہیں خواب خیالوں میں رات بھر میں نے
مگر یہ خواب نہیں فیصلے کہوان کو
کہ جو بھی خواب ہے اک فیصلے کا حامل ہے
کسی سے آپ ہی ہو جائے جب پرے کوئی
تو پھر بتاؤ ایسے میں کیا کرے کوئی
جیے تو کس کے لئے کس لئے مرے کوئی
پرائے درد کے زخموں میں کیا بھرے کوئی
کہ زخم عشق ہیں اور عشق ایک منزل ہے
کہیں سکون نہیں دھوپ میں نہ چھاؤں میں
نہ ہی خلوص کی خوشبو ہے اب وفاؤں میں
یقین رکھ کے محبت کی انتہاؤں میں
میں جا رہا ہوں بہت دوران فضاؤں میں
جہاں سے لوٹ کر آنا بہت ہی مشکل ہے
یہ ٹھیک ہے میرے پاس زر نہیں کوئی
درست ہے میرا اپنا گھر نہیں کوئی
بجا کہا میرا در و سر نہیں کوئی
میری نواؤں میں پنہاں اثر نہیں کوئی
مگر وفا کا شجر اتنا بے ثمر بھی نہیں
مجھے خبر ہے تو اتنا بے خبر بھی نہیں
کہ تیرا قرب سمندر نہیں ہے ساحل ہے
معاف کرنا میری جاں کہا سنا میرا

مرسلہ: عطا الرحمٰن۔ کراچی

نظم

خوشی کے ایک خواب سے نکلتا ہوں
دکھ کے ایک خواب میں آ پڑتا ہوں
یہیں کہیں
اپنی بہت ساری تعبیریں گم کر بیٹھا ہوں
تعبیریں چاہے اچھی نہ بھی ہوں
ان کو کھو دینا
یا گم کر بیٹھنا
یا حاصل نہ کر پانا
دکھ کے خواب سے بھی زیادہ دکھ دینے والی بات ہے
خوشی کے ہر موڑ پر یہی سمجھتا ہوں
میں دکھ سے بھاگ آیا ہوں
اگر تم کو اب ہو تو خوشی کے بھی ہو
اور دکھ کے بھی
اور اگر تعبیر ہو
تو پھر مل کیوں گئے ہو
ہو سکتا ہے یہ میری خوش فہمی ہو
اور میں ملتے اور پا لینے کے
فرق کو سمجھ نہ پایا ہوں

(فرحت عباس شاہ)

مرسلہ: سید فیضان عثمانی۔ حیدر آباد

نظم

وہ چنچل الھڑ لڑکی میری نظمیں یوں پڑھتی ہے
جیسے ان نظموں کا محور
اس کی اپنی ذات نہیں ہے
(یعنی اتنی سندر لڑکی اور کوئی بھی ہو سکتی ہے)
جیسے اس کو علم نہیں یہ ساری باتیں، اس کی ہیں
ساری گھاتیں اس کی ہیں
ہر آہٹ ہے اس کی آہٹ، سب سائے ہیں اس کے سائے
سارے عمل اس کے ہیں
ہر خوشبو اس کی خوشبو، سب چہرے ہیں اس کے چہرے
سارے آنچل اس کے ہیں
جیسے اس کو علم نہیں ہے اسی لڑکی کے سارے کام
سارے نام اسی کے ہیں
ہر کھڑکی ہے اس کی کھڑکی سارے بام اسی کے ہیں
اس لڑکی کے نام سے میں نے جو کچھ اپنے نام لکھا ہے
اسی سے ہی منسوب ہوا ہے
(شاید میرا وہم ہو لیکن میں نے محسوس کیا ہے)
جب میں نظم سناتا ہوں وہ آنکھ چرانے لگتی ہے
مجھ سے نظریں مل جائیں تو وہ شرمانے لگتی ہے
کچھ لمحے وہ چنچل لڑکی گم صم سی ہو جاتی ہے
لیکن تھوڑی دیر میں پھر سے پتھر کی ہو جاتی ہے
جیسے میری نظم کی لڑکی

(امجد اسلام امجد)

مرسلہ: ارم آغا۔ کوئٹہ

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کردینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ 300/= روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات تو کین منی 300/= روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)......مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)......منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)......اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

88-C II۔ خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

□ زاہدہ۔ گجرات۔

o پیارے بابا جی! السلام علیکم! میری بہن جس کی عمر 40 سال ہے' وہ شادی شدہ ہے' رات میں سو کر جب صبح اٹھتی ہے تو بستر سے اٹھا نہیں جاتا۔ اُس کا وزن زیادہ ہے اور روز بہ روز بڑھتا جارہا ہے۔ پیٹ اور کولہے کا حصہ بہت زیادہ موٹا ہے۔ میری بہن بے چاری بہت پریشان ہے۔ اُس نے مجھ سے کہا ہے کہ میں آپ کو لکھ کر بھیجوں۔ اُس کے جسم میں چربی بہت ہے۔ میری بہن کی ساس بھی بہت زیادہ بیمار ہیں لیکن میری بہن اپنی جسمانی بیماری کی وجہ سے بہت مشکل محسوس کررہی ہے۔ بابا جی! آپ میری بہن کے لیے دُعا کریں اور دوا بھی ضرور بتائیں تاکہ میری بہن کو شفا ہو جائے۔

☆ بیٹی زاہدہ! اللہ تمہیں مکمل صحت عطا فرمائے۔ جسم میں درد وزن بڑھنے کی وجہ سے ہے۔ مناسب ہوگا غذا متوازن لے اور یاشافعی کا بہت وِرد کرو۔ انشاء اللہ' مکمل افاقہ ہوگا۔ آئندہ خط جوابی لفافے کے ہمراہ لکھنا تاکہ تفصیل بتائی جاسکے۔

□ نعمان۔ پنڈی۔

o یابا جی! السلام علیکم! کے بعد عرض ہے کہ آپ اللہ کے فضل و کرم سے خیریت سے ہوں گے۔ میرے بہت سے مسائل ہیں جو میں بیان نہیں کرسکتا لیکن اِن میں دو بہت اہم مسائل ہیں جو آپ سے بیان کررہا ہوں۔ اِن کا جواب علیحدہ علیحدہ دیجیے گا۔ پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ میں اللہ کے فضل و کرم سے حافظِ قرآن ہوں لیکن میں صحیح رَوانی کے ساتھ نہیں پڑھ سکتا۔ بابا جی! میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں' میرے باپ اور میرے چچا حج کے لیے چلے جائیں۔ پیسے کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ اِس کے لیے بھی کوئی وظیفہ بتادیں۔ آپ استخارہ کرکے بتائیں کہ میرے لیے جگہ کا بندوبست ہوجائے گا کہ نہیں؟ میں آپ کے جواب کا انتظار کروں گا۔

☆ بیٹے نعمان! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی کے ساتھ روزانہ سورۃ یٰسین کی باآوازِ بلند تلاوت کیا کرو۔ والد سے کہو' اللہ سے دُعا کیا کریں کہ وہ اپنے گھر ضرور بلائے۔

□ صوفیہ۔ گوجرانوالہ۔

o بابا جی! آداب! میں کافی عرصے بعد آپ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہورہی ہوں۔ بابا جی! اَب سے چار سال پہلے میرے شوہر نے قرض لے کر پلاسٹک مولڈنگ کی مشین خریدی تھی' ایک سال تک تو کاروبار چلا مگر اُس کے بعد سے مشین بالکل بند پڑی ہے۔ گھر میں بہت پریشانی ہے۔ آپ کے وظیفے کی برکت سے میرے شوہر کو بنک سے لون ملا اور انہوں نے جگہ کرائے پر لے کر مشین سیٹ کرلی مگر ابھی تک

اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: C II-88۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 35893122 - 35893121-021

کام شروع نہیں ہوا۔ کوئی نہ کوئی رکاوٹ آجاتی ہے۔ میں بہت پریشانی میں آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ شوہر الگ پریشان ہیں۔ گھر میں ہر وقت لڑائی جھگڑا رہتا ہے۔ برائے مہربانی آپ استخارہ نکال کر بتائیں کہ شوہر کا یہ کام ٹھیک ہے اور کسی نے کچھ کروایا تو نہیں ہے؟ کیونکہ ہمارے گھر میں بہت سکون اور محبت تھی مگر دو تین سال سے پتا نہیں کیا ہوگیا؟ برائے مہربانی جولائی کے شمارے میں مجھے جواب دے دیں کہ گھر اور کاروبار میں برکت ہو اور قرض جیسی لعنت سے نجات مل جائے۔ میرے شوہر بہت پریشان ہیں۔ بچے الگ خاموش رہتے ہیں۔ میرے شوہر کے کاروبار میں برکت کے لیے خصوصی دُعا کروائیں۔

☆ بیٹی صوفیہ! اللہ تمہارے مالی مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی کے ساتھ وظیفہ جاری رکھو اور مدت پوری ہونے پر وظیفہ ترک مت کیا کرو بلکہ جاری رکھتے ہوئے مجھے مطلع کیا کرو۔ کچھ نہ کچھ رقم ضرور خیرات کیا کرو۔ اللہ ضرور اپنا کرم فرمائے گا۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ شاہد۔ حب

○ پیارے بابا جان! السلامُ علیکم! کے بعد عرض ہے کہ میرا نام زین ہے اور میرا شہر گوادر ہے۔ بابا جان! عرصۂ دراز سے میں ایک لڑکی سے محبت کرتا ہوں لیکن بابا جان! وہ میری کسی بات کا جواب نہیں دیتی۔ جب بھی بولتا ہوں تو گھر کے اندر بھاگ جاتی ہے۔ بابا جان! ''سچی کہانیاں'' میں آپ کا کالم پڑھا تو سوچا کہ اِس سلسلے میں آپ سے راہنمائی حاصل کی جائے۔ بابا جان! پلیز' میری مدد فرمائیں اور استخارہ کرکے مجھے بتائیں کہ یہ کام میرے لیے نقصان دہ ہے یا فائدہ مند؟ اُس کے بعد میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا اور بابا جان! اللہ آپ کو اپنی حفظ واَمان میں رکھے اور آپ اِسی طرح لوگوں کے مسئلے حل کرتے ہیں۔

☆ بیٹے شاہد! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ بیٹے......! اگر تم واقعی میں اس بچی سے مخلص ہو تو اپنے والدین کو اس کے گھر بھیج دو' یہی سب سے بہتر طریقہ ہے۔

□ ثمینہ جمیل۔ کراچی

☆ بیٹی! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ تمہارے شوہر درست کہتے ہیں مگر بیٹی! والدین بہت قیمتی سرمایہ ہیں۔ تم اُن سے ملنے ضرور جایا کرو اور کھڑے کھڑے جایا کرو۔ شوہر کو ساتھ مت لے جاؤ۔ بیٹی! والدین کی خبر گیری کرنا تمہارا فرض ہے۔ بھائی یا بھاوج کے رویے کی وجہ سے جانا ترک مت کرو تاکہ زندگی میں تمہیں ہمیشہ اطمینانِ قلب رہے۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 71-71 بار سورۃ فاتحہ پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ رابعہ۔ بورے والا

☆ بیٹی رابعہ! بڑا دُکھ اور افسوس ہوتا ہے جب مسلمان گھروں کے افراد اُلٹے سیدھے عملیات کروانے والوں کے پاس جاتے ہیں۔ یہ ایمان کی شدید کمزوری ہے اور یاد رکھو' اللہ کے ہاں بھی اِس کی معافی نہیں۔ پریشانی' خوشی' بیماری' صحت سب خدا کی طرف سے ہے۔ خوشی میں شاکر رہنا اور پریشانی میں صابر رہنا ہی ایک مومن کا فرض ہے۔ اللہ سے خوب معافی مانگو۔ حسبِ استطاعت صدقہ خیرات نکالو اور ہر نماز کے بعد الحمد شریف' چاروں قُل اور آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر ضرور دَم کیا کرو۔ مجھے ایک ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کرو۔

□ ساجدہ۔ سیالکوٹ

☆ بیٹی ساجدہ! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ

فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ میرا مقصد تمہیں پریشان کرنا نہیں ہے مگر بیٹی! کچھ باتوں کا جاننا بہت ضروری ہے۔ میرے اندازے کے مطابق بیٹی! تمہارے گھر پر اثرات ہیں جو تم لوگوں کو کافی پریشان کرسکتے ہیں اور تمہاری خوشیوں میں رکاوٹ بھی ڈال سکتے ہیں لہٰذا بہتر یہی ہوگا کہ جلد از جلد دونوں مسئلوں کے لیے مجھ سے تعویذ منگوالو۔ جب تک تعویذ تیار نہیں ہوتے' روز بعد نمازِ عشاء ایک بار سورۃ جن ضرور پڑھو۔ خط جوابی لفافے کے ہمراہ لکھو۔

☐ رافعہ۔ حیدرآباد

☆ بیٹی رافعہ! تم نے ایک خط میں کئی مسئلے لکھ دیئے ہیں۔ بہرحال بہنوں سے کہو' شادی کے لیے بعد نمازِ فجر ایک بار سورۃ اَحزاب پڑھیں۔ رزق میں برکت کے لیے سورۃ واقعہ پڑھنا بہت بابرکت ہے۔ جہاں تک بھائی کا تعلق ہے تو بھاوج سے کہو' نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 11-11 بار آیت الکرسی پڑھ کر تصور میں شوہر پر دَم کردیا کرے۔ انشاء اللہ' ضرور کرم ہوگا۔ مدت 41 دن ہے۔

☐ فریدہ۔ لیہ

☆ بیٹی فریدہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بعد نمازِ فجر ایک بار سورۃ مزمل پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ بیٹی! تمہارے خواب نشاندہی کرتے ہیں کہ کوئی بہت قریبی شخص تم لوگوں کو پریشان کرکے خوش ہوتا ہے۔ خوب صدقہ خیرات کیا کرو۔ چلتے پھرتے گھر کے سارے افراد یَارَحمٰن کا وِرد کریں۔ اللہ حامی وناصر ہو۔

☐ فضا بتول۔ کراچی

☆ بیٹی فضا! اللہ تمہیں مکمل شفا عطا فرمائے۔ دل میں وہم مت لاؤ۔ کچھ نہ کچھ رقم اپنے اوپر سے ضرور خیرات کیا کرو۔ جہاں تک بچی کا تعلق ہے تو تم لوگ معاملات میں خاموشی رکھو۔ کوئی فیصلہ بھی جلدبازی میں مت کرنا۔ مجھے 21 روز بعد صورتِ حال سے آگاہ کرو۔

☐ سیما۔ حیدرآباد۔

☆ بیٹی سیما! نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ مائدہ پڑھو اور دُعا کرو۔ یہی عمل بعد نمازِ عشاء کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ انشاء اللہ' ضرور حالات میں مثبت تبدیلی آئے گی۔

☐ سبین۔ کوئٹہ

☆ بیٹی سبین! اللہ پر بھروسا رکھو۔ وظیفہ کرنے سے تبدیلی تو آئی ہے اور یہی مثبت تبدیلی ہے۔ انشاء اللہ' جلد کرم ہوگا۔ والدہ کی صحت اور تندرستی کے لیے دُعا گو رہو۔ بے شک ماں دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ وظیفہ مزید ایک ماہ جاری رکھو۔

☐ منصور احمد۔ میرپورخاص

☆ بیٹے منصور! تمہیں براہِ راست بھی جواب دیا ہے اور کالم کے ذریعے بھی جواب دے رہا ہوں۔ یقیناً تمہارے حالات بہت تکلیف دہ ہیں۔ ماں باپ کے سامنے اولاد دم توڑ دے' صرف اِس لیے کہ علاج نہ ہوسکے کہ پیسا نہ ہو' بہت تکلیف دہ بات ہے۔ جہاں لوگ روزانہ ہزاروں روپے ضائع کردیتے ہیں' وہاں ایسے بھی لوگ ہیں جو اولاد کا علاج ہی نہیں کرواسکتے۔ بہرحال بیٹے! دنیا میں ابھی اچھے لوگ باقی ہیں۔ تم اللہ سے مدد مانگتے رہو۔ بیٹے! میں جو بھی ہوسکا' وہ ضرور کروں گا۔

☐ راحت۔ ساہیوال۔

☆ بیٹی راحت! حالات اتنے سہل نہیں جتنے تمہیں نظر آرہے ہیں۔ بہتر یہی ہوگا کہ مجھ سے تعویذ منگوالو۔ تفصیل کے لیے جوابی لفافہ ضرور اِرسال کرنا۔

□ م۔کراچی۔

o باباجی! السلامُ علیکم! میرا نام ''م'' سے شروع ہوتا ہے۔میری والدہ کا نام ہوا ہے اور میری عمر 18 سال ہے۔باباجی! دو سال ہوئے' مجھے نزلے کی شکایت ہے۔میں نے ناک کی ہڈی کا آپریشن بھی کروایا اور اَب ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ الرجی ہوگئی ہے اور نزلہ کبھی ٹھیک نہیں ہوگا۔باباجی! مہربانی فرما کر مجھے حل بتایئے' میں بہت پریشان ہوں۔باباجی! میں نے نزلے کی وجہ سے پڑھائی بھی چھوڑ دی ہے اور صرف قرآنِ پاک ابھی پڑھ رہی ہوں۔ پلیز باباجی! مجھے جولائی کے شمارے میں جواب دیں۔

☆ بیٹی......! اللہ تمہیں مکمل شفا دے۔نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔روزانہ رات کو سونے سے قبل ایک بڑے برتن میں کھولتا ہوا پانی لو اور اُس میں خوب سارا نمک ملا کر بھاپ لو۔یہ عمل 7-8 منٹ روز کرو۔نہار منہ ادرک کے لمبے لمبے ٹکڑے نمک کے ساتھ توے پر بھون لو اور یہ 3-4 ٹکڑے بسم اللہ پڑھ کر کھالو۔انشاء اللہ' افاقہ ہوگا۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔

□ ریاض خان۔پشاور۔

o پیارے باباجی! السلامُ علیکم! امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ آپ جیسے اچھے لوگوں کا سایہ اللہ پاک ہمارے سر پر بہت دیر تک رکھے۔ باباجی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں پڑھائی میں بہت کمزور ہوں۔مجھے کوئی آسان وظیفہ دیں کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکوں۔ پیارے بابا! میرے لیے دُعا کرنا۔

☆ بیٹے ریاض......! اللہ تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 7-7 تسبیح رَبِّ زِدنی علماً کی پڑھو اور دُعا کرو۔نہار منہ چھے سات بادام ضرور کھایا کرو۔مدت 41 روز ہے۔

□ علن۔دادو۔

o باباجی! السلامُ علیکم! امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔میرا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے' وہ یہ کہ میری بس ایک بیٹی کے سوا کوئی اولاد نہیں۔ میں پڑھا لکھا نہیں ہوں اور یہ خط میں کسی دوسرے سے لکھوا رہا ہوں جب سنا کہ آپ ''سچی کہانیاں'' میں لوگوں کے مسئلے حل کرتے ہیں تو سوچا' میں بھی اپنا مسئلہ آپ کو بتا دوں۔میری شادی کو بہت عرصہ ہو چکا ہے۔آپ ہم پر احسان کرکے تعویذ دیں کہ بیٹا ہو جائے اور ہم کو یہ بھی بتائیں کہ آپ سے تعویذ کیسے حاصل کریں؟ ہم کو تو آپ کا ایڈریس بھی معلوم نہیں۔بس آپ اپنے کرم سے ہمیں کوئی آسان وظیفہ بتائیں اور ایک تعویذ بھی دیں کہ ہمارا مسئلہ حل ہو جائے' بس آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔میں آپ کو ہمیشہ دُعائیں دیتا رہوں گا۔

☆ بیٹے علن......! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔تم مجھے جوابی لفافے پر واضح پتا لکھ کر خط اِرسال کرو تاکہ میں تمہیں تعویذ لینے کا طریقہ بتا سکوں۔خط میں اپنا نام مع والدہ اور بیوی کا بھی مکمل نام لکھو۔

□ روزینہ۔حیدرآباد

o پیارے باباجی! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور زندگی دے۔باباجی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے پتّے میں پتھری ہے۔ہومیوپیتھک علاج کروا رہی ہوں۔ میں آپریشن نہیں کروانا چاہتی۔میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔آپ کوئی ایسا وِرد یا وظیفہ دیں جس کو پڑھنے سے بغیر آپریشن کے پتھری ریزہ ریزہ ہوکر پتّے سے نکل جائے۔ وظیفہ وغیرہ کتنے دن پڑھنا ہے اور کتنی مرتبہ' سارا تفصیل سے لکھ دیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔باباجی! میری بڑی بہن

کا بھی یہی مسئلہ ہے۔ وہ بھی آپریشن کروانا نہیں چاہتی۔ اُس کے لیے بھی کوئی وظیفہ بتا دیں کہ بغیر آپریشن کے پتّے سے پتھری نکل جائے۔ ساری عمر آپ کو دُعائیں دیں گے۔

☆بیٹی روزینہ! اللہ تمہیں مکمل شفا عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ دن میں جس وقت سہولت ہو' ہزار بار یَاشَافِیُ پڑھ کر پانی کی بڑی بوتل پر دَم کرو اور پھر یہ پانی دن بھر پیتی رہو۔ دن بھر میں تمہارے کم از کم دس گلاس پانی کے ہونا چاہئیں۔ یہ عمل 14 دن کرو پھر مجھے حالات سے مطلع کرو۔ بہن سے کہو' وہ بھی یہی عمل کرے۔

□ انیلا خان۔ بلوچستان۔

o محترم بابا جی! السلامُ علیکم! میں نے آپ کا بہت نام سنا ہے۔ بابا جی! جس طرح آپ انسانیت کی خدمت کرتے ہیں' اِس کا اجر اللہ آپ کو دونوں جہاں میں دے۔ بابا جی! ہم بھی آج ایک مسئلہ لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ وہ مسئلہ میرے کزن کا ہے۔ بابا جی! کچھ عرصے پہلے اُس نے کاروبار شروع کیا جو بہت اچھا چل رہا تھا مگر اَب بالکل نہیں چل رہا۔ وہ بہت پریشان ہے کیونکہ اُس کا سارا سرمایہ اِس کاروبار میں لگا ہوا ہے۔ بابا جی! آپ ہمیں ایسا وظیفہ دیں جس کے کرنے سے کاروبار بہت ترقی کرے۔ ہم آپ کو تمام عمر دُعائیں دیں گے۔ آپ نے اس سلسلے میں ایک بہن ساجدہ کو جو وظیفہ دیا تھا' میں وہ وظیفہ کرنا چاہتی ہوں۔ وہ وظیفہ کرنے کی بھی اجازت دیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی' شکریہ۔ اللہ حافظ! اگر کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف فرمائیں۔

☆بیٹی انیلا......! وظیفے کی اجازت ہے' بس خیال رہے' نماز قضا نہ ہو۔ وظیفہ مکمل ہونے پر کچھ رقم ضرور خیرات کر دینا۔

□ راحیلہ ذاکر۔ پشاور۔

o بابا جی! آداب! بابا جی! میں اپنے دیور کی شادی اپنی بہن سے کرنا چاہتی ہوں۔ استخارہ کر کے بتائیں کہ یہ رشتہ کیسا رہے گا اور اُن کی اَزدواجی زندگی کیسی گزرے گی اور اُن کی شادی کا میری زندگی پر کوئی منفی اَثر تو نہیں پڑے گا؟

☆بیٹی راحیلہ......! استخارہ حق میں ہے۔ تمہاری زندگی پر کوئی منفی اَثر نہیں پڑے گا۔ جب تک تم یہ نہیں سوچوگی کہ تم نے اپنی بہن پر احسان کیا ہے اور اُس کو اُس کا بدلہ دینا چاہیے۔ کسی سے کوئی امید مت رکھنا۔ سب خیر رہے گی۔

□ نسرین۔ سبی۔

o محترم بابا جی! السلامُ علیکم! سدا خوش رہیں! میرا مسئلہ یہ ہے کہ تقریباً ایک سال پہلے میری شادی ہوئی تھی لیکن شوہر پتا نہیں کس مزاج کا ہے کہ میں اُسے سمجھ نہیں سکی۔ میں تو اُس سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہوں اور یہ مجھ میں ذرا بھی دلچسپی نہیں لیتا' نہ ہی خود سے کوئی بات کرتا ہے۔ میں کروں تو جواب دے گا ورنہ نہیں۔ جیب خرچ کے نام پر ایک روپیا نہیں دیتا۔ میری ضرورت میری امی پوری کرتی ہیں۔ میں چاہتی ہوں' یہ بھی مجھ سے محبت کرے' میری ہر بات مانے اور میرے بغیر ایک منٹ نہ رہے۔ اَب میں پانچ مہینے سے اپنے میکے میں ہوں لیکن یہ فون تک نہیں کرتا۔ ملنا تو بہت دور کی بات ہے' بہن طعنے دیتی ہے کہ پتا نہیں' کب اپنے گھر جائے گی؟ بابا جی! میں بہت بے زار ہوں' خودکشی حرام نہ ہوتی تو اَب تک کر چکی ہوتی۔ پیارے بابا جی! کوئی ایسا عمل بتائیں کہ یہ میرے بغیر رہ نہ سکے اور اپنی غلطی تسلیم کر کے مجھے لے جائے۔

☆بیٹی نسرین......! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد 3 تسبیح

سورۃ الناس کی پڑھ کر اپنے اوپر دَم کرلیا کرو۔ شوہر سے ضرورت کے تحت بات کرو مگر اپنے فرائض خوش اسلوبی سے پورے کرو۔ تمہیں خود اپنے سُسرال چلے جانا چاہیے۔ اپنے شوہر کو بلوالو اور اپنے گھر چلی جاؤ۔ ساتھ رہو گی' خیال کرو گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا ورنہ شوہر کو تمہارے بغیر رہنے کی عادت ہو جائے گی۔ بیٹی......! سمجھداری سے چلو' گھر بنانا بہت مشکل ہے اور ٹوٹنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگتا۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔

□ نصرت جہاں۔ کراچی۔

o باباجی! بہت عرصے سے آپ کا کالم پڑھ رہی ہوں مگر خط لکھنے کی جسارت پہلی بار کر رہی ہوں۔ باباجی! مسئلہ ہی کچھ بہت سنگین ہے۔ میں نے آج تک کوئی بھی اچھا کام نہیں کیا۔ دنیا کا ہر قبیح اور گناہ کا کام کیا۔ اِس وقت میری عمر 45 سال ہے۔ تین مہینے قبل میرے جسم پر جگہ جگہ پھوڑے بننا شروع ہو گئے جن میں سے پیپ رِستی رہتی ہے۔ میں نے فیصل آباد سے لے کر اسلام آباد تک تمام ڈاکٹروں کو دکھا دیا مگر کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔ علاج کروانے سے تکلیف 100 گنا بڑھ جاتی ہے۔ باباجی! میں جانتی ہوں' یہ میرے اعمال کا صلہ ہے' مجھے دنیا کے لیے عبرت بنا دیا گیا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میرے گناہ بہت بڑے ہیں مگر باباجی! میں دل سے شرمندہ ہوں اور تائب ہونا چاہتی ہوں۔ لوگ مجھ سے کتراتے ہیں' بچے مجھے دیکھ کر ڈر جاتے ہیں۔ میرے کھانے پینے کے برتن الگ کر دیئے گئے ہیں۔ گھر سے باہر کچا کمرا بنا کر دے دیا ہے جس میں' میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں۔ آپ اللہ کے نیک بندے ہیں' میری مدد کریں۔ کسی طرح اللہ مجھے معاف کر دے' مجھے لوگوں کی' اُن کے رویوں کی کوئی پروا نہیں' بس میری سزا معاف ہو جائے۔

☆ بیٹی نصرت! اَب توبہ کا وقت گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ بندے کو بہت موقع دیتا ہے مگر بندہ بہت نافرمان ہے۔ تمہارے گناہ بہت بڑے ہیں' انسان ہونے کے ناتے میں تمہیں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ توبہ کرتی رہو' شاید وہ پاک ذات معاف کر دے۔ تمہارے پھوڑوں میں جو کیڑے پڑ گئے ہیں' اُن سے گِھن مت کھاؤ۔ وہ عذابِ الٰہی ہے۔ کاش بیٹی......! تم نے اپنے برائی کی طرف بڑھتے ہوئے قدم روک لیے ہوتے۔ کاش......! یہ جان لیا ہوتا کہ یہ زندگی بہت مختصر ہے۔ اصل زندگی تو بعد میں شروع ہو گی۔ بہرحال میں تمہارے لیے صرف یہی دُعا کر سکتا ہوں کہ اللہ تم پر اپنا رحم فرمائے۔

□ اسما راشد۔ بھوال۔

o باباجان! میرا مسئلہ حل کر دیں' میں آپ کی بہت شکر گزار رہوں گی۔ میری شادی کو 8 سال ہو چکے ہیں اور اَب تک اولاد سے محروم ہوں۔ لوگوں کے رویے اَب مجھے بہت دکھ دیتے ہیں۔ آپ نے میری جیٹھانی کو تعویذ دیا تھا' اُن کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی۔ اَب پھر انہوں نے آپ سے تعویذ منگوایا۔ باباجی! پلیز' مجھے بھی تعویذ تیار کر دیں تاکہ میری بھی اولاد ہو سکے۔ یہ آپ کا مجھ پر احسان ہوگا۔ مجھے طریقۂ کار سب پتا ہے مگر میری جیٹھانی نے کہا' آپ ہر ایک کو تعویذ نہیں دیتے لٰہذا پہلے اجازت لے لو۔ باباجی! میں بھی آپ کی بیٹی ہوں' میری بھی مشکل حل کر دیں تاکہ میں اپنے سُسرال میں خوش و خرم رہ سکوں۔

☆ بسمہ اسما......! اللہ سے مدد مانگو' وہ ضرور تمہاری دُعا قبول فرمائے گا۔ میں تعویذ تیار کر دوں گا' بس خیال رکھنا' تعویذ استعمال کرنے کا بھی خاص طریقہ ہے۔ اِس پر عمل لازمی ہے۔ انشاء اللہ' کلامِ

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آئیے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

الٰہی کی برکت سے ضرور کرم ہوگا۔ خط میں مکمل کوائف اِرسال کرنا۔

□ نوشین ظفر۔شاہدرہ۔

o بابا جی! میں بہت بدنصیب عورت ہوں۔ پہلی شادی بھی اپنی مرضی سے کی اور ایک بچے کے بعد طلاق ہوگئی۔ گھر میں بھائی بھاوج کا رویہ بہت خراب تھا اِس لیے میں نے دوبارہ اپنی مرضی سے دوسری شادی کرلی۔ میرے دوسرے شوہر کے پہلے سے دو بچے تھے اور اُن کی پہلی بیوی اُن کی کزن بھی تھیں۔ شروع میں تو سب ٹھیک رہا لیکن اَب اُن کا رویہ مجھ سے بہت خراب ہورہا ہے۔ میرے بیٹے کو تو بالکل بھی برداشت نہیں کرتے۔ میرے دو بچے اُن سے بھی ہیں' اُن کو بھی وہ پیار نہیں ملتا جو اُن کا حق ہے۔ ساری توجہ پہلی اولاد کی طرف ہے۔ میں کچھ بولتی ہوں تو لڑنے مرنے لگتے ہیں' بہت برا بھلا کہتے ہیں۔ بابا جی! میں بہت غریب گھر سے ہوں' پلٹ کر واپس بھی نہیں جاسکتی۔ اَب تو تین بچوں کا ساتھ ہے۔ بابا جی! میں چاہتی ہوں' میرے شوہر ہم لوگوں سے محبت کریں اور کم از کم ایک گھر میرے نام کر دیں۔ وہ بہت پیسے والے ہیں' مجھے کم از کم ایک آسرا ہی ہوجائے۔ بابا جی! آپ نے بہت سے لوگوں کے مسائل حل کیے ہیں' میرا مسئلہ بھی حل کردیں' میں اور میرے بچے بھی آپ کو دُعائیں دیں گے۔

☆ بیٹی نوشین! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بعض اوقات انسان ایک کے بعد ایک غلطیاں کرتا چلا جاتا ہے۔ بہرحال جو ہوا' سو ہوا' اَب تم نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین پڑھو اور دُعا کرو۔ خیال رہے' جہاں جہاں لفظ "یٰسین" آئے' وہاں رک کر 7 بار سورۃ فاتحہ پڑھو پھر دُعا کرو۔ معاملات میں خاموشی رکھو۔ اللہ سب بہتر کرے گا۔

مجھے 41 دن بعد مطلع کرو۔

□ راحیل۔پنڈی

o بابا جی! میں اکثر آپ سے رابطے میں رہتا ہوں۔ مسئلہ وہی ہے میری بیوی کی نافرمانی کا۔ اَب تو دو بچے بھی ہوچکے ہیں مگر وہ کسی طور بھی نباہ کرنے کو تیار نہیں۔ آپ مجھے جیسے سمجھاتے رہے' میں ویسے ہی چلتا رہا' ہر ہر طرح سمجھانے کی کوشش کی مگر بے فائدہ۔ وہ اَب بھی اپنی ضد پر قائم ہے کہ مجھے تمہارے ساتھ نہیں رہنا اور بچے بھی تم ہی رکھو۔ بابا جی! اَب بتائیں' اِن حالات میں' میں کیا کروں؟ گھر والوں کے سامنے بہت شرمندگی ہوتی ہے اور اَب تو یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ جن بچوں کی خاطر یہ سب برداشت کررہا ہوں' وہی اِن حالات میں بہت سہمے ہوئے رہتے ہیں۔ اُن کے چہرے پیلے ہیں اور بچوں والی کوئی شرارت اُن میں نہیں۔ بابا جی! میں نے ہمیشہ آپ سے مدد چاہی' آپ نے جیسے کہا' ویسے ہی کیا' اَب بتائیے' کیا کروں کہ اَب تو میرے اعصاب بھی جواب دے رہے ہیں۔

☆ بیٹے راحیل! تم نے اپنی جانب سے مکمل کوشش کرلی' اَب مناسب یہی ہے کہ اپنی بیوی کو فارغ کردو۔ زندگی ایک بار ہی ملتی ہے' اِس کو تباہ مت کرو' پرسکون ذہن کے ساتھ بچوں کی تربیت کرو۔ دنیا میں اچھے لوگ بھی ہیں جو کسی کی اولاد کو اپنی اولاد سے بڑھ کر چاہتے ہیں۔ تم نے ہر طرح سمجھا کر دیکھ لیا' نرمی سے بھی اور سختی سے بھی لہٰذا اَب تم پر کوئی بوجھ نہیں۔ ایسا ہوتا ہے کہ دو لوگ اکثر ساتھ نہیں چل پاتے تو عزت سے الگ ہوجانا ہی بہتر ہے۔ اُس کا حق مہر اَدا کردو۔ جو زیور اُس کو دے چکے ہو' واپس مت لو۔ عزت کے ساتھ معاملے کو نمٹادو' بس اَب یہی بہتر ہے۔ یَاقَھَّارُ کا بہت وِرد کیا کرو۔ اللہ ہر اپنا کرم ضرور فرمائے گا۔

□ زینب۔ جھنگ۔

☆بیٹی زینب! تمہارا مسئلہ قابلِ اشاعت نہیں۔ بہ کثرت توبہ استغفار پڑھو اور بہتر ہوگا' مجھ سے تعویذ منگوالو۔ کلامِ الٰہی کی موجودگی میں شیطان قریب نہیں آتا۔

□ غالب کمال۔ لاہور۔

o بابا جان! مجھے میرے ایک دوست نے آپ کا پتا دیا۔ آپ کے کہنے پر ایک بہن صاحبہ نے اُس کی بہت مدد کی اور اَب وہ اپنا چھوٹا سا کاروبار کررہا ہے۔ بابا جان! کیا وہ بہن صاحبہ میرے لیے کچھ نہیں کرسکتیں؟ میں بھی بہت پریشان ہوں' ایسا نہیں ہے کہ محنت نہیں کرتا' محنت بہت کرتا ہوں مگر بابا جان! آپ جانتے ہیں کہ مہنگائی نے کمر توڑ دی ہے پھر حق دار کو حق بھی نہیں ملتا۔ انتہائی غریب گھر کا ہوں لہٰذا کہیں کوئی سنوائی نہیں۔ میری عمر اِس وقت 35 سال ہے۔ 3 بہنیں ہیں اور بوڑھی والدہ۔ مجھ سے چھوٹے بھائی کا پچھلے دنوں انتقال ہوگیا۔ دکھ اِس بات کا ہے کہ لاش بھی نہیں ملی۔ میری ماں اِس غم میں رورو کر اندھی ہوگئی۔ بابا جان! کوئی ایسا وظیفہ دیں کہ ہمارے حالات اِس قابل تو ہوں کہ پیٹ بھر کر کھا سکیں' تن ڈھانپ سکیں۔ اللہ آپ کو اِس کا اَجر دے گا۔

☆ بیٹے غالب! اللہ تم کو حوصلہ دے۔ بے شک دنیا میں بہت اچھے اچھے لوگ بھی ہیں اور انہی کے دَم سے دنیا چل بھی رہی ہے۔ میری وہ بیٹی بھی ہمیشہ سب کے کام آتی ہے۔ دُعا کرو کہ وہ خود خیریت سے ہو کیونکہ بہت عرصے سے میرا رابطہ بھی نہیں ہے۔ بیٹے......! بہنوں سے کہو بعد نمازِ فجر ایک بار سورۃ آلِ عمران ضرور پڑھیں۔ اللہ سے دُعا کریں' وہ ضرور غیب سے کوئی سبب پیدا کرے گا۔ مدت 41 دن ہے۔



معروف شعراء کے مجموعۂ کلام پر سیر حاصل تبصرے

وقت کی دستک

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

''شاعری ادب کے ماتھے کا جھومر ہے۔ یہ اَدب کا مقصد بھی ہے اور حتمی انجام بھی۔ یہ انسانی ذہن کی اعلیٰ و ارفع سوچ کی مظہر ہے۔ یہ حسن اور لطافت کے حصول کا نام ہے۔ نثر نگار اس مقام سے دامن بچاتا ہے جہاں سے شاعر بآسانی گزر جاتا ہے۔'' شاعری کی اہمیت اور نثر پر اس کی فوقیت کا سکّہ بٹھانے والے یہ زوردار الفاظ نامور انگریز ادیب سمر سٹ ماہم کے ہیں۔ مَیں خود بھی اسی ''مسلک'' کا پیرو کار ہوں۔

مَیں اُن لوگوں سے اتفاق نہیں کرتا جو کہتے ہیں کہ شاعری تو چلتے پھرتے بھی ہو جاتی ہے، نثر کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے بیٹھنا پڑتا ہے۔ میرے نزدیک چلتے پھرتے ہو جانے والی شاعری بس ''چلتی ہوئی'' ہوتی ہے۔

قاری/ سامع پر اس کا کوئی دیرپا تاثر قائم نہیں ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ شاعر سے کبھی کبھار کوئی شعر/ مصرع بیساختہ بھی سرزد ہو جاتا ہے جیسا کہ علامہ اقبال سے منسوب ایک واقعے سے پتا چلتا ہے۔ علامہ کے ایک استاد اور کرم فرما پروفیسر آرنلڈ نے ایک بار ان سے طنزآمیز تحیّر کے انداز میں سوال کیا کہ کیا وہ (اقبال) بھی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اُن کے نبیؐ پر قرآن حکیم، اللہ کی طرف سے نازل کیا گیا تھا؟ علامہ نے اس سوال کا جواب کچھ اس طرح دیا ''جناب، وہ (اللہ) تو قادرِ مطلق ہے مجھ جیسے عاصی بندے پر بھی بسا اوقات کوئی شعر یا مصرع بنا بنایا نازل ہو جاتا ہے۔''

تاہم ایک یہ استثنائی کیفیت ہے۔ عام حالات میں (معیاری) شاعری بچوں کا کھیل نہیں۔ حضرت امیر مینائی نے درست کہا تھا

خشک سیروں تن شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعۂ تر کی صورت

تو گویا شعر (خصوصاً غزل کے شعر) کی تخلیق، آمد اور آورد کے سمبندھ سے ہوتی ہے۔ اب یہ شاعر کے تخیّل کی پرواز اور زبان و بیان پر اس کی گرفت پر منحصر ہے کہ وہ کس مہارت سے اپنے شعر کو الفاظ کا جامہ اور معانی کی روح عطا کر کے اہلِ بصیرت کے سامنے پیش کرتا ہے۔

پاکستان کے ایک نامور شاعر اور بیوروکریٹ سیّد ہاشم رضا نے اپنی خود نوشت "Our Destination" میں ایک جگہ لکھا ہے ''شاعری اور

غربت میں ہمسائیگی کا رشتہ ہے۔'' واقعی، شاعری میں دولت نہیں لیکن دولت میں شاعری بھی تو نہیں۔ اس لحاظ سے دونوں میں ایک ''محرومی'' کا رشتہ بھی ہے۔ فرق یہ ہے کہ دولت والا مزید دولت کی خاطر کڑھتا رہتا ہے جبکہ شاعر اپنی دولت استغنیٰ پر قناعت کرتے ہوئے بے نیازی سے کہتا ہے ؏ ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے (جگر)۔

ڈاکٹر نزہت عباسی قافلۂ سخن وراں کے ایک رکن کی حیثیت سے اپنی منزل کی جانب سبک روی سے گامزن ہیں۔ ''وقت کی دستک'' اُن کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے جس میں غزل کا غلبہ ہے۔ ابھی اُن کا فن اور سن اس مرحلے پر تو نہیں پہنچے کہ وہ زمانے کو اپنی ٹھوکر پر ماریں البتہ اُن کی خود اعتمادی اُن سے کہلواتی ہے

سچ بھی کہنے سے اب نہیں ڈرتی
اتنی بیباک ہو گئی ہوں میں

شاعری ڈاکٹر نزہت عباسی کی علمی کاوشوں کا محض ایک پہلو ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے تحقیق، تدریس، تنقید اور نثر نگاری پر بھی بھرپور توجہ مرکوز کر رکھی ہے۔

''اردو کے افسانوی ادب میں نسائی لب و لہجہ'' پر مبنی اُن کا مبسوط مقالہ شائع ہو چکا ہے۔ وہ فطرتاً خاموش طبع اور کسی حد تک ''مجلس گریز'' ہیں۔ چنانچہ مشاعروں، مباحثوں اور ادبی چوپالوں میں شرکت سے حتی المقدور پرہیز کرتی ہیں اگرچہ انتہائی خلیق، متواضع اور منکسر المزاج ہیں۔ ایسے لوگ فضولیات میں اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے ٹھوس اور مثبت کاموں میں منہمک رہتے ہیں اور جلوت میں بھی خلوت کے مزے لوٹتے ہیں۔ ڈاکٹر نزہت کے حسب ذیل اشعار سے اُن کے مزاج اور ذہنی رجحان کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے

تھے جلوتوں کے ہجوم مجھ میں
میں خلوتوں کے خمار میں تھی
ہے خموشی ہی مسئلے کا حل
بات اُلجھے گی اب وضاحت سے
مری اک چپ ہی میری گفتگو ہے
میں اپنی خامشی میں بولتی ہوں

مؤخر الذکر شعر پڑھ کر میرے ذہن میں کارلائل کا یہ مشہور قول گونجنے لگا: Silence is more eloquent than words (خاموشی الفاظ سے زیادہ خوش گفتار ہے۔)

''وقت کی دستک'' کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ شاعرہ وقت کی پکار پر گوش بر آواز ہے۔ اُس کی شاعری میں نہ صرف جدید نظریات ملتے ہیں بلکہ اُس کا اسلوب بھی انفرادیت اور برجستگی سے مملو ہے۔ غزل ایک نازک اور قدرے چلبلی صنفِ سخن ہے۔ اس کا حق وہی ادا کر سکتا ہے جسے اپنی بات مؤثر انداز میں کہنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ اس میں ذرا سی بے احتیاطی یا کج روی غزل کو عامیانہ سطح پر گرا دیتی ہے۔

ڈاکٹر نزہت نے اس امر کا پورا اہتمام کیا ہے کہ اُن کا کلام کہیں بھی یکسانیت، فرسودگی اور سطحیت کا شکار نہ ہو۔ انہوں نے سیاست، سانحاتِ روز و شب، معرکۂ حق و باطل، معاشی ناہمواری، شہرت کی ہوس، مسیحاؤں کی سفاکی جیسے خشک (لیکن رائج الوقت) موضوعات کو بھی غزل کی رومان پرور فضا کے تناظر میں برتا ہے (میں متعلقہ موضوعات کے شعری حوالوں سے اس مضمون کو بوجھل نہیں کرنا چاہتا۔) ڈاکٹر نزہت عباسی اپنے کلام کی اس خوبی کا پورا ادراک رکھتی ہیں۔ کہتی ہیں

نئے خیال، نئے فلسفوں کی بات کرو
نئی حیات نئی منزلوں کی بات کرو
ابھی تلاش ہے مجھ کو جہانِ تازہ کی
نئی صدی میں نئے راستوں کی بات کرو
نئی دنیا کا نقشہ دیکھتی ہوں
پھر اس نقشے میں خود کو ڈھونڈتی ہوں

یہ بھی اپنی جگہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جدید موضوعات کے ساتھ ساتھ کوئی ذی فہم شاعر غزل کے قدیم اور روایتی مضامین سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا کہ بقول غالب ؏ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر۔ لیکن ڈاکٹر نزہت عباسی نے اُن پامال موضوعات کو بھی اپنی فکر کی تازگی سے حیاتِ نو بخشی ہے۔ یوں بھی بقول صابر ظفر

لکھنے والا جو اسے اپنے لہو سے لکھے
کوئی مضمون بھی پامال نہیں ہو سکتا

اس مجموعے میں ایک غزلِ مسلسل محبت اور ایک ہجر کے موضوع پر شامل ہے۔ متفرق موضوعات پر ڈاکٹر نزہت کے چند اشعار کا اعادہ بے جا نہ ہوگا۔

مَیں سوزِ دل کی تپش سے تھی شاد
عجب سی لذت شرار میں تھی
لاکھ روشن کرو تم اپنی وفاؤں کے چراغ
میرا ایقان مگر ڈوب گیا ہے مجھ میں
وسعتِ کون و مکاں کی کوئی حد بھی ہے کہیں
چشمِ حیرت ہے تو پھر دید کی گنجائش ہے
بے دھیانی بھی ہے دھیان میں کیا
ہے حقیقت بھی کچھ گمان میں کیا
ساری دنیا کے خزانے بھی میسر ہوں جسے
ہاتھ بھی اُس کا کشادہ ہو ضروری تو نہیں

''وقت کی دستک'' کی مناسبت سے ڈاکٹر نزہت عباسی نے وطنِ عزیز (خصوصاً کراچی) میں امنِ عامہ کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال کو بھی اپنے مخصوص دل گداز پیرائے میں اُجاگر کیا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں

سارے شہر پر چھائی ہے اک خوف کی فضا
جو امن کی ہوائیں تھیں مسموم کیوں ہوئیں
سانحہ آج پھر ہُوا کیا ہے
شہر کی یہ عجب فضا کیا ہے
بچے خوف سے گھر سے باہر نہ نکلیں
دھول اُڑتی ہے گلیوں میں چوباروں میں

ایک پوری نظم میں ''سانحۂ بلدیہ ٹاؤن'' (۱۱ ستمبر ۲۰۱۲ء) میں کام آنے والے محنت کشوں کی مرگِ ناگہانی کا نوحہ اور اُن کے پسماندگان کی بے چارگی کا نقشہ پُرسوز انداز میں کھینچا گیا ہے۔ مثلاً یہ شعر دیکھیے

جلتے بجھتے انگارے ہیں اشک نہیں ہیں آنکھوں میں
غم کی تمازت جھلساتی ہے خواب کے منظر راکھ ہوئے

ہمارے ملک کی سیاست کیا ہے، ایک سیاپا ہے۔ اب سے نصف صدی قبل (غالباً) شورش کاشمیری نے کہا تھا

مرے وطن کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

بدقسمتی سے آج بھی ملکی سیاست ہوس ناکی کا شکار ہے۔ نزہت عباسی نے ٹھیک کہا

اُجالوں کی جگہ ظلمت نے لے لی
سیاست کی سیہ کاری ہے اب بھی
پیش منظر بدلتا رہتا ہے
آج کے دور کی سیاست' بس!
تھیں سیاست کی بھی عجب چالیں
کھیل سب سازشوں کی زد میں تھا

جہاں سیاست کا یہ حال ہو وہاں سیاست داں بھی اپنے ہاتھ دکھاتے ہیں۔ ہمارے رہنماؤں کے کرتوتوں کا ایک یہ رنگ بھی ملاحظہ کیجیے

شعبدے ہیں جو اَب سیاست کے
قوم کو دان کر دیے تم نے
تم ہمیشہ رہزن پر ہی لگاؤ تہمت' بس!
راہ میں جو رہبر ہی ہم کو لوٹ جائے تو

دوسرے شعر میں حمایت علی شاعر کے اس مشہور شعر کا عکس نظر آتا ہے

رہزن کے بارے میں اور کیا کہوں کھل کر
میرِ کارواں یارو، میرِ کارواں یارو!

شاعرہ نے بگاڑ کے بنیادی عوامل کی بھی ٹھیک ٹھیک نشاندہی کر دی ہے

ہم کو متاعِ قوم کے لٹنے کا غم نہیں
ہم نے شکست و فتح کے اسباب کھو دیے

بدقسمتی سے علم و ادب اور تعلیم و تربیت کا شعبہ بھی بگاڑ سے نہ بچ سکا۔ نزہت کہتی ہیں اور بالکل درست کہتی ہیں

علم، ہنر اور فن تو اب متروک ہوئے
کھوٹے سکے چلتے ہیں بازاروں میں

شاعری کی کامیابی کا راز اس میں نہیں کہ لکھتے وقت شاعر کے جذبات کیا تھے بلکہ اس میں ہے کہ پڑھتے وقت قاری کے احساسات کیا ہیں۔ جب یہ دونوں ایک wavelength پر آ جاتے ہیں تو شاعری ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دیتی ہے اور معاشرے میں صحت مند اقدار کے فروغ کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ شاید اسی لیے امریکہ کے ایک آنجہانی صدر

جان ایف کینیڈی نے شاعری اور اقتدار کا موازنہ کرتے ہوئے کہا تھا ''جب اقتدار انسان کو نخوت کی طرف دھکیلتا ہے تو شاعری اسے اس کی کمزوریوں سے آگاہ کرتی ہے، جب اقتدار انسان کی سوچ کے دائرے کو محدود کر دیتا ہے تو شاعری اسے اپنے وجود کی لامتناہی وسعتیں یاد دلاتی ہے۔ جب اقتدار انسان کو بدعنوانی پر مائل کرتا ہے تو شاعری اس کے باطن کو پاک صاف کرتی ہے۔''

ڈاکٹر نزہت نے بھی اپنے ایک شعر میں یہی مضمون باندھا ہے۔ کہتی ہیں

انسان کے شعور کی وسعت کا کیا بیاں
اس کی ذہانتوں کا بھلا کیا شمار ہو

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ نزہت عباسی نے اپنے کلام کو محض ذہنی لذّت و فرحت کے حصول کا آلۂ کار نہیں بنایا بلکہ اصلاحِ احوال کی پُرخلوص کوشش بھی کی ہے اور ناصحِ مشفق کا روپ دھارے بغیر سیدھے سادے لیکن فکر انگیز انداز میں اپنے پیغام کا ابلاغ کیا ہے

یہاں ہیں خون کے رشتے اجنبی سے
یہاں سب کے رویّے اجنبی سے

زندگی کا ہو کوئی تو مقصد
زیست یوں ہی بسر نہ ہو جائے

ساری دُنیا کے خزانے ہی میسّر ہوں جسے
ہاتھ بھی اس کا کشادہ ہو ضروری تو نہیں

بھٹک نہ جائے کہیں کاروانِ فکر و عمل
شبِ سیاہ میں بیداریوں کی بات کرو

بہت احساں جتانے سے تعلق ٹوٹ جاتا ہے
بہت ایثار و قربانی کے جذبے مار دیتے ہیں

''وقت کی دستک'' سنجیدہ، مثبت اور مقصدی شاعری کا عمدہ نمونہ ہے۔ تاہم اس کے چند اشعار نے میری رگِ ظرافت کے ساتھ چھیڑ چھاڑ ضرور کی۔ اولاً مَیں نے یہ دیکھا کہ ڈاکٹر نزہت عباسی نے جو ایک اُستاد ہیں لاشعوری طور پر سہی، متعدد مقامات پر اپنی ''اُستادی'' کے جوہر دکھائے ہیں۔ مثال کے طور پر، معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ ذیل اشعار کہتے وقت ڈاکٹر صاحبہ ذہنی طور پر کلاس روم میں تھیں

غزل

میں سوگئی تو زخمِ نہاں بولنے لگا
سناٹا میرے گھر میں کہاں بولنے لگا

دی بارشوں نے آتشِ خاموش کو زباں
جلنے لگی ہے آگ دھواں بولنے لگا

اک عمر بازگشتِ صدا اپنی ہی سنی
میں چپ ہوئی تو سارا جہاں بولنے لگا

مجھ کو بتا رہا ہے سفر کی صعوبتیں
رستے کو مل گئی ہے زباں بولنے لگا

اک دو قدم بھی ساتھ مرے جو گیا نہیں
وہ ہمسفر ہے آج نشاں بولنے لگا

توڑا تھا اک صدا نے جو صدیوں کا وہ سکوت
اِک کُن فکاں سے کون ومکاں بولنے لگا

ڈاکٹر نزہت عباسی

کیا جواب لکھیں گے ہاتھ ہیں قلم لیکن
زندگی کے پرچے کا ہر سوال دیکھیں گے

اک زمانے کی آزمائش ہے
ایک لمحے کے امتحان میں کیا

مَیں اپنے حرف حرف پڑھتی ہُوں
وقت تعلیم ہو گیا مجھ میں

یا پھر امتحانی پرچے کے انداز میں پوچھے گئے یہ سوال کہ: مختصر الفاظ میں بیان کیجیے

آنکھیں ہماری خواب سے محروم کیوں ہوئیں
آباد بستیاں تھیں یہ معدوم کیوں ہوئیں

وہ بھی شریکِ جرمِ محبت رہا، مگر
ساری سزائیں پھر مرا مقسوم کیوں ہوئیں

یہ شعر دیکھیے جس میں کھلم کھلا مجھ خاکسار پر چوٹ کی گئی ہے

فرق کچھ نہیں پڑتا ایک جیسے ناموں سے
آدمی کو جانا ہے ہم نے اُس کے کاموں سے

گویا مجھے یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ مَیں (''بقلم خود بخود'') جو پاکستان کے ایک سابق (امریکی برانڈ) وزیر اعظم (ڈاکٹر معین قریشی) کا ہم نام ہوں تو اِس سے کیا ہوتا ہے؟ آدمی کی شناخت اُس کی حیثیت اور کارناموں سے ہوتی ہے۔ پس کہاں وہ ہستیٔ ذی وقار اور کہاں مَیں بے ہنر و بے اختیار۔ فرق صاف ظاہر ہے!

زیرِ نظر کتاب کے ایک شعر سے میرے ذہن میں بہت عرصے قبل پڑھا ہوا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ پہلے شعر ملاحظہ فرمائیے۔ نزہت کہتی ہیں

اک مسافت ہے جیسے صدیوں کی
کتنی لمبی ہے تیرے ہجر کی رات

واقعہ یوں ہے کہ ریاضی کے ایک استاد جو اتفاق سے اردو کے شاعر بھی تھے اور غریب تخلص کرتے تھے ایک روز کلاس میں آئے تو انہوں نے دیکھا کہ کسی شریر طالب علم نے تختۂ سیاہ پر اکبر الہٰ آبادی کا یہ شعر لکھ رکھا ہے

دعویٰ بہت بڑا ہے ریاضی میں آپ کو
طولِ شبِ فراق کو تو ناپ دیجیے

غریب صاحب شعر پڑھنے کے بعد چند لمحوں تک فکر کرتے رہے اور اس کے بعد اس مشکل ترین سوال کا یہ آسان ترین جواب لکھ ڈالا

طولِ شبِ فراق جو ناپا گیا غریبؔ
لیلیٰ کی زُلف سے ہُوا دو چار ہاتھ کم

ڈاکٹر نزہت عباسی یقینِ کامل (conviction) اور اعتمادِ کلّی (credence) کی شاعرہ ہیں۔ شاعری اگر واقعی وفورِ جذبات کے فطری بہاؤ کا نام ہے (جیسا کہ عموماً کہا جاتا ہے) تو اُس کی بہترین مثال ڈاکٹر نزہت عباسی کے یہاں نظر آتی ہے۔

یہ کلام الفاظ اور افکار کا ایک مترنم امتزاج ہے۔ اُن کے ہر شعر سے اُن کے علم، مشاہدات اور تجربات کی عکاسی ہوتی ہے۔ اندازِ بیان اتنا سلیس، واضح اور رواں ہے کہ اس میں تعقید و تکلف کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔ یہ کلام کسی ماورائے ادراک دنیا (Surreal world) کے لیے نہیں۔

یہ اسی جہانِ خراب کا آئینہ ہے۔ چنانچہ اسے پڑھتے وقت ایک غیر مرئی اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ آج کل شاعری کے جو دھڑا دھڑ مجموعے بازار میں آ رہے ہیں مَیں اُن کا بھی خیر مقدم کرتا ہوں کہ وہ بہر حال قرطاس و قلم کے رشتے کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ تاہم جب کوئی کلام اپنی تخلیق اور پیشکش میں منفرد ہوتا ہے تو وہ خود اپنی ستائش سے مبرا ہو جاتا ہے۔

اردو ادب میں شعراء نے اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی روایت کو ''تعلّی'' سے تعبیر کر کے جائز قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر نزہت اس کے برعکس اپنی کسرِ نفسی کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہیں

قولِ فیصل نہیں، تردید کی گنجائش ہے
میری تحریر میں تنقید کی گنجائش ہے

جب کوئی فنکار یہ روش اختیار کر لیتا ہے تو اُس کا فن روز بروز نکھرتا جاتا ہے۔

مَیں میدانِ شعر و ادب میں ڈاکٹر نزہت عباسی کی مزید کامیابیوں اور کامرانیوں کے لیے دعا گو ہوں۔

☆☆......☆☆

سفر کہانی

ممنوعہ سرزمین پر ایک پاکستانی کا سفر

مسجد اقصیٰ

وسیع و عریض مسجد اقصیٰ اپنی مثال آپ ہے

یہاں ایک ایسا مقام بھی ہے جو مسلمانوں، یہودیوں

اور عیسائیوں کے لیے مقدس حیثیت رکھتا ہے۔

شیراز خان

میرا ہمیشہ سے یہ عزم تھا کہ کینیڈا کی شہریت اور پاسپورٹ ملنے کے بعد سب سے پہلے جس میں ملک میں جاؤں گا وہ اسرائیل ہوگا اپنے دوستوں سے اس سرزمین کے بارے میں ڈھیر ساری کہانیاں سننے کے بعد میرے جذبات کی کوئی انتہا نہیں تھی مگر میں بہت خوفزدہ بھی تھا کیونکہ ایسے لوگوں کے بارے میں بھی سن رکھا تھا جنہیں پاکستانی یا مسلم ہونے کی وجہ سے اکثر اسرائیلی کسٹمز حکام نے ملک میں داخل ہونے سے روک دیا تھا۔

۱۷ فروری ۲۰۱۶ء کو میں نے ڈھیر ساری دعاؤں اور مشوروں کے ساتھ اسرائیل جانے کے لیے برٹش ایئرویز کی پرواز پکڑی۔ میں مقامی وقت کے مطابق صبح پانچ بجے تل ابیب کے گورین ائیر پورٹ پہنچا۔ اسرائیلی کسٹمز پہنچنے پر ایک افسر بے جان آواز میں مجھ سے تفتیش کرنے لگا۔ کیا میں اسرائیل میں کسی کو جانتا ہوں؟ کیا مجھے عربی آتی ہے؟ کیا میں کبھی مشرق وسطیٰ آیا ہوں؟...... اس نے میرا پاکستانی پاسپورٹ دیکھنا چاہا مگر چونکہ اس کی معیاد ختم ہوچکی تھی اس لیے میں اپنے ساتھ نہیں لایا تھا۔ میرا کینیڈین پاسپورٹ لیتے ہوئے انہوں نے مجھے انتظار گاہ کی جانب جانے کا اشارہ کیا۔ مجھے پہلے ہی ایسی صورت حال کی توقع تھی چنانچہ میں اپنے ساتھ اسرائیل پر سیاحتی گائیڈ لے آیا تھا جو میں نے وہاں پڑھنی شروع کر دی۔

تیس منٹ کے بعد ایک دوسرے کسٹم افسر کی جانب سے مجھے ایک کمرے میں بلایا گیا۔ انہوں نے مجھ سے اسرائیل آنے کا مقصد پوچھا اور یہ بھی پوچھا کہ میں نے کسی دوسرے ملک جانے کے بجائے اسرائیل آنے کا انتخاب کیوں کیا؟ وہ آہستگی اور احتیاط سے میرے جوابات کا اپنے کمپیوٹر میں اندراج کرتا رہا۔ کینیڈا منتقل ہونے کے بعد میرے پیشے کے متعلق سوالات کی بوچھاڑ کرنے کے بعد انہوں نے مجھے ایک سفید کاغذ پر اپنا مکمل نام اور ای میل ایڈریس لکھنے کو کہا اور پھر اسی انتظار گاہ میں

انتظار کرنے کو کہا

ایک گھنٹہ گزر جانے کے بعد ایک نوجوان خاتون افسر مجھے ایک اور سوال جواب کے سیشن کے لیے بلانے آئیں۔ میں ایسے کمرے میں بیٹھا تھا جہاں یروشلم میں واقع قبۃ الصخرا کی تصویر لگی تھی اور اسرائیلی پرچم آویزاں تھا۔ مجھ سے اتنے سوالات پوچھے گئے کہ خدا کی پناہ۔ وہ سیشن پچیس منٹ تک جاری رہا۔ آخر میں مجھے بتایا گیا کہ وہ خاتون میری فراہم کردہ معلومات کی تصدیق کریں گی۔

ائرپورٹ لینڈ کرنے کے چار گھنٹے کے طویل انتظار کے بعد ایک خاتون میرا پاسپورٹ تھامے میرے پاس آئیں، انہوں نے مجھے ایک علیحدہ کاؤنٹر پر ویزا جاری کیا اور مجھے لگیج مشین کی جانب جانے کی ہدایت دی۔ میں نے اپنا سامان اٹھایا اور جلدی سے والد کو فون کر کے اطلاع دی کہ میں بالآخر یروشلم روانہ ہورہا ہوں۔

تل ابیب سے پینتالیس منٹ کی مسافت پر موجود یروشلم یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے لیے ایک مقدس شہر کی حیثیت رکھتا ہے یہ شہر مسلم، یہودی، عیسائی اور آرمینائی علاقوں میں بٹا ہوا ہے۔ میں دوپہر کو اولڈ سٹی میں واقع اپنے ہاسٹل میں پہنچا وقت ضائع کیے بغیر میں نے اپنا بیگ کمرے میں چھوڑا اور سب سے پہلے مسجد اقصیٰ جانے کا فیصلہ کیا۔ جفا گیٹ (جو کہ اس قلعہ بند شہر کا ایک دروازہ ہے) سے مسجد اقصیٰ کی طرف جانے والے راستے میں خوبصورت روایتی بازاروں سے گزر ہوتا ہے۔

مسجد اقصیٰ کے دروازے پر اس وقت ڈیوٹی پر موجود گارڈ نے مجھ سے پاسپورٹ دکھانے کو کہا اور



میرے مسلمان ہونے کی تصدیق کرنے کے لیے مجھ سے سورۃ الفاتحہ پڑھنے کو کہا (غیر مسلمانوں کے لیے یہاں آنے کے لیے مخصوص گھنٹے مختص کیے گئے ہیں) میں نے سورۃ پڑھی اور اندر داخل ہو گیا۔

یہ وسیع و عریض مسجد اپنی سادگی میں ہی اتنی شاندار اور اپنی مثال آپ تھی۔ مسجد میں عبادت گزاروں کی تھوڑی تعداد دکھائی دی۔ میں نے مسجد کی اندرونی آرائش کو دیکھنے کے بعد وہاں نماز پڑھی۔ مسجد کے سامنے سونے سے آراستہ قبۃ الصخرا (ڈوم آف دی راک) ہے جو دنیا کی سب سے حیرت انگیز اور سب سے زیادہ فوٹوگراف کی گئی جگہوں میں ہے مسجد کا گنبد ہلکے نیلے رنگ کے آسمان کے نیچے بالکل واضح اور الگ تھلگ دکھائی دے رہا تھا۔ میں دیر تک اس سنہرے گنبد کے سحر میں گم ہو کر انتہائی عاجزی سے اسے دیکھتا رہا۔ یہ وہ مقدس مقام ہے جہاں سے آخری نبی حضرت محمدؐ نے معراج کے لیے آسمانوں کی جانب اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔

اس کے بعد دیوار گریہ یا مغربی دیوار گیا جو کہ ایک مقدس مقام کی حیثیت رکھتی ہے اور جہاں یہودیوں کو عبادت کرنے کی اجازت ہے۔ وہاں میں نے یہودیوں کو قدیم چونے پتھر کی دیوار کے سامنے رنج و غم کی حال میں دعائیں مانگتے دیکھا۔

اب میں نے چرچ آف سیپلشر کا رخ کیا۔ یہ عیسائیوں کے لیے مقدس جگہ ہے وہ مانتے ہیں کہ مقام پر تاریخ کے سب سے اہم واقعات رونما ہوئے جیسے یہی وہ مقام ہے جہاں مسیح مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوئے تھے، کہا جاتا ہے کہ اس جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقبرہ موجود ہے۔

دن ڈھلنے کے ساتھ ساتھ مجھ میں ایک سکون سما گیا تھا تینوں جگہوں پر ان مختلف مذاہب کے پیروکاروں کو دیکھ کر میرے اندر ایک آسودگی کی کیفیت اتر چکی تھی۔ یروشلم میں تین دن گزارنے کے بعد میں نے اپنے ساتھی مسافر جن کا تعلق ہندوستان سے تھا اور ان سے میری ملاقات ہاسٹل میں ہوئی تھی کے ساتھ بیت اللحم اور ہیبرو (الخلیل) جانے کا فیصلہ کیا۔

بیت اللحم یروشلم کے جنوب میں تیس منٹ کی مسافت پر واقع ہے۔ یہ حصہ فلسطینیوں کے زیر اثر ہے اور یہاں چرچ آف نیٹیوٹی (حضرت عیسیٰ کی جائے پیدائش) موجود ہونے کی وجہ سے سیاحوں کے درمیان یہ شہر خاصا مقبول ہے۔

بیت اللحم سے ہم الخلیل پہنچے جہاں فلسطینی سول انتظامیہ اور اسرائیلی افواج دونوں کا کنٹرول ہے ۔ اس شہر کی سب سے خصوصی بات الحرم الابراہیمی ہے یہ مقام مسلمانوں یہودیوں اور عیسائیوں تینوں ہی کے لیے مقدس حیثیت رکھتا ہے کیونکہ وہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، اور ان کی ازواج مطہرات کے مقبرے موجود ہیں دو سیکورٹی چیک پوسٹوں سے گزرنے کے بعد ہم اس مقام کی مسلم جانب پہنچے یہاں اسلام عیسائیت اور یہودیت تینوں ہی مذاہب کے مقدس پیغمبران مدفون ہیں۔ وہاں میں نے اپنے اندر ایک روحانی تسکین و تازگی کا احساس پایا۔

ہاسٹل میں میری ملاقات لیتھوانیا سے تعلق رکھنے والے ایک کینیڈین سیاح سے ہوئی تھی انہیں بھی اپنا ہم سفر بنا کر ہم نے رام اللہ جانے کا فیصلہ کیا جو مغربی کنارے پر واقع ایک فلسطینی شہر ہے۔ یہ شہر یروشلم سے ۳۵ منٹ کی ڈرائیو پر واقع ہے۔ اس دوران ہمیں کسی بھی چیک پوسٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا میرا ہاسٹل رام اللہ کے اندر موجود مرکزی بس اسٹیشن سے صرف ایک منٹ کے پیدل سفر پر واقع

تھا۔رام اللہ میں ایک رات قیام کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے ہم نے اپنا وقت ضائع کیے بغیر اپنے بیگز ہاسٹل میں پھینکے اور شہر کی سیر کو نکل گئے۔

رام اللہ ایک پررونق اور ہلچل سے بھرا فلسطینی شہر ہے اسی شہر میں فلسطینی لبریشن آرگنائزیشن (پی ایل او) کے سربراہ یاسر عرفات کا مقبرہ ہے ہم چند مقامی بازاروں سے گزر کر ایک میوزیم پر چند لمحوں کے لیے رکے اور شیشہ پیا۔میں نے جہاں کہیں بھی شیشہ پیا ہے ان تمام کے مقابلے میں وہاں کے مشہور بلدنا کیفے کا شیشہ اب تک کا بہترین شیشہ ثابت ہوا۔ہم خوش قسمت تھے کہ وہاں چند دلچسپ مقامی افراد ہمارے دوست بن گئے تھے۔آپ شاید یہ سوچ بھی نہیں سکتے ہوں گے مگر وہ وہاں ایک کم وبیش عام سی زندگی گزار رہے ہیں۔اسرائیل میں کسی دوسری جگہ کے مقابلے میں مجھے سب سے زیادہ لگژری گاڑیاں مغربی کنارے کے اس شہر رام اللہ ہی میں دیکھنے کو ملیں مگر میں یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ رام اللہ سے پندرہ منٹ کی ڈرائیو پر مہاجرین کے کیمپس قائم ہیں جہاں بڑی تعداد میں فلسطینی انتہائی غربت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اگلے دن میں فلسطینی شہر نابلس گیا۔مقامی بس کے ذریعے وہاں پہنچنے میں مجھے ایک گھنٹہ سے تھوڑا زیادہ وقت لگا۔رام اللہ اور نابلس دونوں شہر ماضی میں اسرائیلی اور فلسطینی افواج کے درمیان جھڑپوں کے دوران متنازعہ علاقے رہے ہیں کچھ گھنٹوں کے قیام کے دوران مجھے وہاں چہل پہل اور عمارتوں سے بھرا شہر دیکھنے کو ملا۔تھوڑی دیر کے لیے خود کو نابلس کے بازاروں میں گم کرنے کے بعد میں نے مشہور میٹھی سوغات کنافہ کھائی۔کنافہ میٹھی چاشنی میں جذب پنیر پیسٹری ہے اور عرب ممالک میں خاصی مقبول ہے۔اسرائیل پہنچنے کے بعد یہ واحد کھانے کی چیز ملی جو سب سے زیادہ خوش ذائقہ تھی۔اس کے بعد میں حماد الشفاء میں سکون بخش ترک حمام سے محظوظ ہوا۔وہاں سے نکلتے وقت میں خود کو ذہنی طور پر بہت پرسکون محسوس کر رہا تھا۔

نابلس زیتون کے تیل کے سب سے زیادہ صابن بنانے کے حوالے سے خاصا مقبول ہے اسی لیے میں بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ آخر یہ صابن بنتے کیسے ہیں؟ دوپہر ہو جانے کی وجہ سے تمام کارخانے بند ہو گئے تھے لیکن میں چھوٹی دکانوں سے کچھ مقامی طور پر بنائے گئے صابن حاصل کرنے میں کامیاب رہا اور انہیں دیکھ کر واقعی یہ اندازہ ہوا کہ یہ کیوں مقبول ہیں۔اب اس شہر کو خیرآباد کہنے کا وقت آ گیا تھا میں نے بس پکڑی اور رام اللہ کے لیے روانہ ہو گیا۔وہاں سے یروشلم کے لیے ایک دوسری بس میں سوار ہو گیا اور اس کے بعد پھر تل ابیب پہنچا جہاں میں نے اپنے سفر کا آخری دن گزارا۔

اس ایک دن میں مجھ سے جتنا ہو سکا اس شہر کو دیکھا اور محسوس کیا۔تل ابیب کے علاقے جفا جو کہ ایک مسلم اکثریتی علاقہ ہے میں میں نے بہترین ٹیونا پیزا کھایا۔کچھ تحائف خریدے اور اولڈ جفا کے ساحل سمندر پر خوشگوار گرم دھوپ سینکنے کا موقع حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔اس دن جمعہ تھا۔اسرائیل میں یہ یوم سبت ہوتا ہے یہودیت میں آرام یا تعطیل کا دن۔سڑکوں پر ٹریفک بہت کم تھا اور شام ہوتے ہی سب کچھ بند ہونا شروع ہو گیا تھا۔

اگلے دن میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس مقدس سرزمین سے کینیڈا روانہ ہونے کے لیے اپنا سامان سمیٹا لیکن میں اس بات سے کافی خوش تھا کہ اسرائیل دیکھنے کی میری دیرینہ آرزو پوری ہو چکی تھی۔

☆☆......☆☆

اس سلسلے میں مختلف ممالک کے بارے میں دلچسپ معلومات وغیرہ پیش کی جائیں گی

سچی کہانیاں ایک دنیا

دیس دیس گھومیے......!

زین شمسی

دیس دیس گھومنے والا ہمارا یہ نیا سلسلہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ اس سلسلے میں دنیا بھر کے خوبصورت، ممالک، شہر اور تفریحی جگہوں کا آپ سے تعارف کرایا جائے گا۔ اس ماہ ہم ایک ایسے ملک کا تعارف کروانے جا رہے ہیں جو دنیا کے قدیم ترین ممالک میں سے ایک ہے اور دنیا بھر میں اِس کے



یہ جو منظر آپ کے سامنے موجود ہے، یہ وہ جگہ ہے جہاں پاکستان اور چین کی سرحدیں ملتی ہیں۔ معیشت کے اعتبار سے بھی اس جگہ کی بہت اہمیت ہے۔ CPEC کا آغاز بھی اسی جگہ سے ہوا

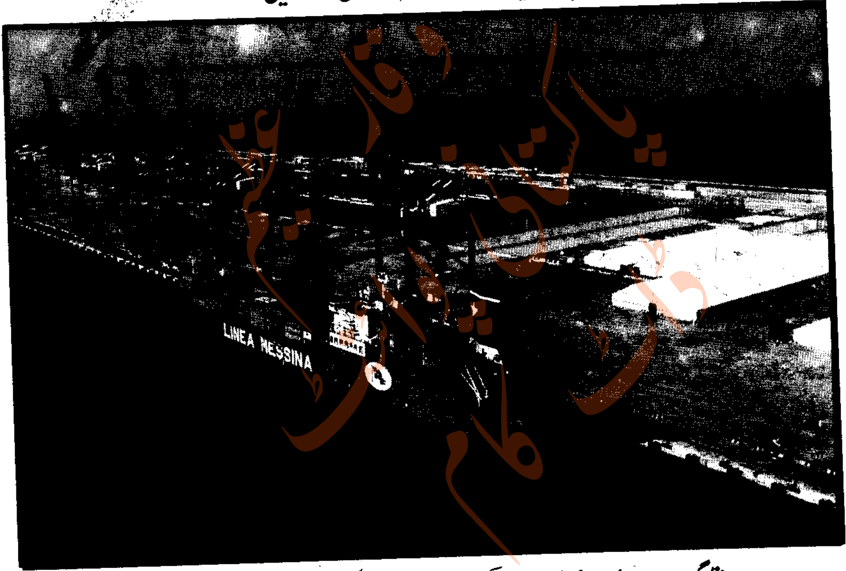
چکے ہیں۔ جس ملک کا میں حوالہ دے رہا ہوں وہ اور کوئی نہیں بلکہ عوامی جمہوریہ چین ہے۔

''پاک چین دوستی وان سوئے'' پر ہم پاکستانی برسوں سے عمل پیرا ہیں اور چینی دوستوں نے بھی اس دوستی کی لاج رکھتے ہوئے پاکستان میں بڑے بڑے منصوبوں کی شروعات کی ہے۔ صرف پاکستان میں نہیں بلکہ دنیا بھر میں چین اپنی مصنوعات کی وجہ سے مشہور ہے۔ دنیا میں چین ان چند ممالک میں سے ہے جو دنیا کی بڑی طاقتوں کا بھرپور مقابلہ اپنی طاقت ور ترین اکنامی سے کرتا ہے۔

چین کی ثقافت بہت قدیم ہے بلکہ یہ کہنا درست

جانی جاتی تھی مگر پھر ماؤ کی قیادت میں اپنے طرزِ عمل کو مکمل طور پر بدل کر چینی قوم آج ایک کامیاب ترین قوم ہے۔ جن کا منشور کام کام اور صرف کام ہے۔

چین پاکستان کے شمال میں واقع ایشیائی ملکوں میں شامل ہے' اس کا شمار طاقت ور ترین ممالک میں ہوتا ہے۔ کاغذ' پرنٹنگ پریس اور بارود اُن کی ابتدائی ایجادات میں سے ہیں۔ چین میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں اور چینی کرنسی اُن کی سرکاری کرنسی ہے۔ چینی لوگ بہت سیدھے سادھے مگر محنتی ہوتے ہیں اور دنیا کے امیر ترین لوگ بھی اس سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں۔



یہ منظر گوادر پورٹ کا ہے' جو آج سے کچھ عرصہ پہلے تک بالکل ویران ہوا کرتا تھا' آج وہ پاک چین دوستی کی وجہ سے نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا کے اعتبار سے بھی ایک بہت اہم جگہ بن چکی ہے

ہوگا کہ اس کا شمار دنیا کی پرانی ترین تہذیبوں میں ہوتا ہے۔ جنگِ عظیم دوم کے بعد چین کو تقسیم کر دیا گیا۔ ایک کا نام عوامی جمہوریہ چین ہے اور دوسرے کا جمہوریہ چین ہے۔ چین کی تہذیب ان چند تہذیبوں میں سے ہے جو بیرونی مداخلت سے ہمیشہ محفوظ رہی۔

ایک عرصے تک چینی قوم افیم چی کے نام سے

اس ماہ ہمارے اس نئے سلسلے ''سچی کہانیاں ایک دنیا'' میں چین کی بات کی گئی ہے۔ امید ہے آپ لوگوں کو یہ نیا سلسلہ پسند آیا ہوگا۔ انشاء اللہ آئندہ ماہ' ایک نئی جگہ' نئے شہر اور ملک کے ساتھ حاضر ہوں گے' آپ کی رائے کا ہمیں انتظار رہے گا۔

☆☆......☆☆

ان خاص لوگوں کی کہانیاں اور باتیں، جن کے کام نے زمانے پر اپنے اثرات مرتب کیے

شبانہ اعظمی

اُردو کے بلند پایہ شاعر کیفی اعظمی کی 'منی' اپنے بابا کے بارے میں کیا کہتی ہیں

ع۔خ۔خان

اردو کے بلند پایہ شاعر کیفی اعظمی (اختر حسین رضوی) کے گھر 18 ستمبر 1950 کو جنم لینے والی لڑکی ''شبانہ اعظمی'' کے حوالے سے پہچانی گئیں۔ شبانہ کی والدہ شوکت اعظمی بھی کیفی اعظمی کے ساتھ ترقی پسند تحریک کی سرگرم رکن تھیں اور جہاں کیفی اعظمی ادبی حلقوں میں انقلابی شاعر کی حیثیت سے مانے جاتے تھے حیدر آباد سے تعلق رکھنے والی ان کی بیگم شوکت انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن (آئی پی ٹی اے) کے پلیٹ فارم سے ترقی پسند تحریک کے ڈرامے اسٹیج کرنے کے حوالے سے مشہور تھیں۔ شوکت بیگم نے تھیٹر کی ایکٹنگ کے حوالے سے ایک معتبر نام کمایا اور اسی کا اثر تھا کہ جب ان کی لاڈلی بیٹی منی نے عالم شباب میں قدم رکھا تو ایکٹنگ کی طرف رجوع کیا۔ اپنے شاعر ابا کی ''منی'' کیفی صاحب کے لیے آخری دم تک منی رہی لیکن ہندی سینما کے شائقین اس دلنشین اداکارہ کو شبانہ اعظمی کے نام سے جانتے اور پہچانتے ہیں۔ شبانہ نے پیرلل سینما کو اعتبار بخشنے کے لیے طویل جدوجہد کی اور کبھی کمرشل سینما کے چارم سے متاثر ہوکر خود کو آرٹ مویز سے دور کرنے کا نہیں سوچا۔ فلم اینڈ ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ انڈیا (پونا) سے تربیت یافتہ شبانہ نے 1974 میں ریلیز ہونے والی انکور سے بولی ووڈ میں اپنا کیریر اسٹارٹ کیا اور یوں ہندی پر ایک غیر روایتی ہیروئن نے جنم لیا ابتدا میں اگرچہ معمولی فیس فیچرز کی وجہ سے فلم بین متاثر نہ ہوسکے لیکن پھر دھیرے دھیرے شبانہ نے اپنی اداکارانہ صلاحیتوں سے ایک خاص حلقے کو متاثر کرنا شروع کیا اور جلد ہی پیرلل سینما کے ساتھ ساتھ روایتی کمرشل سینما کی کامیاب ہیروئن کہلانے لگی۔ St Xavier کالج سے تعلیم یافتہ ذہین اور فطین شبانہ کی تربیت چونکہ سوشلسٹ افکار اور نظریات کے زیر سایہ ہوئی لہٰذا فلم لائن میں بھی شبانہ نے وہی راہ اپنائی جس کی کہ ان کے ترقی پسند والدین توقع رکھتے تھے۔ فلم کے بڑے پردے کو شبانہ نے آرٹ کی تحریک کو پروان چڑھانے اور فروغ دینے کے لیے چنا اور اپنے مقاصد میں بڑی حد تک کامیاب رہی۔

سوشلزم سے متاثر ہوکر اور عام آدمی خصوصاً عورتوں کے سماجی استحصال کے خلاف شبانہ کے کرداروں میں ان مسائل پر جرات مندانہ اظہار ملتا ہے۔ باڈی لینگویج کا جو استعمال اس اداکارہ کی طرف سے کیا گیا ہے وہ شاذونادر ہی دیگر اداکاروں

کے کام میں نظر آتا ہے خصوصاً شبانہ نے اپنی آنکھوں سے منفرد کام لیا ہے جہاں وہ ایکسپریشنز کے ساتھ مکالمے ادا کر رہی ہوتی ہے تو ایک زبان وہ بھی ہوتی ہے جو اس اداکارہ کی آنکھوں میں بولتی ہے۔ شیام بینگل نے شبانہ اعظمی کو ایسے یادگار کردار دیے جوان کے کیریر کو ایک معتبر حوالہ بخشتے ہیں لیکن جہاں شیام کی نشانت اور ستیہ جیت رے کی شطرنج کے کھلاڑی جیسی آف بیٹ فلموں میں کردار نبھائے وہیں کمرشل سینما پر بھی ان کی بعض فارمولا ٹائپ فلموں مثلاً امر اکبر انتھونی، پرورش وغیرہ نے کامیابی حاصل کی۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شبانہ صرف آرٹ فلموں تک محدود نہیں رہیں۔ ارتھ اور معصوم میں اپنی اداکاری کے انمٹ نقوش چھوڑنے والی اس ایکٹرس کے کیریر کو اسپرش، کھنڈر، پار اور منڈی جیسی بہترین فلموں نے مزید وقار عطا کیا۔ معروف فلمی شاعر جاوید اختر سے لو میرج کے بعد شبانہ کا کیریر اسی رفتار سے رواں دواں رہے اور آف بیٹ فلموں کے ساتھ ساتھ وہ کمرشل فلموں سے بھی ناطہ جوڑے رکھنے میں کامیاب رہیں ہالی ووڈ اور برطانیہ میں بننے والی انگلش فلموں Madame Sousatzka اور Immaculated Conception اور سٹی آرتھر جوائے میں انٹری دے کر شبانہ نے انٹرنیشنل فیم اور بین الاقوامی ایکٹرس کا اعزاز بھی حاصل کرلیا اور یہ سفر ابھی جاری وساری ہے۔ شبانہ کی لائف کیریر اچھی بری خبروں اور متنازعہ حوالوں سے بھرپور ہے۔ نہ صرف سینما اسکرین پر بلکہ عام زندگی میں بھی وہ اپنے والد کے نظریات کے پرچار کے حوالے سے سرگرم لائف گزار رہی ہیں۔ کئی سماجی اور سیاسی آرگنائزیشنز سے وابستگی کے علاوہ شبانہ پارلیمانی ممبر کی حیثیت سے بھارت میں بسنے والے لاکھوں مسلمانوں کے حقوق کے لیے لڑتی رہی ہیں۔ خصوصاً ۹۳ء میں ہونے والے ممبئی مسلم کش فسادات اور



۲۰۰۳ء میں گجرات کے ہندو مسلم فسادات میں مسلمانوں کے جانی اور مالی نقصان پر آواز اٹھا کر شبانہ نے مسلمانوں کی ہمدردیاں سمیٹ لیں شیام بینگل نے شبانہ کے بارے میں کہا تھا ''یہ عورت گھڑی کی سوئی کی طرح ہے جو مسلسل گردش میں رہتی ہے۔''
شبانہ اعظمی کی مصروف زندگی اور کیریر کے حوالے سے یہ بات قطعی درست معلوم ہوتی ہے۔ ہندی سینما کو اپنی لائف کی تین دہائیاں دینے والی اس پروقار اداکارہ نے آرٹ کی ترویج خصوصاً پیرلل سینما کو ایک باوقار مقام دینے کی طویل جدوجہد کی ہے یہ کہانی جو کہ خود شبانہ کی زبانی ہے ان لوگوں کے لیے ضرور دلچسپی کی حامل ہوسکتی ہے کیفی اعظمی اور ان کے خاندان سے محبت وعقیدت رکھتے ہیں اور جو آرٹ فلموں میں گہری دلچسپی کے حوالے سے کیفی اعظمی کی صاحبزادی منی کے خیالات وافکار سے آگاہی چاہتے ہیں:

میری پیدائش ایسے ماحول میں ہوئی جہاں چاروں طرف کارل مارکس کے نظریات کے حامی لوگ موجود تھے میرے والد کیفی اعظمی اور والدہ شوکت اعظمی ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اور اپنے ہم خیال ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کے گروہ کے ساتھ عملی جدوجہد کررہے تھے۔ والدین سے ملنے والی تحریک اور تربیت کا اثر ہی شاید میری شخصیت میں آیا اور میں بھی ان کے افکار پر سوچنے لگی۔ مجھے یقین ہے کہ میری پیدائش ایک عام لڑکی کی طرح ہوئی ہوگی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے خیالات او رنظریات میں تبدیلی واقع ہوتی رہی۔ میں اپنی والدہ کے تھیٹر ڈراموں سے بے حد متاثر تھی اور مجھے بہت اچھا لگتا تھا جب وہ اسٹیج پر سب کے سامنے جرات کے ساتھ اپنے نظریات کا اظہار کرتی تھیں اور لوگ ان کے مکالمے سن کر تالیاں بجاتے تھے میرا تعلق ایک ایسی فیملی سے ہے جہاں ہر طرف آرٹ سے پیار اور عقیدت رکھنے والے لوگ تھے اسی لیے ہمارے خاندان کا کوئی ممبر تجارت یا کسی اور پیشے کی طرف نہیں یا گیا بلکہ ہماری گھٹی میں یہ بات شامل رہی ہے کہ آگے چل کر ہمیں آرٹ کے میدان میں ہی کچھ نہ کچھ کرنا ہے میری ایجوکیشن سینٹ زیویئر کالج سے مکمل ہوئی اور یہاں گزارے چند سالوں نے میری زندگی کی راہ متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا اس کے بعد میں نے پونا انسٹیٹیوٹ سے ایکٹنگ کورس مکمل کیا اور اداکاری کے شعبے میں قدم رکھ دیا۔ میں اپنے کیریر کو ایک عزت دار حوالہ بخشنے کے حوالے سے شیام بینگل، ستیہ جیت رائے، مرنیال سین، سعید مرزا، گوتم گھوش، سائی پرانج پائی، اپرنا سین مہیش بھٹ جیسے ڈائریکٹرز کی شکرگزار ہوں جنہوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور وہ کردار دیے جو میری پہچان بنے۔ پریلل سینما سے وابستگی کی ایک وجہ میرا بیک گراؤنڈ اور مقصدی فلموں کی طرف میرا رجحان تھا۔ جس کے باعث میری شناخت آرٹ فلموں اور آف بیٹ فلموں کے حوالے سے ہوئی لیکن کمرشل سینما کی اہمیت اور افادیت سے بھی انکار ممکن نہیں بلکہ میرا خیال ہے کہ آرٹ فلموں سے زیادہ کمرشل سینما معاشرے پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے اس لیے کہ جو عام چیز آدمی کو متاثر کرتی ہے اور جس کی طرف زیادہ لوگوں کا رجحان ہوگا وہی اثرانداز ہوگی۔ بدقسمتی سے آرٹ فلموں کی تحریک نے ایک خاص حلقے کو متاثر تو کیا ہے لیکن کمرشل سینما کو جو کردار ادا کرنا چاہیے تھا یا جو کام سینما جیسے میڈیم سے لیا جاسکتا ہے وہ مقصد حاصل نہیں کیا جاسکا آرٹ فلمیں ایک فیشن کے طور پر دیکھی جاتی ہیں اور ان کے لیے وہ ذوق وشوق شائقین نے کبھی نہیں دکھایا جو وہ شاہ رخ یا دوسرے اسٹارز کی فلمیں دیکھنے کے لیے دکھاتے ہیں ایک دوسری وجہ جس کے باعث پیرلل سینما اپنا وجود تسلیم نہیں کرا سکا ہے شیام بینگل اور دیگر ڈائریکٹرز جنہوں نے اتنی بڑی بڑی فلمیں دی ہی مگر آرٹ فلموں کی تشہیر پر کبھی دھیان نہیں دیا یہ حقیقت ہے کہ ان فلموں کا بجٹ محدود ہوتا ہے اور پھر ایسی فلموں کا سرکٹ بھی لمیٹڈ ہے لہذا ہم محدود وسائل میں رہتے ہوئے ساری پلاننگز کرتے ہیں اس کے باوجود پبلسٹی کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے لگتا ہے کہ پیرلل سینما سے وابستہ لوگ بھی اس

بارے میں سوچنے لگے ہیں اور یہ رجحان بڑھ رہا ہے کہ آف بیٹ یا آرٹ فلموں کو بھی تشہیر کی ضرورت ہے انڈسٹری کی بقا کے لیے ہمیں دونوں طرز کے سینما کو فروغ دینا چاہیے اور اس سلسلے میں حکومت کو بھی سپورٹ کرنا ہوگا کیونکہ جہاں آرٹ کا رشتہ کمرشل سینما سے ٹوٹ جائے وہاں فلم انڈسٹری کے وجود کو بھی خطرات لاحق ہو جاتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ بولی ووڈ فلم میکرز میں شیز کی اوورنیس نہیں ہے یا وہ اس حقیقت کو جھٹلا سکتے ہیں۔

اور ہر بار ان کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آیا تو میری آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ ابا کی پیدائش اعظم گڑھ کی تھی جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض کے ہمعصروں میں ان کا نام لیا جاتا وہ اعلیٰ تعلیم کی خواہش کے باوجود 1942 میں زور پکڑنے والی کوئٹ انڈیا تحریک کی وجہ سے اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکے جس کی خلش تمام عمر ان کو رہی لیکن جب بھی علمی و ادبی حلقوں میں جاتے اپنے نظریات کے بل بوتے پر ہی لوگوں پر علمی قابلیت کی دھاک بٹھا دیتے۔ وہ مارکس کے نظریات کے حامی



'منی' کی اپنے والد اور والدہ کے ساتھ ایک یادگار تصویر

میں اپنے ابو کو بے حد مس کرتی ہوں اور ان کے جانے کے بعد احساس ہوا ہے کہ ابا کی شفقت کا سایہ جب تک ہمارے سروں پر تھا ہمیں اس کی اہمیت کا احساس ہی نہیں تھا لیکن کڑی دھوپ میں آنے کے بعد سائے کے چھن جانے کا احساس ہوتا ہے ان کے انتقال کے بعد میں نے ان کی مووی نسیم کئی بار دیکھی

تھے اور پکے سوشلسٹ تھے۔ سیاست اور سماجی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انقلابی شاعری کرتے کرتے فلمی شاعری کی طرف آئے اور یہاں بھی انہیں بڑا معتبر مقام ملا۔ ان کے تین مجموعہ کلام 'آخر شب، جھنکار اور آوارہ سجدہ' کے نام سے شائع ہوئے۔ ابا نے اسکرپٹ رائٹنگ کی طرف نانو بھائی

وکیل کی خواہش پر رجوع کیا اور ان کے لیے پہلی فلم یہودی کی بیٹی ۵٦ء کا اسکرپٹ لکھا۔ کئی فلموں کے گانے اور اسکرپٹس لکھنے کے بعد انہیں فلمی شاعر کی حیثیت سے شہرت گردوت کی 'کاغذ کے پھول، سے ملی جس کے گانے اس زمانے میں بیحد مقبول ہوئے تھے۔ اس کے بعد چیتن آنند کی نیشنلسٹ وار پر بنائی گئی مووی حقیقت 46ء اور کمال امروہوی کی 'پاکیزہ، 71ء سے بام عروج ملا۔ مجھے ذاتی طور پر ان کی قلم گرم ہوا، بہت پسند ہے جو عصمت چغتائی کے ناول پر بنائی گئی ہے اس فلم کے مکالمے، گیت، اور اسکرین پلے ابا نے لکھے تھے۔ بطور مکالمہ نگار، ان کی فلم من تھن ٦٧ء اور رشی کیش مکرجی کی باورچی 72 جس کے گانے انہوں نے لکھے مجھے بے حد پسند ہیں رمن کمار نے ان کی شخصیت اور زندگی پر ایک ڈاکومینٹری بنائی تھی جس میں ان کا کلام پیش کیا گیا ہے یہ فلم ایک تاریخی دستاویز ہے۔ اس کے علاوہ ''نسیم'' کا میں ضرور ذکر کرنا چاہوں گی جو ان کے خیالوں کی ایک تصویر تھی جسے انہوں نے فلم کے بڑے کینوس پر خود اپنے ہاتھوں سے پینٹ کیا۔ نسیم بنا کر وہ بے حد ریلیکس محسوس کرنے لگے تھے اور اس کے بعد ان کے چہرے پر طمانیت کا ایسا احساس رہتا تھا کہ گویا انہوں نے اپنی زندگی بھر کا نچوڑ اس فلم می پیش کر دیا۔ ہو میری والدہ شوکت اعظمی میں انہیں بہت باہمت خاتون قرار دیتی ہوں جنہوں نے اپنی پوری زندگی تحریک کے نام کر دی انہوں نے اپنی ساری توانائیاں افکار و نظریات مجھ میں منتقل کر دیے اب میرے اندر جو عورت سماجی ناہمواریوں کے خلاف صف آرا ہے وہ انہیں کا نیا روپ ہے۔ خاندان کے دیگر لوگوں میں میرا بھائی بابا اعظمی اور بھابی تنویٰ اعظمی کے نام بھی میں اپنی ذات سے الگ نہیں کر سکتی۔ بھائی اور بھابی نے مجھے جو پیار اور اعتماد دیا میں اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی، ابا کے بعد مجھے لگتا ہے کہ بابا ہی ان کے نام کی مشعل اور تحریک کو لے کر آگے بڑھے گا اور یقیناً ان کا نام اور تحریک زندہ رہے گی۔ جب تک کہ اس معاشرے میں کمزوروں کا استحصال جاری رہے گا۔ بھابھی تنویٰ اعظمی چھوٹی اسکرین اور فلمز میں کام کر چکی ہیں لیکن ان دنوں اداکاری سے ناتہ توڑ کر صرف گھر گرہستی سنبھالے ہوئے ہیں، ان کی پرفارمنسز مجھے یاد ہیں خصوصاً راؤ صاحب میں ان کی ایکٹنگ کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ شاید کچھ لوگوں کے لیے یہ سرپرائز نگ ہو کہ کمرشل فلموں کی دو بڑی کامیاب ہیروئنیں فرح اور تبو کی ماں رضوانہ بیگم میری کزن سسٹر ہیں اور اس رشتے سے میں تبو کی آنٹی ہوئی لیکن درحقیقت میں اسے اپنی بیٹی کی طرح ٹریٹ کرتی ہوں اور جب بھی اس نے مجھے ایکٹنگ کے حوالے سے کچھ ٹپس مانگی ہیں اسے گائیڈ کر کے مجھے خوشی ہوئی ہے فیملی ممبرز کا تعارف کراتے ہوئے میں جاوید اختر صاحب کو کیسے بھلا سکتی ہوں جنہیں آپ سب مجھ سے زیادہ جانتے ہیں جاوید کی پہلی وائف ہنی سے بھی میرے تعلقات بہت اچھے ہیں اور ان کے دونوں بچے فرحان اور زویا مجھے ماں کا درجہ دیتے ہیں جس کے لیے میں ان کی شکر گزار ہوں۔ فرحان کی پیاری سی بیٹی مجھے دادی کہہ کر گلے لگ جاتی ہے تب مجھ میں ممتا کا احساس جاگتا ہے اور میں تھوڑی دیر کے لیے جذباتی ہو کر سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہوں کہ اتنے پیار بھرے خاندان کے ہوتے ہوئے مجھے خدا سے اور کچھ مانگنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟

جب میں بہت چھوٹی سی تھی تو سوچا کرتی تھی کہ میرے والد آخر کام کیا کرتے ہیں۔ نہ تو وہ کوئی کاروبار کرتے تھے اور نہ ہی دوسرے لوگوں کی طرح آفس جاتے تھے۔ ہر وقت کرتا پاجامہ پہنے کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ اس بات پر شروع شروع میں تو مجھے بہت ندامت سی محسوس ہوئی لیکن پھر جب میں نو سال کی عمر کو پہنچی تو ان ساری باتوں کی عادی ہو گئی تب میں اپنی فرینڈز سے جھوٹ بولا کرتی تھی کہ میرے والد کچھ بزنس کرتے ہیں لیکن ان کے بزنس کی نوعیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے شرم محسوس ہوتی تھی کہ آخر میں انہیں کیا بتاؤں کہ میرے والد ایک شاعر ہیں اور اسی پر ان کی گزر بسر ہے۔ یہ بات میں صرف جانتی تھی کہ وہ ہم سب کی کفالت اچھے طریقے

سے کرتے تھے اور کبھی کسی چیز کی کمی کا
اولادوں کو نہیں ہونے دیا لیکن لوگ تو شا
سی چیز تصور کرتے ہیں ان کی نظر میں شا
ہوتے ہیں اور یہ کوئی ایسی جاب نہیں ہے
لوگ اپنی اور اپنے بچوں کی کفالت کر سکیں
انہوں نے فلمی نغمہ نگاری شروع کی اور ا
رسالوں اور ٹریڈ پیپرز میں شائع ہوئیں تو
فرینڈز کے علم میں یہ بات آ گئی کہ میر
شاعر ہیں اور فلموں کے لیے گانے لکھتے
بھی ان کی باتیں سن کر فخر محسوس ہوا ا
بڑے مان سے کہتی کہ کیا تم لوگ نہیں
میرے والد شاعر اور نغمہ نگار ہیں۔ میں یہ
کہ میرے والد کوئی معمولی شخصیت نہیں ہیں
تحریر کے فن سے پہلی بار آشنا ہوئی جب
گرودت کی فلم کاغذ کے پھول کے لیے
نے کیا کیا حسین ستم تحریر کیا اس سلسلے میں
ہمارے گھر پر ہوئی تھی جس میں ابرار علو
اسکرپٹ کے متعلق بتایا اس میٹنگ میں
موجود تھے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس
ہماری پوری فیملی موجود تھی جس میں میر
ابھائی (بابا) بھی شامل تھے۔ کاغذ کے
گیتوں کی تیاری میری بابا کی یادداشتوں
ہے لیکن ابا اپنے کام کے بارے میں کسی
نہیں کرتے تھے وہ خاموشی سے لکھتے او
کے حوالے کر دیتے تھے ہمیں ان کی
بارے میں اسی وقت علم ہوتا جب ان کے
کمپوز ہو کر مارکیٹ میں آ جاتا تھا ایک گا
میں ریکارڈ ہوتا اس کے بعد اس کی آڈیو
آتی اور لوگ ریکارڈ خرید کر سننے کے
جاتے لیکن ابا اپنے گھر میں اجنبی ہی ر
تھے۔ ان کے لکھے لاتعداد گیت ایسے ہیں
ہیں اور جو میری یادداشت میں محفوظ
انہوں نے فلموں کے لیے بہت زیادہ کا
جس قدر بھی گانے لکھے وہ اپنا تا
میں کامیاب رہے ان کی شاعری کا کمال

ماس اپنی
ں کو بیکار
بیروزگار
جس سے
پھر جب
ں تصاویر
ہری تمام
الد ایک
تب مجھے
ں انہیں
تھیں کہ
نے لگی تھی
ں ان کی
وں نے
نا وقت
ی میٹنگ
نے بابا کو
رت بھی
ٹنگ میں
می، میر
ل کے
میں محفوظ
، ڈسکس
وڈیوسرز
ت کے
ا ہوا گانا
ند گھنٹوں
یٹ میں
گھر لے
کے قائل
مجھے پسند
حالانکہ
، کیا لیکن
چھوڑنے
ہے کہ دل

میں گھر کر جاتی ہے۔ کاغذ کے پھول کے گانے سپر ہٹ ہوئے جس وقت نے ...... اور دیکھی زمانے کی پار...... قابل ذکر ہیں لیکن مجھے یہ دونوں گانے پسند نہیں آئے یہاں تک کہ جب میں چھوٹی سی تھی اور لوگوں کو یہ گانے گنگناتے دیکھتی تھی تو حیرت کرتی تھی کہ آخر ان گیتوں میں ایسی کیا بات ہے کیونکہ میرے نزدیک اس فلم کا سب سے بہترین گیت ایک دو تین چار اور پانچ چھ اور سات آٹھ نو اور ایک جگہ سب رہتے تھے جھگڑے تھے پرانی صفر...... ایک نے دس کو بانٹتے دیکھا...... سب نے صفر کو لوٹا...... نو نے آٹھ سے آنکھ لڑائی۔ آٹھ نے سو سو بات بنائی اور پھر دو کو الگ الگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس گانے کی سچویشن یہ تھی کہ ایک ٹیچر اپنے بچوں کو پڑھا رہی ہے اور کھیل کھیل میں انہیں ایک پیغام دینا چاہتی ہے دراصل وہ اپنی کہانی بیان کر رہی ہے مجھے سمجھ نہیں آئی کہ میرا فیورٹ یہ سونگ کیوں لوگوں کی توجہ حاصل نہیں کر سکا ابا کے کئی یادگار گیتوں میں سے ایک تم جو اتنا مسکرا رہے ہو...... فلم ارتھ میں راج کرن اور مجھ پر فلمایا گیا تھا یہ گانا میرے لیے اس کے علاوہ کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتا کہ اس کے لیریکس میرے والد نے دیئے میری یہی کیفیت ہر اس گانے کے لیے ہوتی جس کے بول دل کو چھو لیں چاہے وہ کسی شاعر نے لکھا ہو اس گانے کو اسکرین پر مہیش بھٹ نے اس قدر خوبصورتی سے پیش کیا کہ ڈائریکٹر کی تخلیقی صلاحیتوں کو بے اختیار داد دینے کو دل چاہتا ہے مہیش بھٹ جی نے اس گانے کی نفسیات محسوس کرتے ہوئے بالکل اسی انداز میں اسکرین پر پیش کیا جن جذبات کا اظہار شاعر نے کیا۔ اس گانے پر مہیش صاحب نے بہت محنت کی تھی اور اس کا اندازہ اسکرین پر گانا دیکھ کر بخوبی ہو جاتا ہے۔ اپنے والد کے لکھے گانوں کی جو چیز مجھے بھاتی ہے وہ ان گیتوں کی سادگی ہے مثلاً ارتھ کا ایک اور گانا:

کوئی یہ کیسے بتائے کہ وہ تنہا کیوں ہے
وہ جو اپنا تھا وہی اور کسی کا کیوں ہے
یہی دنیا ہے تو پھر ایسی یہ دنیا کیوں ہے

یہی ہوتا ہے تو آخر یہی ہوتا کیوں ہے
وہ جو الفاظ اپنی شاعری میں استعمال کرتے تھے وہ اس قدر عام فہم اور سادہ ہیں کہ با آسانی سمجھ میں آ جاتے ہیں اسی لیے ان کے لکھے بول عام آدمی کے دل کو چھوتے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کا انسانی مشاہدہ اس قدر گہرا تھا کہ وہ ایک عورت کے ان جذبات کی بھی صحیح اور سچی عکاسی کرتے محسوس ہوتے ہیں جو اپنے شوہر کی محبت کا دم بھرتی ہے اور اسے کسی اور کا ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ ابا نے گرم ہوا کے مکالمے اور اسکرین پلے بھی لکھا کنیش ورما اور من تھن کے مکالمے ان کی تحریر کردہ تھے۔ ہیر رانجھا کا پورا اسکرپٹ انہوں نے منظوم شکل میں ترتیب دیا تھا یہ ان کا یادگار کام ہے اسکرپٹ اور مکالموں کے اعتبار سے گرم ہوا ایک ایسی فلم ہے جس کے مکالمے روح میں گھر کرتے محسوس ہوتے ہیں میری والدہ شوکت اعظمی کا کہنا ہے کہ اس فلم میں باپ بیٹی اور ایک بھائی کے اپنی بہن سے مکالمے احساس دلاتے ہیں کہ جیسے یہ کردار ہماری سوسائٹی کا ہی حصہ ہیں۔ ان کا لب و لہجہ اور زبان ہماری معاشرت سے متاثر نظر آتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ابا کے لیے مکالمہ لکھنا شاعری سے زیادہ آسان تھا۔ وہ اس وقت بے حد پرسکون دکھائی دیتے تھے جب کسی فلم کے مکالمے لکھ رہے ہوتے تھے میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ کام حاصل کرنے کے لیے انہیں کوئی جدوجہد کرنا پڑی ہو گانے ہوں یا اسکرین پلے وہ اپنے کام میں یکتا تھے اور جو لوگ ان کی تحریر کی قدر و قیمت سے آگاہ تھے ان کے پاس چل کر خود آتے تھے ابا کی سب سے اچھی ٹیوننگ پروڈیوسر ڈائریکٹر چیتن آنند سے تھی اور میں نے محسوس کیا کہ ان دونوں نے جب بھی مل کر کام کیا اس کی جو عملی تصویر سامنے آتی وہ شاہکار ہوتی تھی میں نے ان دونوں کو ساتھ کام کرتے اور اپنے پروجیکٹس پر مغز کھپاتے دیکھا ہے۔ چیتن آنند خاموشی سے کمرے میں داخل ہوتے اور میرے والد کے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ جاتے ان کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں مسلسل چین گردش کر رہی ہوتی تھی جس میں ان کی کار اور آفس کی چابیاں موجود ہوتی تھیں دونوں کئی کئی گھنٹے نشست کرتے اور ان کے درمیان مختلف موضوعات پر گفتگو جاری رہتی۔ ایک ایک گانے پر کئی کئی نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ مجھے اس بات پر حیرت بھی ہوتی تھی کہ چیتن آنند آخر کیوں ایک شاعر کے پاس اتنا وقت لگا دیتے ہیں جبکہ ایک فلم میکر کی خواہش ہوتی ہے کہ بس کام ہونا چاہیے لیکن بعد میں جب اس کا رزلٹ کامیابی کی صورت میں نکلتا تھا تو سمجھ آنے لگی کہ اچھی شاعری اور میوزک فلم کی کامیابی میں کلیدی اہمیت رکھتے ہیں۔ آپ ماضی کی فلمیں دیکھیں ان میں کوئی آئٹم سونگ نہیں ہوا کرتا تھا اس کے باوجود فلم کے تمام گانے اپنی جگہ اہمیت رکھتے تھے اور سنے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ کم مقبول گانوں کو بھی توجہ ملتی تھی دلچسپ بات یہ ہے کہ ابا آج کل فلموں میں دکھائے جانے والے آئٹم سونگز پر کوئی تنقید نہیں کرتے تھے جب کبھی ٹی وی یا سینما پر کوئی فلم دیکھ رہے ہوتے تھے تو انہوں نے کبھی بھی شاعری یا مکالموں پر بیزاری ک اظہار نہیں کیا اس کی وجہ یہ بھی کہ وہ ایک حقیقت پسند انسان تھے۔ وہ بڑی باغ و بہار شخصیت تھے۔ مثلاً ہمیں آج کل کے بے ہنگم گانے گنگنانے کی عادت سی ہو گئی ہے اور میں اکثر ان کے سامنے بے خیالی میں کوئی گانا گنگنانے لگتی تھی جیسے تیرے باپ کو دیکھا باندرا اسٹیشن پے...... تو وہ صرف مسکرا کر رہ جاتے اگرچہ باہر سے وہ بے حد سخت اور کرخت محسوس ہوتے تھے لیکن ایک بیٹی کی حیثیت سے میں جانتی ہوں کہ وہ بے حد ڈیسنٹ اور سوفٹ قسم کے انسان تھے۔ وہ اپنی بات سادہ لفظوں میں بیان کرنے کا ہنر جانتے تھے اور اسی لیے کم بات کیا کرتے تھے۔ ان کی شاعری میں بھی آپ کو اردو زبان کے سادہ اور آسان الفاظ ملتے ہیں اور وہ دوسرے شاعروں کی طرح مشکل پسندی کی طرف نہیں گئے۔ دوسری جانب چونکہ وہ ترقی پسند تحریک سے بھی وابستہ تھے لہٰذا ان کی شاعری کے اس شعبے میں ہمیں انقلابی اور مقصدی مواد ملتا ہے۔ مثلاً ان کا ایک گیت کتنے بازو کتنے سر...... میں ایک گہرا پیغام دیا گیا ہے یہ گانا میں آزاد ہوں کے لیے

انہوں لکھا تھا۔ ابا نے اس گانے میں پیغام دیا ہے گن لے دشمن دھیان سے ہارے گا وہ بازی جب کھیلے ہم جی جان سے۔ اسی طرح ان کے کئی گیت ہیں جن میں وہ رومانوی شاعر سے زیادہ ایک باغی شاعر نظر آئے لیکن ان کے لہجے میں کبھی مایوسی نہیں ہوتی تھی۔ ابا کی شخصیت اور کردار کے بارے میں مجھ سے زیادہ ان کی شاعری میں گواہی ملتی ہے۔ ان کی ایک نظم کا بند جس میں ان کی پوری شخصیت جھلکتی محسوس ہوتی ہے:

جو میری طرح جیا کرتے ہیں کب مرتے ہیں
تھک گیا ہوں مجھے سو لینے دو روتے کیوں ہو
سو کے بھی جاگتے رہتے ہیں جانباز سنو
میری آواز سنو...... پیار کا راگ سنو

فلم لائن جوائن کرنے سے پہلے میں پونا انسٹیٹیوٹ میں تربیت کے دوران بننے والی دو شارٹ فلموں دی دسمبر ایوننگ، اور منشی جی (73ء) میں کام کر چکی تھی ان فلموں سے مجھے بے حد اعتماد ملا تھا خصوصاً کیمرے کا سامنا کرتے ہوئے نئے فنکاروں کو جھجک ہوتی ہے اس حوالے سے کم از کم میں کیمرا نشس نہیں تھی، جب پہلی بار خواجہ احمد عباس کی فلم' فاصلہ، کے سیٹ پر شوٹنگ کے لیے پہنچی تو کیمرا تکنیک اور فلم کی باریکیوں سے آگاہ تھی۔ یہ ایک میڈیوکر فلم تھی جو میں نے سب سے پہلے جوائن کی لیکن شیام بینگل جی کی انکور، پہلے ریلیز ہوگئی کیونکہ شیام برق رفتاری سے کام کرنے کے عادی رہے ہیں جبکہ خواجہ عباس وقت کی محدودیت کو نہیں مانتے تھے یہ میرے لیے اچھا ہی ہوا کہ انکور میری پہلی سائننگ فلم فاصلہ سے پہلے ریلیز ہوگئی کیونکہ فاصلہ میری توقعات پر پوری ہیں اتری۔ اس کے علاوہ مجھے انکور کے تھیم نے بھی متاثر کیا تھا یہی وجہ ہے کہ میں نے اس فلم میں جی لگا کر کام کیا جس کا رزلٹ اسکرین پر لوگوں نے دیکھا اور خاص طور پر شیام بینگل میری پرفارمنس سے اتنے مطمئن ہوئے کہ اس کے بعد مجھے اپنی دیگر فلموں کی کاسٹنگ میں نظر انداز نہیں کر سکے میں نے ان کے ساتھ نشانت، جنون، منڈی، سمسن اور انترند جیسی یادگار فلمیں کیں میری خوش قسمتی کہ کیریر کے مختلف ادوار میں مجھے پیرلل اور کمرشل سینما کے جینئس لوگوں کے ساتھ کام کرنے کے مواقع ملتے رہے۔ مرنیال سین کے ساتھ کھنڈر، جینیسز، اور ایک دن اچانک سعید مرزا کی البرٹ پنٹو کو غصہ کیوں آتا ہے؟ گوتم گھوش کی پارسائی، براتج کی سپرش اپرسین کی ستی (ان کے ساتھ ایک ٹی وی ڈرامہ بھی کیا) اور مہیش بھٹ کی ارتھ، وشواس گھات، وغیرہ میری ایسی یادگار فلمیں ہیں جنہیں میں اپنے کیریر کا حاصل قرار دے سکتی ہوں۔ کمرشل سینما کے حوالے سے مجھے من موہن ڈیسائی (امر اکبر انتھونی، پرورش) پرکاش مہرہ (جوالا مکھی) ششیکر کپور (معصوم) پرکاش جھا (مرتیوڈنڈ) جیسے ڈائریکٹرز کا ساتھ ملا اور اس لسٹ میں مزید کئی نام بھی جوڑے جا سکتے ہیں۔ ویسٹ سائیڈ سینما کے لیے اسماعیل مرچنٹ (ان کسٹڈی) رولینڈ جوف (سٹی آف جوائے) جون شیل سنر (میڈم سوازتسکا) جیسے ڈائریکٹرز کے ساتھ کام کرکے میں سمجھتی ہوں کہ مین نے سینما کے حوالے سے اپنے مشاہدے اور علم کو مزید وسعت دی ہے۔ آف بیٹ فلموں سے غیر معروف ہیروئن کی حیثیت سے اسٹارٹ لینے کے بعد جس فلم کو میں اپنی کامیابی کی پہلی سیڑھی قرار دوں گی وہ سی پی ڈکشت کی فقیرا ہے جس کی کامیابی نے مجھے در حقیقت مین اسٹریم ہندی سینما اسٹار کے طور پر شناخت دی۔ اس دوران تھیٹر سے اپنا رشتہ بنائے رکھا اور آئی پی ٹی اے کے تحت سفید کنڈلی، جیسے کھیلوں میں ایکٹ کیا جو میرے کریڈٹ پر چند یادگار ڈراموں میں سے ایک ہے۔ تھیٹر سے تعلق کے نتیجے میں جاوید اختر سے ملاقات اور دوستی ہوئی اور ہمارے درمیان قربت بڑھی۔ جاوید اختر شاعری کے ساتھ ساتھ تھیٹر میں بھی حصہ لیا کرتے تھے اور ایک اچھے جذباتی اداکار کے طور پر جانے جاتے تھے لیکن پھر ایکٹنگ شاید ان کے لیے کمفرٹیبل نہیں رہی البتہ تھیٹر سے تعلق اور ناتا وہ ختم نہیں کر سکے اور میں سمجھتی ہوں کہ کوئی بھی شخص جو تھیٹر پر کام کر چکا ہو، اس ماحول سے مانوس رہ چکا ہو، اس کے لیے کافی مشکل ہوتا ہے کہ وہ اس سے اپنا ناتا توڑ سکے۔ اس فیلڈ کا حارم اور کشش اسے اپنی جانب ضرور

کھینچ لاتے ہیں۔ میرا تھیٹر سے تعلق اس وجہ سے برقرار ہے کہ یہ پرفارمنگ آرٹ کی واحد فیلڈ ہے جسے ابھی تک کمرشل ازم کا عفریت نگل نہیں سکا ہے، تھیٹر کے حوالے سے جو مقصدی کام ہوا ہے وہ ایک تحریک کی حیثیت رکھتا ہے جس کے معاشرے پر گہرے اثرات ہیں۔ ہم نے اپنی اقدار کی قربانی دے کر جو ترقی حاصل کی ہے میرے اور میرے ہم خیال لوگوں کے نزدیک یہ تباہی کا راستہ ہے جو ہمارے کلچر اور سوسائٹی کو زوال کی طرف لے جارہا ہے۔ ہم لوگوں کو بیداری دینے کے بجائے میٹھی گولی دے رہے ہیں تاکہ وہ گہری نیند سوتے رہیں۔ ہماری تحریک ان سوئے ہوئے لوگوں کو بیدار کرنا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ ہمارے شعبے میں بچوں کے لیے کچھ کام نہیں ہورہا ہے تو میں نے نہ صرف سنیما انڈسٹری بلکہ پرفارمنگ آرٹ کے دیگر شعبوں کی سرکردہ شخصیات سے اس سلسلے میں بات کی اور اس بار پر زور دیا کہ بچوں کے لیے الگ سنیما ہونا چاہیے جسے ہم صرف چلڈرن سنیما قرار دے سکیں اور جو صرف بچوں کی دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی ذہنی و معاشرتی تربیت کرسکے۔ جب میں نے چلڈرن فلم سوسائٹی کی چیئر پرسن کا چارج سنبھالا تو میرے سامنے یہی ٹاسک تھا کہ بچوں کو بھی تفریح کا حق دیا جائے اور اس سلسلے میں بولی ووڈ فلم میکرز کو اپنا کنٹری بیوشن دینا چاہیے اس حوالے سے مذکورہ تنظیم نے کئی پروجیکٹس کو ایسوسی ایٹ کیا میری فلم ''مکڑی'' خاص طور پر بچوں کے لیے بنائی گئی ایک ایسی تفریحی فلم ہے جس نے انڈین سنیما کو نئی راہ دکھائی ہے اور فلم میکرز کو باور کرایا کہ بچوں کا سنیما بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے بچوں کے لیے بنائی گئی فلموں کی کامیابیاں میرے اس دعوے کا ثبوت ہیں۔ آرٹ فلموں میں مین اسٹریم سنیما کے درجے پر نہیں رکھا جاتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ موضوعات میں اور آرٹ کی درست اور حقیقی شکل پیش کرنے کے حوالے سے پیرلل سنیما نے انڈسٹری کی بقا میں اہم کردار ادا کیا ہے پیرلل سنیما ہی دراصل سنیما کا اصل تصور ہے جسے کمرشل فلموں نے بڑی حد تک نقصان

پہنچایا ہے۔ [illegible] فلم کے بڑے پردے سے جو کام لیا جاسکتا تھا [illegible] ف پیسہ کمانے کی لالچ کے باعث نہ لیا جاسکا کوئ [illegible] پروڈیوسر بڑی مشکل سے ایک چھوٹے بجٹ کی آ [illegible] لم پر پیسے لگانے کے لیے تیار ہوتا ہے جبکہ کروڑوں کی لاگت سے بننے والی فلموں پر جن کے بجٹ کی واپسی مشکوک ہوتی ہے پروڈیوسرز فوراً سرمایہ کاری کے لیے تیار رہتے ہیں بس ڈائریکٹر اور کاسٹ اچھی ہونی چاہیے موضوعات اور کہانیوں سے کمرشل سنیما کے میکرز کو کیا سروکار۔ میں نے جن فلموں میں کام کیا ان کی کہانیاں اور موضوعات ہمارے معاشرے کی محرومیوں کی عکاسی کرتے ہیں اور یہ کردار ہر اس انسان کے اندر سانس لیتے ہیں جو معاشرے کا حصہ ہیں اور جو ساری غلاظتوں کے باوجود اس سوسائٹی کو قبول کرنے پر آمادہ ہے۔

میری پہلی فلم انکور میں ریجنل Accents شامل تھا۔ اس فلم میں لکشمی کا کردار ان عورتوں کی ترجمانی کرتا ہے جو زمینداروں کے مظالم اور ہوس کا نشانہ بن جاتی ہیں۔ شیام بینگل کی فلم شانت میں بھی اسی قسم کے ٹاپک کو ڈسکس کیا گیا جس میں ایک ٹیچر کی وائف کا چار زمیندار گینگ وار کردیتے ہیں شیام کے ساتھ میری ایک اور خوبصورت فلم جنون بھی ہے جس میں ایک شادی شدہ مرد کے برٹش گرل سے تعلقات کو ڈسکس کیا گیا ہے یہ کہانی پارٹیشن سے پہلے کی ہے جنون ایک سچے واقعہ پرمبنی تھی۔ 1857ء میں ایک مسلمان پٹھان سرفراز خان (نصیرالدین شاہ) اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایک چرچ پر حملہ کرتا ہے جہاں عبادت کی غرض سے موجود رتھ لیب ڈور اپنی ماں اور نانی کے ساتھ فرار ہوکر ایک ہندو کے گھر میں پناہ لیتی ہے مگر جاوید خان (ششی کپور) انہیں ڈھونڈ نکالتا ہے اور رتھ سے شادی کی خواہش ظاہر کرتا ہے جب اسے غدر کے سپاہیوں کی شکست کی خبر ملتی ہے تو وہ مخالف فوج کے ساتھ مل جاتا ہے اور بالآخر مارا جاتا ہے اس کے مرنے کے کئی سال بعد رتھ کا برطانیہ میں انتقال ہوجاتا ہے۔ کھنڈر دیہات سے تعلق رکھنے والے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکے دیپو کی کہانی ہے جو اپنے دوستوں

کو گاؤں آنے کی دعوت دیتا ہے تا کہ وہ تباہ حال مناظر کی تصویر کشی کر کے دنیا کے سامنے پیش کر سکیں دیبو کے فوٹوگرافر دوست سبھاش کو ایک تباہ شدہ مکان کے کھنڈر میں ایک لڑکی جیمنی ملتی ہے جو اپنی نابینا ماں کے ساتھ وہاں رہتی ہے۔ جیمنی کی منگنی اس کے ایک کزن سے طے ہوتی ہے جس سے وہ مل نہیں سکتے سبھاش ایک پلان بناتا ہے وہ جیمنی کو حاصل کرنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ محبت اور ہوس کے جذبوں کے بیچ اس خوبصورت فلم جیمنی کا کردار میرے چند یادگار کرداروں میں سے ایک ہے۔ اسی طرح شیام کی فلم منڈی بھی ہمارے معاشرے پر ایک گہری چوٹ ہے۔ اس فلم میں بڑی خوبصورتی سے کھوٹوں میں بسنے والی عورتوں کی معاشرت اور سماج پر ان کے اثرات ڈسکس کیے گئے ہیں۔ میں نے اس فلم میں رک منی بائی کا کیریکٹر نبھایا جو ایک چکلہ چلاتی ہے کوٹھے کی تمام عورتوں میں زینت (سمیتا پاٹل) اس کی سب سے زیادہ چہیتی ہے جو بائی کی نگرانی میں کلاسیکل سنگیت کی تربیت لیتی ہے سماج کے ٹھیکے داروں کو کوٹھے کا وجود آنکھوں میں کھٹکنے لگتا ہے تو وہ اسے ہٹانے کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن اس اشو پر خود ان میں پھوٹ پڑ جاتی ہے کیونکہ ایک حلقہ جس میں مسٹر اگروال جیسے لوگ موجود ہوتے ہیں یہ کہتا ہے کہ طوائفیں اور دھندہ کرنے والی عورتیں بھی معاشرے کا حصہ ہیں جبکہ گپت (کلبھوشن کھربندا) جیسے لوگ اسے سوسائٹی کے لیے ناسور سمجھتے ہیں۔ جب یہ مجبور عورتیں نقل مکانی کر کے نئی جگہ جاتی ہیں تو اسی علاقے کے لوگ اپنی جنسی ضرورتوں کی تسکین کے لیے ان کے پیچھے پیچھے نقل مکانی کرنے لگتے ہیں اور اس طرح ایک نئی بستی آباد ہونے لگتی ہے۔ یہ کہانی معاشیات کے ایک اصول کو پورا کرتی ہے جہاں منڈی ہوگی وہاں مال اترے گا اور پھر وہاں بیوپاری اور گاہک بھی آئیں گے۔ دھندہ کرنے والی عورتوں کو اگر متبادل روزگار نہیں دیا جاتا تو وہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کیا کریں؟ وہ دوسروں کے نفس کی غلام نہ بنیں تو پھر کیا کریں؟ اس فلم میں شیام جی نے بڑے دھیمے

لہجے میں سماج کے نام نہاد ہمدردوں کو جھنجوڑنے کی کوشش کی ہے۔ سمن کی کہانی ایک مڈل کلاس فیملی سے متعلق ہے اس فلم میں میرا کردار اوم پوری (راماولا) کی وائف کا ہے جس کا نام گورما ہے یہ فیملی بڑی مشکلوں سے گزر بسر کرتی ہے اور پورے کنبے کی کفالت اکیلے راماولا پر ہوتی ہے جو کھڈی پر کپڑا بننے کا کام کرتا ہے۔ اچانک ایک کردار مندیرا (نینا گپتا) ان کی زندگیوں میں تبدیلی لانے کا سبب بن جاتی ہے جو ان کا کپڑا مہنگے داموں خرید کر اسے نمائشوں میں لے جانا چاہتی ہے لیکن گورما اس صورت حال سے مندیرا سے رقابت محسوس کرنے لگتی ہے اور اپنے شوہر کو اس کا کام کرنے سے روکتی ہے۔ میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات کی ایک مختلف تصویر اس فلم میں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ خاندان کے معاشی مسائل سے زیادہ اہمیت انائیت کی ہے جو عورت کے لیے سب سے مقدم ہے۔ گورما کا کردار جو کہ کسی بھی مڈل کلاس فیملی کا ہو سکتا ہے اس قدر جذباتی دکھایا گیا ہے کہ وہ اپنے شوہر کو خود سے دور جاتا دیکھ کر خاصی ایگریسو ہو جاتی ہے یہاں تک کہ اپنے شوہر کو آگ لگانے کی کوشش بھی کرتی ہے۔ پستون جی ڈائریکٹر دے مہتا کی ایک معیاری فلم ہے اس فلم میں پارسی کمیونٹی کے معاشرتی مسائل کو ڈسکس کیا گیا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ پارسی کمیونٹی کے رہن سہن، عقائد اور معاشرت کی بڑی خوبصورت جھلک اس فلم میں پیش کی گئی ہے۔ پستون جی بھارت میں موجود سوا لاکھ سے زائد پارسیوں کی معاشرت اور رویوں کی ترجمانی کرتی ہے نصیر الدین شاہ اس نے اس فلم میں فیرج شاہ کا کردار نبھایا جو اس فلم کا نیریٹر بھی ہے۔ انوپم کھیرے نے پستون جی کا کردار ادا کیا ہے یہ دونوں کیریکٹر ایک لڑکی جیرو سے مشترکہ محبت کرتے ہیں لیکن فیروج اپنی محبت کا اقرار کرنے سے ہچکچاتا ہے اور جیرو سے اظہار محبت کی خواہش دل میں لیے ہی دوسرے شہر چلا جاتا ہے اور پھر کئی سال بعد ممبئی واپس آ کر جیرو کو تلاش کرتا ہے لیکن تب بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ جیرو کا کردار بھی میرے چند یادگار اور

مشکل کرداروں میں سے ایک ہے کیونکہ اس فلم کے لیے مجھے اپنی ٹون تبدیل کرنا پڑتی ہے اور یہ تجربہ میرے لیے خاصا منفرد ثابت ہوا۔ کلپنا جی لاجمی کے ساتھ میری پہلی فلم ایک پل بھی ایک خوبصورت کہانی پرمبنی ہے اس سے قبل وہ شیام جی کی اسسٹنٹ تھی اور چند ڈاکومنٹریز بنا چکی تھی لیکن فیچر فلم ڈائریکٹ کرنے کا یہ اسے پہلا چانس ملا تھا۔ اس فلم میں دکھایا گیا ہے کہ ایک عورت جنسی ضرورت پورا کرنے کے لیے کس طرح شوہر کے اعتماد کو دھوکا دیتی ہے ایک پل میں جو ماحول دکھایا گیا ہے وہ آسام کا ہے جہاں ایک لڑکی کی ارینج میرج چائے کے کاشتکار نصیر الدین شاہ سے ہو جاتی ہے لیکن شوہر کی غیر موجودگی میں وہ لڑکی اپنے شوہر کے باغات کے ایک ملازم سے انوالو ہو جاتی ہے اور جنسی ملاپ کے نتیجے میں حاملہ بھی ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچے کو ضائع کر دے لہذا وہ اسے جنم دینے کا ارادہ کر لیتی ہے لیکن اپنے شوہر کو بھی اندھیرے میں نہیں رکھتی۔ کلائمکس میں شوہر اس سچویشن کو قبول کر لیتا ہے اور بیوی کو اس کے ناجائز بچے سمیت اپنانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ کلپنا نے اس فلم کے ڈرامائی مناظر کو خوب نبھایا اور انہیں اوور ہونے سے بچایا خصوصاً جب بیوی شوہر کو بتاتی ہے کہ وہ اس بچے کا باپ نہیں ہے۔ یہ جذباتی اور ڈرامائی سین کلپنا نے بے حد سکون کے ساتھ پکچرائز کیا اور بلا وجہ ہیوی بیک گراؤنڈ کے استعمال سے سین کا تاثر خراب نہیں کیا۔ اسی طرح ایک اور نئی لیڈی ڈائریکٹر سائی پرانج پائی کے ساتھ مجھے پہلی بار سپرش کرنے کا تجربہ ہوا اور اپنی پہلی فلم میں ہی پرانج نے خود کو منوالیا۔ یہ کہانی ایک بلائنڈ اسکول ٹیچر سے متعلق ہے جس میں نصیر الدین شاہ نے اسکول پرنسپل کا رول پلے کیا ہے۔ وہ دوسروں کا سہارا قبول نہیں کرتا اور بے حد خوددار انسان ہے لیکن کویتا اس کی زندگی میں آ کر اسے اتنا تبدیل کر دیتی ہے کہ وہ لڑکی اس کی عادت بن جاتی ہے۔ کویتا اپنے پہلے شوہر کے انتقال کے بعد تنہا زندگی گزار رہی ہوتی ہے لیکن اچانک اسے پرمارل جاتا ہے جو اسے بلائنڈ اسکول جوائن کرنے کی آفر دیتا ہے اور پھر دونوں ایک دوسرے کے قریب آنے لگتے ہیں۔ پرانج اس حوالے سے بیحد لکی رہی کہ اس کی پہلی ہی فلم کو تین ایوارڈز ملے حالانکہ یہ فلم ایوارڈ جیتنے کے پانچ سال بعد 1984ء میں ریلیز ہوئی لیکن 79ء میں ہی چونکہ اسے سنسر سرٹیفکیٹ مل چکا تھا لہذا یہ فلم ایوارڈز کی نامزدگیوں میں شامل کر لی گئی۔ سپرش آف بیٹ فلم ہونے کے باوجود باکس آفس پر اچھا بزنس کرنے میں کامیاب رہی اور اس حوصلہ افزائی نے پرانج کو مزید ہمت دی کہ وہ پیرلل سینما سے اپنا رشتہ جوڑے رکھنے پر آمادہ ہوئی۔ بولڈ موضوعات کے حوالے سے میری چند یادگار فلموں میں لکھنؤ کی معاشرت اور ہند و مسلم فسادات کے پس منظر میں بنائی گئی مظفر علی انجمن اور ڈائریکٹر گوتم گھوش کی پار بھی قابل تذکرہ ہیں۔ پار میں فیوڈل ازم کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے اور مزارعوں پر ہونے والے مظالم کی تصویر کشی کی گئی ہے کہانی کے مطابق ایک غریب جوڑے کو گاؤں کے زمیندار کی جانب سے گاؤں چھوڑنے کا حکم ملتا ہے جس کے بعد دونوں کلکتہ چلے جاتے ہیں جہاں ان دونوں میاں بیوی کو لوگوں کو دریا کے پار پہنچانے کا کام مل جاتا ہے۔ حاملہ ہونے کے باوجود بیوی شوہر کا ساتھ دیتی ہے کیونکہ ان کے پاس دریا کے علاوہ کوئی گھر نہیں ہوتا اسی پانی کے گھر پر دریا پار کرتے ہوئے حادثاتی طور پر بچہ ماں کے پیٹ ہی میں مر جاتا ہے جس پر وہ تکلیف محسوس کرتی ہے لیکن اس سے زیادہ کربناک ایک ماں کے لیے اپنے بچے کی موت ہوتی ہے جسے اس نے جنم نہ دیا ہو۔ اس فلم کا ایک سین تو خاصا جذباتی ہے جب میں اپنے شوہر (نصیر الدین شاہ) سے کہتی ہوں کہ ذرا سنو وہ میرے پیٹ میں چہک رہا ہے۔

میری کئی فلمیں ایسی ہیں جو کسی وجہ سے نہ بن سکیں لیکن مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہے گا کہ وہ اسکرپٹس ہم نے کھو دیئے۔ ایسے کئی موضوعات جنہیں کبھی نہیں چھیڑا گیا اور ان میں اسپیشلی میرے لکھے گئے کردار، جو لوگوں تک نہ پہنچ سکے مثلاً میری ایک فلم داٹر، پر سنسر بورڈ نے اعتراض کرتے ہوئے اس کا

اسکرپٹ بین کر دیا حالانکہ اس فلم میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں تھی کے زاد گستاد کے ساتھ چینل فور کے لیے ایک مووی دی اسٹوری ٹیلر ایک فلم ہے جس میں مجھے بنجارن کا رول نبھانا تھا لیکن یہ پروجیکٹ فنانشل کرائسیز کی وجہ سے شروع نہ ہو سکا اس کے علاوہ کئی ایسے پروجیکٹس ہیں جنہیں نہ کرنے کا مجھے افسوس رہے گا لیکن میں نے جس قدر فلمیں اور کردار اسکرین پر پرفارم کر لیے ہیں کیریر کے اس مقام پر آ کر کم از کم مجھے یہ اطمینان ضرور ہے کہ میں نے کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا مجھے یقین ہے کہ ابا کی روح خوش ہو گی کہ ان کی منی نے کبھی ان کے نظریات کے خلاف کوئی کام نہیں کیا۔

اپنے حوالے سے منظر عام پر آنے والے اسکینڈلز پر وضاحت کرنا ضروری نہیں سمجھتی۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو حقائق کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں جہاں تک کنٹروورسیز کا تعلق ہے تو وہ میرے مخالف ہو جاتے ہیں۔ میں یہ اعتراف کرتے ہوئے ذرا نہیں ہچکچائی کہ شیکھر کپور اور بجمین گیلانی سے میری دوستی رہی ہے۔ جب مجھے احساس ہوا کہ یہ دونوں میرے صرف اچھے دوست ہیں تو میں نے ان سے شادی کا فیصلہ تبدیل کر لیا اور تب مجھے جاوید اختر صاحب نے یہ احساس دلایا کہ وہ میرے لیے زیادہ مخلص ہیں۔ شیکھر کپور سے میری منگنی پر خاندان کی جانب سے کسی نے مزاحمت نہیں کی تھی اور سب کچھ طے تھا لیکن اچانک شیکھر کی ماں نے اعتراض کر دیا چونکہ وہ پنجاب سے تعلق رکھتی تھیں اور چاہتی تھیں کہ ان کی بہو پنجابی ہو جبکہ میں پنجابی تھی اور نہ ان کی ہم مذہب نتیجتاً شیکھر سے میری منگنی ٹوٹ گئی۔ جاوید سے میری شادی پر میڈیا اور خصوصاً ٹریڈ کے لوگوں کو خاصی حیرت ہوئی کیونکہ جاوید پہلے سے شادی شدہ اور دو بچوں کے باپ تھے۔ ہماری شادی کی خبریں بھی مہینے بھر پہلے ہی سے میڈیا اور پریس والوں کو مل گئی تھیں حالانکہ ہم دونوں اسے خفیہ رکھنا چاہتے تھے لیکن وہ کہتے ہیں نا کہ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے تو ہمارے ساتھ بھی وہی معاملہ ہوا۔ گھر کی ایک بھیدی نے تمام



ٹریڈ کو خبر کر دی کہ جاوید اور شبانہ شادی کرنے والے ہیں۔ اس نعقد نے ہنی اور ان کی فیملی کو بے حد متاثر کیا لیکن میں اس حوالے سے خود کو قصوروار ہرگز نہیں ٹھہراؤں گی۔ اس لیے کہ دوسری شادی کا فیصلہ جاوید کا تھا ہنی کے دونوں بچے مجھے اپنے بچوں کی طرح عزیز ہیں اور وہ مجھے ماں کا درجہ دیتے ہیں۔ جاوید سے میری شادی ایک شاعر کے لیے میرے جذبات کا نتیجہ ہے اور میں انہیں صرف اسی وجہ سے پسند کرتی ہوں کہ وہ ایک شاعر ہیں۔ یہ سچ ہے کہ مجھے جاوید سے زیادہ ان کی شاعری سے عشق ہوا لیکن اب ہم دونوں ایک دوسرے کی عادت بن چکے ہیں۔

ان دنوں میری مصروفیات ہیومن رائٹس فورمز تک محدود ہیں۔ اس کے علاوہ تھیٹر سے میں اپنا رشتہ بنائے رکھنا چاہتی ہوں میں آرٹ لورز اور دنیا بھر میں پیرلل سینما کے مداحوں کو ٹریبیوٹ دینا چاہوں گی جن کی وجہ سے آرٹ فلموں اور متوازی سینما کا وجود قائم ہے۔

☆☆......☆☆

دی سگنل مین

CHARLES DICKENS

ترجمہ: نجیب عمر

''ہیلو...... نیچے وہاں۔''

اس نے یہ آواز سنی کوئی اسے پکار رہا ہے۔ وہ اپنے ڈبے نما کمرے کے دروازے پر چھوٹا سا سرخ، سبز رنگ کا جھنڈا لیے کھڑا ہے۔ جسے اس نے ڈنڈے پر لپیٹ رکھا ہے۔ وہاں زمین کی ہیئت اور سناٹے کی بنا پر کوئی آواز کی سمت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا چونکہ میں سرنگ کے چھت نما کٹاؤ کے سرے پر کھڑا ہوں اور اس کا نیچے سے مجھے دیکھنا تقریباً ناممکن ہے۔ میں نے کئی زاویے بدل کر اسے دیکھنے کی کوشش کی لیکن یہ غیر معمولی بات ہے کہ مجھے دیکھے بنا اسے میری موجودگی کا ادراک ہے۔ وہ اپنے چھوٹے قد اور دھند کے باوجود مجھے محسوس کر رہا ہے۔ وہ سرنگ کے سامنے کھائی میں ہے اور میں بلندی پر۔ ڈوبتے سورج کی تیز شعاعیں میرے سامنے اسے دیکھنے کے لیے مجھے اپنی آنکھوں پر ہتھیلی کا سایہ کرنا پڑا تا کہ میں اسے کسی حد تک دیکھ سکوں۔

میں ایک تنہائی پسند شخص ہوں اور شام کی چہل قدمی عادتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ میں ٹہلتا ہوا اکثر اس سطح مرتفع پر آ جاتا ہوں جس کے نیچے سرنگ سے برآمد ہوتے ٹرین کو سیٹی بجاتے دیکھنا مجھے بھلا لگتا ہے۔ تنہائی مجھے انگیخت کرتی ہے اور میرے غور و فکر کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے لیکن میں نے محسوس کیا کہ یہ سرنگ کے دہانے کے قریب کوئی اور بھی یہاں ہے۔ تجسس کی بنا پر میں اسے دیکھنا اور اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے دوبارہ پکارا۔

ہیلو!...... نیچے (اگر مجھے سن سکتے ہو)۔

پٹریوں کے درمیان آگے بڑھتے پوری طرح گھوم کر نظریں اوپر اٹھائیں اور ٹھیک اپنے اوپر اس نے مجھے دیکھا۔

''کوئی راستہ ہے کہ میں نیچے آ کر تم سے بات کر سکوں''

بغیر کوئی جواب دیئے وہ میری جانب اوپر دیکھتا رہا اور میں اسے نیچے۔ اس سے قبل کہ میں اپنا سوال دہراتا اسی لمحے ایک زبردست گڑگڑاہٹ سے زمین اور فضا تھرا گئی۔ ایک غبار سا میری جانب اٹھا اور میں پیچھے ہوتا گیا ورنہ میں نیچے کھینچ لیا جاتا۔ ایک تیز رفتار ٹرین کے بخارات مجھ تک پہنچ رہے تھے اور پھر چاروں طرف پھیل گئے۔ منظر صاف ہوا تو میں نے اسے ڈنڈے پر جھنڈا لپیٹتے دیکھا جس سے اس نے جاتی ٹرین کو سگنل دیا تھا۔

میں نے اپنا سوال دہرایا۔ قدرے توقف کے بعد اور اس دوران میں گہری نظروں سے مجھے جانچتا نظر آیا۔ اس جھنڈا لپیٹے ڈنڈے سے ایک جانب میری سطح پر اشارہ کیا وہاں سے کوئی دو سو گز کا فاصلہ ہوگا۔

ٹھیک ہے' میں نے کہا اور اس جانب چل پڑا جبکہ وہ مجھ پر نگاہیں جمائے رہا۔

ایک اوبڑ کھابڑ، دائیں، بائیں مڑتے نیچے کی جانب جاتے راستے پر چلتا گیا۔

جہاں میں کھڑا تھا کٹاؤ بہت گہرا تھا، معمول کے خلاف تیزی سے گہرائی میں جاتا ہوا۔ یہ ایک مرطوب چٹان کو تراش کر بنایا گیا تھا جو گیلا ہو رہا تھا۔ میں نے نیچے اترتے دیکھا۔

اس بنا پر راستہ میرے لیے طویل ہو گیا۔ اس کی بتائی ہوئی جگہ تک پہنچتے پہنچتے میرا سانس پھول گیا۔ اگرچہ نیچے اترنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔

کافی نیچے آ کر میں اس کے قریب تھا۔ وہ انہی پٹریوں کے درمیان کھڑا تھا جس پر سے ابھی ابھی ٹرین گزری تھی۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ میرا منتظر ہو۔ اس کا بایاں ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے اور بائیں کہنی سینے پر پھیلے دائیں بازو پر ٹکا ہوا۔ اس کا رویہ ایسا، جیسے وہ میری توقع کر رہا ہو۔ میں ایک لمحے کو متعجب ہو کر رکا۔

میں دوبارہ نشیب کی سمت چل پڑا اور پٹریوں کے قریب پہنچ کر اس کے روبرو ہوا۔ وہ ایک نحیف، سیاہی مائل زردی جیسی رنگت، گھنی داڑھی، اور بھنویں غالباً بھاری۔ اس کی ڈیوٹی کی جگہ مکمل تنہائی اور ہولناکی کی علامت تھی۔ شاید میں نے ایسی نم آلود جگہ دیکھی ہو۔ دونوں جانب پہاڑ کو تراشا گیا تھا جس کے پتھر بھیگے ہوئے تھے۔ وہ گولائی میں پھیلتے ہوئے اوپر چلے گئے تھے لیکن دونوں سرے ملتے نہیں تھے۔ ان کے درمیان آسمان پٹی کی طرح نظر آ رہا تھا جسے آپ



باہر کی دنیا کی واحد کھڑکی کہہ سکتے ہیں ورنہ زمین دوز سنگلاخ قید خانہ۔

قریب ترین منظر، دوسری جانب، سرخ روشنی مقدور بھر تاریکی سے لڑتی ہوئی۔ یہی روشنی سرنگ کے دہانہ کو کسی قدر واضح کرتی ہوئی۔ سرنگ کے ماحول میں ایک وحشت ناک مایوسی چھائی ہوئی جہاں فراخی کا احساس بڑی مشکل سے ہوتا۔ شاید بہت تھوڑی سورج کی روشنی کا وہاں سے گزر ہوتا۔ اس وجہ سے وہاں ایک ایسی بو رچی ہوئی جو موت کا پتا دیتی ہو۔ اس قدر سرد ہوا وہاں سے گزری جس نے مجھے بھی یخ کر دیا۔ جیسے میں طبعی دنیا سے کسی اور دنیا میں آ گیا ہوں۔

اس سے پہلے کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت کرتا میں اس کے مقابل آ گیا۔ میں اسے چھو کر دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی نگاہیں میری آنکھوں پر جمائے ایک قدم پیچھے ہو کر اپنا ہاتھ بڑھایا۔

''یہ ایک ویران سا پوسٹ ہے جہاں آپ کی ڈیوٹی ہے'' میں نے کہا۔ میں نے اپنی بلند قامتی سے نیچے کی جانب دیکھا تو میرے لیے اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹانا مشکل ہو گیا۔ میں نے قیاس کیا کہ کوئی بھولا بھٹکا ہی شاید اس کی طرف آتا ہوگا۔ لیکن وہ ناپسند نہیں کرتا ہے۔ اس نے میرے اندر دیکھ لیا ہوگا کہ زندگی کی دلچسپیاں بہت تھوڑی ہیں اور زندگی کے بیشتر ہنگاموں سے آزاد ہو چکا ہوں۔ اس مقصد کے لیے میں نے اس سے بات کی لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ میری طرح سوچتا ہوگا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کس طرح گفتگو کا آغاز کیا جائے اس کی شخصیت میں بھی کوئی ایسی چیز تھی جس نے مجھے وحشت میں مبتلا کر دیا۔

سرنگ کے دہانے پر سرخ روشنی پر اس نے ایک عجیب سی نگاہ ڈالی اور غور سے دیکھتا رہا جیسے اسے وہاں کوئی متوقع چیز نہ مل رہی ہو، اس کے بعد میری جانب دیکھا۔

''یہ سرخ روشنی تمہارے اختیار میں ہے' کیا ایسا نہیں؟'' اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا'' کیا تم نہیں جانتے؟''

جب میں نے اس کی ساکت نگاہوں کا جائزہ لیا تو میرے ذہن میں ایک وحشت ناک خیال آیا کہ یہ انسان نہیں کوئی روح ہے۔ جیسے میں نے سوچنا شروع کیا مجھے لگا یہ دوسروں پر اثر ڈالنے کی قدرت رکھتا ہو۔

اپنی باری پر میں ایک قدم پیچھے ہٹا اور ہاتھ بڑھانے سے پہلے میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے متعلق ایک نظر نہ آنے والے خوف کو پا لیا۔ اس سے مجھے ہمت ملی اور میری وحشت کم ہوئی۔

''آپ مجھے دیکھیے'' بڑی مشکل سے ایک مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجاتے میں نے کہا'' غالباً آپ مجھ سے خوفزدہ ہیں۔''

''مجھے شک ہے'' وہ گویا ہوا'' شاید میں نے آپ کو پہلے دیکھا ہوا ہے۔''

''کہاں؟''

اس نے سرخ روشنی کی جانب اشارہ کیا جسے وہ دیکھ رہا تھا۔

''وہاں'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

مجھ پر نگاہیں جمائے بے آواز لہجے میں بولا ''ہاں''

''میرے بھائی، میں وہاں کیا کرنے جاؤں گا اور اگر ایسا ہے تو تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں وہاں کبھی گیا ہی نہیں''

''میں سمجھتا ہوں'' اس نے کہا'' مجھے یقین ہے، میں قسم کھا سکتا ہوں۔''

اس کا انداز واضح تھا جیسے میرا۔

اس نے میرے ریمارکس کا صاف اور برملا جواب دیا اور واضح ترین الفاظ میں کہا۔ کیا اس کے پاس کام کا بوجھ زیادہ ہے۔ لگتا ایسا ہی ہے اس کی ذمے داریاں کافی ہیں لیکن چوکنا رہنا اور پابندی وقت اس کے کام کی نوعیت کا بنیادی تقاضا ہے۔ اس کا کام بھاری اور محنت طلب ہے۔ وہ تنہا ہے بغیر کسی معاون اور مددگار کے۔ سگنل دینا، روشنی آراستہ کرنا اور فولادی دستے سے بار بار کانٹا بدلنا۔ یہ سب خود

اسے اپنے تئیں کرنا پڑتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں، بے شمار طویل اور تنہا وقفوں کے درمیان اسے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ وہ یہی کہہ سکتا ہے کہ زندگی کی اس روٹین نے دراصل اس کی زندگی کو ایک طرز عطا کر دیا تھا جس کا وہ عادی ہو چکا ہے اس نشیب کی ٹھٹھرتی تنہائی نے اسے ایک نئی زبان سے آشنا کیا جسے وہ صرف منظر سے سیکھتا تھا۔ جس کی ادائیگی کا خاص لہجہ اور تلفظ تھا جسے اس نے اپنے ناپختہ خیالات سے خود ایجاد کیا تھا۔ اس نے کسی حد تک کسور، اعشاریہ اور تھوڑا سا الجبرا پر بھی کام کیا تھا لیکن ایک کمزور طالب علم کی طرح اعداد پر اس کی گرفت مضبوط نہیں تھی۔

اس کے فرائض منصبی کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس مرطوب راہداری میں ہمیشہ رہے اور ان پتھریلی دیواروں کے درمیان سے نکل کر اوپر چمکتے سورج کی روشنی میں نہ جائے۔ وقت اور حالات اسے کیوں مجبور کرتے ہیں۔ چوبیس گھنٹوں میں اسے چند گھنٹے تو ایسے ملتے ہوں گے جب وہ اس تھکا دینے والی روٹین سے الگ ہو سکتا ہو۔ روشن اور خوشگوار موسم میں وہ گھٹن سے پر اس نشیب سے نکل تو سکتا ہے لیکن وہ تو سارا وقت اس برقی گھنٹی کی پکار کا جواب دینے کے لیے خود کو مستعد رکھتا ہے اور ایسے وقت اس کی پریشانی بڑھ جاتی ہے۔ اسے اس سے بھی کم آسودگی حاصل ہوتی ہو گی جتنا میں قیاس کر سکتا ہوں۔

وہ مجھے ایک بکس نما کمرے میں لے گیا۔ ایک طرف آگ روشن تھی۔ ایک ڈیسک جس پر ایک رجسٹر رکھا تھا۔ غالباً وہ اس میں اندراج کرتا ہو گا۔ ایک ٹیلی گرافی کا آلہ جس پر سوئیاں بجی تھیں۔ اور ایک چھوٹی سی برقی گھنٹی جس کا ابھی اس نے ذکر کیا تھا۔

میرے یقین کرنے پر کہ وہ ان ریمارکس سے درگزر کرے گا جو میں نے دیے تھے کیوں کہ اس کا حوصلہ زیادہ تھا جیسی کہ اس کی تربیت کی گئی ہو۔ وہ اس پوسٹ کی ضروریات سے زیادہ تعلیم یافتہ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس میں تھوڑی سی ناموزونیت ہے لیکن وہ اتنی سمجھ ضرور رکھتا ہے جو بڑے بڑے جسموں والے لوگوں میں نہیں ہوتا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ ایسا تربیت گاہوں (جیل) پولیس کے محکمے، فوج اور کم و بیش ہر جگہ ہوتا ہے حتیٰ کہ ریلوے میں بھی۔ ممکن ہے اس نے جوانی میں فلسفے کی تعلیم حاصل کی ہو۔ وہ متعدد لیکچر میں شریک ہوا ہو لیکن یہ ضرور ہے کہ اس نے بہتر موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اپنی حیثیت کم کرتا چلا گیا جسے کبھی بڑھا نہیں سکا۔

اسے زندگی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ اپنا بستر بچھا کر اس پر فروکش ہو چکا تھا اور اب اتنی دیر ہو چکی تھی کہ وہ دوسرا بستر بچھانے کے متعلق سوچتا۔

''آپ جو مجھے یہاں مطمئن دیکھتے ہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں گہرے احترام کے ساتھ بولا جو اس نے میرے اور آگ کے درمیان قائم کر رکھا تھا۔

وہ درمیان میں Sir کا لفظ ضرور استعمال کرتا۔ خصوصاً جب وہ اپنی جوانی کی باتیں کرتا۔ غالباً اس لیے کہ وہ مجھے باور کرانا چاہتا کہ وہ کچھ اور نہیں جو کچھ بھی ہے میرے سامنے ہے۔ برقی گھنٹی کی وجہ سے اسے کئی مرتبہ سلسلہ کلام توڑنا پڑتا۔ اس دوران میں اسے پیغام بھی پڑھنا پڑتا اور جواب بھی دینا پڑتا۔ ایک مرتبہ اس نے دروازے پر گئے بنا جھنڈا اس گزرتے ٹرین کے لیے لہرایا۔ اور ڈرائیور سے کچھ گفتگو بھی کی۔ اپنے فرائض کی ادائیگی میں، میں نے محسوس کیا وہ غیر معمولی مستعد اور اپنے کام کا پورا ہے۔ گفتگو کے درمیان مناسب جگہ پر رک کر اپنا کام مکمل کرنے تک قطعی خاموش رہتا۔

اگر میں ایک لفظ میں بتانا چاہوں تو یہ شخص اس پوسٹ پر متعین کیے جانے والے لوگوں میں سب سے زیادہ مناسب اور محفوظ ہے۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ گفتگو کے درمیان دو مرتبہ پژمردہ چہرے کے ساتھ اس نے برقی گھنٹی کی جانب دیکھا جب وہ نہیں بجی۔ باکس کا دروازہ جسے مرطوب ہوا کو روکنے کے لیے بند رکھا جاتا تھا۔ اس نے کھول کر سرنگ کے دہانے پر جلتی ہوئی سرخ روشنی میں دیکھا، دونوں موقعوں پر وہ ایک گھبراہٹ کے ساتھ واپس لوٹا۔ جسے

میں نے محسوس کیا۔لیکن وہ وضاحت کرنے کے قابل نہیں رہا، جبکہ ہم دونوں مختلف کیفیت سے گزر رہے تھے۔

جب میں رخصت لینے کے لیے اٹھا تو کہا کہ ''آپ نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کردیا کہ آج میں ایک انتہائی قناعت پسند شخص سے ملا ہوں۔''

میں خوفزدہ تھا اور تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے ایسا صرف اسے مزید کھولنے کے لیے کہا۔

''مجھے یقین ہے کہ میں ایسا ہی ہوں۔'' اس نے دوبارہ گفتگو کا آغاز مدہم آواز میں کیا جیسا اس نے پہلے کیا تھا۔

''لیکن میں مشکل میں ہوں' جناب واقعتاً مشکل میں، اس کی وضاحت بہت مشکل ہے جناب، اس سلسلے میں کچھ کہنا نہایت ہی دشوار ہے، آپ جب کبھی دوبارہ آئیں گے تو میں آپ کو بتانے کی کوشش کروں گا۔''

''میں خود دوبارہ آنے کا متمنی ہوں۔ بتاؤ کب رکھی جائے ملاقات۔''

''میں علی الصباح واپس جاتا ہوں اور جناب کل رات دس بجے واپس آؤں گا۔''

''میں گیارہ بجے تک آجاؤں گا۔''

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور دروازے تک مجھے چھوڑنے آیا۔ میں آپ کے راستے پر روشنی کیے دیتا ہوں جناب، اس نے اپنے مخصوص دھیمے اور عجیب لہجے میں کہا تاکہ آپ اوپر تک آسانی سے چلے جائیں۔ جب آپ راستہ پالیں تو پکاریئے نہیں اور جب آپ اوپر پہنچ جائیں' تب بھی نہ پکاریں۔''

اس کے انداز نے میرے لیے ماحول کو مزید سرد کردیا۔ تاہم میں نے سوائے ''بہت اچھا'' کہ اور کچھ نہیں کہا۔

جب آپ آئندہ تشریف لائیں تو بھی پکاریں نہیں۔ ایک الوداعی سوال کرنے کی اجازت دیں۔ آج شب آپ نے یہ کیوں کر پکارا ''ہیلو...... نیچے''

''خدا جانے'' میں نے کہا'' میں تو متوجہ کرنے کے لیے بس پکار دیا''

''صرف توجہ کے لیے نہیں جناب، میں ان خاص الفاظ کی بات کر رہا ہوں۔ میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔''

میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے انہی الفاظ سے پکارا۔اس میں کوئی شک نہیں۔ کیوں کہ میں نے آپ کو نیچے دیکھا اور پکار اٹھا۔

''کوئی اور وجہ تو نہیں، جناب۔''

''کیا اس کے علاوہ کوئی اور وجہ ہونے کا امکان ہے؟''

''کیا آپ کو قطعی احساس نہیں کہ کسی غیر مرئی طریقے سے آپ کو یہ الفاظ بتائے گئے ہوں۔''

''نہیں، قطعی نہیں۔''

اس نے مجھے شب بخیر کہا اور میرے لیے اوپر جانے کا راستہ روشن کردیا۔ میں پٹریوں کے ساتھ ساتھ چلتا گیا لیکن اس خوف کے ساتھ کہ میرے پیچھے کوئی ٹرین نہ آرہی ہوحتیٰ کہ میں نے راستہ پالیا۔

چڑھنا اترنے کی نسبت آسان نہیں ہوتا تاہم گرنے یا پھکنے کا خدشہ کم ہوجاتا ہے۔ پھر میں بغیر کسی ایڈونچر کے اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔

پابندیٔ وقت کے ساتھ دوسری شب میں وہاں تھا۔ میں نے دائیں بائیں مڑتے راستے پر پہلا قدم رکھا۔ دور کہیں گھڑی نے گیارہ بجائے۔ وہ نشیب میں میرا منتظر تھا۔ اس کے ہاتھ میں سفید روشنی جل رہی تھی۔

''آج میں نے پکارا نہیں'' میں نے کہا۔ جب میں اس کے قریب پہنچ گیا۔ ''کیا اب میں آپ سے بات کرسکتا ہوں؟''

''ہر طرح سے جناب۔''

''شب بخیر یہ رہا میرا ہاتھ۔''

''شب بخیر جناب، یہ رہا میرا۔''

ہم ساتھ ساتھ چلتے اس باکس تک آئے۔ اندر داخل ہوکر آگ کے قریب بیٹھ گئے۔

''میں نے اپنا ذہن بنالیا ہے جناب۔'' بیٹھتے ہی وہ میری جانب جھکا اور سرگوشی سے قدرے بلند آواز میں اس نے ابتدا کی'' کیا آپ دریافت نہیں

کریں گے کہ میں دو مرتبہ کس مشکل میں گرفتار رہا ہوں۔ کل میں نے کسی اور کی جگہ آپ کو دیکھا اور ملاقات بھی رہی یہی میری پریشانی کا باعث ہے۔''

''کیا غلطی سے؟''

''نہیں وہ کوئی اور ہے۔''

''کون ہے وہ۔''

''میں نہیں جانتا۔''

''کیا میری طرح؟''

''مجھے خبر نہیں۔ میں نے کبھی اس کا چہرہ نہیں دیکھا۔ بایاں ہاتھ چہرے پر ہوتا ہے اور دایاں ہاتھ ہلاتا جاتا ہے۔شدت سے۔اس طرح۔''

میں اس کے ہاتھ ہلانے کو غور سے دیکھتا رہا۔ ہاتھ ایک مخصوص اشارے کے طور پر تند و تیز طریقے سے' نہایت جذباتی انداز میں جیسے کہنا چاہتا ہو خدا کے لیے راستہ صاف کر دو۔''

''چاند سے روشن ایک رات میں'' وہ شخص بولا ''میں یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے ایک چیختی ہوئی پکار سنی ۔ہیلو...... نیچے (کون)۔ میں نے اوپر کی جانب دیکھنا شروع کیا۔ سرنگ کے قریب سرخ روشنی میں کوئی کھڑا ہے اور اسی طرح ہاتھ ہلاتے ہوئے جیسا میں نے آپ کو بتایا۔ آواز کرخت معلوم ہوتی تھی۔ دیکھو...... دیکھو...... پھر آواز آئی' ہیلو...... نیچے (کون)' دیکھو......' میں نے اپنا لیمپ اٹھایا، اسے سرخ روشن کیا اور پکارنے والے کی جانب لپکا۔ کیا مسئلہ ہے؟ کیا ہوا ہے کہاں؟ وہ سرنگ کے ٹھیک اندھیرے سرے پر کھڑا تھا۔ میں حصار نظر میں لیتے اس کی جانب بڑھا۔ٹھیک اسی لمحے وہ غائب ہو گیا۔''

''سرنگ کے اندر'' میں بولا۔

''نہیں میں خود سرنگ کے اندر دوڑا' کوئی پانچ سو گز تقریباً پھر میں رکا اور لیمپ کو اپنے سر کے اوپر کیے، طے کیے ہوئے فاصلے کا اندازہ کیا۔ دیکھا کہ پتھریلی دیواروں سے پانی رس رہا تھا۔جس کے دھبے دیکھے جا سکتے تھے ۔حتیٰ کہ چھت کی محراب سے بھی قطرے ٹپک رہے تھے ۔ اب اور تیزی سے باہر کی طرف بھاگا۔ مجھے اس جگہ سے نفرت سی ہونے لگی۔

سرنگ کی سرخ روشنی میں چاروں طرف اپنے لیمپ کی سرخ روشنی سے بھی دیکھا۔ فولادی سیڑھیوں سے اوپر گیگری تک گیا۔ پھر نیچے آیا اور واپس یہاں آ گیا۔ اپنے پوسٹ سے دونوں جانب ٹیلی گراف کیا اور الارم بھجوایا تاکہ معلوم کیا جائے اگر کوئی گڑبڑ ہو لیکن دونوں جانب سے یہی پیغام لوٹایا گیا کہ سب خیریت ہے۔

اب میں اپنی ریڑھ کی ہڈی پر کسی یخ انگلی کا لمس محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ سب کچھ، وہ ہیولیٰ اس کی اپنی ذہنی اختراع ہو سکتی ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہو۔ نازک شریانیں کسی بیماری کے سبب آنکھوں کو افعال کو قابو کر کے تصور کو تقریباً حقیقت کا روپ دے دیتی ہیں جو سراسر دھوکا ہوتا ہے۔ بعض متاثرہ مریضوں کے ساتھ ایسا دیکھا گیا ہے کہ بیماری کے دکھ اور تکلیف کی بنا پر وہ ایسا محسوس کرتے ہیں جسے تجربے سے ثابت بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک تصوراتی چیخ ۔ میں نے بتایا جب ہم اس قدر آہستہ گفتگو کر رہے ہیں۔ اس غیر فطری وادی میں چلنے والی ہوا۔ ٹیلی گراف کے تاروں کو ٹکرا کر کسی ساز کی ہیجان انگیز آواز بھی بنا سکتی ہے۔

''یہ سب کچھ ممکن ہے۔'' کچھ دیر ہم بیٹھے سننے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ دوبارہ گفتگو میں در آیا۔

اسے یہاں چلنے والی ہوا اور تاروں کا حال پہلے سے معلوم ہونا چاہیے چونکہ وہ یہاں کی سرما کی سرد ترین اور طویل راتیں گزار چکا ہے اکیلا یہ سب کچھ محسوس کرتا ہوا لیکن اس نے بڑے ادب سے کہا کہ ابھی اس کی بات ختم نہیں ہوئی۔

میں نے اس سے معافی چاہی اور اس نے میرے بازو کو چھوتے ہوئے ان الفاظ کا اضافہ کیا۔

اس ہستی کے ظاہر ہونے کے چھ گھنٹے کے اندر ایک زبردست حادثہ ہوا جسے بھلایا نہیں جا سکتا اور دس گھنٹے کے اندر لاشیں اور زخمیوں کو سرنگ کے اسی حصے سے لے جایا گیا جہاں وہ کھڑا اشارہ کر رہا تھا۔

ایک ناقابل فہم قسم کی تھرتھراہٹ مجھ پر طاری ہو گئی۔ میں نے اس کیفیت کو کسی طور برداشت کر لیا۔

سلسلہ خیال پھر جاری ہو گیا کہ یہ غیر معمولی قسم کا حسن اتفاق بھی ہو سکتا لیکن غیر معمولی قسم کا بھی اتفاق اگر مسلسل ہو تو ناقابل یقین ہو جاتا ہے لہذا اس پر غور کرنے کی ضرورت تھی خصوصاً اس طرح کے معاملات میں۔

میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے نقطۂ نظر کو تسلیم بھی کرتا ہوں میں نے دل میں سوچا کہ وہ میرے حسن اتفاق کی تھیوری کو آسانی سے تسلیم نہیں کرے گا۔ ایک سطحی ذہن رکھنے والا عام آدمی اپنی زندگی میں حسنِ اتفاق کے لیے زیادہ گنجائش نہیں رکھتا۔

اس نے پھر التجا کی کہ ابھی اس کی بات مکمل نہیں ہوئی۔

میں نے اس سے بار بار مداخلت کرنے کی معذرت چاہی۔

''یہ'' اس نے پھر اپنا ہاتھ میرے بازو پر رکھ کر اپنے کاندھے کے اوپر گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ایک سال قبل۔ اس حادثے کو چھ سات مہینے گزر چکے تھے اور میں درناک واقعہ اور اس کے شاک سے نکل آیا تھا۔ ایک روز صبح ابھی دن کا آغاز ہو رہا تھا۔ میں نے اس بھوت کو دوبارہ دیکھا۔''

وہ ٹھہری ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھتے، رکا۔

''کیا اس نے پکارا تھا۔''

''نہیں وہ خاموش تھا۔''

''کیا اس نے اپنا ہاتھ ہلایا تھا۔''

''نہیں بلکہ وہ روشنی کے کھمبے کے سہارے کھڑا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے اس طرح۔''

میں نے ایک مرتبہ پھر اسے غور سے دیکھا۔ اس کے رویے سے دکھ اور کرب کا احساس ہو رہا تھا۔ ایسے تاثرات، مقبروں کے سنگی دیواروں پر کھدے انسانی چہروں میں پائے جاتے ہیں۔

''کیا تم اس کی طرف گئے تھے؟''

''میں اندر آ کر بیٹھ گیا۔ اپنے خیالات کو کسی قدر مجتمع کیا۔ کسی قدر اس لیے کہ اس نے مجھے خوفزدہ کر دیا تھا۔ میں دوبارہ دروازے پر گیا۔ دن کی روشنی مجھ پر مترشح ہو رہی تھی اور وہ بھوت جا چکا تھا۔

لیکن کچھ بھی نہیں ہوا اور نہ کچھ سامنے آیا۔

اس نے اپنی انگشت شہادت سے دو یا تین مرتبہ میرے بازو کو چھوا لیکن اس کے انداز میں گرمجوشی نہیں تھی۔

ٹھیک اسی دن جب ایک ٹرین سرنگ سے باہر نکلی۔ ایک کمپارٹمنٹ کی میری جانب کھلتی کھڑکی میں۔ میں نے دیکھا کہ کوئی ہاتھوں اور سر کو عجیب انداز سے حرکت دیتا مجھے کچھ اشارے کر رہا ہے۔

میں نے اسے ٹھیک اس وقت دیکھا جب ڈرائیور کو سگنل دینا تھا کہ گاڑی روکے۔ اس نے روکا اور بریک لگا دی لیکن گاڑی ڈیڑھ دو سو گز گھسٹتی چلی گئی۔ پہیوں کے رگڑ کی آواز اور چنگاری۔ میں ٹرین کے پیچھے بھاگا اور کھڑی گاڑی کے متوازی دوڑتا گیا۔ میں نے وحشت ناک چیخ و پکار سنی۔ ایک کمپارٹمنٹ میں ایک حسین خاتون دم توڑ گئی اور اس کی لاش یہاں لائی گئی اور اسی جگہ ہمارے درمیان کی جگہ پر رکھی گئی۔

غیر ارادی طور پر میں نے اپنی کرسی پیچھے کھسکائی اس جگہ پر میری نگاہ تھی جہاں اس نے اشارہ کیا تھا۔

''سچ جناب قطعی اور ناقابل تردید سچ، جیسا میں نے آپ کو بتایا۔ بالکل اسی طرح ہوا۔''

میں مزید کچھ سوچنے اور سوال کرنے کے قابل نہیں رہا۔ میرا حلق سوکھ رہا تھا۔ ہواؤں سے بجتے ٹیلی گراف کے تار اس غم انگیز تاثر کو دور تک لے جا رہے تھے۔

اس نے پھر بولنا شروع کیا۔ اب آپ غور کریں اور فیصلہ کریں کہ میں کیسی مشکل اور تکلیف میں ہوں۔ وہ بھوت ایک ہفتے قبل سے اب ٹھہر ٹھہر کر بار بار وہاں ظاہر ہوتا ہے۔

''اسی روشنی میں؟''

''ہاں اسی خطرناک روشنی میں''

''وہ کیا کرتا نظر آتا ہے۔''

''وہ دہراتا ہے' پہلے کے مقابلے میں ممکن حد تک زیادہ جوش اور ولولے سے وہی حرکت دہراتا

ہے جس کا مفہوم میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ خدا کے لیے ہٹ جاؤ، راستہ صاف کر دو۔''

وہ پھر غائب ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد مجھے کوئی راحت اور سکون نہیں ہوتا۔ کئی منٹوں تک اس کی آواز میرے کانوں میں گونجتی رہتی ہے۔

ہیلو...... دیکھو...... دیکھو۔ وہ کھڑے ہو کر مجھے اشارے کرتا ہے لیکن چہرہ چھپائے ہوئے۔ اسی کے ساتھ میری چھوٹی گھنٹی بج اٹھتی ہے۔

میں نے بھی گھنٹی بجنے والی بات محسوس کی ہے۔ کیا کل شام بھی جب میں تمہارے ساتھ بیٹھا تھا، یہ گھنٹی بجی تھی اور تم دروازے تک کسی کو دیکھنے گئے تھے۔''

''جی ہاں، دو مرتبہ!''

اب دیکھو میں نے اسے سمجھایا۔ کس طرح تمہارا تصور، تمہارے خیالات تمہیں دھوکا دے رہے ہیں۔ میری آنکھیں گھنٹی پر جمی ہوئی تھیں اور میرے کان اس کی آواز سننے کے لیے مستعد' اور اگر میں جیتا جاگتا، تمام حسیات سے آراستہ انسان ہوں تو میں تمہیں بتاؤں کہ دونوں مواقعوں پر گھنٹی نہیں بجی اور نہ میں نے سنی۔ وہ صرف اس وقت بجتی ہے جب تم سے رابطہ رکھنے والے اسے بجاتے ہیں اور یہ طبعیات کے قدرتی اصولوں کے تحت بجتی ہے۔ نہ کسی اور وقت کسی اور طرح سے بجتی ہے۔

اس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور بتایا کہ اس نے بھوت کی بجائی ہوئی گھنٹی کو شناخت کرنے میں کبھی غلطی نہیں کی۔ مجھے اس میں کوئی مغالطہ بھی نہیں کہ میں انسانوں کی بجائی گھنٹی اور اس بھوت کی بجائی گھنٹی میں امتیاز نہ کرسکوں۔ بھوت جب گھنٹی بجاتا ہے تو اس کی تھرتھراہٹ مخصوص قسم کی ہوتی ہے جو کسی اور طبعی طریقے سے پیدا نہیں کی جاسکتی۔ میں یہ بھی دعویٰ نہیں کرتا کہ آنکھیں گھنٹی کو ان خاص مواقعوں پر ہلتا ہوا دیکھتی ہیں اور مجھے اس بات پر بھی حیرت نہیں کہ آپ نے نہیں سنا لیکن میں نے سنا ہے۔

''اور جب تم نے باہر جھانکا تو کیا وہ بھوت وہاں موجود تھا؟''

''ہاں وہ تھا وہاں!''

''دونوں مواقعوں پر!''

اس نے تیقن سے جواب دیا ''دونوں مرتبہ!''

''کیا آپ میرے ساتھ دروازے تک آسکتے ہیں تاکہ دیکھیں کہ وہ اس وقت وہاں ہے یا نہیں۔''

اس نے اپنا نچلا ہونٹ دبایا جیسے وہ اس کے لیے تیار نہ ہو لیکن پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے دروازہ کھولا اور سیڑھیوں پر کھڑا ہو گیا۔ وہ راہداری میں کھڑا رہا۔ وہ خطرناک روشنی بدستور روشن تھی اور سرنگ کا ہولناک دہانہ بھی۔ چٹانوں سے تراشی ہوئی نم سنگی دیواریں دونوں جانب ایستادہ اور ان کے اوپر آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے۔

''کیا تم نے اسے دیکھا؟'' میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمائے دریافت کیا۔ اس کی آنکھوں میں مخصوص چمک نمایاں تھی جیسے کچھ کھوجتی ہوئی۔ لیکن یہ تاثر زیادہ گہرا نہیں تھا جتنا کہ میں متجسس تھا۔ میں نے اسی خاص جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں'' اس نے جواب دیا ''وہ وہاں نہیں ہے۔''

''تم اب مجھ سے متفق ہو'' میں نے پوچھا

ہم دوبارہ اندر آگئے اور دروازہ بند کر دیا اور انہی کرسیوں پر دوبارہ براجمان ہو گئے۔ اب میں اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے متعلق سوچ رہا تھا۔

اب ہمارے درمیان کوئی اختلاف نہیں رہا۔

اس نے اپنے خیالات کی پوری طرح وضاحت کر دی اور مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ اب میری پوزیشن قدرے کمزور ہو گئی ہے۔

''آپ نے اب پوری طرح سمجھ لیا ہوگا، جناب!'' اس نے کہا ''وہ کیا چیز ہے جس نے اس قدر خوفناک طریقے سے مجھے پریشان کیا ہوا ہے۔ یہی وہ سوال ہے کہ وہ بھوت کیا چاہتا ہے؟''

میں سمجھتا ہوں کہ شاید پوری بات ابھی میرے ادراک میں نہیں آئی۔ میں نے اسے بتایا

اس کا انتباہ کس کے خلاف ہے؟

زیادہ تر آنکھیں آگ پر جمائے اور گا ہے

میری طرف دیکھتے وہ غور وفکر میں منہمک رہا۔اور بولا ''خطرہ ہے کیا؟ اور خطرہ ہے کہاں؟ وہ خطرہ معلق ہے ان پٹریوں پر، کوئی بڑی تباہی آنے والی ہے۔تیسری مرتبہ مجھے اس کے ہونے کا یقین ہے چونکہ دو مرتبہ اس سے قبل ہو چکا ہے لیکن یہ سب میرے لیے ایک ظالمانہ وحشت ہے۔میں کیا کرسکتا ہوں؟''

اس نے جیب سے رومال نکال کر پیشانی پر آنے والے پسینے کے قطرے پونچھ ڈالے۔

اگر میں اپنے پوسٹ سے کسی طرف یا دونوں جانب خطرے کا سگنل بھیجوں تو میں اس کی کوئی توجیہہ نہیں دے سکوں گا۔اس دوران میں وہ اپنی ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑتا رہا۔اس طرح میں خود کو مشکل میں ڈال لوں گا۔اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہوگا وہ مجھے پاگل قرار دے سکتے ہیں۔

ہمارے پاس کام اس طرح ہوتا ہے۔

پیغام......خطرہ......احتیاط برتی جائے۔

جواب' خطرہ کیا ہے؟ اور کہاں!

پیغام' میں نہیں جانتا لیکن خدا کے لیے احتیاط بہتر ہے۔

وہ مجھے برخواست کردیں گے۔

اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتے ہیں۔

اس کا ذہنی انتشار میرے لیے قابل رحم ہے ایک حساس آدمی کے لیے اذیت کا باعث۔اس کی برداشت سے بڑھ کر کیوں کہ وہ ایک ذمے دار اور فرض شناس ملازم ہے۔

''جب وہ پہلی مرتبہ خطرناک سرخ روشنی میں ظاہر ہوا'' وہ بولتا گیا۔پیشانی پر جھولتے کالے بالوں کو الٹتے ہوئے۔اپنے ہاتھوں کو اپنی کنپٹیوں پر شدت بے حالی سے دباتے ہوئے ''وہ کیوں مجھے بتا نہیں دیتا کہ حادثہ کہاں ہونے والا ہے اور اگر یہ ناگزیر ہے تو وہ طریقہ کیوں نہیں بتاتا جس کے ذریعے اس حادثے کو روکا جاسکتا ہو۔

''دوسری مرتبہ جب وہ ظاہر ہوا' اس نے اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا۔بجائے اس کے اس نے یہ کیوں نہیں بتایا کہ وہ مرنے والی ہے۔اس خاتون کو گھر پر بھی روکا جاسکتا تھا۔اگر وہ دو مرتبہ حادثے سے قبل صرف مجھے یہ بتانے آیا تھا کہ اس کی تنبیہہ بالکل سچی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب وہ مجھے تیسرے کے لیے تیار کررہا ہے وہ سب کچھ مجھے غیر مبہم طریقے سے بتا کیوں نہیں دیتا۔میں کیا کروں۔اے خداوند میری مدد فرما۔ایک بے اختیار سگنل مین اس دور دراز تنہا پوسٹ پر کیا کرسکتا ہے۔وہ کسی ایسے شخص کو متنبہ کیوں نہیں کرتا جو اس پر یقین کرے اور سد باب کی طاقت بھی رکھتا ہو۔

جب میں نے اسے اس حال میں دیکھا۔لہذا میں نے فیصلہ کیا کہ اس مسکین شخص کے لیے اور عام لوگوں کی حفاظت کے پیش نظر اس وقت مجھے حالات کے مطابق بات کرنا چاہیے تاکہ اس کا ذہن مزید پراگندہ نہ ہو۔لہذا ایسے تمام سوالات جن کا تعلق حقائق سے ہو یا خیالی ہوں انہیں پرے کرتے اس کے سامنے ایک فرض شناس شخص کی ذمے داریاں بتائیں کہ اسے اپنا کام بہترین طریقے سے انجام دینا چاہیے اور اس کے لیے آسانی تھی کہ وہ پہلے ہی سے اپنا فرائض سے کماحقہ آگاہ ہے۔اگرچہ وہ اس چکرا دینے والی ہستی کے بار بار ظاہر ہونے کو پوری طرح سمجھ نہیں پا رہا ہے۔اس کوشش میں میں اچھا خاصا کامیاب رہا کہ اسے اس کے طرز فکر سے باہر لانے کی کوشش کروں۔اب وہ پرسکون ہو چکا تھا۔اس پوسٹ پر اس کی پیشہ ورانہ ذمے داری بھیگتی رات کے ساتھ ساتھ بڑھنے لگتی تھی اور اس سے مزید توجہ کا تقاضا کرتی تھی۔میں نے اس کے پاس رات ٹھہرنے کی پیش کش کی جو اس نے اس نے سنی ان سنی کردی۔

میں اپنے راستے پر بلندی کی سمت جارہا تھا تو الٹ کر سرخ روشنی پر نظر ڈالی۔اب مجھے بھی اس سرخ روشنی سے نفرت ہو گئی تھی۔اس رات میں چین کی نیند نہیں سو سکا جیسے وہ سرخ روشنی میرے بستر کا احاطہ کیے ہوئے ہو۔

میں ان دو حادثات کو پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا۔خصوصاً اس نوجوان لڑکی کی موت کو۔میرے پاس کسی بھی طرح کوئی جواز نہیں کہ میں ان حادثات کی پردہ

پوشی کروں۔

لیکن جو سوچ میرے دماغ میں گردش کر رہی تھی کہ مجھے جواب میں کیا کرنا چاہیے کیوں کہ اب میں ان تمام معلومات کا حامل تھا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ وہ سگنل مین ذہین، ہوشیار، دردمند اور فرائض کی ادائیگی میں نہایت مستعد۔ لیکن اس ذہنی کرب میں وہ کب تک ایسا رہ پائے گا۔ ابھی تک اس کے کاندھوں پر بڑی بھاری امانت ہے۔ کیا میں اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر اس کا ساتھ دوں کہ وہ اپنی ڈیوٹی بدرجۂ اتم ادا کر سکے۔

میں نے محسوس کیا کہ میں اس کے احساسات کو دبانے میں کامیاب نہیں ہو رہا کیوں کہ میرے اظہار میں کوئی منافقت موجود تھی کمپنی کے ذمے داروں کو اس نے یہ سب کچھ بتایا۔ اوّل انہوں نے تمام معاملات کو زیادہ سیریس نہیں لیا بلکہ اسے درمیانی راہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ لہذا میں نے اسے کسی مناسب ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی پیش کش کی تاکہ تمام تفصیل بتا کر اس کی رائے لی جائے۔ کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ اس کی ڈیوٹی میں آئندہ مثبت تبدیلی ہونی تھی۔ اس نے میرا مشورہ قبول کر لیا۔ اب اسے ایک یا دو گھنٹے کی فرصت طلوعِ صبح کے وقت اور ایسا ہی شام کو ملے گی۔ میں نے اسی پروگرام کے مطابق دوبارہ آنے کا وعدہ کیا۔

دوسری شام ایک سہانی شام تھی۔ اس کا لطف اٹھانے میں گھر سے جلدی نکل پڑا۔ ابھی سورج نشیب میں نہیں اترا تھا۔ میں میدانی راستے کو قطع کرتے ہوئے گہرے کٹاؤ کے اوپر پہنچ گیا میں نے اپنی چہل قدمی کو مزید ایک گھنٹے طول دینے کا فیصلہ کیا کہ آدھا گھنٹہ جانے میں اور مزید آدھا گھنٹہ واپس آنے میں در پھر وقت ہو جائے گا کہ میں سگنل مین کے باکس تک جا سکوں۔

میں اپنی چال کو تیز کیے بنا اس پہاڑی کٹاؤ کے کنارے تک آیا اور میکانکی انداز سے نیچے نگاہ ڈالی میں اس سنسنی کو بیان نہیں کر سکتا جس نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ سرنگ کے دہانے کے قریب

غزل

اب آرزوئے عشق کا حاصل نہیں رہا
لیلیٰء جستجو کا وہ محمل نہیں رہا
صحرائے حزن و یاس میں بھٹکا وہ قافلہ
جس قافلے میں رہبرِ منزل نہیں رہا

آلام و مشکلات میں گرچہ اسیر تھا
"لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا"
طوفان کی تلاش تھی ساحل تھا رو برو
ساحل کی سمت آئے تو ساحل نہیں رہا
شب ہائے غم میں آنسو بہائے تھے جو کبھی
ان آنسوؤں کا اب کوئی حاصل نہیں رہا

ساحل کو بھی ڈبو کے رہی موجِ اشکِ غم
طوفانِ اشک و آہ کا حاصل نہیں رہا
بیتاب یہ مشاہدۂ چشمِ شوق ہے
حق کو ملا مقام تو باطل نہیں رہا

بشیر بیتاب

میں نے ایک ہیولیٰ دیکھا جس کا بایاں آستین آنکھوں کو ڈھانپے ہوئے اور دائیں ہاتھ کو زور زور سے ہلا رہا تھا۔

ایک بے نام خوف جو مجھ پر طاری ہوا تھا ایک لمحے میں زائل ہو گیا۔ جب میں نے اس ہیولیٰ کو ایک زندہ شخص کے قالب میں دیکھا اور چند لوگوں کو اس کے قریب جمگھٹا لگائے پایا جنہیں وہ شخص نقل اتارتے بتا رہا تھا کہ اس نے کیا دیکھا۔ وہ خطرناک سرخ روشنی ابھی جلی نہیں تھی اور اس کے کھمبے کے ساتھ ایک زمین سے لگی چھوٹی جھونپڑی نما کوئی چیز تھی۔ یہ میرے لیے بالکل نئی چیز تھی جسے چند بلیوں اور ترپال سے بنایا گیا تھا جو ایک بستر سے زیادہ بڑی نہیں تھی۔

ایک ناگزیر دکھ کا احساس کہ کچھ ہو چکا ہے۔ ایک خود ملامتی خوف نے مجھے گھیر لیا کہ اس شخص کے ساتھ کوئی جان لیوا حادثہ ہو چکا ہے جسے میں یہاں کل چھوڑ گیا تھا۔ پچھتاوے کا شدید احساس کہ کیا کسی کو بھیج کر اس حادثے کو روکا جاسکتا تھا یا کم از کم اس کی اصلاح کی جاسکتی تھی۔ میں اس اوبڑ کھابڑ راستے پر تیزی سے جتنا میں بھاگ سکتا تھا نشیب میں اترتا گیا۔

''کیا معاملہ ہے؟'' میں نے لوگوں سے دریافت کیا۔

''آج صبح سگنل مین مارا گیا، جناب۔''

''وہ شخص تو نہیں جو اس باکس میں رہتا تھا۔''

''جی ہاں، جناب!''

''آپ اسے پہچان لیں گے اگر آپ اسے جانتے ہیں'' اس شخص نے کہا جو دوسروں کا ترجمان دکھائی دیتا تھا۔ اس نے احتراماً سر سے ٹوپی اتاری اور ترپال کا ایک کونا سرکایا۔ اف میرے خدایا' اس کا چہرہ مکمل تھا۔ آپ اس کرب کا ادراک کر سکتے ہیں کہ گزشتہ شام جس شخص کے ساتھ گزاری اسے اب ایک لاش تسلیم کریں' برداشت کرنا پڑتا ہے۔

''یہ کیسے ہوا؟ یہ کیسے ہوا؟'' میں ایک ایک شخص سے یہ سوال پوچھتا رہا۔ اس دوران میں ترپال دوبارہ ڈھک دیا گیا۔

اسے ایک انجن نے دو ٹکڑے کر دیا، جناب! پورے انگلینڈ میں اس کام کو اس سے بہتر جاننے والا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ بہر حال اس نے باہر جاتی ریل کی پٹریوں کو کلیئر نہیں کیا۔ یہ دن کی مکمل روشنی میں ہوا۔ اس نے لیمپ روشن کیا ہوا تھا جو اس کے ہاتھ میں تھا۔ جیسے ہی انجن سرنگ سے باہر آیا۔ اس کی پشت انجن کی جانب تھی جس نے اسے کاٹ ڈالا۔ ڈرائیور چلایا تھا۔ اس نے بتایا یہ سب بتایا کیسے ہو' ٹام' محترم کو دوبارہ بتاؤ یہ سب کیسے ہوا؟''

وہ شخص گہرے رنگ کا سیاہی مائل یونیفارم پہنا ہوا تھا۔ اپنی جگہ پر وہ سرنگ کے دہانے کی جانب پیچھے کو ہولیا۔ ''سرنگ کے اندر بیضوی ٹریک پر چلتے ہوئے'' اس نے بتایا'' جناب! میں نے اسے دہانے پر دیکھا۔ میں اسے واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ اپنی اسپیڈ چیک کرنے کا وقت قطعی نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ سگنل مین نہایت محتاط ہوا کرتا ہے جبکہ میں نے محسوس کیا کہ وہ سیٹی کی آواز پر دھیان نہیں دے رہا۔ میں نے سیٹی بند کر کے اس کے قریب ہوتے ہوئے اسے پکارا جتنی زور سے پکار سکتا تھا۔

''تم نے کیا کہا؟''

میں نے کہا'' وہاں نیچے، دیکھو...... دیکھو...... خدا کے لیے راستہ کلیئر کر دو۔''

آہ وہ ایک وحشت ناک وقت تھا۔ میں نے اسے پکارنا بند نہیں کیا۔ میں نے ایک ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیا تا کہ جو ہونے جا رہا ہے اسے دیکھ نہ سکوں اور دوسرا ہاتھ لہراتا رہا آخر لمحے تک۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

اس بیان کو اس مخصوص وقوعہ پر آپ جیسے چاہیں چسپاں کریں لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کیا یہ حسن اتفاق ہے کہ جس قسم کی تنبیہ انجن ڈرائیور نے کی اور جو اشارے کیے۔ نہ صرف الفاظ بلکہ حرکات بھی بعینہ وہی تھے جو اس بدنصیب سگنل مین کو دکھائے جاتے رہے اور وہ اس سے پریشان ہوتا رہا لیکن اس کے یا میرے گمان تک میں نہ تھا کہ وہ بے چارہ خود شکار ہونے والا ہے۔

☆☆......☆☆